سفر آشوب

(مغربی ایشیا کی سیاست پر مضامین)

مصنف

حامد انصاری

مترجم

پروفیسر اختر الواسع

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

سفر آشوب

(مغربی ایشیا کی سیاست پر مضامین)

مصنف

حامد انصاری

مترجم

پروفیسر اختر الواسع

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2014
تعداد	:	550
قیمت	:	-/235روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1200

SAFAR ASHOB
(Maghrabi Asia Ki Siyasat Par Mazameen)
By: Hamid Ansari
Translated by: Prof. Akhtarul Wasey

ISBN :978-93-5160-059-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے ۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں ۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں ۔ زبان کا حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے ۔مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں ۔ مفروضے سے معروضہ، مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے ۔فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں رد و قبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ جذبے ، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے ۔زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے ۔ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں کی لسانی تشکیل کا نتیجہ ہے ۔اردو نے اپنا ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر کرتے ہیں ۔

اردو میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو پکی روشنائی عطا کر کے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے ۔کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں ۔کسی خاص جغرافیائی خطے کے مسائل کو سیاسی، سماجی، معاشی،

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2014
تعداد : 550
قیمت : -/235روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1200

SAFAR ASHOB
(Maghrabi Asia Ki Siyasat Par Mazameen)
By: Hamid Ansari
Translated by: Prof. Akhtarul Wasey

ISBN :978-93-5160-059-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے ۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں ۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں ۔ زبان کا حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے ۔مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔ مفروضے سے معروضہ، مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے ۔فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں رد وقبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے ۔زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے ۔ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں کی لسانی تشکیل کا نتیجہ ہے ۔اردو نے اپنا ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر کرتے ہیں۔

اردو میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو پکی روشنائی عطا کر کے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے ۔کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں ۔کسی خاص جغرافیائی خطے کے مسائل کو سیاسی، سماجی، معاشی،

تہذیبی اور تاریخی تناظر میں دیکھنے کا رویہ عالمی منظرنامے کے مسائل سے معاملہ کرتا ہے۔ اس کتاب میں مشرق وسطیٰ کے مسائل کو مختلف پہلوؤں سے ابھارا گیا ہے اور بتدریج تبدیلیوں سے نتائج نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔مغربی ایشیا کی سیاسی تاریخ اپنے ظاہر و باطن میں ہلچلوں اور ہچکولوں سے عبارت ہے۔فلسطین، اسرائیل اور لبنان کے ناگفتہ بہ حالات نے پوری دنیا کو سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔عرب اتحاد اور پین اسلامزم کے نعرے پر سوالیہ نشان قائم ہوا ہے۔جنگ اور فساد مسائل کا حل نہیں، پھر بھی دنیا کی بڑی طاقتیں جنگی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے جس میں اسلام اور جمہوری اصول، عسکریت، سفارت کاری، تعلیم اور معاشی اصلاحات کے توسط سے حقوق انسانی کی بقا کو موضوع بنایا گیا ہے۔مشرق وسطیٰ کے مسائل نائب صدر جمہوریہ جناب حامد انصاری کی فکر ونظر کا خاص میدان ہیں۔اس موضوع پر نہ صرف ان کے متعدد لکچرز ہوئے ہیں، بلکہ وہ مسلسل ان موضوعات پر سوچتے اور لکھتے رہے ہیں۔ پروفیسر اختر الواسع ہمارے عہد کے اہم دانشور ہیں۔انھوں نے حامد انصاری صاحب کی تحریروں کو انگریزی سے اردو کا قالب عطا کیا ہے۔اس عمدہ کاوش کے لیے کونسل انھیں مبارک باد پیش کرتی ہے۔

امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ ہمیں اہل ذوق کی آرا کا انتظار رہے گا۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
(ڈائرکٹر)

جب روح راستہ بھول جائے تو اس کی
صرف ایک ہی مسرت ہے کہ ایک کیفیت سے
دوسری کیفیت میں ڈھلتی رہے۔

ابوالعتاہیہ
(748-825AD)

فہرست

	تعارف	ix
	پہلا حصہ: اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں	
1-	اسلام اور جمہوری اصول	3
2-	دین اور سیاست	29
3-	عسکری اسلام	51
4-	یونائیٹڈ اسٹیٹس اور عالم اسلام	73
5-	ہندوستانی مسلمان: ایک تصور	99
	دوسرا حصہ: بھنور کے گھیرے میں	
6-	خلیج فارس کی پاسبانی - I	107
7-	خلیج فارس کی پاسبانی - II	127
8-	فلسطینی عسکریت پسندی اور امن کا عمل	143
9-	افغانستان: ایک خصوصی ہمسایہ	159
10-	فلسطین: سفارتکاری کی گنجائش؟	195

11-	سعودی عرب میں اصلاحات	241
12-	عراق کی دلدل-I	305
13-	عراق کی دلدل-II	337
14-	'عظیم تر مشرق وسطیٰ' کی اصلاح	375

تیسرا حصہ: برمحل افکار

15-	جدیدیت کی ایک مسمار عمارت (دی ڈریم پیلیس آف دی عربس: اے جنریشنز اوڈیسی، فواد عجمی)	435
16-	مذاکرات میں لیت ولعل (دی برنگ آف پیس: دی سیرین۔اسرائیلی نگوسیشینز، اتامر رانبووچ)	443
17-	اسرائیل اور عرب ریاستی نظام (دی ڈیکلائن آف عرب اسرائیلی کانفلکٹ: مڈل ایسٹ پالیٹکس اینڈ دی کویسٹ فار ریجنل آرڈر: آوراہم سیلا)	461
18-	انسانی حقوق کی جدید گردان (ہیومن رائٹس ہورائزنز: دی پرسوٹ آف جسٹس ان اے گلوبلائزنگ ورلڈ: مصنف رچرڈ فاک)	477

چوتھا حصہ: ضمیمے

19-	ضمیمے	487
20-	فلسطین	489
21-	سعودی اصلاحات	531

تعارف

اس مجموعہ میں شامل مضامین گزشتہ کچھ سالوں میں مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے تھے۔ یہ خاص طور سے مشرق وسطیٰ کے خطہ سے متعلق ہیں جس کے مسلسل جاری رہنے والے مسائل کو مرکزیت کے وبال نے دو چند کر دیا ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے طور پر نکلے ہوئے اس ناگزیر عنصر نے اس خطہ کو کئی بار تنازعہ کے حلقوں کی جانب ڈھکیلا ہے۔ اس نے معاشرتی ارتقائی عمل میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں اور اس سے اشارۃً وکنایۃً ایسی فرسودہ اور گھسی پٹی چیزیں بھی اختراع کیں جس نے تجزیہ کو مہملات کی حد تک آسان بنا دیا۔ یہ مضامین اگرچہ طرح اندازی کے طور پر ہیں لیکن یہ اس خطہ کے کچھ علاقوں میں فعال محرکات کی شناخت اور سماجی وسیاسی تبدیلی کے اسباب وعلل کی جستجو میں بھی ہیں۔

مغربی ایشیا کی اصطلاح بجا طور سے استعمال کی جاتی ہے۔ جغرافیائی نقطہ نظر اور مغربی ممالک کے علاوہ دیگر مقامات کے لیے مشرق وسطیٰ ایک غیر موزوں اصطلاح اور اس زمانے کی وراثت ہے جب نقشہ پر مقاموں کی پہچان یوروپین سلطنتوں میں ان کی مقامیت کے حوالہ سے ہوتی تھی۔ ایک امریکی بحری مورخ نے 1900 میں تحریر کرتے ہوئے مشرق وسطیٰ کے متعلق بیان کیا ہے کہ ایک اہم جگہ ہے جو یوروپ اور مشرق کے درمیان سینڈوچ بنا ہوا ہے (1) تعجب خیز بات

یہ ہے کہ علاقہ کے لوگوں نے اس اصطلاح کو بغیر اس کے متضمن اثرات کو سمجھے ہوئے اسے جوں کا توں قبول کرلیا۔ حالیہ سالوں میں مختلف مسلک وعقیدہ کے تجزیہ نگاروں نے، اپنے نقشہ کشی کی انجینئرنگ کے شوق و تلاش میں یہ بھی کہہ دیا کہ ''مشرق وسطی کا کوئی وجود نہیں ہے''۔ لہٰذا جب مشرق وسطی کے باشندوں نے اپنے اوپر تھوپی ہوئی اصطلاح کو قبول کرلیا تو وہ جنھوں نے یہ اصطلاح وضع کی تھی زمینی اور نفسیاتی ساخت نو کی تلاش میں اس سے دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔

دنیا کے کئی دوسرے ممالک کی طرح، دور جدید میں مغرب سے مغربی ایشیا کا تعارف سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شروع ہوا اور انیسویں صدی کے اندر ان تعلقات میں تیز رفتاری آئی۔ یہ غیر مساوی بنیاد پر تھا۔ جیسا کہ لاپی ڈوس نے کہا ہے کہ یوروپین کی کاروباری اور سیاسی بالادستی نے مسلم سماجوں کے اداروں کے توازن کو بگاڑ دیا ہے(2)۔ تجارت اور ٹیکس کی آمدنی سے ان کو بے دخل کردیا ہے، مرکزی حکومتوں کو کمزور کردیا ہے اور خود کو ثقافتی، سیاسی اور معاشی پیکر میں ڈھال لیا ہے۔ اس کا ابتدائی ردعمل حیرانی کا تھا۔ اس زمانے کے عرب ادیبوں کی تحریریں جیسے شام کے رفاع الطحطاوی، تیونس کے خیرالدین اور مصر کے عبدالرحمٰن الکوابکی ان مخصوص حالات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایران کے مرزا مالکم خان اور ہندوستان کے سید احمد خان نے بھی یہی کیا۔ جمال الدین افغانی نے اس کو ایک وسیع تر اسلامی تصور بنانے کی کوشش کی اور ہندوستان میں الطاف حسین حالی اور محمد اقبال نے یہی کام کیا۔ ولفریڈ کانٹ ویل نے 1957 کی اپنی تحریروں میں اس نفسیاتی اثر کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے جو نئی صورتحال کے نتیجے میں مسلم ذہن پر مرتب ہوا تھا:

> ''موجودہ اسلام کا بنیادی اضطراب یہ احساس ہے کہ اسلامی تاریخ کے ساتھ کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اور جدید مسلمان کا اساسی مسئلہ یہ ہے کہ اُس تاریخ کو کیسے ٹھیک ٹھاک کیا جائے، تاکہ یہ پوری توانائی کے ساتھ متحرک ہو اور اسلامی معاشرہ ایک بار پھر اسی طرح پھلے پھولے جیسے کہ ایک آسمانی ہدایت یافتہ معاشرہ کو چلنا چاہیے۔''(3)

لیکن براہ راست یوروپین غلبہ یا حکومت بعد کا وقوعہ ہے۔ عرب دنیا میں قوم پرستانہ جذبہ کی اولین لہریں عثمانی سلطنت کی بدانتظامی اور بدنظمی سے پیدا ہوئیں اور ان کی توجہ شام اور لبنان کی آزادی اور عربی ان ملکوں کی سرکاری زبان ہونے پر تھی۔ اس کی کوئی مسلکی جہت نہ تھی۔ وقت کے ساتھ عرب یگانگت و یکجہتی کا احساس جاگا جو زبان اور ثقافت کے مشترک ہونے اور اس کو ایک سیاسی شکل دینے پر مبنی تھا۔ نیشنلزم کے دور میں اس کا اظہار عرب نیشنلزم کی صورت میں ہوا۔ سامراجیت کے دور میں، سامراج مخالف ممکنات اس کی سب سے پہلی ترجیح تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کی تقسیم کاری کا بھلا ہو کہ اس کو عثمانی غلبہ سے نجات ملی اور عارضی ہی سہی، اطمینان و سکون کا تجربہ ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے منظر نامہ نے عرب امنگوں کی تکمیل میں نئی اور پیچیدہ رکاوٹیں حائل کیں؟ مغرب جو عرب زندگی کا اثر انگیز عنصر تھا ان کو دھونساتا، تحقیر کرتا، الزام لگاتا اور دھوکہ دیتا رہا، (4) نصف صدی بعد اپنی زندگی کے آخری دنوں میں منظر کا جائزہ لیتے ہوئے ایڈورڈ سعید نے انکشاف کیا کہ ''مغرب کو عرب نیشنلزم سے شدید زہریلی اور گہری جڑوں والی دشمنی تھی اور اس کو ہر ممکن طریقہ سے زک پہنچانا ان کا سیاسی ارادہ تھا۔''(5)

ریاست کی ساخت نے معاملات بہتر نہیں کیے۔ پان عربزم اور مقامی عرب قوم پرستی کے درمیان تضادات اور آفاقیت کے نعرہ اور سیاسی دباؤ سے بھرپور پالیسیوں کی وجہ سے سکڑتی ہوئی معاشرہ کی بنیاد کی حقیقت کے درمیان تضادات نے مدد کی اور اب بھی اس عمل میں مدد کر رہی ہیں۔ سماجی ترقی کے نہ ہونے نے بھی اپنا اثر چھوڑا۔ نذیرہ زین الدین نے اس کا چار نقابوں کی علامتوں سے اظہار کیا ہے: لباس، جہالت، جمود، منافقت - دانشوروں نے سیکولر قوم پرستی اور جدت کی عمارت تعمیر کی، (6) لیکن یہ ان ہی کے گوشہ عافیت تک محدود رہی۔ عرب قوم پرستی کو کئی دھچکے لگے جو اس کے قانونی جواز کے بحران سے ابھر کر بالآخر اس کے انہدام پر ختم ہوئے۔ اس نے بڑے پیمانے پر سیکولر گردان کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے راہ ہموار کی اور اُن تحریکات و نظریات کو ان کی جگہ دی جو مذہب سے متاثر تھے اور اس قرآنی آیت میں جواز تلاش کرتے تھے: ''تم انسانوں کی طرف بھیجی گئی تمام امتوں میں

بہترین ہو، تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو، برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر یقین رکھتے ہو (سورۃ آل عمران: 110) اسلامی تجدید کی دعوت اس کا ایک صریح منطقی نتیجہ تھی۔

عرب اور مسلم سماجوں میں اسلام کے مقام، پین اسلامزم کے مختلف نقطۂ نظر اور قومیت کے تصور میں اس کے نقوش اکثر بحث کا موضوع رہے ہیں لیکن وقت اور مقام میں اس کے محرکات اور جہتوں کے فہم وادراک کے بجائے اس بحث نے حرارت وتپش زیادہ پیدا کی ہے۔ پھر بھی اسلامزم کے آفاقی فیصلے اور رائیں ہر جگہ 'قومی۔ ریاستی حدود میں قید ہیں' اور مقامی، نسلی اور مسلکی حقیقتوں کی دی ہوئی شکل لیے ہوئے ہیں (7) یہ مظاہرہ کے لیے اجتماعی قوت، حتیٰ کہ کمیونٹی کی بہبود کے لیے بھی سامنے لایا لیکن قومی تعمیر نو کے لیے نہیں۔ سید قطب کا ترتیب دیا ہوا ہراول دستہ ''کریٹیکل ماس'' نہ بن سکا اور نہ ہی اس کے بعد میں آنے والی تحریکوں سے کوئی بہتر نتائج برآمد ہوئے۔ اسلامی بحث ومباحثہ کا بہرحال ایک یہ فائدہ ضرور ہوا کہ توجہ، طرز حکمرانی، حاکم ومحکوم کے حقوق اور سیاسی استحقاق کے بڑے مسئلہ پر مرکوز ہوگئی لہٰذا بہتر حکمرانی اور قانون کی حکومت پر روایتی اور جدید دلائل ایک دوسرے کے نزدیک آگئے اور ایک دوسرے کے مدد ومعاون ثابت ہوئے۔ اسی طرح سے گروپ حقوق جو ایک قوم پرست کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا ہے یا گروپ شناخت پر مبنی رجحان نے بحث کو آخرکار حقوق انسانی کی جانب دھکیل دیا ہے۔ مارچ 2004 میں ''عرب اصلاحات کا مسئلہ: تصور اور نفاذ'' پر دیے گئے اسکندریہ اعلان میں کہا گیا کہ ضرورت یہ ہے کہ ''ایک جانب آزادی فکر وتخلیق اور دوسری جانب مذہب کے نام پر لادی گئی سرپرستی کے ضرر رساں تضاد کو ختم کیا جائے۔'' شاید ایک بہت غیر اہم اقلیت نے یہ دلیل دی ہے کہ مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے ان کا پختہ ارادہ ہو کہ ان کے سماج انصاف اور تکثیریت کے لیے جوابدہ ہیں: ''اس کا مطلب ہے کہ ظلم اور بے انصافی کے ہر نقش کو مقصدیت کے ساتھ مٹایا جائے اور اس کی ہر ساخت کو للکارا اور ڈھایا جائے۔'' ان تصورات کی بنیاد پر ایک روایتی تنقیدی تجزیہ یا موروثی سماجی سیاسی فریم ورک اپنے آپ کو خود روایت میں ڈھال لے گا اور آخرکار تنقیدی تجزیہ کو دوبارہ تعاون دے گا۔

مغربی ایشیا میں فساد اور بلڑ بازی کا عمل جاری ہے۔ ایک تھمیڈ ورین دور کے بعد ایرانی انقلاب نے تبدیلی کے لیے داخلی محرکات اور جغرافیائی سیاسی ہم آہنگی کے لیے بیرونی دباؤ میں توازن کے لیے کوشش کی۔ نظریہ سازوں کی ایک نئی نسل نے اسلامی فریم ورک کے اندر آزادی و جمہوریت اور ایرانی شناخت۔ ایرانی، اسلامی اور مغربی۔ کی نئی وسعتوں پر غور کرتے ہوئے سایہ دار راستے تلاش کر لیے ہیں (8) ابھی حال ہی میں نوجوان قدامت پرستوں کا ایک گروپ، اپنی علاحدہ رایوں اور نظریات جو انقلاب کے اولین اصولوں سے منسوب ہیں، کے ساتھ ابھرا ہے۔ دوسری طرف عراق کی جنگ کے باعث عرب دنیا میں موجود مسائل نے مزید پیچیدگی پیدا کر لی ہے عرب حکومتوں نے امریکہ کو جنگی کوششوں سے خبردار کیا، ٹالنے کی کوشش کی اور خفیہ طور سے تعاون کیا۔ ان کے عوام کا ردعمل شدید، لیکن رائیگاں تھا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس نے یک طرفہ طور سے 9/11 سے جو سبق حاصل کیے اس میں عرب اور مسلم غم و غصہ کی وجہ ان ملکوں میں غلط طرز حکمرانی اور عدم جمہوریت کو قرار دیا اور اس لیے ان کی جدیدکاری کا فیصلہ کیا گیا۔ اور تینوں کمزوریوں کو ایک بڑے دھماکے سے بہتر بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا جس کی ابتدا ''آپریشن عراقی فریڈم'' سے ہوگی۔ اس عمل میں غم و غصہ کا ایک اہم عنصر بھلا دیا گیا اور وہ فلسطینی مسئلہ کے منصفانہ حل کی جانب پیش رفت میں ناکامی تھی۔ نہ ہی مجوزہ جمہوریت سازی کے آخری مقصد کے بارے میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کا ارادہ زیادہ واضح ہے۔ اگر اس پر سنجیدگی سے کام کیا جائے تو یہ نئی سرداری کے خاتمہ کا اعلان ہوگا اور ایسا کوئی بھی قدم۔ کم سے کم مدت میں۔ خود یونائیٹڈ اسٹیٹس کی حکمت عملی کے خلاف جائے گا۔ لیکن یہ یقیناً ممکن ہے کہ سرپرستی کے نقدان کے خوف سے ارباب حل و عقد وہ کام کریں جو ان سے مطلوب ہے اور اسی حد تک کریں جتنا مطلوب ہے۔ لیکن کیا عوام ساتھ دیں گے؟ کیا سماجی جوڑ توڑ کی استعداد اس حد تک ممکن ہے؟ کیا یہ خود کو استحقاق کے داؤ پر لگا سکتی ہے۔ ''عرب ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ 2004'' میں کہا گیا ہے بہتر حکمرانی اور آزادی کے درمیان بڑی رکاوٹیں کھڑی ہوئی ہیں: ''عرب دنیا ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑی ہے جہاں ایک آزاد معاشرہ کی تخلیق کی کوشش میں سمجھوتے اور غفلت

سے کام نہیں چلے گا'' (9) ایسی تخلیق یک بیک نہیں ہوگی۔ اس کو درآمد کی ہوئی شے کے بجائے ایک طریقہ عمل میں سمونا ہوگا۔

عرب منظرنامہ کے ایک محتاط مبصر کا مشاہدہ ہے کہ ''موجودہ صورتحال میں اضطراب و بے چینی کا سلگتا ہوا احساس ہے جو بغاوت سے بہت قریب ہے۔ تبدیلی کی پیاس کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔'' اس کے مزید تین مشاہدات بھی قابل ذکر ہیں: حکمراں طبقہ کا دوسروں کو اختیارات تفویض کرنے سے انکار، حاکم اور رعایا کے درمیان معاہدہ عمرانی کا انقطاع اور ''پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں'' بیرونی فوجیوں کے اڈوں کی واپسی۔ (10)

یہ مباحثہ ابھی عالم طفلی میں ہے اور یقیناً نئ صدی کے چیلنجز کا سامنا کرے گا (11) یہ حقوق انسانی کے ہمیشہ سکڑتے ہوئے افق کے لیے نئ پگڈنڈیاں کھوج سکتا ہے جو انسانی آزادی کا راستہ ہے۔ رچرڈ فاک، جن کی کتاب پر تبصرہ اس مجموعہ کے ایک باب میں شامل ہے، نے اس کی کچھ لالچ دلانے والی وسعتوں کا پتہ لگایا ہے۔ اس بحث کا ایک اور پہلو آفاقیت کی ناگزیری اور شناخت اور سند کے مسئلہ پر اس کا ایک جنسیانہ اثر ہے۔ کیا اس جوش سے بھرے عمل میں دیگر مغربی ایشیائی ملک بھی شریک ہوں گے؟

اس وقت جب یہ مسودہ اشاعت کے لیے جارہا ہے فلسطین اور لبنان میں مزید دھماکے ہورہے ہیں اور یہ روسو کے اس عقیدے کو مزید تقویت بخشتے ہیں کہ طاقت حق نہیں عطا کرتی ہے اور طاقت استحقاق کے مترادف نہیں ہے۔ ان دھماکوں کا منبع جون 1967 کے بعد اسرائیلی طاقت کے غیر استحقاقی اظہار سے ہے اور فطری طور پر اس سے جوڑا جاتا ہے:

> پچھلے چار عشروں میں یو ایس پالیسی امریکی عوامی آئیڈیل اور جزوی طور سے یو ایس تعاون یافتہ اسرائیلی عمل کے درمیان واضح تضاد کے باعث ایک دلدل بنی ہوئی ہے۔ ایک طرف تو امریکا عربوں کو جمہوریت کے مہذب عصری اصولوں، جدیدیت اور تنازعوں کے پرامن حل کی نصیحت کرتا ہے۔ دوسری جانب نہ صرف یہ کہ ایک جابرانہ فوجی قبضہ کی حمایت

> کرتا ہے بلکہ نسلی مذہبی بنیاد کے دعووں پر بسی بسائی آبادی کی زمین کو ہتھیا لینے کی حمایت کرتا ہے جس کو دیگر حالات میں یو ایس کی حکومتیں اور رائے عامہ کی اکثریت قطعی طور سے ناجائز قرار دیں گے (12)۔
>
> اسرائیل اور تیل کے مرکب کے نتیجے میں یونائیٹڈ اسٹیٹس خود کو ایک ایسے علاقے میں الجھا ہوا پاتی ہے جو شورشوں سے بھرپور اور کٹر امریکی مخالف ہے جس کی نظیر اس سے پہلے تاریخ میں نہیں ملتی (13)۔

اس رجحان کو تقویت دینا اور اس کو بڑے پیمانے پر آگے لے جانا ایک نظریاتی ترجیح اور مغربی ایشیا میں زمینی نقشہ کشی کی ایک شعوری خواہش تھی۔ 9/11 کے اگلے دن قومی سلامتی مشیر کنڈولیزا رائس کو فکر تھی کہ ''ہم ان مواقع سے فائدہ کیسے اٹھائیں؟'' اس کے خیال میں گیارہ ستمبر ''ان بڑے زلزلوں میں سے ایک تھا جو ہموار اور دھاردار کردیتے ہیں (14)۔'' ایک پین ٹیگن تجزیہ نگار نے لکھا ''میرے لیے تو 9/11 ایک حیران کن تحفہ تھا۔'' (15) لہٰذا ''آپریشن عراق فریڈم۔ خلیج فارس میں مرکوز ایک سسٹم پرٹربیشن کی تخلیق کی کھلی کھلی کوشش تھی تاکہ وہاں ضابطوں میں گڑبڑی پیدا کی جائے، چیزوں کو ہلا دیا جائے اور ایک زبردست دھماکہ کا ٹریگر دبایا جائے جس سے علاقہ کے سلامتی نظام میں مکمل تبدیلی آجائے اور ہماری توقع تھی کہ اس سے زیادہ ہوگا'' (16)۔ اس سلامتی کو آفاقیت کے مسلسل عمل اور فروغ کے لیے لازمی سمجھا گیا۔ یہ مکمل عمل ایک وسیع قیاسی طرز استدلال میں ظاہر کیا گیا یعنی مارکیٹس کی ترقی کے لیے استحکام لازمی ہے: ترقی کے لیے وسائل لازمی ہیں؛ وسائل کو انفرااسٹرکچر کی ضرورت ہے: انفرااسٹرکچر کو مال کی ضرورت ہے، مال کا انحصار قانون پر ہے اور قانون کے لیے استحکام ضروری ہے۔ اس استحکام کے لیے ایک طاقتور مطلق العنان حکمراں کی ضرورت ہے جس کے پاس طاقت استعمال کرنے کی ہمت اور صلاحیت ہو۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس اُسی حکمراں کا پیکر ہے۔ (17)

چار سال بعد اس رجحان کی ناکامی ثابت ہوگئی۔ اکتوبر 2005 میں میری لینڈ یونیورسٹی کے پروفیسر شبلے تلہامی اور زوگبی انٹرنیشنل نے مشترکہ طور پر چھ اعتدال پسند عرب ملکوں جو یونائیٹڈ اسٹیٹس کے دوست تصور کیے جاتے ہیں یعنی مصر، اردن، لبنان، مراکش، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں رائے شماری کی۔ نتیجہ کے طور پر کئی انکشافات ہوئے (مندرجہ ذیل باکس میں رائے شماری کے نتائج دیکھے جاسکتے ہیں)

نمبر سوالات	جوابات کا طرز
1- سب سے بڑا خطرہ کیا ہے؟	اسرائیل 70%، یو ایس 63%، یو کے 11%، ایران 10%
2- علاقہ میں یو ایس پالیسی کا خاص عنصر	تیل 76%، اسرائیل کی حفاظت 68%، علاقہ پر بالادستی 63%، مسلمان ریاستوں کو کمزور کرنا 59%، عالمی تباہی کی روک تھام 25%، استحکام 8%، جمہوریت کا فروغ 6%
3- علاقہ میں جمہوریت کے فروغ میں امریکی حصہ	مختلف ممالک میں فیصد مختلف ہے۔ 59% سے 78% کا خیال ہے کہ یہ اصل مقصد نہیں ہے؛ 10% سے 24% کا خیال ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس اس کو غلط طریقہ سے ہینڈل کررہا ہے۔ 1% سے 16% سمجھتے ہیں یہی اصل مقصد ہے۔
4- جنگ کے بعد عراق کی حالت	بدتر 77%، بہتر 6%، پہلے جیسی 13%

5-غزہ سے اسرائیلی انخلا کے اسباب	فلسطینی لچک 27%، فلسطینی گروپس کے مسلح حملے 26%، مغربی کنارہ پر کنٹرول مضبوط کرنے کی خواہش 20%، بین الاقوامی دباؤ 15%، امن کی خواہش 5%، محمود عباس کا الیکشن 4%
6-جوہری توانائی کی افزودگی پر ایران کا حق	حمایت 60%، مخالفت 21%، غیر یقینی 19%
7- ایران کے جوہری توانائی کے پروگرام کا مقصد	پر امن مقصد 32%، جوہری اسلحہ 43%، غیر یقینی 25%
8-پسندیدہ ٹی وی چینل	الجزیرہ 65%، العربیہ 34%، ایم بی سی اور ابوظہبی 19%، ایل بی سی 16%، ایک مصری نیٹ ورک 14%، المنار 9%
9- القاعدہ کے کس پہلو سے آپ کو ہمدردی ہے، اگر ہے؟	یونائیٹڈ اسٹیٹس سے مقابلہ 36%، مسلم موقف کے لیے کھڑے ہونا 20%، اس کا طریقہ عمل 7%، ایک اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش 6%

یہ بات صاف ہوگئی کہ مشرق وسطی کے عظیم منصوبے نے توقع کے مطابق نتیجہ نہیں دیا ہے، لیکن پھر بھی ایک سوچی سمجھی ہٹ دھری جاری ہے۔ اب یہ بھی روز بروز مشکل ہوتا جارہا ہے کہ مغربی ایشیا کے خاص مسائل پر اسرائیلی پالیسیوں اور ان پالیسیوں پر امریکی ردعمل یا عدم ردعمل میں امتیاز کیا جائے۔ جب جون 2006 میں اسرائیلی وزیراعظم ایہود اولمرٹ نے فرانس کا دورہ کیا تو انھوں نے ''الفگارو'' سے ایک بے تکلف انٹرویو میں غیر مبہم الفاظ میں اپنی ترجیحات پیش کیں: ''ہم چاہتے ہیں کہ حماس کی قیادت والی حکومت بغیر کسی تشدد کے گر جائے؛ یروشلم یہودی ریاست کی راجدھانی رہے؛ امریکی صدر بخوبی سمجھتے ہیں کہ اسرائیل بستیوں کو کیوں نہیں ہٹا رہا؛ میں صدر جیراک سے اپنی اس خواہش پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ اسرائیل کی شمالی سرحدوں پر لبنان کے ساتھ استحکام قائم رہے'' (18)۔ ایک منتخب مذاکراتی پارٹنر کو تسلیم نہ کرنے سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ دائمی حیثیت پر گفت وشنید کے لیے

اسرائیل کا رجحان نہیں ہے یعنی وہ ایک فلسطینی ریاست کے حق میں نہیں ہے۔ 2003 میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کے صدر نے ارئیل شیرون کے ساتھ ایک سازش میں شریک ہوکر روڈ میپ کے نفاذ کو ٹال دیا تھا۔ تین سال بعد وہ یہ کام ایک بار پھر ارئیل شیرون کے جانشین کے ساتھ کررہے ہیں تاکہ تنازعہ کے مذاکراتی حل کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں۔ بجائے اس کے کہ وہ خطہ کا ایک ملک بنے اسرائیل چاہتا ہے کہ وہ اس میں ایک جزیرہ بنا رہے۔

اس کے باوجود گہری نظر رکھنے والے اسرائیلیوں کو علاقہ میں ابھرنے والی ایک نئی چیز سے کچھ اشارے مل رہے ہیں۔ عرب رائے عامہ گہرے اشارے ترسیل کررہی ہے اخوان المسلمین کا مصر میں، حماس کا مقبوضہ فلسطین میں اور مذہبی شیعوں کا عراق میں اقتدار پر آنا وہ اشارے ہیں۔ عرب رائے عامہ کی اس جدت کی بازگشت مغرب میں بیٹھے ان افراد کے آنگن میں بھی گونجنا چاہیے جو عالمی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں (19) اس رائے کو جولائی۔اگست میں ہونے والی لبنان کی لڑائی میں جو زبردست حمایت حزب اللہ کو عرب ممالک میں حاصل ہوئی مزید تقویت بخشتی ہے۔ (20) ایک جوشیلی رائے عامہ کا یکجا ہونا، غیر ریاستی کرداروں کی تعاون یافتہ مزاحمت، ان دونوں عناصر سے ہم آہنگ ہوتا ہوا مضبوط سرکاری موقف، عوامی میڈیا کی مسلسل فکری و نظریاتی نشریات اور اسرائیل کے ضرر پذیر ہونے کے احساس نے مجموعی طور پر علاقائی سیاست میں ایک نیا عنصر داخل کردیا ہے جس کے اثرات آنے والے مہینوں میں نظر آئیں گے۔ (21)

اس تنازعہ کی قیمت اسرائیل کو بھی چکانی پڑ رہی ہے اور کم سے کم کچھ اسرائیلیوں کو اس کا ہوش ہے:

> جنگ میں جیسا کہ جنگ میں ہوتا ہے: اسرائیل ایک کرخت قوم پرست ماحول میں فرق ہوتا جارہا ہے اور اندھیرا ہر چیز کو ڈھانکتا جارہا ہے۔ روکنے کے آلات جو ہمارے پاس تھے گلتے جارہے ہیں اور جس بے حسی اور اندھے پن نے گزشتہ سالوں میں اسرائیلی سماج کو جکڑ رکھا تھا وہ مزید طاقتور ہورہا

ہے۔ داخلی محاذ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ شمال میں مسائل
ہیں اور وسطی علاقہ پرسکون ہے۔ لیکن دونوں ہی پر جارحانہ
رویہ، بے دردی اور انتقام، انتہا پسندی کی آوازیں جو پہلے
حاشیہ پر تھیں اب دل کی صدا بن چکی ہے۔ اس سے پہلے کہ
جنگ کسی نتیجہ پر پہنچے یہ بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی بگولے
کی طرح اٹھتی ہوئی قیمت اخلاقی دیوالیہ پن کو جو ہمیں چاروں
طرف سے گھیرے میں لے رہا ہے اور حزب اللہ کے کافی
ادشار کی طرح ہمارے وجود اور نشانیوں کے لیے خطرہ بن رہا
ہے، بھی شامل ہوگا۔(22)

کسی بھی سماج میں انسانی شعور میں انصاف کا ایک احساس ناقابل گریز لازمہ ہے اور جیسے کہ جان رالز نے اشارہ کیا ہے کہ ''انصاف کے ذریعہ حاصل کیے ہوئے حقوق سیاسی سودے بازی اور سماجی مفادات کے میزان کے تحت نہیں آتے۔'' لہٰذا مغربی ایشیا میں جو بھی تصفیہ ہو وہ منصفانہ ہو۔

حواشی

1- اس اصطلاح کے تاریخی ارتقا پر بسام طبی نے اپنی کتاب'' کانفلکٹ اینڈ وار ان دی مڈل ایسٹ: فروم انٹر اسٹیٹ وار ٹو نیو سیکورٹی'' (سیکنڈ ایڈیشن لندن 1998) صفحات 46-44، اس کے باوجود بھی وہ اصطلاح کے آگے بے بس ہو گئے ''مشرق وسطیٰ کی اصلاح کو یہاں صرف سلاست کی وجہ سے برقرار رکھا گیا ہے۔ قاری کو اصطلاح کی یورو سینٹرک تصوراتی تاریخ اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے۔

2- لاپی ڈوز، ایرا ایم۔''اے ہسٹری آف اسلامک سوسائٹیز (نیویارک1995) صفحہ 557

3- اسمتھ، ڈبلیو سی۔ ''اسلام ان موڈرن ہسٹری'' (نیویارک 1957) صفحات48-47

4- حوالہ بالا،صفحہ 165

5- سعید، ایڈورڈ۔'دی عرب کنڈیشن'۔''الاہرام ویکلی'' 24 مئی 2003

6- عجمی، فواد۔''دی ڈریم پیلیس آف دی عربس: اے جنریشنز اوڈیسی'' (نیویارک، 1998) صفحات 15 اور XI

7- طبی، بسام۔''عرب نیشنلزم ٹوبین اسلام اینڈ دی نیشن اسٹیٹ'' (نیویارک 1997)،صفحہ 231

8- سروش، عبدالکریم۔ ''ریزن، فریڈم اینڈ ڈیموکریسی ان اسلام'' (نیویارک

2000) صفحہ 156۔ ایک مذہبی جمہوری حکومت کے فرائض صفحہ 122 میں گنائے گئے ہیں۔ ایران کے مباحثہ میں دیگر اہم شرکا محسن کا دیور اور مجتہد شبستار؛ موازنہ سعید عامر ارجمند: ''دی ریفارم مومنٹ اینڈ دی ڈبیٹ آن موڈرنٹی اینڈ ٹریڈیشن ان کنٹمپریری ایران''۔''انٹرنیشنل جرنل آف مڈل ایسٹ اسٹڈیز'' جلد 34 (2002) صفحات 31-719۔ ارجمند کا خلاصہ قابل غور ہے۔''1990s کے ایرانی اصلاح پسندی نے اسلامی جدیدیت کو نہ صرف اس کی انتہا پسند سیاسی جہت سے آزاد کیا بلکہ اس کو معذرت آمیز بند ذہنیت سے بھی نجات دلائی جو بیسویں صدی کے زیادہ تر حصہ میں اس کا نشان بنا رہا۔''

9- یو این ڈی پی ''عرب ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ'' 2004 (2005) صفحہ 179

10- سیل، پیٹرک۔''وھاٹ ہوپ فار عرب ڈیموکریسی؟''۔الحیات، 3 جون 2005

11- فضل الرحمٰن کے اس سے پہلے والے کام کے علاوہ بھی مسلمان مفکرین جیسے محمد ارکون (ری تھنکنگ اسلام) نے اس مباحثہ میں ٹھوس طریقہ سے حصہ لیا۔ فاطمہ مرنیسی (اسلام اینڈ ڈیموکریسی) اور امینہ ودود (قرآن اینڈ ویمن: ری ریڈنگ دی سیکریڈ ٹیکسٹ فرام اے وومینز پرسپیکٹیو) نے بھی نسوانی نقطہ نظر سے ایسا ہی کام کیا ہے۔ خالد ابوالفضل (اسپیکنگ ان گاڈز نیم: اسلامک لا، اتھارٹی اینڈ ویمن) نے متن کے تجزیہ میں نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ طارق رحمان نے ایک اور پہلو کا احاطہ کیا ہے (ویسٹرن مسلمز اینڈ دی فیوچر آف اسلام)۔ مولانا حسین احمد مدنی، محمد مجیب، اصغر علی انجینئر، رشید الدین خان، رفیق زکریا، ایم جے اکبر اور دوسروں نے ان ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں جو ایک تکثیری، جمہوری سوسائٹی میں رہ رہے ہیں، کے بارے میں لکھا ہے۔

12- لیون، اناطول۔''امریکن رائٹ آر اونگ: این ایناٹومی آف امریکن نیشنلزم'' (نیویارک 2004) صفحہ 184

13- حوالہ بالا صفحہ 190

14- یونگ، گیری۔''بلیئرز بلو بیک'' گارجین 11 جولائی 2005
15- بارنیٹ، تھامس پی ایم ''دی پین ٹیگنز نیو میپ: وار اینڈ پیس ان دی توینٹی فرسٹ سنچری'' (2004) صفحہ 34
16- حوالہ بالا، صفحہ 277
17- حوالہ بالا، صفحات 205-199
18- تقی الدین، راندہ۔''اولرٹ اِن فرانس'' الحیات، 14 جون 2006
19- باریئل زوی۔''دیپراز عرب پبلک اوپنین، ہارمیٹز، یکم جنوری 2006
20- میک فارقوہر ''ٹائیڈ آف عرب اوپینین ٹرنز ٹو سپورٹ حزب اللہ'' دی نیویارک ٹائمز 28 جولائی 2006
21- خوری، رای جی۔''قنا: ان ٹو اِن چارٹرڈ ڈپلومیٹک یسرین'' ایجنس گلوبل میں hights@agenceglobal.com، 30 جولائی 2006
22- لیوی، گڈیان۔''ڈیز آف ڈارک نیس'' ہارٹیز، 30 جولائی 2006

پہلا حصہ

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں

اسلام اور جمہوری اصول

اسلامی علم کائنات تخلیق کے موضوع سے شروع ہوتا ہے۔ قرآن تخلیق کے مقصد سے بحث کرتا ہے۔ اس کی تخلیق 'حق' (سورۃ الحجر:85، سورۃ النحل:3، سورۃ الدخان:39، سورۃ الجاثیہ:22 اور سورۃ الاحقاف:3) اور اطاعت خداوندی (سورۃ الاحقاف:20) کی خاطر کی گئی ہے۔ انکار اور اس کے اثرات کے سوال کو ابلیس کی کہانی کے ذریعہ (سورۃ ص 71-78) اجاگر کیا گیا ہے۔ (1) حکمراں کا قانونی استحقاق، حاکم ومحکوم کے باہمی حقوق و فرائض اور بیعت و وفاداری کی شرائط کے مسائل مسلمانوں اور مسلم معاشرہ کے لیے لامتناہی غوروفکر کا باعث رہے ہیں۔ ان میں سے ہر موضوع روایتی ہے اور ہر ایک کے گرد ایک عصری ہالہ ہے۔ لہٰذا روایت اور جدیدیت ایک ہی سکے کے دو رُخ کی طرح ابھرتے ہیں اور اصل چیلنج، ڈیلیل براؤن کے حساس الفاظ میں اس طرح دیکھنا ہے کہ 'روایت روشنی کی ایک لکیر ہے جو جدیدیت کے منشور (Prism) سے منعطف ہورہی ہے'۔ (2)

دانشور ایک عرصہ سے اسلامی طرز حکومت کے بارے میں بحث کررہے ہیں۔ انھوں نے نص، تفسیر اور تاریخ کے صفحات کو کھنگال ڈالا ہے۔ ان میں سے کچھ نے 'پردے اٹھائے ہیں' لیکن دوسروں نے اسے پھر گرا دیا ہے۔ آخرالذکر عمل کے نتیجہ میں جو بات واضح

اور بین تھی پھر پردے کے پیچھے چلی گئی اور متنازعہ بن گئی۔ اس سلسلہ میں خاصا وقت برباد ہوا اور روشن خیال قیاس آرائیوں کو جو کسی بھی فعال معاشرہ کی نشانی ہوتی ہیں، جامد اور گمراہ کن تقلید کے حق میں پس پشت ڈال دیا گیا۔

مسلمان عالم انسانیت کا چھٹا حصہ ہیں اور دنیا کے زیادہ تر حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک دینی اور معاشرتی طور سے اسلام ایک زندہ حقیقت ہے۔ لہٰذا معاشرتی معاملات میں اسلامی زاویہ اخلاق، عوامی مسائل سے وابستہ ان کے ادراک پر اثرانداز ہوتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر ایک خالص قدیمی سیاسی اکائی اور طرز حکومت کا تصور ہر دور میں عملی طور سے برمحل رہا ہے۔

قرآن اپنے مقصد اور موضوع کو سورہ نمبر/2 میں ظاہر کرتا ہے۔ ''یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اور ہدایت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیئے'' (سورۃ البقرہ:2) یہ ہدایت چھ ہزار سے کچھ زیادہ آیات میں دی گئی ہے اور ان میں سے درج ذیل آیات حکمرانی کے سوال سے متعلق ہیں۔

- مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (سورۃ الحجرات:15)
- تم سب امتوں میں بہتر ہو جو اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ (سورۃ آل عمران:115)
- اے ایمان والو! اپنے وعدوں کو پورا کرو۔ (سورۃ المائدہ:1)
- اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ (سورۃ النساء:59)
- اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب کا حکم مانا، نماز قائم کی اور آپس کے مشورہ سے کام کیا اور ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (سورۃ الشوریٰ:38)
- یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔

ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کردو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہوجائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ (سورۃ آل عمران:159)

- اور کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو یہ مناسب نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ فرمادیں تو وہ اس میں اپنے اختیار پر عمل کریں اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو وہ یقیناً صحیح راستہ سے بھٹک گیا۔ (سورۃ الاحزاب:36)

- اے ایمان والو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ (سورۃ النساء:135)

قرآنی نص کی یہ آیات ذاتی اور عوامی معاملات میں طرز عمل کے لیے عمومی اصول مرتب کرتی ہیں۔ یعنی یہ ایک قوم کی سیاسی زندگی کی تنظیم اور خاص طور سے اس کے کام کرنے کے طریقہ سے متعلق ہے۔ آخرالذکر میں کسی بھی فیصلہ سے پہلے عوامی مشورہ (شوریٰ) کرنا چاہیے۔ مدینہ کی شہری ریاست اور مسلمانوں کے مسائل طے کرنے میں یہی اصول حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائے تھے۔ لہٰذا یہ ایک نمونہ بن گئے۔

کئی سوال ایسے ہیں جن کے جواب دینے کی ضرورت ہے۔ اس نمونہ یا ماڈل کی نوعیت اور عملی تفصیلات کیا تھیں؟ کیا یہ اصول لازمی تھے یا سفارشی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد کے زمانے اور آنے والے ادوار میں اس کو کہاں تک قابل تقلید سمجھا گیا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان تاریخی شواہد سے ہم کیا نتیجہ برآمد کرسکتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے مسلمان ایک سیاسی قوم بننے سے قبل دینی اکائی تھے۔ لہٰذا سیاسی قوم کے ظہور کے وقت سماجی اتصال و روابط موجود تھے۔ اور پیغمبر اسلام نے اپنی ذات میں قوم کی دینی و سیاسی سربراہی کو یکجا کردیا تھا۔ میثاق مدینہ میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اختلاف کے موقعہ پر مسئلہ ''اللہ اور محمدؐ'' کے حوالہ کردیا جائے گا (3) یہ اپنی قسم کی اکیلی مثال تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان قوم کو کئی توجہ طلب سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسے کہ قوم کا قائد کون ہوگا اور اس کی شناخت کیا ہوگی، اس کے اختیارات کیا ہوں گے وہ کس سے اور کتنی بار صلاح و مشورہ کرے گا اور اگر ضرورت پڑی تو اس کی اصلاح کا کیا طریقہ ہوگا؟ رقبہ کی وسعت نے معاملات کو پیچیدہ بنا دیا۔ مسلم اقتدار کے ابتدائی سالوں میں جزیرہ نمائے عرب کی حدوں کے پرے فتوحات کے سیلاب نے شہری ریاست کو ایک سلطنت میں تبدیل کردیا اور اس نے اسلامی ریاست کے نظم و نسق پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ لہٰذا اس عہد کے تاریخی شواہد کی تحقیق اور محتاط چھان بین لازمی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اکثر روایت و عقیدت ہمیں ایسا کرنے سے روک دیتے ہیں۔

یہ بات بہت اہم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا۔ ایک ایسے طریقۂ کار کے ذریعہ جس میں مدینہ اور مہاجرین کے اثرات غالب تھے کافی دلیل و حجت اور بحث و مباحثہ کے بعد ابوبکر الصدیق کو خلیفۃ رسول اللہؐ چن لیا گیا۔ باہر والوں سے کوئی صلاح و مشورہ نہیں لیا گیا۔ اس انتخابی کالج کی تفصیلات ابن ہشام اور طبری نے فراہم کی ہیں (4) دو سال بعد ابوبکر نے عمر بن الخطاب کو اپنا جانشین مقرر کیا: ''میں تمھارے معاملات اس شخص کے سپرد کرتا ہوں جو میری رائے میں تم میں سب سے بہتر ہے،'' (5) اس نامزدگی کو مدینہ میں عوام نے منظور کیا۔ دس سال بعد جب عمر کا وقت آیا تو انھوں نے چھ ممبروں کی ایک کونسل کو اگلا خلیفہ چننے کا اختیار تفویض کیا جو سخت گیر ہدایات کی روشنی میں اپنوں ہی میں سے ایک ممبر کو اتفاق رائے برقرار رکھتے ہوئے خلیفہ منتخب کرے (6) آخر میں چوتھے خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ کار کچھ کچھ پہلے خلیفہ کے انتخاب سے ملتا جلتا تھا سوائے اس تشدد اور ہنگامہ آرائی کے جو اس سے پہلے وقوع پذیر ہوا اور جس نے قوم کی حساسیت اور ادراک پر ایک ان مٹ نقش چھوڑ دیا۔

اس حقیقت سے دامن نہیں بچایا جاسکتا کہ اسلامی تاریخ کے اوّلین اور سب سے زیادہ قابل احترام دور نے قوم کے سیاسی قائد کے انتخاب کے لیے کوئی مستقل طریقہ کار سامنے نہیں رکھا۔ جو بات وضاحت سے اس دور میں سامنے آئی وہ اس عمل اور اصول سے متعلق تھی کہ قوم کے قائد کو کیا برتاؤ اختیار کرنا چاہیے اور یہ کہ ان حقوق کے ساتھ ساتھ جو مذہب نے عطا کیے ہیں ۔ رعایا کو اور کیا کیا مفادات حاصل ہونا چاہئیں ۔ ظاہر ہے کہ اوّلین اہمیت سنتِ رسول کو دی گئی ۔ اس کے بعد پہلے چار خلفا کے انتظامی طریقۂ کار، خصوصاً عمر بن الخطاب اور علی بن ابی طالب ، پر عمل کیا گیا۔ ان سب میں حاکم کے فرائض کے شعور کا علم ہوتا ہے ۔ (7) اور مسلمانوں کے اس عہد کی سیاسی تصویر کشی میں یہی نقش و نگار نمایاں ہیں ۔

شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مروجہ عرب قبائلی روایت کے مطابق وراثتی اصول سے اتفاق نہیں کیا اگر چہ نسل و خون اور قبائل کے مراتب کو تسلیم کیا۔ یہ ایک متفقہ فیصلہ تھا کہ 'امیر ایک ذی عقل اور صحیح فیصلہ دینے والا فرد ہو' (8) بہر حال اس کی اخلاقی برتری پر کبھی کبھی سمجھوتہ بھی ہوا ہے ۔ سنہ 660 عیسوی میں جب معاویہ بن ابی سفیان علی بن ابی طالب کی جانشینی کے امیدوار تھے تو علی کے فوجوں کے ایک سپہ سالار نے اپنی فوج سے سوال کیا 'اے لوگو! تم ایک خطا کار قائد کو مانو گے یا بغیر کسی قائد کے لڑنا پسند کرو گے؟' ۔ جواب تھا کہ نہیں' ہم ایک خطا کار قائد کے ساتھ ہوں گے' ۔ (9) دو صدیوں کے بعد فقیہ الجاحظ نے معاویہ کی تخت نشینی کے سال کو ایک '' جابرانہ، فرقہ وارانہ ظالمانہ اور تشدد سے پُر'' سال کہا ہے ''ایک ایسا سال تھا جس میں امامت خسرو کے طرز کی بادشاہت میں تبدیل ہوگئی اور خلافت استبداد میں بدل گئی جو قیصریت کی خصوصیت ہے'' (10) ۔ 19 رسال کی حکومت میں معاویہ نے ایک بادشاہی ڈھانچہ کو مضبوط کرلیا، تو انھوں نے بھی ابوبکر کی نقل میں اپنا جانشین مقرر کرنا چاہا اور شرم سے عاری ہو کر اپنے بیٹے یزید کو جانشین نامزد کیا حالانکہ عوام میں اس کا تاثر خوش گوار نہیں تھا۔ اس معاملہ میں ان کی کامیابی پر بستر مرگ پر کہے ہوئے ان کے الفاظ ہی روشنی ڈالتے ہیں ۔ انھوں نے کہا 'اے میرے بیٹے ! میں نے تمھارے کرنے کے لیے کچھ نہیں چھوڑا ہے، تمھارے کام آسان کردیے ہیں، مخالفین کو تمھارے

لیے زیر کر دیا ہے، عربوں کی گردنیں تمھارے لیے جھکا دی ہیں اور تمھارے لیے اتحاد و اتفاق پیدا کر دیا ہے'۔ (11)

یہ تبدیلی رسمی بھی تھی اور معنوی بھی۔ جن عرب فوجوں نے بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کو سرنگوں کیا تھا انھوں نے ان دو عالمی طاقتوں کے طرزِ حکومت کی کچھ خصوصیات کو بھی اپنا لیا تھا۔ محمد شعبان نے شاہی جرأت مندی کے معاشی پہلوؤں کو کھنگالا ہے۔ (12) عزیز العظمیہ نے ان ''بے قابو بلکہ کسی حد تک تفریحی تجربات جو اموی حکمرانوں نے شاہی استحقاق، مراعات اور بادشاہی اعلان کے ساتھ براہ راست اور ذاتی طور سے کیے ہیں، کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ عباسیوں نے اس پر مزید اضافہ کیا (13) عہدہ کے نام میں تبدیلی جو خلیفہ دوم کے زمانے میں واقع ہوئی یعنی خلیفہ رسول اللہ سے خلیفۃ اللہ، کے عملی اثرات معاویہ کے دور حکومت میں ظاہر ہونے لگے جب دیگر شاہی مراعات و اختیارات کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلمانوں کی موت و زندگی پر بھی اختیار حاصل کر لیا۔ (14)

ایک ہی نسل کی زندگی میں ایسی معنوی اور حقیقی تبدیلی فہم و ادراک سے دور ہے۔ کیا عربوں کی آزادی سے اساطیری محبت اور قبائلی خودمختاری ان فائدوں پر قربان کر دی گئی جو مجموعی طور سے ایک سلطنت کے آقا ہونے کی حیثیت میں حاصل ہو رہے تھے؟ کیا وہ شوریٰ کے اصول کو طرزِ حکومت کے لیے مقدس اور متبرک خیال کرتے تھے؟ اگر ایسا تھا تو اس کو باقی کیوں نہیں رکھا گیا اور اگر ایسا نہیں تھا تو خلافت کے واہمہ کو جاری رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آخرالذکر کی ناگزیری قانونی استحقاق اور جواز کے لیے تھی۔ قانونی استحقاق کے لیے یہ تشویش کیا صرف حکمراں کے انتخاب تک محدود تھی یا اس نے طرزِ حکومت کے دیگر پہلوؤں پر بھی اثر ڈالا؟

واقعات کی ترتیب بہت موزوں ہے۔ امویوں نے (660-750 اے.ڈی) حکومت کی لیکن خلافت کے نظریہ یا اصول کو آگے نہیں بڑھایا۔ حقیقت میں خلافت کا ایک نظریاتی فریم ورک امویوں کے مخالفین زیدیوں اور خوارج نے (اگرچہ متضاد زاویہ نگاہ سے) پیش کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ خلیفہ یا امام میں ذاتی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ انھوں نے مومنین کی

جماعت کے اس حق (جو ذمہ داری کی معاہدانہ نوعیت سے ظہور میں آتا ہے) کی بھی توثیق کی کہ ناقص اور فاسقانہ طرز حکومت کے سبب بیعت کو واپس لیا جا سکتا ہے۔ عباسیوں نے زیادہ پاکبازی اور زہد کے کھوکھلے دعویٰ پر حکومت حاصل کی تھی لیکن بہت جلد انھوں نے اپنے پیش روؤں کا طرزِ حکومت اور طرزِ زندگی اپنا لیا اور وہی صورت حال ان کے سامنے آئی۔ نتیجہ کے طور پر پیدا ہونے والے انتشار نے سادہ ذہن سے ایک ایسے عدالتی و قانونی عمل کا مطالبہ کیا جو ''خلافت راشدہ سے امویوں کے ہاتھ میں اور پھر امویوں سے عباسیوں کی طرف انتقال حکومت کا قانونی جواز پیش کر سکے اور تاریخی خلافت کے تحت مسلم کمیونٹی کے اندرونی امن عامہ کو تحفظ دے سکے'' (15) لہٰذا استحکام کے لیے کوشش اوّلین ترجیح بن گئی۔

خلافت کا سنی نظریہ جو آٹھویں اور نویں عیسوی صدیوں میں معروف وممتاز فقہا اور عوامی نمائندوں نے پروان چڑھایا اس وقت تکمیل کو پہنچا جب فیصلہ کن قوت خلیفہ یا امام کے ہاتھوں سے نکل کر مقامی حکمرانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ لہٰذا اس کو ان تین پہلوؤں سے ہم آہنگ ہونا پڑا جن کو بنیادی نظریہ میں جگہ نہیں دی گئی تھی۔ (i) اوّل تو شوریٰ کے ذریعہ منتخب ہونے والے خلیفہ سے وراثت کے اصول پر بننے والے خلیفہ کا انعقاد (ii) خلیفہ کے یکطرفہ اختیارات کی خصوصیات میں سدھار اور (iii) خلیفہ کی فوجی طاقت میں بتدریج زوال جس کے نتیجہ میں مقامی حکمرانوں کی طاقت میں اضافہ ہوا لیکن جو خلافت کی برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ سلطنت کو قائم رکھنے والے اداروں کی عدم موجودگی کا اس سلسلہ میں بڑا ہاتھ ہے ساتھ میں فوجی وسائل پر ضرورت سے زیادہ انحصار اور صوبوں میں ایک مناسب مالیاتی نظام کی غیر موجودگی بھی اس صورت حال کی ذمہ دار ہے۔ جب 892 سن عیسوی میں خلیفہ معتدد نے عنان حکومت سنبھالی تو ''تاریخ میں پہلی بار سرکاری خزانہ بالکل خالی تھا''۔ (16)

جن لوگوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے ان میں سب سے نمایاں نام ابوالحسن الماوردی (958-1058 اے۔ڈی) کا ہے۔ امامت یا اقتدار اعلیٰ کا مقصد 'عقیدہ کی

حفاظت اور دنیاوی امور کا انتظام ہے۔ ماوردی خلیفہ کے عہدہ کو لازمی تصور کرتے تھے اور اس کی اہلیت کے لیے انھوں نے سات شرائط کو لازمی رکھا۔ اس عہدہ پر تقرر دو طرح سے ہوسکتا ہے؛ رائے دہندگان کے انتخاب کی بنیاد پر یا اپنے پیش رو کی نامزدگی پر۔ اس نکتہ پر کہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے رائے دہندگان کی کم سے کم تعداد کتنی ہونی چاہیے، علما میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ خود کو تاریخی نظیروں تک محدود رکھتے ہوئے ماوردی کا خیال ہے کہ کم سے کم تعداد ایک سے چھ تک ہوسکتی ہے۔ جن کو ان کا پیش رو بھی نامزد کرسکتا تھا۔ لیکن وہ اس رائے کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ انتخاب میں سلطنت کے ہر حصہ کے عوام شامل ہوں تا کہ وہ بالاتفاق منتخب ہو اور اس کے اقتدار کو بالاتفاق تسلیم کیا جائے، خلیفہ کے عوامی فرائض دس ہیں اور اگر ان کی بجا آوری ہورہی ہے تو اس کی بیعت و اطاعت لازمی ہو جاتی ہے۔ لیکن عدل کی جانب سے بے توجہی (بشمول فسق و فجور اور مشکوک راسخ العقیدگی) اور جسمانی معذوری کے سبب اس کو عہدہ پر قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن کسی خلیفہ کو عہدہ سے ہٹانے کا کوئی واضح طریقہ کار سامنے نہیں رکھا گیا۔ خلیفہ کے لیے مطلوبہ اہلیتوں کے متعلق ماوردی خلیفہ ثانی عمر کے ایک بیان کو پیش کرتے ہیں ''وہ طاقتور ہو مگر پرتشدد نہیں، لچکدار ہو مگر کمزور نہیں، کفایت پسند ہو مگر بخیل نہیں، فیاض ہو مگر فضول خرچ نہیں۔'' (17)

یہ ایک اور بات ہے کہ جس وقت ماوردی یہ سطور تصنیف کر رہے تھے خلیفہ کے پاس کوئی فیصلہ کن سیاسی قوت نہ تھی لہٰذا فقہا کی یہ تمام تجویزیں ان لوگوں کو اسلامی قانونیت کے دائرہ میں لانا تھا جو اصل طاقت کے حامل تھے۔ اسی لیے بزور قوت حکمرانی حاصل کرنے والے مقامی سرداروں کو قانونی جواز عطا کیا گیا۔ امن عامہ میں خلل کے اندیشے نے 'غاصبوں کے جشنِ اعزاز' کو جائز قرار دیا۔ الغزالی (1058-1111 اے.ڈی) کو بھی یہی مسئلہ درپیش تھا۔ اس موضوع پر ان کی فکر میں خانہ جنگی کا خوف اور سیاسی انتشار اور ابتری کا ڈر کافی نمایاں ہے۔ الغزالی کا خیال تھا کہ فیصلہ کن طاقت کی غیر موجودگی کے باعث یا تو امامت کے سارے اداروں کو کالعدم قرار دے دیا جائے یا پھر اس مفروضہ پر چلا جائے کہ سب کچھ ٹھیک ہے: ''جو رعایتیں ہم نے دی ہیں وہ اضطراری نہیں ہیں لیکن ضرورت حرام کو

بھی جائز ٹھہرا دیتی ہے۔ آخر ترجیح کس کو حاصل ہے؟ ایک آئینی طور پر درست اقتدار اعلیٰ کی غیر موجودگی کی وجہ سے معاشرتی زندگی کے تانے بانے بکھرنے اور نراج کو یا موجودہ اقتدار کو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، تسلیم کرنے کو؟ ان دونوں میں سے فقیہ صرف آخرالذکر کا انتخاب کرسکتا ہے۔ (18) اسی نظریہ کو اپناتے ہوئے فضل اللہ خنجی (م:1521) نے اس عمل کو آگے بڑھایا اور واضح طور سے اعلان کیا کہ اس امر سے قطع نظر کہ اسے کس طرح حاصل کیا گیا فیصلہ کن قوت کا مالک امام ہے'۔ (19) اس طرح سے جو 'حق' یا 'اختیار' ظہور میں آیا اس کو بنیاد بنا کر ہندوستان، ایران اور ترکی کے مسلمان فرماں رواؤں نے مطلق العنانی کی مشق کی۔ ایسی صورت حال میں صحیح طرز حکومت کے اصل معنی ہی بدل گئے اور اس کا اصل اور اولین مقصد امن عامہ کا قیام اور نراج اور انتشار سے دفاع بن گئے۔ اس طرح سے استبداد کے مسئلہ کی حیثیت ثانوی ہوگئی جو اگرچہ ناپسندیدہ تھا لیکن اس سے مفر بھی ممکن نہ تھا۔

تین صدیوں کے بعد ایک اور ممتاز دانشور مفکر، شاہ ولی اللہ دہلوی (1703-1762 اے ڈی) نے نتیجہ میں پیدا صورت حال کا ان الفاظ میں جائزہ لیا:

> خلیفہ کے عہدہ پر فائز رہنے والے افراد اکثر اپنی ترنگ اور متلون مزاجی میں آکر ظالم اور جابر بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے اقتدار کا بے جا استعمال کرسکتے ہیں اور بغیر روک ٹوک اور بے لگام طاقت کے استعمال سے عوام کے حقوق سلب کرکے ان میں بگاڑ پیدا کرسکتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں خلیفہ کے عہدہ کے نقصانات اس کے مفروضہ فوائد سے بڑھ جاتے ہیں۔ اپنی پالیسی کو جاری رکھنے کے لیے وہ عام طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں اور عوامی فائدے کی پالیسی پر غور کررہے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ ایسے اصول مرتب کیے جائیں جن کی خلاف ورزی کی مذمت کی جائے اور ان پر غیر عمل درآمدی کی صورت میں حکمرانوں کو قابل مواخذہ ٹھہرایا جاسکے۔

اتنی تند و تلخ تنقید کے باوجود وہ ایک پرسکون رجحان کے حق میں تھے۔ حکمراں کو اس وقت تک اقتدار میں رکھنا چاہیے جب تک کہ نماز کا نظام قائم ہے کیونکہ اس کو ہٹانے میں جو تشدد اور اختلاف ظاہر ہوگا اس سے زیادہ نقصان ہوگا۔ اس رجحان کی موافقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثوں کو پیش کیا گیا (20) اس طرح گویا ایک طرف تو غلط روی اور خطا کاری کو تقدیس و برگزیدگی عطا کی گئی تو دوسری جانب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عہد میں رائج ایک صحیح طرز حکومت کے ضابطوں کو کمتر درجہ پر اتار دیا گیا۔ اور جیسا کہ محمد اسد نے صحیح مشاہدہ کیا ہے کہ اس طریقہ نے ایک روشن ابتدا کو نقش و نگار طاق نسیاں بنا دیا اور اسلام کے تنزل اور اس کے ماننے والوں کی سماجی اور معاشرتی جمود کی جانب کام کیا' ۔(21)

شیعہ اسکول میں بھی ایک نظریاتی قانونیت جو عملی طور پر سمجھوتہ والی ہو، سے متعلق ایک ملتی جلتی تلاش جاری تھی اگر چہ وہ مختلف طریقوں اور علاحدہ طرز استدلال اور منطق پر مبنی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلا تنازعہ پہلے خلیفہ کے انتخاب پر واقع ہوا۔ سنیوں نے پوری امت مسلمہ کو قیادت کا حق دیا جبکہ شیعہ کے خیال میں 'اقتدار کے حقدار صرف وہی تھے جنھوں نے پیغمبر سے ذاتی طور پر براہ راست اقتدار حاصل کیا تھا اور یوں خدائی رضامندی بھی ان کے اقتدار میں شامل ہوگئی۔ ابتدائی دور اور حسین کی وفات (680 اے.ڈی) تک زور 'افکار کے واضح رجحان، معاشرتی منظم ریاست' اور مذہب سے وابستگی کے بنیادی اصول پر تھا۔ اس کے بعد اختلافات اس سوال پر پیدا ہوئے کہ کون سا حکمراں خدائی رضا یا حمایت کے معیار پر پورا اترے گا اور اس نے شیعہ اسلام میں اندرونی تفریق پیدا کردی۔ (22) امام جعفر الصادق نے امام کے تصور کی اس طرح وضاحت کرنی چاہی کہ 'امامت اور خلافت کو دو علاحدہ اداروں میں بانٹ دیا جائے یہاں تک کہ خدا کسی امام کو فتح نصیب کرے'۔ مزید یہ کہ امامت کو خدا نے دو بنیادی خصوصیات سے نوازا ہے اوّل تو یہ کہ امامت خاندان نبوت کے کسی منتخب فرد کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی جاتی ہے جس کو وہ حدود و اختیارات کی صراحت کرتے ہوئے دوسرے فرد کو منتقل کرتا ہے، دوسرے یہ کہ امام علم

دین کے ایک مخصوص حصہ کا منجانب اللہ حامل ہوتا ہے جس کو وہ اپنے جانشین کو منتقل کر دیتا ہے (23) اس کے باوجود اختلافات جاری رہے جو تین نمایاں فرقے یعنی زیدیہ، اسماعیلیہ اور امامیہ کی صورت میں ظاہر ہوئے (24) اگرچہ یہ اختلافات طرز حکومت کے شیعی ادراک پر اثر انداز ہوئے لیکن انھوں نے سیاسی اقتدار کی قانونیت میں پرسکون رجحان کو، کم سے کم ماضی قریب تک، نہیں چھیڑا۔ (25)

1924 میں ترکش نیشنل اسمبلی نے خلافت کو ختم کر کے ایک ہزار سالہ وراثت کو تہس نہس کر دیا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ مصری عالم علی عبدالرازق نے 1925 میں یہ بحث کی کہ قرآن، حدیث اور اجماع میں خلافت کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور اسلام مسلمانوں کو آزاد چھوڑتا ہے کہ وہ اپنی فلاح و بہبود کی خاطر جو چاہیں طرز حکومت اختیار کریں(26) اس نے کہا کہ "دین میں ایسی کوئی شق نہیں ہے جو مسلمانوں کو سماجی اور سیاسی میدان میں دوسری قوموں سے مقابلہ میں روکے یا اس فرسودہ نظام کو توڑنے سے منع کرے جس نے غلامی وتحقیر کا پھندا ان کے گلے میں ڈال رکھا ہے یا اپنی ریاست کے قانون اور حکومت کی تنظیم انسانی عقل کی جدید ترین کامیابی اور ٹھوس تجربہ کی روشنی میں وضع کریں،(27) عبدالرازق بہرحال اپنے زمانے سے آگے تھے اور ان کے اس بیان پر بعد میں جو متنازعہ بحث چھڑی اس میں مخالفین کا پلہ بھاری رہا۔ لہٰذا رشید رضا تجدید خلافت کو ناممکن بتاتے ہوئے ایک اسلامی ریاست کے تصور کے فروغ کے لیے اجتہاد سے کام لیتے ہیں اسی اندازفکر نے اخوان المسلمین اسکول کے سیاسی مفکرین کو پیدا کیا خصوصاً سید قطب اور مودودی جو اسلام اور جمہوریت کو ایک دوسرے کے متضاد سمجھتے تھے۔ اسلامی کیمپ کے دیگر مفکرین جیسے الجزائر کے مالک بن نبی (م:1973) اسلامی اقدار کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے، ان کی دلیل تھی کہ 'اگر اسلام میں کہیں بھی جمہوری روایت کا وجود ہے تو اس کو آئینی متن کے الفاظ میں نہیں بلکہ اسلام کی عام روح میں ڈھونڈنا چاہیے جو عالم انسانی کے ثقافتی ارتقا کو پیش کرتا ہے' اسلام ایک حقیقی جمہوریت کو پیش کرتا ہے کیونکہ یہ سیاسی جمہوریت اور معاشرتی جمہوریت کا مرکب ہے' انھوں نے کہا کہ موجودہ ناگوار صورت حال کے مسلمان خود ہی ذمہ دار ہیں۔ (28)

تیونس کے رشید غنوشی، بن بنی کے ایک شاگرد نے گزشتہ سالوں میں اس فکر کو اور آگے بڑھایا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ اگر اسلام آخری وحی الٰہی ہے تو یہی مناسب ہے کہ بدلتی نوعیت کے امور میں کوئی حرفِ آخر نہ کہا جائے۔ اور مسلمان خود ہی لچکدار اور تعمیری سوچ کے ذریعہ (اجتہاد) اپنے لیے مناسب حل تلاش کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ علاقے جن کو احکام الٰہی کے ذریعہ پُر کرنا ہے اور وہ علاقے جن کو دانستہ طور سے خالی چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ان کو ضرورت اور حالات کے مطابق اجتہاد سے پُر کیا جائے لیکن عقیدہ کے فریم ورک کے اندر، میں فرق ہے۔ (29) ان کے دو اور دعوے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی اور کی طرح مسلمانوں کو بھی اصل جدیدیت درکار ہے۔ حقیقی جدیدیت میں انسانیت کا فروغ، آزادی انتخاب کے حق کا قیام، سائنٹفک اور تکنیکی ترقی کی تبلیغ، جمہوری نظام کا قیام اور عوام کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنا شامل ہیں۔ دوسرے یہ کہ قدیمی اسلامی طرز کی حکومت کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کے لیے دوسرا سب سے بہتر انتخاب ایک سیکولر جمہوری حکومت ہے۔ جو ایک آمرانہ نظام حکومت سے جو اسلامی ہونے کا دعویٰ کرتا ہو کم بُری ہے۔ (30) دوسرے مفکرین جیسے کہ فضل الرحمٰن اصرار کرتے ہیں کہ قرآنی فرامین وضوابط اپنی چشم تصور سے 'مسلم معاشرہ کو شفاف اور ان تھک ہمہ گیر مساوات، بغیر کسی طبقاتی فخر وغرور کے داغ دھبے، کوئی پردہ پوشی نہیں، اور معاشرہ جس کی اندرونی زندگی اور کردار باہمی تعاون وخیرخواہی کے گرد گھومتی ہے، دیکھنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر امت کے سیاسی اور قانونی فیصلے جو کمیونٹی پر اثرانداز ہو رہے ہوں لوگوں کے ایک دوسرے کے رفقاء کار ہونے کی وجہ سے نہ تو موخر کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی مسترد کیے جا سکتے ہیں اور وہ لوگ جو ایسا خیال کرتے ہیں دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام کو کالعدم قرار دینے کے مجرم بنتے ہیں۔ (31)

امامیہ عقیدے کو بھی مختلف قسم کی نظریاتی ترجمانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ امام خمینی نے انیسویں صدی کے ایک مجتہد ملا احمد نراقی کے رجحان کو منتخب کرتے ہوئے یہ دلیل دی ہے کہ بارھویں امام کی سربراہی کے اس دور میں قانونی بنیاد پر طرز حکومت کے لیے صرف یہی ایک

راستہ ہے کہ علما طاقت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسی حکومت اس اعتبار سے آئینی ہے کہ حکمران ملک کی حکمرانی اور انتظام میں قرآن و سنت کی شرائط سے بندھا ہوگا، (32) اسلامک ریپبلک آف ایران نے ایک جمہوری فریم ورک میں اس کا احاطہ کرنا چاہا لیکن اس عمل کے درمیان جمہوری اور غیر جمہوری عناصر کے تضادات زیادہ گہرے ہو گئے۔ یہ تضاد بنیادی طور پر ان اختلاف جو اقتدار اعلیٰ جیسا کہ دستاویز میں ہے، کے بارے میں دو رائے ہونے سے شروع ہوا۔ (33)

بیسویں صدی میں ہونے والے مباحثوں نے جمہوریت اور اسلام کے ایک دوسرے سے معارض نہ ہونے کا فیصلہ کر دیا اور اس طرح سیکولرزم کے روایتی تصور کو کاری ضرب لگی۔ لیکن بحث صرف حکمرانوں کے امور کے بارے تک محدود رہی اور حکومت کے طریقے اور طرز کے بارے میں بہت کم بولا گیا۔ شاید اس کی ایک وجہ عوامی انتظامیہ اور بین الاقوامی عہد ناموں کے فعال ذخیرہ الفاظ کی عدم موجودگی ہو۔ عالمی افق پر رونما ہونے والے حالات اور سرد جنگ کے اختتام پر دنیا کے اکثر حصوں میں دوڑتی ہوئی جمہوریت کی لہر اپنی حدود میں رہنے والی سیاسی کمیونٹیوں کا تعلقات و طاقت کے وسیع تر فریم ورک میں عمل کے تجزیہ کی ترغیب دی۔ انسانی حقوق کے احترام کے بارے میں قومی اور بین الاقوامی ایجنڈے میں کئی بار سوال اٹھے۔ اسی طرح سے عورت کے مقام، بچوں کے حقوق، اقلیتوں سے برتاؤ، لسانی اور مذہبی اقلیتیں عقیدہ اور مذہب کی بنیاد اور مذہب کی بنیاد پر اختیار اور ناروا داری، فروغ و ترقی کے حقوق کے موضوع بھی زیر بحث آئے۔ 'ویانا ڈیکلریشن' اور ''پروگرام آف ایکشن آن ہیومن رائٹس'' نے اعلان کیا کہ جمہوریت، ترقی اور بنیادی حقوق و آزادی کے لیے عزت و احترام ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ نافذ ہوں گے۔ اقوام متحدہ کی ہزار سالہ چوٹی کانفرنس نے 'ملکیت' کے لیے نئی اخلاقیات کا مطالبہ کیا۔ عالمی بینک نے حکومت کے طرز عمل کے لیے اشارے دیے۔ یونائٹیڈ نیشنس ڈیولپمنٹ پروگرام (یو این ڈی پی) نے اعلان کیا کہ انسانی آزادی کی راہ میں حقوق انسانی اور انسانی ترقی ساتھ ساتھ چلتے ہیں لہٰذا

انسانی ترقی کے لیے ایک باعمل حکومت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ عرب ہیومن ڈیولپمنٹ
رپورٹ نے ایک اچھی اور بہتر حکومت کی تعریف 'شفاف، جوابدہ اور حصہ لینے والی' کے
الفاظ میں کی ہے۔ وہ ذی اثر، رعب دار اور عدل و انصاف پر مبنی حکومت ہوتی ہے جو امن و
قانون کو آگے بڑھاتی ہے۔ رفتہ رفتہ قانونی جواز کے نئے نئے معیار افق پر ظاہر ہوئے اور
رائے کی ایک خاص شکل بننے لگی کہ قومی اقتدار اعلیٰ کو حکومت کی زیادتیوں کے لیے ڈھال
نہیں بننا چاہیے، اگر چہ اس رائے کی بھی مزاحمت کی گئی۔

اکیسویں صدی میں طرز حکومت کے ان معیاروں پر مسلمان ذہن کا کیا ردعمل ہونا
چاہیے؟ اوّل تو یہ کہ کیا یہ معیار اسلام کے طے شدہ معیار سے متعارض ہیں اور کیا یہ ان
قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں جو اسلامی طرز حکومت اور بنیادی اقدار کی صورت میں
اس نے پیش کیے ہیں یعنی فیصلہ لینے سے پہلے مشورہ، حکومت کا شفاف طریقہ کار، معاشرتی
عدل، حکمرانوں کے فرائض، رعایا کے حقوق، اختلاف رائے کا حق جو کہ بیعت کے روک
لینے تک پہنچتا ہے؟ دوسرے یہ کہ کیا یہ معیار مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو محدود کر دیتے ہیں؟
دونوں سوالوں کے جواب نفی میں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پیش کردہ معیاروں کو وسیع مقبولیت
حاصل ہونا چاہیے۔ لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہے اور ثقافتی تخصیص سے مقامی روایت تک سے
متعلق سوالات استدلال کے دائرہ میں لائے جارہے ہیں تاکہ ایک ایسی ذمہ داری اور عمل
سے بچا جاسکے جو واضح اور صریح طور سے مذہبی قانون نے فرض کیا ہے اور بہت حد تک
عصری معیار اور تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ یہ دراصل اسلامی اقدار کے نظام پر کئی جانب
سے ایک زبردست حملہ ہے اور اس میں اسلام کے غیر مخلصین شامل ہیں۔

معاشروں میں ترقی تقاضوں اور جواب کا عمل ہے۔ اس وقت کا چیلنج ہے کہ
آزادی اور ذمہ داری کے منظرنامہ کو اپنے بل بوتے پر وسعت دی جائے۔ 1996 میں ملیشیا
کے مہاتیر محمد نے کہا تھا کہ کیونکہ اسلام ہر زمانے اور دنیا کے ہر خطہ کے لیے ہے۔ تو مسلمان
نص قرآنی میں ہدایت و راہنمائی آج کے زمانے کے حوالے سے تلاش کریں۔ (34)
1997 میں ایران کے محمد خاتمی نے ایک اسلامی سول سوسائٹی کی تخلیق کی دعوت دی جس کے

شہری کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ''اپنی تقدیر خود لکھیں گے، طریقہ حکومت پر نظر رکھیں گے اور حکومت کو ذمہ دار ٹھہرائیں گے''۔ دوسرے علما نے اپنے مشاہدۂ باطن کے مطابق زیادہ مبہم الفاظ استعمال کیے کہ 'اسلام کے گھر کو ترتیب و تنظیم کی ضرورت ہے' (35) اس کا شاید ہی کچھ اثر ہوا ہو۔........ اگر چہ ماضی سے گہرے روابط کے ساتھ مضبوطی سے جڑا ہوا حکومت کا ایک نیا طریقہ اجداد کی گم گشتہ وراثت کا نعم البدل تو نہیں ہوسکتا لیکن اگر مسلمان اپنی موجودہ مایوس کن حالت سے دور رہنا چاہتے ہیں تو تبدیلی لانا لازمی ہے۔

تبدیلی لانے کی ضرورت پر اس سے بھی زیادہ دل کو لگنے والی بات تحفظ اور استحکام سے متعلق ہے۔ محمد خاتمی نے اس نکتہ کی بھی حمایت کی۔ ''یہ ضروری ہے کہ آزادی اور قومی تحفظ کے درمیان رشتہ کو اور اول الذکر کا آخر الذکر پر مثبت اثر اور معاشرتی استحکام پر عدم آزادی کے تباہ کن اثر کو سمجھا جائے''۔(36) دنیا کے ایک دوسرے حصے، انڈونیشیا میں عبدالرحمٰن وحید نے کہا ''اصل چیلنج ایک متحدہ تعلیمی نظام کو مرتب کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی قانون کی تفہیم کے لیے ایک نیا رجحان تاکہ اس ظاہری تعارض کو دور کیا جائے جو رسمی بنیادی اصولوں اور عالمی اقدار کے درمیان ہے جو کہ نہ صرف ہم تسلیم کرتے ہیں بلکہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ ہمارے عقیدہ کا دل ہیں''(37) یہ نئی جہتیں جو تبدیلی کے لیے اشد ضروری ہیں بیداری کے اس حجم کی جانب اشارہ کرتے ہیں جس کو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔ تبدیلی کے لیے خارجی دباؤ بھی ایک پیچیدہ عنصر ہے جیسا کہ 12 دسمبر 2002 کی امریکی پالیسی کے اعلان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس اعلان میں انھوں نے ایسے قائدین کو تلاش کرنے کی تلقین کی ہے جو عقیدہ اور واضح سیاسی نظام کے درمیان توازن قائم رکھ سکیں۔ کیا یہ باہر سے لائی ہوئی تبدیلی، طریق کار کو خراب نہیں کردے گی یا خود اعتمادی کو ٹھیس نہ لگائے گی؟ اور ایک طویل مدت تک منفی ردعمل کو شروع نہیں کرے گی؟

ایک اچھی حکومت کی نشانیاں یعنی حصہ داری، شفافیت، جوابدہی اور قانون کی بالادستی، بہتر طرز حکومت کے لیے اسلامی ضابطوں کا ایک جز ہیں۔ اگر کوئی بھی مسلم معاشرہ ان کے بارے میں تذبذب کا شکار ہے تو اس کی وجہ غیر اسلامی اور غیر متعلق اسباب ہیں۔

ایسے رجحانات متعلقہ معاشروں کے لیے نقصان دہ ہیں اور ان کی مجموعی ترقی پر روک لگا سکتے ہیں۔ یہ حالات فوری طور سے مثبت عمل چاہتے ہیں۔ 1961 میں محمد اسد نے محسوس کیا کہ دنیائے اسلام کے ممالک کے لیے ''آزادانہ انتخاب کا لمحہ'' آن پہنچا ہے، لیکن وہ یقینی طور سے غلط تھے کیونکہ انھوں نے مسلم معاشروں کے ذیلی تاریخی زیروبم، (عبداللہ العروئی سے مستعار ترکیب) کے لیے کوئی جگہ نہ رکھی۔

زیروبم میں تبدیلی ہمارے زمانے میں واضح طور سے اشد ضروری ہے۔ کیا یہ مطالبہ کرنا بہت زیادہ ہوگا کہ ان تخلیقی جذبوں اور تحریک کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو اتنی مدت تک اور اتنی بہتر طریقہ سے اسلامی تہذیب کی خصوصیت رہے؟

پس نوشت

یہ مقالہ ''خدابخش لائبریری جرنل'' (Vol.131, Jan-March 2003, pp1-18) میں شائع ہوا تھا اور کچھ قارئین نے عمل اور نظریہ کے درمیان فاصلہ کے بارے میں سوال اٹھایا۔ ''زیادہ تر اسلامی ممالک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط کیوں نہیں ہوئیں؟ اس سوال کا جواب اس بحث کے نظریاتی فریم ورک اور وقت اور مقام کی مطابقت میں تلاش کرنا چاہیے۔

جمہوریت پر مباحثہ جدیدیت کا ایک پہلو ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت دوطرفہ طریق کار ہے۔ ایک طرف تو یہ ریاست کی طاقت کی اصلاح کے بارے میں فکرمند ہے اور دوسری جانب سول سوسائٹیز کی تعمیرنو کے لیے کوشاں ہے۔ لہذا یہ ریاست اور معاشرہ میں ایسی تبدیلی کی خواہاں ہے جو ایک دوسرے پر منحصر ہوں۔ اگر ایک جمہوریت کا انتخاب کرتا ہے تو دوسرا حقوق کے بنیادی تبدیلیاں لانے والے نظام کے لیے برسرعمل ہوگا، (38) عملی طور سے یہ بحث اکثر مسلم معاشروں میں نوآبادیاتی دور کے بعد ظاہر ہوئی ہے۔ طرز حکومت کے بارے میں شہری مباحث جو اسلام اور جدیدیت کی وسیع تر بحث کے ساتھ ہی جاری ہوئے تھے عام طور سے اسی میں ضم ہوگئے۔ طرز حکومت طے کرنے کے معاملہ میں غوروفکر کو تین رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو روایت پرستی سے چپٹے رہنے کی خواہش

دوسرے یہ یقین کہ شوریٰ کا اصول جامع اور کافی ہے تیسرے یہ عقیدہ کہ اقتدار اعلیٰ کا موجود تصور اس کلیہ کے منافی ہے کہ اس کائنات میں اقتدار اعلیٰ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے طرزِ فکر نے پسندیدگی کے نازک معاملہ میں رکاوٹ پیدا کی۔ اور مسلمانوں کے اس انتخاب پر اثر پڑا کہ کیا محفوظ رکھا جائے، اسلام کے مستقبل کے لیے کیا بنیادی اور مناسب ہے اور یہ کہ آخر بنیادی طور سے کیا چیز اسلامی ہے اور کیا محض تاریخ کا حصہ ہے؟ (39) دوسرے طرز فکر نے اولین اور سب سے قدیم حکومت کے طرز اور طریقوں کے علاوہ مسلم تاریخ کے تمام ادوار کے طرز حکومت کے تجربوں کو مسترد کر دیا۔ اور حکومت کرنے کے کسی بھی معین طریقۂ عمل کی تحقیق نہیں کی گئی جیسے کہ محمد اقبال کا مشاہدہ ہے کہ مسلمانوں نے انتخابی اصول پر کبھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ (40) تیسرا طرز فکر جو اس غور و فکر کے مانع رہا ہے جا حد تک اقتدار اعلیٰ کے تصور کے بارے میں انیسویں اور بیسویں صدی کے فقہا کی آرا سے متاثر تھا اور انھیں اس حقیقت کا شاید ہی کچھ علم ہو کہ ریاست کے نظریہ تکثیریت اور بین الاقوامی قانون نے کس انداز سے ریاست کے تصور کو بدل دیا ہے اور جس کی وجہ سے اقتدار اعلیٰ کے تصور میں بھی تبدیلی آئی ہے۔(41)

نظریاتی فریم ورک میں بگاڑ ساتھ ہی ساتھ صورت حال کو برقرار رکھنے کی کوشش کو جائز قرار دینے کی ناگزیری مل کر تعریف و توضیح کا ذریعہ بن گئے جس نے مسلم اراضی یا ریاستوں کو ایک ثقافتی دفاعی انداز اختیار کرنے کی طرف راغب کیا (42) نتیجہ کے طور پر قدیمی مندرجات و متون کی تشکیل نو اور اداروں کی تخلیق تاکہ کمیونٹی اور ریاست کی یکجہتی اور استحکام برقرار ہے اور حکومت اور ریاست کے امور میں عوام کی فعال، مثبت اور ذمہ دارانہ شرکت (43) قائم رہے، کا تقاضہ پورا نہیں کیا گیا۔ اس کے بجائے مباحثہ اسلامی ریاست کے ترکیبی عناصر، اقتدار اعلیٰ کے مابعد الطبیعاتی جہتوں اور یہ کہ مغربی سیکولر جمہوریت کا تصور اسلام سے متعارض ہے، میں الجھ کر رہ گیا۔ اس سماجی اور دانشورانہ حرکت کا سب سے زیادہ فائدہ حکمرانوں اور حاکیت کے خواہش مندوں کو ہوا۔ مذہب کو خاص طور سے ایک ایسی قوت کی طرح استعمال کیا گیا جو موجودہ صورت حال برقرار رکھ سکے۔ اس کو ایک متحرک اور تبدیلی

لانے والے عنصر کی حیثیت سے استعمال کرنے کی کوششیں اس وقت تک محدود رہیں جب تک اسلامی مفکر اور فعال وسرگرم کارکن منظرعام پر نہیں آئے۔ آخرالذکر کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک دانشور کا خیال ہے کہ ''مذہبی فعالیت اور جمہوریت کا عمل بیسویں صدی کی آخری دہائیوں کی دو سب سے زیادہ اہم سرگرمیاں ہیں'' (44) ایک ہم عصر فقیہہ جس نے پرانے نظریہ کے حوالے سے ان جڑواں ذہنی رجحانات کو پرکھا ہے، کہتا ہے کہ ''اسلامی طرز حکمرانی اور جدید جمہوری ریاست میں کچھ اختلافات ہیں اس کے باوجود ان میں اتنا کچھ مشترک ہے کہ اسلامی ریاست کو ایک کامیاب جمہوریت کا درجہ دیا جاسکتا ہے (45) بہرحال، عملی طور سے دونوں کا طرز یکساں نہیں تھا۔ مسلم معاشروں کو یکجا کرنا تجربوں کا مجموعہ ہے۔ 'مسلم' اور 'عرب' ان دونوں اصطلاحات کو یکساں معنوں میں استعمال کرنا ایک عام کج فہمی ہے جس سے غلط نتیجے اور خلاصے سامنے آتے ہیں۔ اعداد وشمار کے حساب سے دنیا کے مسلمانوں کی 85% آبادی غیرعرب ہے اور 70% سے زیادہ مسلمان ایشیائی ممالک میں رہتے ہیں۔ لہٰذا عرب اور مغربی ایشیائی ممالک میں جمہوری طرز حکومت کی موجودگی یا عدم موجودگی اسلام اور جمہوریت کی ہم آہنگی یا غیر ہم آہنگی کے متعلق ایک عمومی فیصلہ سنا دینے کے لیے کافی وجہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس، ایک وسیع تر انقلابی فکر بشمول ایشیا، کسی بھی ایسے سوچ کی تردید کرتی ہے اور کامیابی یا جزئی کامیابی کی ایک مختلف تصویر پیش کرتی ہے۔ اس کے ثبوت میں بنگلہ دیش، انڈونیشیا، ایران، ملیشیا، پاکستان اور ترکی کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس کے باوجود رکاوٹیں برقرار ہیں اور جمہوریت کے عمل کی رفتار اور حدود پر اثر ڈالتی ہیں۔ یہ رکاوٹیں دو نازک مقامات سے متعلق ہیں۔ اوّل تو مقدس اور سیکولر کا مسئلہ ہے دوسرا حقوق کے جدید نظام کی قبولیت اور نفاذ کا ہے۔ اس سے پہلے کی نسل کی انقلابی فکر ناکام ہوگئی اور دوبارہ نظام اسلامی کے رنگ کی طرف چلی گئی۔ اسی طرح سے حقوق کے جدید نظام کے سوال کو اسلام کے مذہبی طور سے منظورشدہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے فریم ورک میں حل نہیں کیا جاسکتا (46) ریاست کی تشکیل میں سماجی ماحول اور سماج میں توازن قائم رکھنے

والی طاقتوں کا دخل ہوتا ہے۔ اگر ریاست کی تعمیر سیاسی طریقہ کار کی سماجی توانائیوں سے ٹکراؤ کی راہ پر ہے تو مصالحت کے لیے وہ مہارت درکار ہے جس کی جڑیں مضبوطی کے ساتھ شہری معاشرہ سے جڑی ہوئی ہوں۔ لازمی طور سے ساری توجہ سول سوسائٹی ہی کی جانب منتقل ہو جاتی ہے۔

''عرب ریفارم ایشو''، مارچ 2004 کے 'الیگزینڈر یہ اسٹیٹمنٹ' سے عرب دنیا میں رجحان و اظہار میں آئی ہوئی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے بہت ہی واضح الفاظ میں اصلی جمہوریت کے مطالبات و تقاضوں کا احاطہ کیا ہے:

> اس اصلی جمہوریت کا مطالبہ اظہار رائے کی تمام شکلوں کے لیے ایک ضمانت شدہ آزادی ہے جس میں اولین اہمیت پریس اور سماعی اور بصری الیکٹرونک میڈیا کو حاصل ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ آزاد، مسلسل، مرکزی، غیر مرکزی انتخابات کا عمل اختیار کیا جائے تاکہ عوام کے اقتدار اور حکمرانی کی آزادی کی ضمانت برقرار ہے۔ یہ ایک انتہائی درجہ کی غیر مرکزیت کا بھی مطالبہ کرتی ہے تاکہ مقامی کمیونٹی کو زیادہ سے زیادہ اظہار رائے حاصل ہو اور انسانی ترقی کے ہر میدان ثقافت میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکے۔ عوامی زندگی میں اعلیٰ درجہ کی شفافیت اور بین الاقوامی معاہدوں کے مطابق بہتر حکمرانی اور حقوق انسانی کے فریم ورک میں بدعنوانیوں کے خاتمہ کے حصول کے لیے یہ لازمی ہے۔ خواتین، بچوں اور اقلیتوں کے حقوق، جرائم میں ماخوذ افراد کے بنیادی حقوق کا تحفظ اور شہریوں سے انسانی سلوک کا مطالبہ سرفہرست ہے۔

متعین سیاسی اصلاحات اور بین الاقوامی معاہدوں اور معمولات کو اختیار کرنا بھی اس دستاویز میں شامل ہے۔ ساتھ ہی اس میں ثقافتی اصلاح کے لیے یہ مشورہ بھی شامل ہے

کہ ان ذرائع کو استعمال کیا جائے جو منفی اقدار جیسے 'جی حضوری اور اطاعت' کو دور بھگائے اور مثبت اقدار جیسے 'آزادی اور مکالمہ' کو جگہ دے۔ اس اسٹیٹین نے یہ رائے بھی دی کہ اصلاح کا یہ تصور اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب سول سوسائٹی اور حکومت مل کر اس کو عمل میں لانے کی کوشش کریں۔

حواشی

1۔ طبری ''دی ہسٹری آف طبری'' (سنی پریس، البانی 1989) جلد 1، صفحات 249-57

2۔ براؤن ڈینئل: ''ری تھنکنگ ٹریڈیشن اِن موڈرن اسلامک تھاٹ'' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج 1996) صفحہ 3

3۔ ابن اسحاق ''سیرت رسول اللہ'' (انگریزی ترجمہ اے۔گلدم، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، 1980) صفحہ 232

4۔ ابن ہشام، حوالہ سابق صفحات 682-687؛ طبری: حوالہ سابق جلد 9 صفحات 185-201، جلد 10، صفحات 116، طرز حکومت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ابوبکر نے کہا ''میں ایجاد کرنے والا نہیں بلکہ ایک تابع ہوں۔ اگر میں صحیح ہوں تو میرا اتباع کرو لیکن اگر میں راہ راست سے ہٹوں تو مجھے سیدھا کردو''۔ انھوں نے مسلم افواج کے طرزِ عمل کے لیے دس اصول بھی مرتب کیے۔

5۔ طبری۔ حوالہ سابق، جلد 11، صفحہ 148

6- حوالہ سابق، جلد 14، صفحات 143-148

7- حوالہ سابق: جلد 10، صفحات 12-16 اور جلد 11 صفحات 148-150 تک ابوبکر کے لیے، اور عمر کے لیے جلد 11 صفحات 158-159 تک۔ آخر الذکر مستقل اپنے فوجی کمانڈر اور گورنروں سے رابطہ میں رہتے تھے جس کی تفصیل طبری نے دی ہیں۔ ان میں اہم وہ ہدایات ہیں جو انھوں نے یروشلم میں گرجاؤں کی حفاظت کے بارے میں دی تھیں (جلد 12، صفحات 191، 192) حاکم و رعایا کے باہمی حقوق و فرائض پر علی کا خطبہ اور مصر کے گورنر کو ان کے نصائح کا مجموعہ۔نہج البلاغۃ (قم 1975) صفحات 437-440 اور 529-554 میں بالترتیب موجود ہے۔

8- منٹگمری واٹ ڈبلیو: ''محمد ایٹ مکہ'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، آکسفورڈ 1953) صفحہ 22

9- طبری حوالہ سابق، جلد 18، صفحہ 5

10- لیمبٹن اے۔ کے۔ ایس، ''اسٹیٹ اینڈ گورنمنٹ ان میڈیول اسلام'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، آکسفورڈ 1981) صفحہ 62

11- حوالہ سابق، صفحات، 208-209

12- شعبان ایم۔اے: ''اسلامک ہسٹری: اے نیو انٹری پری ٹیشن'' جلد 1 اور 2 (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج 1971 اور 1976) ''فوجی طاقت'' کا استعمال (معاویہ کے بعد والے دور میں) حکومت کی بنیاد اور مسلح بغاوت مخالفت کا واحد طریقہ بن گئے۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ عرب نئے حالات کے تحت اپنے سیاسی اداروں کو فروغ دینے میں ناکام رہے''۔ جلد 1، صفحہ 166

13- العظمیہ، عزیز، ''مسلم کنگ شپ: پاور اینڈ سیکریڈ ان مسلم، کرسچین اینڈ پیگن پالیٹیز'' (آئی بی ٹوریس، لندن، 1997) صفحہ 79

14- شعبان۔ حوالہ سابق صفحات 89-90 اور ولفریڈ میڈولنگ ''دی سکسیشن ٹو محمد:

اے اسٹڈی آف دی ارلی کیلیفیٹ'' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج 1997) صفحہ 326، طرز حکومت میں حقیقی تبدیلیوں پر ابوالاعلیٰ مودودی نے ''خلافت و ملوکیت'' (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 1987) صفحات 157-205 میں نشاندہی کی ہے۔

15۔ لیمبٹن، حوالہ سابق، صفحہ 45

16۔ شعبان، حوالہ سابق، جلد 2، صفحات 89 اور 115

17۔ الماوردی: ''دی آرڈیننس آف گورنمنٹ'' (گارنٹ پبلشنگ، ریڈنگ 1996) صفحات 3-22، حامد عنایت ''ماڈرن اسلامک پالیٹیکل تھاٹ'' (میکمیلن، لندن، 1982) کے مطابق ماوردی کا اثر مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے (صفحہ 59)

18۔ لیمبٹن، حوالہ سابق، صفحات 110، 111

19۔ حوالہ سابق، صفحات 183-185

20۔ محمد الغزالی، ''دی سوشیو۔ پالٹیکل تھاٹ آف شاہ ولی اللہ'' (انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، اسلام آباد 2001) صفحات 241 اور 246، شاہ ولی اللہ کے نظریات کا اندازہ لگانے کے لیے ملاحظہ کریں تاراچند ''ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ ان انڈیا'' جلد 1 (پبلیکیشنز ڈویژن، منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ، نئی دہلی 1961) صفحات 206-208۔

21۔ محمد اسد، ''دی پرنسپلز آف اسٹیٹ اینڈ گورنمنٹ ان اسلام'' (یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، برکلے، کیلیفورنیا، 1961) صفحہ 93، کتاب میں متعلقہ نصوص کو ایک جگہ، صفحات 69-94 میں یکجا کردیا گیا ہے۔

22۔ جعفری ایس ایچ ایم۔ ''دی اوریجنز اینڈ ارلی ڈیولپمنٹ آف شیعہ اسلام'' (بیروت 1976، دوبارہ طبع شد انصاریان پبلکیشن، قم، ایران، تاریخ نہیں) صفحہ 235

23۔ حوالہ سابق، صفحات 281 اور 289-292

24۔ تینوں اسکولوں کی تفصیلات کے لیے دیکھیے لیمبٹن حوالہ سابق صفحات 28-33 اور 63-219 لیمبٹن کا خلاصہ یہ ہے کہ سنی اور امامی نظریات نے 'سیاسی امن' کی راہ دکھائی۔

25۔ ارجمند سعید عامر ''دی شیڈو آف گاڈ اینڈ دی ہڈن امام: ریلجن، پالیٹیکل آرڈر اینڈ سوسائٹل چینج ان شیعائٹ ایران فروم بیگننگ ٹو 1890'' (یونیورسٹی آف شکاگو پریس، شکاگو الینوائیس، 1984) صفحات 171-187، امامت کے 'روحانی اقتدار اعلیٰ' کے تصور نے اس کو دنیاوی اقتدار بھی دیا۔

26۔ ہورانی البرٹ۔ ''عربک تھاٹ ان دی لبرل ایج 1798-1939 (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج 1983) صفحات 184-188؛ بنڈر ایل ''اسلامک لبرزم'' (یونیورسٹی آف شکاگو پریس شکاگو، الیسوئیس، 1988) صفحات 129-158 بھی ملاحظہ کریں۔

27۔ حامد عنایت، حوالہ سابق، صفحہ 65 میں مذکور

28۔ زبیر یحییٰ ایچ ''ڈیموکریسی اینڈ اسلام ان مالک بن بنی تھاٹ''۔ امریکن جرنل آف اسلامک سوشل سائنسز (1998 اسپرنگ 151) صفحات 107-112، تمیمی عظام 'ڈیموکریسی ان اسلامک پولیٹیکل تھاٹ، اینکاونٹرز؛ جرنل آف انٹر۔کلچرل پرسپکٹوز'' (1997، مارچ، 3:1) صفحات 37-41

29۔ تمیمی، عظام ''ڈیموکریسی: دی ریلجس اینڈ دی پولیٹیکل ان کنٹمپریری اسلامک ڈبیٹ''۔ ''اینکاونٹرز: جرنل آف انٹر۔کلچرل پرسپیکٹوز'' (1998، 4:1) صفحات 36-64

30۔ غنوشی الرشید۔ ''سیکولرزم ان دی عرب مغرب''۔ دیکھیے تمیمی اور اسپوسیٹو (ایڈیٹر) ''اسلام اینڈ سیکولرزم ان دی مڈل ایسٹ'' (ہرسٹ اینڈ کمپنی، لندن 2000) صفحات 97-123

31۔ فضل الرحمٰن۔ ''دی پرنسپلز آف شوریٰ اینڈ دی رول آف دی اُمہ ان اسلام'' دیکھیے ممتاز احمد (ایڈٹ) ''اسٹیٹ اینڈ پالیٹکس ان اسلام'' (امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز انڈیا ناپولیس، انڈیانا۔1986) صفحات 91اور95

32۔ مارٹن وینیسا، ''کریٹنگ این اسلامک اسٹیٹ: خمینی اینڈ دی میکنگ آف اے نیو ایران'' (آئی بی ٹورس، لندن 2003) صفحات 117 اور 122

33۔ شیرازی اصغر۔ ''دی کانسٹی ٹیوشن آف ایران: پولیٹکس اینڈ دی اسٹیٹ اِن دی اسلامک ری پبلک'' (آئی بی ٹوریس، لندن 1997) صفحہ 1

34۔ لیکچر، آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز، 16/اپریل 1996

35۔ تہران میں منعقدہ او آئی سی کی چوٹی کانفرنس، 9-10 دسمبر 1997

36۔ ختمی سید محمد۔ ''اسلام، ڈائیلاگ اینڈ سول سوسائٹی'' (سی پی سی اے ایس/ایس ایل ایل اینڈ سی ایس، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی 2003) صفحات 97-96

37۔ آسٹریلین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے ایک نامہ نگار کو جواب، 16/اپریل 2002

38۔ ہیلڈ ڈیوڈ، ''پولیٹکل تھیوری اینڈ دی ماڈرن اسٹیٹ'' (اسٹین فورڈ یونیورسٹی پریس، اسٹین فورڈ، کیلیفورنیا 1989) صفحات 182-183

39۔ فضل الرحمٰن، حوالہ سابق صفحہ 250

40۔ اقبال، محمد ''دی ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام'' (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، لاہور 1982، نقش ثانی) صفحہ 157

41۔ سیاؤ کنگ چوان ''پولیٹکل پلیورزم: اے اسٹڈی آف کنٹمپریری پولیٹکل تھیوری'' (کیگن پال، ٹرینچ، ٹربنر اینڈ کمپنی، نیویارک 1927)، اس میں بیسویں صدی میں ہونے والے مباحثہ کا احاطہ ہے۔ صدی کی آخری دہائی میں اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بلا خوف مخالفت یہ کہہ سکتے تھے کہ ''مطلق العنان اور خصوصی

اقتدار اعلیٰ کا زمانہ گزر چکا ہے۔ یہ نظریہ کبھی حقیقت سے ہم آہنگ نہ ہو سکا''۔ ''این ایجنڈا فار پیس'' (یونائیٹڈ نیشنز نیویارک، 1992) صفحہ 9

42۔ طبی بسام، ''دی کرائسس آف ماڈرن اسلام: اے پری انڈسٹریل کلچر ان دی سائنٹفک، ٹیکنالوجیکل ایج'' (یونیورسٹی آف اوٹاپریس، سالٹ لیک سٹی، اوٹا 1988) صفحہ 81

43۔ فضل الرحمٰن، حوالہ سابق صفحہ 240

44۔ ایسپوسٹو، جان ایل اور وال جان او''اسلام اینڈ ڈیموکریسی'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک 1996) صفحہ 3

45۔ کمالی احمد ہاشم: ''دی اسلامک اسٹیٹ: اوریجنز، ڈیفینیشن اینڈ سالئنٹ ایٹری بیوٹس'' دیکھیے کے ایس ناتھن اینڈ ایم ایچ کمالی (ایڈٹ) ''اسلام ان ساؤتھ ایسٹ ایشیا: پولیٹیکل، سوشل اینڈ اسٹریٹیجک چیلنجز فار دی 21st سنچری'' (انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، سنگاپور 2005) صفحہ 292

46۔ کمالی محمد ہاشم، ''پرنسپلز آف اسلامک جیورس پروڈینس'' (اسلامک ٹیکسٹ سوسائٹی کیمبرج، 1991) صفحات 348-350

دین اور سیاست

اکیسویں صدی کی دنیا میں ہمارا موضوع بلاشبہ مختلف فیہ ہے اور کسی سیمینار میں مقالے کے اعتبار سے ممکنہ طور پر مبہم بھی ہے۔ اس سوال پر، ایک مشہور فلسفی کے قول کے مطابق ''مستقل گمراہ کن اصطلاحات'' کو نظرانداز کرتے ہوئے، ایک وسیع تر سیاق و سباق میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے زمانے اور ہمارے علاقے میں لفظ دین (ریلجن) بہت بولا جاتا ہے اور اکثر غلط معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکٹ آکسفورڈ ڈکشنری میں لفظ 'ریلجن' کے پانچ معنی دیے گئے ہیں اور خود اس کی جڑ لاطینی لفظ 'ریلجیو' سے بتائی گئی ہے جس کا مطلب اتحاد اور بندھن کے ہیں (اس میں یہ مفروضہ ہے کہ ایک ایسا گروہ موجود ہے جو اتحاد چاہتا ہے)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صفت میں نام سے زیادہ مفہوم مضمر ہیں لہٰذا لفظ 'ریلجس' بیک وقت پرہیزگار، عقیدت مند یا ارادت مند، متقی اور باضمیر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں جان لاک کے ان پرتکلف الفاظ کو اپنے فائدہ کے لیے یاد رکھنا چاہیے کہ ''اگر نظریات اور طریقہ اظہار کا ناپ تول کیا جائے اور باریک بینی سے ان پر غور کیا جائے تو وہ ہمیں ایک اور ہی منطق اور تفتیش کی جانب لے جائیں گے جن سے ہم اب تک آشنا نہیں رہے''۔

اگر محض تعریف و تفہیم کی خاطر ہم 'ریلیجن' سے مراد عقیدہ اور عبادت کا نظام لیتے ہیں تو ہمیں اس کے دائرہ عمل کے سوال کا سامنا کرنا ہوگا۔ کیا انگریزی زبان کی اصطلاح ہندو، بودھ 'دھرما' (1) یا اسلامی دین، (2) کے مترادف اور یکساں ہے؟ انفرادی کردار کے اعتبار سے دونوں ہی عقیدہ اور عبادت کی حدود سے آگے جاتے ہیں اور وہ اچھے کام جو سماج پرخوش گوار اثر چھوڑتے ہیں کے وسیع تر دائرہ کا احاطہ کرتے ہیں۔ سیاسی دائرہ میں دین کے اثرات کا تحقیقی جائزہ لینے کے لیے دو نکتوں پر غور کرنا ہوگا۔ اول تو سیاست کی جانب دین کا مناسب اور موزوں رویہ اور دوسرے دین کے زیر اثر یا اس سے مشروط سیاسی رجحان یا عمل۔ اس کے برعکس دین پر سیاست کا اثر حسب ذیل صورت اختیار کرسکتا ہے۔ پہلی تو دین کے اعتبار سے موزوں سیاسی عمل اور دوسرے سیاست سے مشروط دینی عمل۔ اس باب میں ہماری بحث بنیادی طور سے دونوں اولین پہلوؤں پر مرکوز ہوگی۔

ریاست کے نظام میں دین کو مختلف مقاصد اور اہداف کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ حکمرانوں کے قانونی جواز کا آلہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کو پالیسیوں اور طریقۂ عمل کی صورت حال کی برقراری قائم رکھنے کے حق میں استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس کو مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے سیاسی طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس کے دائرہ عمل میں وہ تمام کام آجاتے ہیں جو دینی اداروں کے تعاون یافتہ سیاسی گروپ اور مذہبی تنظیمیں کررہی ہیں۔ اس تناظر میں اس سوال کو دوسرے الفاظ میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے۔ کیا ریاستی پالیسیوں کی حمایت یا ساخت کے لیے ریاستی و ذیلی ریاستی عناصر کے ذریعہ سیاست میں ان دینی اصول و اخلاقیات کا استعمال کیا جاتا ہے جو معاشرتی وزن اور اثر کے حامل ہیں؟ ان پالیسیوں کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ حکومت کی دوہری یا تکثیری ذمہ داریوں سے متصادم ہوتی ہیں یا ان کی خلاف ورزی کرتی ہیں؟ کیا دین کا کوئی بھی بین الاقوامی کردار ہے؟ اور اگر ہے تو اس کے بین الریاستی تعلقات اور علاقائی سالمیت پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

مورخ ایڈورڈ گبن کا یہ مشاہدہ نہایت ہی موزوں ہے۔ بادشاہی روم میں دین کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے تحریر کیا ہے کہ ''بازنطینی دنیا میں عبادت کے جتنے بھی طریقے

رائج تھے عوام ان کو صداقت میں برابری کا درجہ دیتے تھے، فلسفیوں کے نزدیک وہ جھوٹ میں برابر تھے اور سرکاری حاکم کے لیے برابری کے فائدہ مند تھے۔ اس طرح رواداری اور برداشت نے نہ صرف باہمی خوش گواری کو جنم دیا بلکہ دینی اتفاق و ہم آہنگی کی بھی تخلیق کی'' (3) اصل نکتہ یہ ہے کہ مذہب ہمیشہ سے ایک معاشرتی حقیقت رہا ہے اور ساتھ ہی حکومت کے لیے ایک للکار بھی، لہٰذا اس کو ایسے فریم ورک میں رکھنا چاہیے جہاں یہ معاشرہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہو سکے۔ چنانچہ فی نفسہ اصل مسئلہ دین کا نہیں ہے بلکہ اس کی سماجی افادیت اور اس شخص یا جماعت سے متعلق ہے جو سماجی مقاصد کے لیے دینی علامتوں اور اصولوں کے استعمال کے بارے میں حرف آخر کا اختیار رکھتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس موضوع پر بحث و مباحثہ میں اتفاق و یگانگت کم اور تنازعات زیادہ حاوی رہے۔ معاشرتی مفکرین کا خیال ہے کہ تمام تہذیبوں میں 'مذہب نے وسیع تر تہذیبی فریم ورک اور لیجسٹے کے کچھ عناصر فراہم کیے ہیں۔ جنھوں نے جزوی طور سے ان راہوں کو پابند نشان کیا ہے جن سے دینی سرگرمیاں اور تنظیمیں سیاسی عمل سے جڑ جاتی ہیں۔ اس عمل کے دوران ماورائی دینی اور ماورائی نظم و ترتیب کے مابین بنیادی منشا ظاہر ہوئے اور دنیا کے کئی حصوں میں ان کو ادارے کی حیثیت دے دی گئی جیسے کہ قدیم اسرائیل، یہودا کے دوسرے دولت مشترکہ، زرتشتی ایران، چین کی ابتدائی بادشاہی، ہندو اور بودھ مت اور (بعد میں) اسلام میں کیا گیا'' (4) یوروپ میں یہی جنگ قرون وسطی کے اواخر میں عیسائیت کے تعلق سے لڑی گئی اور چودھویں صدی میں دوسروں کے ساتھ مارسیلز آف پڈوا کے خلاف سنائی گئی۔ اس تحریر کے مطابق، رومی پادریوں کی حکمرانی کی خواہش 'واحد سبب ہے جو ریاست کے اندر انتشار اور نااتفاقی پیدا کرتا ہے' (5) اس طرز کو فیصلہ کن طریقہ سے 'اصلاح' کے ذریعہ درست ہونے میں دو سو سال اور لگے۔ اصلاح وہ عمل ہے جس کے ذریعہ تدریجی طور پر یوروپ میں آزاد، سیکولر اور خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں۔ اسی عرصہ میں مسلم معاشرہ میں یہ کشمکش کم سے کم تھی اس کی وجہ 'اسلام کا ایک ضابطہ حیات کی جنسیت سے روایتی رشتہ' اور سیاست کو اس ضابطہ حیات کے لیے عالمی اطاعت حاصل کرنے کا لازمی ذریعہ، ماننا تھا(6)

اس کے اور لاقانونیت اور ہراج کو روکنے کے لیے خاموش انداز میں سیاسی فکر میں فروغ کے باوجود (7) سلطان اور علما کے درمیان کبھی کبھی کھنچاؤ بھی منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں سلطان کا پلہ عموماً طور سے بھاری رہا ہے کیونکہ آخرکار شریعت کے نفاذ کی ذمہ داری سلطان پر تھی۔(8)

لہٰذا جدیدیت سے قبل کے سیاسی افکار اور عمل میں مذکورہ بالا سلسلوں اور جہتوں کے ساتھ دین کو سیاست اور پالیسی کے ایک ذریعہ کی طرح قبول کرلیا گیا تھا۔ بین الریاستی تعلقات کی کمی کی وجہ سے اس ادراک کا اثر بنیادی طور سے داخلی ہی رہا۔ اور تمام متعلقہ فریقوں کی رضامندی سے اس کو وقت کا فطری نظام تسلیم کرلیا گیا۔ سترھویں صدی میں اور اس کے بعد یوروپی نوآبادیاتی نظام کے ظہور سے ساری افریشیائی دنیا بے ترتیبی کا شکار ہوگئی تھی۔قوموں کا گٹھ بندھن نوعیت کے اعتبار سے یورپی-عیسائی تھا اور کھیل کے ضابطہ بھی اسی لحاظ سے بنائے گئے۔ایک جرمن اسکالر اے ایم آئی ہیرین نے 1809 میں ریاستوں کے نظام کو بیان کرتے ہوئے لکھا ''کئی پڑوسی ممالک کا مجموعہ جو اپنے عادات و خصائل، دین اور معاشرتی فروغ کی سطح پر یکساں ہو، اور باہمی مفادات ان کو آپس میں جوڑے رکھے''(9) دوسری جنگ عظیم اور کئی افریقی ایشیائی آزاد مملکتوں کے ظہور کے بعد اس صورت حال میں تبدیلی آئی (سوائے ترکی کے جہاں یہ عمل 1942 کے بعد شروع ہوا)۔ ان میں سے اکثر مختلف ثقافتی وراثت کے دعویدار تھے۔کئی ممالک نے شعوری طور پر ریاست کے جدید ڈھانچہ اور طرز حکومت کو اختیار کیا جس میں کئی سطحوں پر یورپین ماڈل کی جھلک موجود تھی۔ (جو اپنے سیکولر اور عالمی نقطۂ نظر کی وجہ سے بین الاقوامی نمونہ بن چکی تھی) روایتی اور عصری مرکب کی تلاش میں ان کا براہ راست مقابلہ دین اور سیاست کے سوال پر ہوا۔

ایک صاحب علم فرانسیسی نے کبھی ایشیا کو ''تمام مقامی ادیان سے بالاتر'' کہا تھا: لہٰذا اس بحث کے مرکزی کردار چین، ہندوستان اور عالم اسلام کے ممالک ہی ہوتے تھے۔ چین نے 1949 میں کمیونسٹ نظام کو اختیار کرلیا اور عوامی پالیسیوں میں مذہب کے لیے کوئی جگہ نہ چھوڑی۔ (جہاں تک کنفیوشزم اور شانتو کا سوال ہے تو وہ بنیادی طور سے اجداد کی

پرستش اور سماجی اخلاقیات سے تعلق رکھتے تھے)۔ ہندوستان کے معاملہ کو دوقومی نظریے اور برطانوی ہند کے مسلم اکثریت کے صوبوں کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کے پس منظر میں دستور ساز اسمبلی نے شعوری طور سے یہ فیصلہ کیا کہ ایک ایسا ریاستی ڈھانچہ تیار کیا جائے جس میں جمہوریت، مذہبی رواداری، معاشی ترقی اور ثقافتی تکثیریت کو اولین ترجیح دی جائے۔ نہرو کا مقصد ایک غیر فرقہ وارانہ سیکولر ریاست تھا۔ آئین نے اس کو ایک قانونی شکل دے دی۔ اس کے باوجود نہرو اچھی طرح جانتے تھے کہ 'ہندوستان کی آزادی کے وقت سیکولر قوم پرست قوتیں بری طرح مجروح ہوئی ہیں' اور یہ کہ 'حکمراں پارٹی میں نظریاتی ہم آہنگی کی کمی ہے''۔ جولائی 1948 کے اپنے ایک خط میں انھوں نے تحریر کیا تھا ''میرا یقین ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ریاست ہے جہاں تمام مذاہب اور ثقافتوں کو آپس میں تعاون کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان اسی وقت عظیم بن سکتا ہے جب وہ اس جامع وراثت کی حفاظت کر سکے جو اس نے ایک طویل زمانے میں تیار کی ہے۔ لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ کبھی کبھی شکوک مجھے گھیر لیتے ہیں کہ ایسا ہوگا کہ نہیں''(10) گزشتہ سالوں کی بحث اور رجحان اس فیصلہ کو درست ثابت کرتا ہے کہ نتیجہ کے طور پر 'ہندو قوم پرستی کا ظہور ہوا جس نے اپنی جگہ نہ ہی سیاسی نظام میں بنائی اور نہ ہی مذہب کے میدان میں بلکہ ایک وسیع تر احاطہ میں جس کو ہم عوامی کلچر کہہ سکتے ہیں، جگہ بنائی''(11) جس کا مقصد ''معاشرہ میں ایک منظم سماجی اور سیاسی تنظیم کو تھوپنا تھا''(12) بہرحال ایک ایسے نتیجہ کی آرزومندی اور پہنچنے کی صلاحیت کے بارے میں ہندوستانی آرا میں کافی اختلاف تھا۔

اب سے دو دہائی پہلے مورخ عائشہ جلال نے 'ہندوستان پر برطانوی راج کی آخری دہائی میں محمد علی جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سیاسی مقاصد کی تہہ میں پوشیدہ دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش کی۔ عائشہ جلال کا تجزیہ یہ تھا کہ وہ اور مسلم لیگ'' آخر میں وہ اکثریتی اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے متضاد مفادات میں سمجھوتہ نہ کر پائے۔ جس کو برطانوی پالیسی نے باری باری صوبہ جاتی اور فرقہ وارانہ رنگ دے کر ہندوستانی سیاست میں نمایاں کر دیا تھا''(13) اس کے علاوہ جلال نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ ''یہ کیونکر ممکن ہے

کہ جب وہ اپنا حق خود اختیاری استعمال کر رہے ہوں تو دو علاحدہ اور دشمن ریاستوں کے شہری کیسے ہو سکتے ہیں؟''(14) ایسی حالت نے ظہور پاکستان کو بھی ایک شناختی بحران سے دوچار کیا جو آسانی سے حل نہیں ہونے والا تھا: ''پاکستان اکثریتی مسلم آبادی پر مشتمل تھا لیکن اس کے معاشرہ پر علاقائی ثقافت کا رنگ غالب تھا جس میں سے بعض ایک دوسرے سے زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ اگرچہ سب نے اسلام کو جذب کیا لیکن اسلام کسی کو بھی مکمل طور پر جذب نہ کر سکا، نتیجہ کے طور پر اسلام نے بجائے قومی یکجہتی کے آلہ کار ہونے کے ثقافتی انتشار میں مدد کی''۔(15) اس کے باوجود اور 11 راگست 1947 کے جناح کے اعلامیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے پاکستان نے اسلام کو سرکاری دین تسلیم کیا اور ملک ایک 'اسلامی دستور' اپنانے کی راہ پر گامزن ہوا۔ اس موضوع پر بحث طویل بھی تھی اور تلخ بھی۔ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق اسلام کی سرکاری مذہب کی حیثیت بھی اصل مقصد کی حقیقی تصویر نہیں تھی۔ جس نے آخرکار 15 رجون 1988 کو شریعت آرڈی نینس کی شکل اختیار کی۔ اس کا اصل مقصد اسلامیانے کے عمل کو تیز اور مکمل کرنا تھا۔ اس موقعہ پر ضیاء الحق نے کہا ''وہ دن دور نہیں ہے جب انشاء اللہ پاکستان اسلام کا سچا گہوارہ بن جائے گا۔ غیر اسلامی اقدار کی لگن ختم ہو جائے گی۔ غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کا ماحول چھٹ جائے گا۔ اسلام دشمن قوتیں مزید کمزور پڑ جائیں گی اور وطن عزیز میں ہر جانب شریعت محمدی کا دور دورہ ہوگا''۔ اس کا مطلب تھا کہ سرکاری پالیسی کے ہر پہلو میں بشمول پاکستان کی حدود سے باہر وقوع پذیر ہونے والی تجارتی مہمات میں شریعت کی جھلک نمایاں ہوگی۔ چودہ سال بعد 12 رجنوری 2002 کو پاکستان کے دوسرے سربراہ مملکت نے اس اصول میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی۔ ابھی اس کے اثرات کا اندازہ کرنا باقی ہے۔

بنگلہ دیش میں، خاص طور سے اپریل 1977 کی آئینی ترمیمات کے بعد اسلامی عنصر نے سرکاری پالیسیوں کے بنانے میں ایک یقینی مقام حاصل کرلیا جس کو صدر ضیاء الرحمٰن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا: ''ہم علی الترتیب اپنے مذاہب پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور مذہب کے سائے میں زندہ رہنا چاہتے ہیں''۔ 1988 میں دستور کی آٹھویں ترمیم نے اسلام کو

بنگلہ دیش کا سرکاری مذہب تسلیم کرلیا۔ اس فیصلہ نے داخلی سیاست کے ساتھ ساتھ سرکار کی علاقائی سیاست اور تیل برآمد کرنے والے ممالک (او آئی سی) کی جانب اس کی پالیسی پر گہرا اثر چھوڑا۔(16)

برصغیر ہند کے قطعی تاریخی حوالوں سے پرے ایشیا کی دوسری مسلم اکثریتی سماج، خواہ وہ عرب ہوں یا غیرعرب، میں جدیدیت نے متوقع نتائج برآمد نہیں کیے یا متوقع رفتار سے آگے نہیں بڑھی۔ سیکولر سیاست اور کلچر سے علاحدگی پیدا ہونے لگی۔ اکثر ممالک سیاسی فروغ کے ایک المناک تجربہ سے دوچار ہوئے (جیسے 1967 کی جنگ، ایران انقلاب اور حرم مکہ کا محاصرہ)۔ اس دوران غیر روایتی دانشوروں نے روایتی عقائد کو نئے معنی دیے اس عمل کو بعض دانشوروں نے 'آبجیکٹیو فیکشن آف مسلم کانشس نیس' (مسلم شعور کو معروضی انداز میں ڈھالنے) کا نام دیا ہے: میرا دین کیا ہے؟ یہ میری زندگی میں کیوں اہم ہے؟ میرے عقائد میرے کردار کی کس طرح رہنمائی کرتے ہیں؟(17) ان خطوط پر مشاہدہ نفس نے بالآخر اسلامی رجحان کی حوصلہ افزائی کی اورعوامی پالیسی میں دین یا مذہب کو ایک اوزار کی طرح استعمال کرنے کے ذہنی جھکاؤ کو تقویت ملی۔ اس طرح نیا اسلام سیاست کی زبان بن گیا اور اسلامی علامتوں اور زیب و زینت والی لفظی تصویر کے ساتھ ''اسلام ہی حل ہے'' کا نعرہ اکثر سرزمینوں میں گونجنے لگا۔

یہ بات کہ سیاست کو مذہب میں داخل کرنا یا مذہب کی روشنی میں سیاسی فیصلے کرنے کا میلان جدید زمانے میں بھی خالص اسلامی نہیں ہے دوسری مثالوں سے بھی واضح ہوتا ہے 1956 میں سری لنکا کی بندرا نائکے حکومت نے فیصلہ کیا کہ بودھ مت کو اس کا 'جائز' مقام ملنا چاہیے۔ 1965ء میں نیپال کے شاہ مہندرا نے زور دیا کہ 'یہ لازمی ہے کہ تمام ہندو' ہندو سماج کی حفاظت، قوت اور ترقی کے لیے آگے بڑھیں اور دھرما کو پھر سے نافذ کریں لہٰذا انسانیت کی بقا کے لیے ہندوؤں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے(18) اور پھر اسرائیل ہے جو ایک یہودی ریاست کی صورت میں وجود میں آئی ہے(19) اور تمام سیاسی و قانونی مقاصد کے لیے اسی طرح تسلیم کی جاتی ہے جس میں مذہبی پارٹیاں کم وبیش ہر وقت مخلوط

حکومت کا حصہ ہوتی ہیں۔ دنیا کے دوسرے حصوں جیسے یونائیٹڈ اسٹیٹس، لاطینی امریکا، مشرقی ایشیا اور افریقہ کے ذیلی صحارا علاقہ میں تبلیغی مساعی میں کافی اچھال آیا ہے۔ ''یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اکیسویں صدی کی دنیا آج کی دنیا سے کم مذہبی ہوگی'' (20)

لہٰذا سیاست اور سیاست کی زبان کو سیکولر بنانے کی کوششوں کو کماحقہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور دنیا کے اکثر ممالک میں داخلی طور سے اس کے آثار اور ثبوت کو واضح طور سے دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن داخلی دائرہ بہرحال ایک ناقابل سرایت خانہ بندی نہیں ہے جہاں پانی نہ داخل ہوسکے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ داخلی اور خارجی پالیسیوں کی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور اکثر معاملات میں باہمی انحصار نمایاں رہتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر خارجہ پالیسی کا مقصد اور عمل لازمی طور سے کسی نہ کسی حد تک متعلقہ ریاست کے دینی رویہ کا آئینہ دار ہوتا ہے اگر اس عمل کا تنقیدی تجزیہ کیا جائے تو اس رویہ کے لیے مندرجہ ذیل میں سے ایک یا سارے ہی عناصر ذمہ دار ہوں گے: چوٹی کے فیصلہ کرنے والے کی ذاتی ذہنی رغبت اور پسندیدگی فیصلہ کرنے کے عمل میں کسی گروہ یا تنظیم کا دخل اور اثر اور حکمراں طبقہ کے ممتاز افراد کا کسی خاص مکتب فکر کی تجاویز اور معیار سے اتفاق مسلسل پریشانی، اس عمل کا ادراک ان معاشروں میں زیادہ آسان ہے جہاں مذہب و سیاست کا ملاجلا نظام ہے اور مذہب کو ریاست کے لیے قانونی جواز کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔

یہ نظریات و پالیسیاں بین الاقوامی تعلقات میں کیا کردار ادا کرتی ہیں اور متعلقہ ممالک کی روایتی خارجہ پالیسیوں کے پروگرام کو آگے بڑھانے میں کہاں تک اثر انداز ہوتی ہیں؟ کیا ان کو بین الاقوامی تعلقات پر ابھرتی ہوئی عالمی سوچ سے ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے؟

پہلے سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم چند مخصوص ملکوں کے ایک گروپ کی پالیسیوں کا جائزہ لیں۔ ان میں سب سے پہلی مثال ایران ہے جہاں 1979 کے انقلاب کے بعد آئین کی دفعہ 3 (16) میں خارجہ پالیسی کے متعلق بیان کیا گیا کہ یہ ''اسلامی معیار کے مطابق تمام مسلمانوں کے لیے برادرانہ ذمہ داری اور دنیا کے مستضعفون

(کمزور اور محروم) کے لیے مسلسل تعاون کی بنیاد پر بنائی جائے گی''۔ ایک دہائی اور کچھ قابل ذکر تجربہ کے بعد امام خمینی نے وزارت خارجہ کو ہدایت دی کہ ''مسلمان قوموں سے تعلقات بہتر بنانے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لائیے۔ دوسرے مسلم ممالک کے ارباب حل وعقد کو بیدار کیجیے، اور ان کو اتحاد و یگانگت کی جانب دعوت دیجیے''۔ گزشتہ سالوں کے دستیاب شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اب توجہ کا مرکز نظریاتی نہیں بلکہ عملی ہے۔ حتیٰ کہ وسط ایشیا کے پڑوسی ملکوں میں ''ایران نے اپنی اسلامی شناخت میں سیاسی کے بجائے ثقافتی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے۔''(21) دوسری جانب سعودی عرب میں اسلام نے خارجہ پالیسی کے ایک اوزار کی حیثیت سے ملک کو مرکزی مقام عطا کرنے خصوصاً اسلامی اور او آئی سی متعلقہ امور میں، اور اس سے قبل ترقی پذیر دنیا کے مسلم ممالک کو معاشی امداد فراہم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ''سیاسی اسلام'' اور اس سے وابستہ تازہ ترین امور نے بلاشبہ ملک کے لیے کچھ پریشانیاں کھڑی کردی ہیں۔ نتیجہ کے طور پر ''اکثر سعودی' آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ' کی حالت میں پہنچ گئے ہیں''(22) تیسری مثال پاکستان اور افغانستان اور ریاست جموں وکشمیر سے متعلق اس کی اسلامی ترقی پسندی (فارورڈ پالیسی) کی ہے۔ دونوں کے نتیجہ سے ہر کوئی واقف ہے(23) اس کے علاوہ عراق کی بھی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ عراق کو ایک طویل عرصہ سے بعث سوشلزم کا علمبردار مانا جاتا تھا اور وہ اگست 1995 میں کویت پر عراق کے حملہ کے بعد علامتی طور سے مذہبی جھنڈے کے نیچے آیا۔(24) اس فہرست میں اور اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ خارجہ پالیسی میں مذہب کے دخول کی کوششوں سے اس کے متعارف کرنے والوں کا ملا جلا نتیجہ ظہور میں آیا ہے جس کی وجہ سے لازمی طور پر علاقائی اور علاقہ سے باہر تناؤ پیدا ہوا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب سرد جنگ کے خاتمہ پر بین الاقوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ 'منشور' کی نئی نئی ترجمانیوں نے رفتہ رفتہ اقوام متحدہ کے دائرہ عمل کو وسیع اور اراکین ممالک کے 'داخلی حکمرانی اختیار' کی حدود اور ان کے 'تعاون' (دفعہ 56) کے حلف کے معنی پر نئے سوچ کا آغاز کیا۔

آج کی قومی ریاست دراصل ریاستوں کے ایک بین الاقوامی نظام کا حصہ ہے جس کا وجود کچھ مقاصد کے حصول کے لیے ہے۔ ان مقاصد میں سرفہرست ان کی آزادی کی برقراری ہے۔ دوسرے مقاصد میں امن کا قیام، تشدد کی روک تھام، ذمہ داریوں اور معاہدوں کا تقدس، باہمی تعاون کے فروغ کے علاوہ خود اس نظام کا جاری رکھنا بھی شامل ہے کیونکہ یہی نظام ان مقاصد کے حصول اور نفاذ کے لیے کوشاں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نظام کے برقرار رہنے کی اشد ضرورت نے اس نظام کے اراکین پر زور دیا کہ وہ مشترکہ فائدہ کے تصور پر مبنی ضابطوں کو ترتیب دیں۔ ان ضابطوں کو بنایا جائے، پھیلایا جائے، نافذ کیا جائے، وضاحت کی جائے، قانونی اعتبار بخشا جائے اور ان کی حفاظت کی جائے۔ یہ ضابطے یا قواعد دنیا کی سیاست کے اصول میں جو تشدد کو محدود یا منظم کرتے ہیں حقیقت میں مل جل کر رہنے کی ضمانت ہیں۔ ''ان قوانین کے مجموعہ کے قلب میں یہ اصول ہے کہ ہر ریاست کو دوسری ریاست کے اقتدار اعلیٰ کا احترام لازم ہے اور یہ کہ ایک ریاست دوسری ریاست کے اس کے اپنے شہریوں پر حاکمانہ اور قانونی اختیارات تسلیم کرے اور ہر ریاست یہ احترام وتسلیم دوسری ریاست کو لوٹائے۔ اس مرکزی اصول کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریاستیں ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کریں گی۔ اس اصول سے دوسرا نتیجہ یہ منضبط ہوتا ہے کہ ریاستیں اپنے اقتدار اور دوسرے حقوق کے استعمال میں برابر کے درجہ پر ہوں گی'۔(25) روایتی بین الاقوامی قانون کے ان اصولوں کو آخرکار اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ 2 میں ضم کردیا گیا جس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کے زمانے کے بین الاقوامی تعلقات کے لیے ایک فریم ورک مہیا کیا۔ معاہدوں، میثاق، اعلانات نے منشور کے بعض اصولوں کی وضاحت کی اور مستحکم کیا۔ اس عمل کے دوران یہی اصول بین الاقوامی قوانین کی شناخت بن گئے۔ ان میں سے کچھ ریاست کی مذہب کے زیر اثر پالیسیوں سے براہ راست متصادم ہوتے تھے اور دو کا تعلق سیاست میں مذہبی امتیاز سے تھا۔ اول تو ہر طرح کی غیر رواداری یا تعصب اور عقیدہ یا مذہب کی بنیاد پر امتیاز کے خاتمہ کا اعلان - اور دوسرے لسانی، مذہبی نسلی یا قومی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے

حقوق کا اعلان تھے۔(26) خاص طور سے اول الذکر اس معاملہ میں اقوام متحدہ کے رویہ کی تمہید ہے یعنی منشور کے متضاد مقاصد کے لیے عقیدہ اور مذہب کا استعمال 'نا قابل قبول' ہوگا۔ اس اصول کی نظراندازی ''عالم انسانیت کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ بڑی جنگوں اور مصیبتوں کو لائی ہے خاص طور پر اس وقت جب وہ دوسری ریاستوں کے داخلی مقدمات میں بیرون مداخلت کا ذریعہ بنتے ہیں اور لوگوں اور قوموں کے درمیان نفرت پھیلاتے ہیں۔ اعلانیہ کی دفعہ 3 اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ مذہب اور اعتقاد کی بنیاد پر تفریق ''منشور کے اصولوں سے روگردانی ہے' اور اس کی 'انسانی حقوق کے عالمی اعلانیہ اور دیگر دستاویزات میں مذکور انسانی حقوق اور بنیادی آزادی سے روگردانی تسلیم کرتے ہوئے مذمت کی جائے گی اور اس کو ریاستوں کے باہمی امن پسند تعلقات کے عمل میں رکاوٹ تسلیم کیا جائے گا۔

اس سوال میں ایک نئی جہت کا اضافہ ریاستی اقتدار اعلیٰ کے اصول کے تقدس کی جانب اقوام متحدہ کے رویہ میں ٹھوس تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس نے قابل ذکر حد تک ریاستوں (یا ان میں سے کچھ) کی بین الاقوامی معمول اور بیرونی ردعمل کو نظرانداز کرتے ہوئے پالیسیوں کو اپنانے کی آزادی کو سلب کر دیا۔ داخلی برانگیختگی و برہمی کا تصور جو ناکام یا ناکام ہوتی ہوئی ریاست کے تصور میں ضم ہے، نے مداخلت کے جدید نظریہ کی وضاحت اور نفاذ کی طرف بڑھایا(27) لہٰذا ایسا نظر آئے گا کہ تیزی سے ایک انفرادی سیکولرزم کی جانب بڑھتی ہوئی عالمی کیونٹی کا ماحول مذہب سے متاثر سیاسی جذبات اور تحریکات ایک اکیلے قومی سماج میں خصوصاً بحران و پریشانی کے وقت، داخلی و بیرونی سطح پر متصادم ہوگا۔

یہ ایک الگ اور افسوسناک امر ہے کہ عالمی طاقتوں کے آپسی تعلق اس بحث کو غیر متوازن بناتے ہیں۔ اور اس دوران عالمی یکسانیت اور عالمی تنوع سے ظاہر ہونے والی ناگزیر کاموں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ضرورت غیر اطمینان بخش تھی اور خالص ثقافتی امتیازات کو بھی مناسب جگہ نہیں دی گئی اور گلوبلائزیشن کے تناظر میں 'عالمی شہر' اور عالمی گاؤں کے فرق پر بھی کماحقہ غور نہیں کیا گیا اور نہ ہی ایک سے دوسرے میں منتقل ہونے کے

عمل کی ساخت اور موافقت کی ضرورت کو سمجھا گیا۔ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اگر چہ جمہوری عمل کی حمایت ہر دور میں قابل تحسین ہے مگر اسے اپنی بقا کے سلسلہ میں ایک دوسرے اور عالمی نظام کے ڈھانچوں میں ضم ہونے کے لیے ایک جمہوری نظریہ کی ضرورت ہے۔ (31) اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔

تجربہ نے بتایا ہے کہ علاقائی اور اس سے ماورائی سیاسی اور حفاظتی مسائل و مشکلات اب صرف بین الریاستی سطح پر حل نہیں ہو سکتے۔ مجموعی طور سے عوامی بیداری میں فروغ اور انفارمیشن کے میدان میں انقلاب کے پس منظر میں سول سوسائٹیوں کی شرکت ایک ضرورت بلکہ کسی حد تک حقیقت بن چکی ہیں۔ لیکن اس کی بھی حدود ہیں کیونکہ مجموعی طور سے عوامی رواج و نظریات سوسائٹی کے شعوری و لاشعوری فکری عمل کی تخلیق ہیں اور مذہب اور عقیدہ کے نظام میں مزاحمت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو آسانی سے آلہ کار بنایا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے اور شہری زندگی میں مذہب کے استعمال سے متعلق معاملہ کی وجہ سے عوام میں جانکاری کے لیے بڑا کام کرنا لازمی ہوگا۔ رائے عامہ اور سول سوسائٹیوں کو یہ باور کرانا ہوگا کہ عصری عالمی رجحانات سے غیر ہم آہنگ ہونے کے علاوہ روایتی طریقہ کے طرز کلام کا اثر ناکام ہو گیا ہے۔ دوسری طرف وسیع معنوں میں مذہب سماجی ڈھانچہ کے بنیادی عمارت کی حفاظت ساتھ رہتا ہے اور اسی وجہ سے بغیر بنیادی اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ توجہ کے مرکز کو تبدیل کیا جائے اور بین الریاستی تعلقات ہموار کرنے کے لیے مشترکہ قدروں کی تلاش کی جائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ تکثیریت اور سیکولرزم کو سیاست کا اصول سمجھ کر تسلیم کیا جائے۔ یہ برداشت کے فرض کی حد سے آگے جائے گا۔ ضرورت ہوگی یہ برابری اور مساوی سلوک کے اصول سے بغیر شک و شبہ کی وفاداری پر بیان کیا جا سکے۔ اس کی وکالت مذہب کے اصولوں سے نہیں ٹکرائے گی کیونکہ مذہب کا انحصار عقیدہ اور نیت پر ہے جو طاقت کے ذریعہ نافذ نہیں کیے جا سکتے (32)۔ کچھ لوگوں کے خیال میں اخلاقیات کے دخل کے باعث ایک زیادہ انسانی دنیاوی نظام ظاہر ہوگا جو ''عالمی اقدار اور مقامی تعریفات کی

گفتگو کے ساتھ ایک حساس کائناتیت کی خاکہ کشی کرے گا''۔(33)مسلم سماجوں میں ایسا رجحان روایت پرستوں کے پرانے تذبذب کوحل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔اس کے علاوہ یہ دین و سیاست کے تعلق سے جڑی ہوئی نظریاتی تعریف کی نئی تاویل کرنے میں بھی مدد دے سکتا ہے۔اس بیان کی بہترین مثال تیونس کے اسلامی قائد رشید الغنوشی ہیں جو سیکولرزم کو ایک ترقی پذیر جمہوری تحریک مانتے ہیں جو'اپنی کمزوریوں سے قطع نظر' مغربی ذہن کو اس کی نظریاتی غفلت سے جگانے میں کامیاب ہوا اور آخرکار اس کو طاقت کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل بنایا۔الغنوشی مزید کہتے ہیں کہ'ایک سیکولر جمہوری حکومتی نظام ایک ایسے نظام حکومت سے یقیناً کم برا ہے جو مطلق العنان ہو اگرچہ وہ اسلامی ہونے کا دعویٰ کرے''(34) انڈونیشیا کی 87% آبادی مسلمان ہے۔ وہاں کے سابق صدرعبدالرحمٰن وحید جو نہضۃ العلما سے تعلق رکھتے تھے (جس کے بنیادی ممبروں کی تعداد 35 ملین تھی) عرصہ دراز سے کہہ رہے ہیں کہ طریقہ اظہار میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور اسلام کے سیاسی مقام کومخصوص سماجی مطالبات جن کا مقصد تکثیریت اور پنچ شیل نظریہ کا فروغ ہو، کے حوالے سے مرتب کرنا چاہیے(35) وحید نے توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ'اسلامی قوانین کے بارے میں ہماری فہم اور وہ عالمی اقدار جن کو ہم نہ صرف مانتے ہیں بلکہ اپنے عقیدہ کا مرکز کہتے ہیں، کے درمیان کھلا ہوا تضاد ہے، (36) یہ خیالات نئے رجحانات ڈھالنے میں کارگر ہوسکتے ہیں۔

اس باب کی ابتدا میں جو تین سوال اٹھائے گئے تھے اب ان کا جواب دیا جاسکتا ہے۔ وہ ریاستیں اور ذیلی ریاستیں جو دین پرمبنی نظریہ کو اختیار کیے ہوئے ہیں خارجی پالیسی کے تصور اور عمل میں اس کو الگ الگ درجہ کی شدت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔اس قسم کا طرزعمل بین الاقوامی معمولات کے خلاف ہے۔ مقامی، علاقائی اور عالمی تأملات اور لحاظ اکثر ایسی صورت حال کی طرف لے جاتے ہیں جہاں یہ پالیسیاں تناؤ کے سبب کی طرح دیکھی جاتی ہیں۔

کیا عنقریب کوئی حل سامنے ہے؟ اس کا انحصار عصری معاشروں کے باہمی تال

میل اور اختلاف کو ایک فریم ورک میں سمونے میں نئے تصوراتی اہلیت پر ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا ''تو یہ تسلیم کرنا کہ ہم اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں بہتر ہے بجائے اس کے ہم اس خوش فہمی میں رہیں کہ ہم روشنی دیکھ سکتے ہیں۔''(37)

حواشی

1۔ 'دی انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ آتھکس' (ٹی اینڈ ٹی کلارک، نیویارک 1959)، جلد IV، صفحہ 702، دھرما کی تعریف 'مقدس قانون وفریضہ، انصاف دینی تفوق۔

2۔ دین کی اصطلاح قرآن میں کئی جگہ وارد ہوئی ہے (مثال کے طور پر 2:256، 83-84، 19-3:20، 4:171 اور 5:4) اور عبداللہ یوسف علی نے اس کا ترجمہ مذہب (ریلجن) کیا ہے۔ ای جی برل کے 'فرسٹ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ای جی برل، لیڈن 1993) جلد:1، صفحہ 956 کے مطابق یہ اصطلاح تین چیزوں کا احاطہ کرتی ہے پہلی اسلام اپنے پانچ ارکان کے ساتھ یعنی توحید کی شہادت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، زکوٰۃ، روزہ اور حج، دوسری ایمان اور تیسری احسان، ان تینوں چیزوں سے مسلمانوں کا دین تعمیر ہوتا ہے۔

3۔ گبن، ایڈورڈ، 'دی ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر' (ماڈرن لائبریری، 1996) جلد 1، صفحہ 12

4۔ ایسٹنیڈ، ایس این 'ریلجن اینڈ دی سولیزائیشنل ڈائی مینشنز آف پالیٹکس' سعید

امیر ارجمند (ایڈٹ) کی (دی پولیٹکل ڈائی مینشنز آف ریلجن'' میں شائع شدہ مقام (سنی پریس، نیویارک 1993) صفحات 13-14

5۔ مارسلیسز آف پڈوا 'ڈیفنسر پاسس' (یونیورسٹی آف ٹورنٹو پریس، ٹورنٹو، 1980) صفحہ 95

6۔ عنایت، حمید، 'ماڈرن اسلامک پولیٹیکل تھاٹ' (میکمیلن، لندن 1980) صفحہ 1

7۔ 'ہماری جانب سے دی گئی مراعات بے ساختہ نہیں ہیں بلکہ ضرورت حرام کو حلال کردیتی ہے'۔ غزالی (1058-1111 AD) نے اپنے ایک فقہی مقالہ میں تحریر کیا۔

8۔ لہٰذا چودھویں صدی کے ہندوستان میں سلطان محمد تغلق نے حکمراں کو قطعی لغوی معنوں میں لیا اور صوفیہ اور علما سے وفاداری و تعاون کا مطالبہ کیا اور ان سے وہ چاہا جواب تک ہندوستان کی مسلم تاریخ میں کسی نے نہیں کیا تھا۔ مجیب، ایم 'دی انڈین مسلمز' (جارج ایلن اینڈ اَنوِن، لندن 1967) صفحہ 75۔ بعد میں آنے والے حکمرانوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ سلطنت عثمانیہ میں 'حکمرانوں سے علما کی وفاداری اور ذمہ داری اتنی مکمل تھی کہ وہ مؤثر انداز میں کسی ماورائی اسلامی آئیڈیل جو دنیاوی بدعنوانیوں کے خلاف ہو، کی نمائندگی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ لاپیڈوس ایرا ایم 'اے ہسٹری آف اسلامک سوسائٹیز' (کیمبرج 1988) صفحات 326-28

9۔ بُل ہیڈ لے کا حوالہ 'دی انارکیکل سوسائٹی: اے اسٹڈی آف آرڈر ان ورلڈ پالیٹکس' (میکمیلن، لندن، طبع دوم 1995) صفحہ 12

10۔ الحسن، شیر 'لیگیسی آف اے ڈوائڈڈ نیشن: انڈیاز مسلمز سنس انڈیپنڈنس' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی 1997) صفحات 135، 136 اور 145

11۔ کھلنانی، سنیل، 'دی آئیڈیا آف انڈیا' (فرار، اسٹراس اینڈ جیروکس، لندن 1997) صفحہ 8

12۔ ہنسین، تھامس بلوم۔ 'دی سیزرون وار: ڈیموکریسی اینڈ ہندو نیشنلزم اِن ماڈرن انڈیا' (پرنسٹن یونیورسٹی پریس، پرنسٹن، نیو جرسی، 1999) صفحہ 4۔ ہنسین کا حاصل کلام یہ ہے کہ ہندو قومی تحریک نے ایک ایسے وقت میں طاقت حاصل کی جب ثقافتی ہم آہنگی، سیاسی یک جہتی اور یکساں طرز حکومت کے نفاذ کے 'ملکی سطح پر حالات اتنے مایوس کن کبھی نہ تھے'۔ (صفحہ 237)

13۔ جلال، عائشہ۔ 'دی سول اسپوکسمین: جناح، دی مسلم اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، پیپر بیک ایڈیشن، 1994) صفحات XV-XVI

14۔ جلال، عائشہ۔ 'دی اسٹیٹ آف مارشل رول: دی اوریجنس آف پاکستانیز پالیٹکل اکنامی آف ڈیفنس'۔ (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، پہلا ہندوستانی ایڈیشن۔ 1992) صفحہ 9

15۔ حوالہ سابق، صفحات 287 اور 289۔ افتخار ایچ ملک نے بھی اعلیٰ طبقہ کے سیاسی، مذہبی اور صوبائی مفادات پر روشنی ڈالی ہے۔ 'اسٹیٹ اینڈ سول سوسائٹی اِن پاکستان' (پال گریو میکمیلن، لندن 1997) صفحات 55-49۔

16۔ جیکس، کتھرین۔ 'بنگلہ دیش، انڈیا اینڈ پاکستان: انٹرنیشنل ریلیشنز اینڈ ریجنل ٹینشنز اِن ساؤتھ ایشیا' (میکمیلن، لندن 2000) صفحات 110 اور 112۔ ساتھ میں انیس الزماں کا مضمون 'ریلیجن' پولیٹکس اینڈ دی اسٹیٹ اِن بنگلہ دیش، دوہرہ این این اور ڈکشٹ جے این (ایڈٹ) کی کتاب 'ریلیجن، پولیٹکس اینڈ سوسائٹی اِن ساؤتھ اینڈ ساؤتھ ایسٹ ایشیا' (کونارک، نئی دہلی 1998) صفحات 70-60 ملاحظہ کریں۔

17۔ ایکل مین، ڈیل اور پسکاٹوری جیمس 'مسلم پولیٹکس' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی 1997) صفحات 45-37، فواد عجمی نے اپنی کتاب، دی ڈریم پیلس آف دی عربس: اے جنریشن اوڈیسی (ونٹیج بکس نیویارک 1998) میں اس عمل پر کافی

باریکی سے لکھا ہے۔

18۔ ولسن، ڈک۔'ایشیا اویکنز' (وڈن فلڈ اینڈ نکلسن، لندن 1970)، صفحات 36 اور 42

19۔ ایبان، ابا،'این آٹو بائیوگرافی' (رینڈم ہاؤس، نیویارک 1977) صفحہ 112۔ 'جیوش اسٹیٹ' کی اصطلاح پہلی بار یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ایک اعلان میں 14 مئی 1948 میں اس وقت استعمال ہوئی جب اس نے اسرائیل کو'عملی منظوری' عطا کی - یونائیٹڈ اسٹیٹس اسرائیل کو تسلیم کرنے والی اولین ریاست کیوں ہوئی اس پر ایک اسرائیلی دانشور کا تبصرہ کافی دلچسپ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹرومین کا فیصلہ اخلاقی، ثقافتی اور دینی بنیادوں پر مبنی تھا (جیسے کہ انجیل کی یہ پیشین گوئی کہ یہودی ارض موعود میں واپس آئیں گے جو کہ خصوصاً انتہاپسند عیسائیوں اور مبلغین میں عام ہے) نہ کہ جغرافیائی تحفظ اور قومی سلامتی نکتہ نظر پر۔ بن زوی، ابراہیم 'ڈیکیڈ آف ٹرانزیشن-آئزن پاور، کینیڈی اینڈ دی اوریجنز آف امریکن اسرائیلی الائنز' (کولمبیا یونیورسٹی پریس، نیویارک 1998) صفحہ 6

20۔ برگر، پیٹر ایل،'سیکولرزم ان اسٹریٹ' - عزام تمیمی اور جان ایل اسپوسیٹو (ایڈٹ) کی کتاب 'اسلام اینڈ سیکولرزم ان دی مڈل ایسٹ (ہرسٹ اینڈ کمپنی، لندن 2000) صفحہ 46

21۔ مصباحی، محی الدین،'ایرانز فارن پالیسی ٹوورڈز ایشیا' سنٹرل ایشیا اینڈ دی کاکس، جان ایل اسپوسیٹو اور آر کے رمضانی (ایڈٹ) کی کتاب 'ایران ایٹ دی کراس روڈز' (پال گریو، نیویارک، 2001) صفحات 57-156 پر مقالہ

22۔ پرنس ترکی الفصیل، ایلز بیتھ فرائز ورتھ کو 21 جنوری 2002 کو دیا گیا انٹرویو۔ (www.pps.org/newshour/bb/middle-east/saudi-arabia) ملاحظہ کیجیے رولیوا ایرک 'ٹربل ان دی کنگڈم' - 'فارن افیسرز (جولائی، اگست 2002، 81:4) صفحات 89-75

23- امین، شاہد ایم۔ 'پاکستانیز فارن پالیسی: اے ری اپریزل' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی 2000) باب 11، خصوصی صفحات 29-225، اور 73-272 ہندوستانی پالیسی سے سبق پر۔ خارجہ پالیسی میں اسلام کے دخل پر سفیر شاہد امین کا خیال ہے 'مسلم ممالک اس معاملہ میں بہت حد تک الگ الگ ہیں' (صفحہ 279)۔ ایک انجمن کی حیثیت سے او آئی سی کی اثر پذیری پر ان کی رائے ہے کہ سوائے اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کے''او آئی سی میں کچھ بھی ٹھوس نہیں ہے، باقی سب بکواس ہے، (صفحہ 282) 26رجولائی 2002 کے 'فرائڈے ٹائمز' میں خالد احمد کے مضمون کو بھی دیکھیے۔

24- پسکیٹوری، جیمس۔ 'ریلجن اینڈ رینل پولیٹک: اسلامک ریسپونسز ٹو دی گلف وار'۔ جے پسکیٹوری (ایڈیٹ) کی کتاب 'اسلامک فنڈامینٹلزم اینڈ دی گلف کرائسز' (یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ایسوئس، 1991) صفحات 27-1 میں دیکھیے- یہ مقالہ بحران کی ابتدا میں مذہب کی جانب عراق کے رجحان کا تجزیہ کرتا ہے اور دوسرے مسلم ممالک میں علما اور سڑک کے آدمی کے ردِّعمل پر روشنی ڈالتا ہے اور اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ 'اس سے اس اسلامی علامتوں کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے جو مسلمانوں کی سیاست میں اس کو حاصل ہے'۔

25- بُل، ہڈ لے، سابقہ حوالہ، صفحہ 67

26- 25رنومبر 1981 کا A/RES/36/55 اور 18ردسمبر 1992 کا A/RES/ 47/135

27- جس طرح سے اقتدار اعلیٰ کے تصور میں تبدیلی آتی ہے اسی طرح سے دخل اندازی کے نظریات اور تعریف بھی بدلتی ہے۔ ہیڈلے بل نے 1984 میں اعتراف کیا کہ 'ہم نے غیر دخل اندازی کا قانون اس لیے بنایا کیونکہ یک طرفہ دخل اندازی سے خودمختار ریاستوں کے معاشرہ کی ہم آہنگی اور سکون درہم برہم ہوسکتا ہے... لیکن اگر کسی دخل اندازی کا مطالبہ ریاستوں کا معاشرہ خود کرے تو

ایسی صورت میں بغیر معاشرہ کی ہم آہنگی کو برباد کیے یہ عمل اختیار کیا جا سکتا ہے'۔ انٹروِنشن ان ورلڈ پولیٹکس (کلینڈورن پریس، آکسفورڈ 1984) صفحہ 195، اس موضوع پر سرد جنگ کے بعد ہونے والے مباحثے لارا ڈبلیو ریڈ اور کارل کیسن (ایڈٹ) 'ایمرجنگ نارمز آف جسٹیفائیڈ انٹروِنشن'، (امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنسز، کیمبرج، میساچوسٹس 1993) اور جین ایم لیونز اور مائیکل ماسٹنسڈونو (ایڈٹ) کی کتاب 'بیونڈ ویسٹفیلیا: اسٹیٹ ساورنٹی اینڈ انٹرنیشنل انٹروِنشن' (جانس ہوپکنس یونیورسٹی پریس، بالٹیمور، میری لینڈ 1995) کو بھی ملاحظہ کریں۔ 1995 میں رچرڈ ہاس نے اپنی انٹروِنشن کے موضوع پر 1994 کی کتاب میں ایک فیصلہ کن رائے دی کہ ''فوجی دخل اندازی سرد جنگ کے بعد امریکن خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی تعلقات کا ایک مستقل حصہ بنا ہوا ہے''۔

28۔ میتھیوز، جیسکا ٹج مین۔ 'دی ڈیفائننگ سیکورٹی' فارن افیرز (اسپرنگ 1989-68:2) صفحات 162-67

29۔ ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ 2000 (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی) صفحہ 2

30۔ ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ 2000 (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی) صفحہ VI

31۔ ہیلڈ، ڈیوڈ-'ڈیموکریسی، دی نیشن اسٹیٹ اینڈ دی گلوبل سسٹم'۔ ڈیوڈ ہیلڈ (ایڈٹ) کی کتاب پولیٹکل تھیوری ٹوڈے (اسٹینفورڈ یونیورسٹی پریس، اسٹینفورڈ، کیلی فورنیا 1991) صفحہ 234

32۔ قرآن میں اس ہدایت پر کافی زور دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 2:256 'دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے' اور 10:99 'کیا تم دنیا کو اس کی مرضی کے خلاف ایمان لانے پر مجبور کرو گے؟'

33۔ بوتھ کین 'ہیومن رائٹس اینڈ انٹرنیشنل ریلشنز'-'انٹرنیشنل افیئر (1995، 71:1) صفحات 103-6

34۔ الغنوشی، رشید 'سیکولرزم ان دی عرب مغرب' - عزام تمیمی اور جان اسپوسیٹو کی حوالہ

سابق، صفحات 23-122

35۔ محمد شعبان ایچ -'دی رول آف اسلام ان انڈونیشین پولیٹکس' (اجنتا پبلی کیشنز، نئی دہلی 1999) صفحہ 193، دسمبر 1994 میں این یو پارٹی کی کانگریس میں وحید نے زور دیا کہ 'حکومت کی طاقت کسی خاص مذہب کی حمایت یا مخالفت میں استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ اسلام، (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک 2002) صفحات 41-139 بھی ملاحظہ کریں۔

36۔ 10 راپریل 2002 میں سیول میں تقریر، عبدالرحمٰن وحید، سابق صدر نہضۃ العلما

37۔ بل، ہڈلے، حوالہ سابق، صفحہ 308

عسکری اسلام

مورخ ایرا لاپیڈوس نے اسلامی معاشروں کی تاریخ کو 'مذہبی علامات کے دائرہ اور روزمرہ کی حقیقتوں کی دنیا کے درمیان ایک مکالمہ، اسلامی اقدار اور مسلمانوں کے تاریخی تجربہ جس نے کئی مشکل مگر باہم مربوط مسلم سماجوں کی تشکیل کی ہے، کے تعامل کی تاریخ کہا ہے'۔ اپنی اس یادگار اور قابل ذکر تحریر میں وہ ان سماجوں پر یورپین دخل اندازی کے اثر کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 'ہر معاملہ میں یوروپی اثر مختلف تھا۔ اس نے اداروں کے توازن اور توانائی کو بکھیر دیا۔ ایسے طاقتور گروہوں کو آگے کیا جنھوں نے نئی صورت حال اور تناؤ کا مختلف مقامات میں مختلف طریقوں سے سامنا کیا۔ اس وسیع ترعمل میں ممتاز طبقوں کی جدیدیت اور عبقریت نے علما کی اصلاح پسندی سے سبقت لے جانے کی کوشش کی اور نتیجہ کے طور پر اپنے سماجوں کی تعمیر نو کے متبادل تصورات کی تخلیق کی جن میں سے ہر ایک دین اور ریاست سے جڑے ہوئے گزشتہ معنوں اور مطالب سے الگ تھا' (1)۔

لہٰذا ان سماجوں کی قریبی تاریخ، خصوصاً عرب مسلم سماجوں کی تاریخ، فکری عمل میں ذہنی اور معاشرتی ارتقا کا احاطہ کرتے ہوئے جس کا تعلق جدید ریاستوں کے کردار اور کارکردگی سے ہے جو ان ریاستوں میں خاص طور سے بیسویں صدی میں ابھرے، ایک اہم

عنصر بن جاتی ہے۔ اس حوالہ سے داخلی اور خارجی محاذوں پہ عرب ریاست کی ناکام کارکردگی نے سوچ کی دھارا کو عرب نیشنلزم سے دور دھکیل کر، اسلامی روایت کی نئی ترجمانی کی جو بجائے خود انقلابی معنی کی حامل تھی۔ (2) یہ ان لوگوں کی برتری کی جانب اشارہ تھا جن کو بعد میں بنیاد پرست کے نام سے جانا گیا۔ یہ عمل مصر میں حسن البناء سے شروع ہوا اور اس میں دوسرے مصری مفکرین جیسے عبدالقادر عودہ، سید قطب، محمد الغزالی اور یوسف القرضاوی نے ان کا ساتھ دیا۔ عرب دنیا میں شام کے مصطفیٰ علی السباعی اور سعید حواء سوڈان کے حسن ترابی اور تیونس کے رشید الغنوشی نے بھی اس رجحان میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ برصغیر میں اس رجحان کے فکری پیش رو ہندوستان میں ابوالحسن علی ندوی اور پاکستان میں ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ ایران میں علی شریعتی اور خمینی نے ان نبضوں پر ہاتھ رکھا جس کے سبب 1979 میں اسلامی جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ ان میں سے ہر معاملہ میں متعلقہ مفکرین نے ایک متبادل سیاسی نظام جو شریعت کے نفاذ کو ممکن بنا سکے کی حمایت اور اجرا کے لیے اسلامی تاریخ کے اوراق کو کھنگالا اور خالص اسلامی شناختوں کا انتخاب کیا: ہر معاملہ میں یہ انتخاب ایک 'سیاسی عمل' تھا(3)۔

اس موضوع پر بحث کے دوران اصطلاحات کا ایک چیستاں بھی بن گیا۔ اسلامی دنیا کے مشاہدین نے اس عنصر کو بیان کرنے کے لیے اسلامی اضطراب، اسلامی تجدید، اسلامی بنیاد پرستی، اسلامزم، سیاسی اسلام اسلامی سرگرمی اور جنگجو اسلام جیسی اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ جان ایسپوسیٹو نے 1992 کی ایک تحریر میں 'اسلامی تجدید اور اسلامی سرگرمی' کو ترجیح دی ہے(4) اولیور رائے نے اسلامزم اور سیاسی اسلام کو ایک ہی معنوں میں استعمال کیا ہے(5) دوسروں بشمول لارا گازون نے اسلامزم کو ترجیح دی ہے(6) یوسف شوری نے اسلامی بنیاد پرستی کو مبہم اصطلاح قرار دیا ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تجدید، انیسویں اور بیسویں صدی کی اصلاح پسندی اور گزشتہ پانچ دہائیوں کی انقلابیت کا احاطہ کرتی ہے(7) دوسری جانب معاشرتی علوم کے مصری ماہر سعدالدین ابراہیم نمایاں طور سے اسلامی سرگرمی کو ترجیح دیتے ہیں اور جس کی تعریف وہ ایک مشترکہ سماجی سیاسی عمل جس کا ہدف اس صورت حال کو

بدلنا اور اس جانب لے جانا ہے جس کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ وہ صحیح اسلامی نظام ہے(8) ہم عصر اسلامی مصنفین اپنے کو 'اسلامیون' سے تعبیر کرتے ہیں اور سیاسی اسلام کی اصطلاح کو مسترد کرتے ہیں۔ اس اصطلاح کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ ''دشمنان اسلام کی سازش کا حصہ ہے تاکہ اسلام کو مسخ اور تقسیم کیا جاسکے''۔(9)

اسلامی تجدید، اصلاح پسندی یا بیداری کسی خلا میں پیدا نہیں ہوئی اس پر تاریخ کے نقش و نگار ثبت ہیں۔ یہ تاریخ، کم سے کم اٹھارویں صدی سے آگے افریقہ اور ایشیا کے مسلم سماجوں کی یوروپی استعمار سے باہمی تال میل کی داستان ہے۔ کانٹ ویل اسمتھ نے اس سرایت کرنے والے اثر کو موزوں الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''جدید اسلام کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں کوئی اونچ نیچ ہے اور نئے زمانے کے مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس تاریخ کو از سرِ نو کیسے ترتیب دیا جائے اور مکمل تاب و توانائی کے ساتھ پیش کیا جاسکے تاکہ اسلامی معاشرہ ایک بار پھر ترقی کی راہ پر اسی طرز کے ساتھ گامزن ہو جو ایک خدائی ہدایت یافتہ معاشرہ کا اخلاقی اور لازمی خاصہ ہے۔ اس صدی کی ابتدا اس شعور کے ساتھ ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ مذہب، اور جس دنیا پر اس کا حکم چلتا ہے کے درمیان کچھ نہ کچھ بے ترتیبی ہے''۔(10)

عرب دنیا میں اس روحانی بحران کی تجدید غیر معمولی شدت کے ساتھ 1967 کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد ہوئی۔ اس جنگ میں عربوں کی شکست نے یہ واضح کردیا کہ بظاہر سخت نظر آنے والی عرب ریاست حقیقت میں مضبوط نہیں ہے۔ اس شکست نے عرب قومیت اور پان عربزم کے چہیتے اور لاڈ و پیار کے پروردہ تصورات پر کاری ضرب لگائی ''1967 کی شکست نے یہ کیا کہ ایک واضح اور شدید دباؤ کے لمحہ میں محاسبہ کو عائد کیا!''(11) اس محاسبہ نے اپنے اندر جھانکنے کی ترغیب دی۔ اس سلسلہ میں شام میں بائیں

بازو کے دانشور صادق العزم اور علی احمد سعید 'عدونس' نے پہل کی اور انھوں نے عرب شناخت کی بنیادوں پر سوال اٹھائے۔ لیکن عوام کو تسکین قلب کا سامان بہرحال مذہب ہی میں ملا۔ مصر میں جمال عبدالناصر کی ستم رسیدہ اخوان المسلمین کو نئی زندگی ملی اور حسن البناء اور سیدقطب کی تحریروں کے قارئین کا حلقہ اچانک وسیع تر ہوگیا۔ 1974 کے آتے آتے اسلامی تنوع میں اوسط درجہ کے تنازعات نے ریاست کے خلاف تشدد کے لیے راہ ہموار کردی اور یہ مسلسل جاری ہے اگرچہ شدت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ کیونکہ عرب دنیا میں مصر کو ثقافتی اور دانشورانہ مرکزیت حاصل تھی لہٰذا یہاں کی فکر اور عمل کو دیگر مقامات پر بھی دوہرایا گیا۔

اسلامی فوجی مزاج کی تعریف ''اسلام کے دیگر ماننے والوں اور ریاست کے خلاف منظم طریقہ سے تشدد سلوک'' کے الفاظ میں کی گئی ہے۔(12) اس کام کے کرنے والے افراد یا گروپ عام طور سے انتہاپسند مسلمان (ریڈیکل اسلامسٹ) کہے جاتے ہیں۔ یہ گروپ کیا ہیں اور وہ کون افراد ہیں جو اس کے ترکیبی عناصر میں شامل ہیں؟ ان کی سماجی اصل کیا ہے؟ ان کا عسکری تصور کیا ہے اور روایتی یا معتدل بنیاد پرست اسلام سے اس کو کیسے ممیّز کیا جاسکتا ہے؟ ان سوالات کے جواب اور ہر گروپ کے انفرادی مطالعہ اور ان کے اپنائے ہوئے اصولوں کے تجزیہ کے لیے ہمیں معروف ہم عصر مسلمان مصنفین کی تحریروں کو دیکھنا ہوگا۔

جدید اسلامسٹس کی مربوط و واضح داستان حسن البناء (م:1949) سے شروع ہوتی ہے جنھوں نے 1928 میں اخوان المسلمین کی بنیاد ڈالی اور اپنے مشن کی حدود، مقاصد اور طریقۂ کار کی وضاحت کی۔ انھوں نے مذہب اور مذہبی تنظیموں کے درمیان حد فاصل کھینچی اور مؤخر الذکر کی اس کے سست اور بے عمل رجحان کی وجہ سے مذمت کی، ایک عبادت گاہ، درس گاہ، روحانی، ذہنی اور جسمانی مریضوں کے لیے دارالشفا کی حیثیت سے مسجد کی مرکزیت پر زور دیا۔ انھوں نے پانچ دفعات میں تحریک کا خاکہ پیش کیا: 'اللہ ہمارا خدا ہے، رسول ہمارا نمونہ ہے، قرآن ہمارا دستور ہے، جہاد ہمارا طریقہ ہے اور اللہ کی راہ میں شہادت ہمارا وسیلہ

ہے۔ ان کا خلاصہ پانچ الفاظ میں کیا جا سکتا ہے: اعتدال، تلاوت (قرآن و حدیث کی)، نماز، فوجی استعداد اور اخلاق۔(14) تحریک کے مقاصد میں اسلامی ممالک کو اجنبی اقتدار سے آزادی اور ایک ایسی آزاد اسلامی مملکت کا قیام جو نظام تعلیم کی اصلاح، غریبی، جہالت، بیماری اور جرائم کے خلاف جنگ کرے گی اور مضبوط ایمان، حتمی تنظیم اور متواتر عمل کے ذریعہ ایک مثالی معاشرہ قائم کرے گی(15)۔ البنا نے چھ میں سے آخری باب کو جہاد کے لیے وقف کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے شدت اور وضاحت کے ساتھ جہاد کو ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ قرار دیا جس کو نہ ٹالا جا سکتا ہے اور نہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس کو قرآن میں اسی طرز پر بیان کیا گیا ہے جیسا کہ روزہ کو فرض قرار دیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر جہاد کو چھوڑنا یا نظرانداز کرنا سات گناہ کبیرہ میں سے ایک ہے(16)۔ یہ بات بھی روشنی میں لائی گئی کہ بہتر اخلاق کا حامل ہونا، جابر حکمراں کے سامنے حق بات کہنا بھی جہاد کا حصہ ہے لیکن ان پہلوؤں کا عامل اس وقت تک اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یا اعلیٰ شہادت کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں مارے یا مرجائے(17)۔

البنا کے نظریاتی عالمانہ خطبات اور تحریروں، جو جنگ سے متاثرہ مدت میں مصر کے حوالے سے مذہب، تاریخ اور سیاسی تنظیم پر مبنی تھے، نے اسلامزم اور مغرب کے درمیان صورت حال کی بحالی کے لیے کوئی جگہ نہ چھوڑی لیکن بعد میں آنے والے اسلامی مفکرین اور تحریکوں کے قائدین پر انمٹ نقوش قائم کیے۔ سید قطب نے ان کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا تھا اور 'عصری اسلامی فکر اور تنظیم کی بنیادوں میں اکثر ان ہی کی وضاحتیں اور خیالات پائے جاتے ہیں(18)۔

سید قطب (م: 1965) کی ذاتی فکری نشوونما نے جمال عبدالناصر کے سیاسی جور و ستم کے سبب ایک آزادانہ خیالی سے ہٹ کر انتہاپسندی کی شکل اختیار کرلی۔ یہ فکر میدانِ حشر کے منظرنامہ سے شروع ہوتی ہے 'استعماری مغرب اور اشتراکی مشرق میں اقدار کے فقدان کی وجہ سے اس وقت انسانیت ایک چکنی چٹان کی کگار پر کھڑی ہے۔ لہٰذا 'ایک نئی قیادت، کی ضرورت ہے جو یوروپ کے تخلیقی طباعی کے مادی ثمرات کو محفوظ رکھے اور آگے

بڑھائے۔ اسلام وہ واحد نظام ہے جو مطلوبہ اقدار کا حامل ہے۔ لیکن اسلام اس وقت تک یہ کردار ادا نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ سماج بلکہ قوم میں ایک ٹھوس شکل نہ اختیار کرے۔ کیونکہ اس دور میں انسان کسی فکر یا نظریہ پر اس وقت تک کان نہیں دھرتا جب تک کہ وہ ایک زندہ سماج میں مادّی طور سے آشکارا نہ ہو۔ اسی لیے دنیا کی قیادت سنبھالنے کے لیے اسلام کی تجدید کی ضرورت ہے اور یہ ایک نئے یقین اور نظام زندگی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جو ایک جانب جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے فوائد کا تحفظ کرے اور دوسری جانب بنیادی انسانی ضرورتوں کو بہتری کی اسی سطح پر پورا کرے جیسا کہ ٹیکنالوجی نے مادّی آسائش کے میدان میں پورا کیا ہے(19)۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں کچھ مسلم ممالک میں اسلامی تجدید کی تحریک شروع کرنا ہوگی۔ اس کے لیے قائدین کے ایسے گروپ کی ضرورت ہوگی جو منزل کی طرف لے جانے والے راستہ کے تمام سنگ میل اور نشیب و فراز سے واقف ہوں(20)، اس عمل میں قومیت، عربزم کے ساتھ ساتھ ایسے تمام جدید نظریات کو مسترد کردیا جائے گا جو زمین، نسل اور طاقت پر مبنی ہوں: 'مسلمان کی شہریت وہ نہیں ہے جس کو حکومت طے کرے' بلکہ 'مسلمان کا وطن وہی ہے جہاں اسلامی عقیدہ، اسلامی نظام زندگی اور اللہ کی شریعت غالب ہو'(21)۔ یہ برتری محض تبلیغ سے حاصل نہ ہوگی کیونکہ جنھوں نے خدائی اقتدار کو غصب کیا ہے وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں ہیں لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ 'اس تحریک' کا استعمال 'مادی رکاوٹوں کو ہٹانے' کے لیے کیا جائے خصوصاً اس سیاسی طاقت کے لیے جو نظریاتی، نسلی، طبقاتی، سماجی اور معاشی حمایت سے منسلک ہو' صرف اسی وقت زمین پر انسان کو آزادی حاصل ہوسکتی ہے(22)، سید قطب وضاحت کرتے ہیں کہ اسلام کا مقصد اپنے عقیدہ کو لوگوں پر زبردستی تھوپنا نہیں ہے لیکن اسلام محض ایک عقیدہ نہیں بلکہ نظام حیات ہے لہٰذا اسلامی تحریک کے نفاذ کے راستے میں تبلیغ کے لیے راستہ صاف کرنے کی غرض سے جہاد بالسیف ضروری ہے (23) اور یہ جہاد ایک دفاعی انداز تک محدود نہ ہوگا کیونکہ ایک اسلامی کمیونٹی کو یہ 'خدائی حق' حاصل ہے کہ وہ آگے بڑھ کر سیاسی اقتدار پر قابض ہوجائے (24)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سید قطب کو یہ دعویٰ ہے کہ ان کی اسلام فہمی ہندوستانی عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مرہونِ منت ہے جن کی ایک کتاب کا پیش لفظ سید قطب نے تحریر کیا تھا۔ انھوں نے کتاب کے متعلق لکھا کہ یہ اس بات کی روشن مثال ہے کہ 'تاریخ کو کیسے ضبطِ تحریر میں لایا جائے اور کس طرح ایک وسیع تر اسلامی نکتہ نظر سے اس کی ترجمانی کی جائے'۔ اس تجزیہ سے سید قطب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایک عقیدہ کی حیثیت سے اسلام قیادت کے لیے ابھارتا ہے جس کا اصل امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اس کے اوپر ذمہ داری عائد ہو، وہ زندگی کے کاروان کا رہنما ہے اور بھیڑ کے ساتھ چلنے والا نہیں ہے'(25)۔

اس طرح سے سید قطب نے ایک ایسے انقلاب کے تصور کی توسیع کی جس نے موجودہ تمام سماجوں کو جاہلی قرار دیا (جاہلی اس اعتبار سے کہ ان کے پاس خدا کے ایک ہونے کا یعنی توحید کا تصور نہیں تھا) اور ان کو بدلنے کے لیے جہاد کو لازمی قرار دے دیا۔ اس عمل میں تمام روایتی علما اور روایتی فقہ کو خارج کر دیا گیا اور ان کے ساتھ ساتھ تاریخ اسلامی میں ہمیشہ رہنے والے وہ دبے ہوئے نظریات جنھوں نے طوائف الملوکی اور مزاج کے خوف سے آمریت کو ترجیح دی اور جنھوں نے نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے عمل کی حمایت کی۔ لیکن سید قطب کی شروع کی ہوئی انقلابی سرگرمیاں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے قبل تیرھویں اور چودھویں صدی کے ایک عالم اور مفکر ابن تیمیہ نے بھی ناجائز اقتدار کی مزاحمت کی تلقین کی تھی۔

اگر چہ حسن البناء اور سید قطب کے افکار و خیالات تمام عرب دنیا اور عالم اسلام میں پہنچ گئے تھے لیکن اگر چھ دن کی جنگ، میں عربوں کو شکست نہ ہوئی ہوتی اور ایک ذہنی اضطراب اور روحانی اذیت سے مسلمان دو چار نہ ہوئے ہوتے تو یہ افکار و نظریات عالموں اور دانشوروں کے حلقہ تک محدود رہ جاتے۔ ایک عام خیال یہ پیدا ہوا کہ 'عربوں نے خدا کو چھوڑ دیا لہٰذا خدا نے بھی ان کو چھوڑ دیا'۔ یہاں تک کہ شکست کے صرف دو ماہ بعد حکومتِ مصر نے مسلح افواج میں جہاد کے معنی و مفہوم کے بارے میں پمفلٹ تقسیم کیے (26) حکومت کے اعلانات بھی دینی اصطلاحات سے مرصع ہونے لگے۔ اختیار شدہ جدیدیت سے

یہ انحراف حالانکہ عارضی اور تکنیکی تھا، لیکن پھر بھی عوام کی تالیف قلب میں ناکام ثابت ہوا اور اس کے دوررس نتائج مرتب ہوئے۔

اسلامسٹس کے اندر فوجی گروہوں کا ظہور اور ان کی تکنیک اور حکمت عملی کا طرز اور انداز یکساں نہیں تھا۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ اس عمل کو ملکوں (اور گروپوں) کے اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے لیے مسلم سوسائٹیز کے ایک منتخب گروپ جس میں عرب اور غیر عرب دونوں شامل ہوں، کی پچھلی تین دہائیوں کی سرگرمیوں کا تجزیہ کیا جائے۔ مصر، الجزائر، ایران اور انڈونیشیا وسیع تر پیمانے پر ان مختلف رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مصر: مصر میں واقف کار علما نے اسلامی تجدید کو تہہ در تہہ اور چار سطحوں پر ہونے والے عمل میں شناخت کیا ہے۔ (i) عوام کے اندر بڑھتی ہوئی مذہبیت (ii) مسجد کے مبلغین کی سماج اور سیاست پر بڑھتی ہوئی نکتہ چینی (iii) عام دھارا کی احیاءِ اسلامی کی تحریکوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں (یعنی اخوان المسلمین) اور اسلامی اداروں کی بتدریج تعمیر اور (iv) جماعت سے الگ ہوئے نئے انتہا پسندوں کی ٹولیاں جو اپنے نظریات میں زیادہ متشدد تھے کی سرگرمیاں اور جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مکمل معاشرتی نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ان میں سب سے نمایاں التکفیر والہجرۃ (برادری سے خارج اور ہجرت) الناجون من النار (آگ سے بچنے والوں کی تنظیم) اور الجہاد کی تنظیمیں تھیں۔ یہ سب تشدد کی کارروائیوں بشمول قتل میں سرگرم تھے۔ مصر کی حکومت ان کے ساتھ سختی سے پیش آئی۔ لیکن کبھی کبھی مصر کے سیاسی منظرنامہ کے باعث بائیں بازو کے عناصر کے خلاف سیاسی مفادات کے حصول کی خاطر حاکموں نے ان کے اراکین اور ٹھکانوں کا استعمال بھی کیا(27)۔ معاشرتی علوم کے ماہروں نے ان گروہوں کی ساخت کا تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے بانی قائدین میں کئی عناصر مشترک تھے جیسے عمر، جدید سائنسی تعلیم، اخوان المسلمین کی سابقہ رکنیت، جیل کا تجربہ اور خفیہ تنظیموں کی جانب فطری میلان۔ ان کے اندر کشش کی کثرت تھی اور یہ بہت اچھے مقرر تھے۔ مثالی کردار کے حامل تھے اور قومی اور بین الاقوامی مسائل کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان گروہوں کے اراکین عام طور سے چھوٹے شہروں اور قصبوں کے نوجوان (بیس سال

سے کچھ ہی اوپر)، نچلے متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے، بہترین حصولیابیوں اور مقاصد کے حامل، آگے کی راہ پر متحرک، سائنسی یا انجینئرنگ تعلیم سے آراستہ اور باہمی مربوط خاندان کے افراد تھے (28)۔ یہ پہلے کے دور میں انقلابی بائیں بازو کی تحریکوں میں شامل ہونے والوں سے گہری مماثلت رکھتے تھے۔

مصری کوائف کے تازہ ترین مشاہدین کا خیال ہے کہ دو دہائیوں کی مسلح مزاحمت کی جگہ نئے عناصر نے لے لی ہے جس میں ریاست کے مرکزی ستون جیسے کہ یونیورسٹیز، پروفیشنل یونینز یا سنڈیکیٹ، الازہر کے علما اور عدالتیں مذہبی احیا کی جڑوں میں مرکزی کردار ادا کررہے ہیں جو کہ مستند ہے اور مغرب کے لیے روبہ زوال فوجی تحریکوں سے بڑا خطرہ ہے(29)۔

الجزائر: الجزائر میں اسلامی تحریکوں کی ابتدا فرانسیسی حکومت کے خلاف اسوسیشن آف الجیرین علما کی تحریکوں سے وابستہ ہے جس کی بنا پر عبدالحمید ابن بدلیس نے 1931 میں ڈالی تھی۔ اس اسوسیشن کا نعرہ تھا کہ 'اسلام میرا دین ہے، عربی میری زبان ہے اور الجزائر میرا وطن ہے'۔ آزادی کی جدوجہد کے انقلابی دور میں جنگی نعرہ 'مسلم الجزائر' تھا نہ کہ عرب الجزائر۔ خود جدوجہد آزادی کو جہاد قرار دیا گیا تھا اور انقلاب کے قائدین نے خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیکولر، اسلام کو فائدہ مند، کارگر ہتھیار کی طرح استعمال کیا۔ اسی تصور کو آزادی کے بعد بھی باقی رکھا گیا۔ ایف ایل این کی ایک پارٹی حکومت جس کو مکمل اقتدار حاصل تھا، نے ایک طرف تو اسلامیت اور عربیت کی متضاد ذمہ داریوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری جانب معاشرتی خطوط پر فروغ اور مغرب سے متاثر گروہ دانشوران سے بھی مطابقت کی کوشش کی۔ یہ کوشش ناکام ہوگئی اور معاشی محاذ پر الجزائری حکومت کی ناکامی نے اس کو دو چند کردیا۔ ان ابتدائی تنازعات نے 70 کی دہائی کے آخر میں فرانکوفون (فرانسیسی بولنے والے) اور عربوفون (عربی بولنے والے) طلبا کے درمیان ثقافتی تصادم کی شکل اختیار کرلی۔ 80 کی دہائی کے شروع میں عوام کے درمیان اسلام کا کافی فروغ ہوا۔ مصری اسلامزم کا اثر کافی گہرا تھا اور اسی طرح چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے طریقہ تسمیہ میں بھی یہ رنگ

بہت نمایاں اور واضح تھا جیسے کہ الجہاد، التکفیر والہجرہ، الدعوۃ والتبلیغ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک حسن البناء اور سید قطب سے وابستگی کا دعویٰ کرتا تھا۔ آخر کار 1989 میں الجزائری اسلامی قائدین عباسی مدنی اور علی بیلحاج نے ساتھ مل کر اسلامک سالویشن فرنٹ (ایف آئی ایس) قائم کیا۔ یہ نئی تنظیم کافی حد تک غیر مربوط تھی۔ یہ تنظیم اس ہانڈی کی طرح تھی جس کے اجزاء ترکیبی یعنی مختلف جتھوں میں سوائے اسلام کے کوئی قدر مشترک نہ تھی یا ایک جذبہ کہ الجزائری موجودہ سیاسی صورت حال جو معاشی غیر مساوات اور جبر و استعداد پر قائم ہے کو ختم کیا جائے۔(30)

ایف آئی ایس کی یہ کوشش تھی کہ وہ خود کو اسلام کے دائرہ کے اندر نظریاتی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا عالمی اور عام حل کا متبادل بنائیں(31) اس نے کم انقلابی مزاج کی جماعتوں کے خلاف اپنے غیر روادارانہ عمل کا اظہار الجزائری حماس کے قائد کی موت کا فتویٰ جاری کر کے کیا۔ 1990 کے میونسپل الیکشن میں اپنی فتح کے بعد ایف آئی ایس نے عوام کے لیے ایک سخت ضابطہ اخلاق جاری کیا۔ اس نے صوفی علامتوں جیسے اولیا کے مزارات وغیرہ کی بھی مذمت کی۔ خارجی محاذ پر بھی اس کا انداز جارحانہ تھا اور عراق کویت جنگ میں اس نے عراق کی حمایت کی تھی۔ اس سے قبل ایف آئی ایس افغان مجاہدین کو تعاون دے چکی تھی۔ ایف آئی ایس کے لیے بحرانی دور اس وقت شروع ہوا جب 1992 میں نیشنل اسمبلی کے انتخابات کے پہلے راؤنڈ میں انھیں فتح حاصل ہوئی اور الجزائری فوج، ٹریڈ یونینز اور دیگر سیکولر طاقتوں نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ کسی بھی صورت میں انتخابات کا دوسرا راؤنڈ نہ ہونے دیں گے(32)۔ اس کام کے لیے زمین کئی ماہ پہلے تیار کی گئی تھی جب شمالی افریقہ کی حکومتوں کے نمائندے آپس میں ملے اور انھوں نے 'انقلابی اسلام' سے نبردآزما ہونے کے لیے ایک ٹاسک فورس قائم کی(33)۔ لہٰذا ریاست کے تحفظ اور استحکام کے نام پر فوج نے مداخلت کی۔ فوج کے اس سخت اقدام نے ایف آئی ایس کو ایک آئینی حزب مخالف کے بجائے بہت حد تک ایک انقلابی اور آمادہ پیکار جماعت بنا دیا(34)۔ جلد ہی ایف آئی ایس انتہاپسند اور معتدل جتھوں میں تقسیم ہوگئی۔ انتہاپسندوں میں خاصی تعداد میں

'افغان' بھی شامل ہو گئے (یہ وہ الجزائری تھے جو افغان مزاحمت کے دوران مجاہدین کے شانہ بشانہ لڑے تھے)۔ انھوں نے اپنا نام 'آرمڈ اسلامک گروپ' (جی آئی اے) رکھا اور الجزائری فوج کے مقابلہ میں ایک بے ضابطہ جنگ میں مصروف ہو گئے۔ یہ لڑائی اب بھی جاری ہے اگرچہ اس کی شدت میں کمی آ چکی ہے۔ اس نے الجزائری معاشرہ کے ہر طبقہ پر گہرے نقوش مرتب کیے ہیں۔

ایران: 1979 کے ایرانی انقلاب نے ٹراٹسکی کے اس قول کی صداقت ثابت کر دی کہ 'عوام معاشرہ کی منصوبہ بند تعمیرنو کے لیے انقلاب برپا نہیں کرتے بلکہ اس گہرے احساس کے ساتھ کہ وہ پرانے نظام کو اب برداشت نہیں کر سکتے' (35)۔ اس انقلاب نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا کیونکہ مخالفین کے پاس نعروں، پمفلٹ اور آڈیو کیسٹ کے علاوہ کوئی اور اسلحہ نہ تھا اس کے باوجود انھوں نے ایک ایسے حکمراں کو تخت سے اکھاڑ پھینکا جس کے پاس ناقابل تسخیر قوی اور بین الاقوامی وسائل تھے اور جب کہ ملک معاشی خوشحالی، جو اگرچہ یکطرفہ تھی، کے دور سے گزر رہا تھا۔ سوربون کے تربیت یافتہ اسلامسٹ علی شریعتی بھی ذہنی محرکات کے ذمہ دار تھے، شاہراہوں پر مظاہروں کے لیے افرادی قوت بائیں بازو کی جماعتوں اور ٹریڈ یونینوں نے مہیا کی۔ لیکن اصل میں اس کی روح رواں آیت اللہ خمینی کی شخصیت تھی جنھوں نے شیعہ اور مذہبی علما اور عملہ کے نیٹ ورک کو متحرک و فعّال بنایا۔ فرانسیسی انقلاب کی طرح ایرانی انقلاب بھی کئی مراحل سے گزرا۔ جس میں اوّلین انقلابیوں کے درمیان اقتدار پر تنازعہ، ایک دہشت و بربادی کا دور اور پھر عراق کے ساتھ ایک طویل انقلابی جنگ شامل ہیں۔ بہرحال اسلامی ریاست کے قیام کی ان کوششوں کا نتیجہ اقتدار کے مذہبی علما کے ہاتھوں میں چلے جانے کی صورت میں نکلا۔ جو خود کو عام عقیدے کے احکام سے بالاتر رکھنے کی کوشش میں تھے۔ خمینی نے 1988 میں کہا کہ حکومت 'جو رسول اللہ کی نیابت کا مستقل جز ہے اسلام کے بنیادی عناصر میں سے ایک ہے اور دوسری تمام ثانوی احکامات پر فوقیت رکھتی ہے یہاں تک کہ نماز، روزہ اور حج پر بھی' (36)۔ خمینی کی وفات کے بعد ایران ایک تھرمینڈورین دور سے گزرا جس نے جمہوریہ دوئم کو جنم دیا۔ اس زمانہ میں

انقلابی جوش کے دنوں سے انقلابی معقولیت کی طرف قدم اٹھے اور ایک نیا قانونی جواز یعنی دینی اور جمہوری جواز مئی 1997 کے الیکشن کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔ اس الیکشن میں محمد خاتمی کو اقتدار حاصل ہوا۔ خاتمی نے سول سوسائٹیز کو تازہ دم کرنے کا وعدہ کیا تھا(37)۔

ایرانی انقلاب اور اسلامی ریاست کے قیام نے دنیا بھر میں اسلامی تحریکوں کو نئی زندگی بخش دی (فرقہ بندی کی وسیع خلیج کے باوجود)۔لیکن اس کے باوجود عرب اور اسلامی دنیا میں یہ جوش جلد ٹھنڈا پڑ گیا سوائے جنوبی لبنان میں حزب اللہ فلسطین میں اسلامی جہاد اور جنگ میں گھرے ہوئے افغانستان کے کچھ گروہوں میں۔ فاتح اسلامزم کی اس زندہ مثال کی کچھ حدود بھی ہیں' 1979 کے بعد ریاست کا استحکام اور خمینی کے انتقال کے بعد اس کی بقا اس تجزیہ کے لیے کافی مواد مہیا کرتا ہے کہ سیاسی اور سماجی کنٹرول کی روشنی میں اسلامزم کا کیا عمل ہے، یہ اسلامی تحریکوں کی ایک بڑی خامی کو بھی واضح کرتا ہے یعنی کسی بھی معاشی پروگرام کی عدم موجودگی'۔(38)

انڈونیشیا: انڈونیشیا میں اسلامی تحریکیں ولندیزی حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کے وقت ابھریں۔ مسلم جماعتوں خصوصاً مسجوی اور محمدیہ کا آزادی کے بعد کے ابتدائی دور میں بہت گہرا اثر تھا اور 1955 کے الیکشن میں ان کو 44 فیصد ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ مسلمان جنگجو گروپ جنھوں نے آزادی سے قبل جدوجہد میں حصہ لیا تھا اور جو مسجوی سے ملحق تھے، ملک کے کچھ حصوں میں اپنی بالادستی برقرار رکھے رہے۔ ایسا ہی ایک گروپ حزب اللہ تھا جس نے مغربی جاوا کے علاقہ میں ایک اسلامی ریاست (دارالاسلام) کے انعقاد کا اعلان کیا اور 1962 تک برسرِعمل رہے(39) 66-1965 کی مدت میں حکومت نے بھی اسلامسٹ گروپوں کو انڈونیشین کیمونسٹ پارٹی کے خلاف استعمال کیا۔ سوہارتو کی صدارت کے ابتدائی ایام میں حکام نے پالیسی کے طور پر' اسلام کی دینی اور سیاسی سرگرمیوں میں امتیاز قائم رکھا۔ دینی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی لیکن ایک طاقتور سیاسی بنیاد کی تشکیل کی کوششوں پر قانونی پابندی عائد کردی،(40) لیکن یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا اور اکثر نے حکومت کے اس ثقافتی حل کو قبول نہیں کیا اور وہ البناء، سید قطب اور مودودی کی

تحریروں سے متاثر ہوکر سیاسی اسلام کے سایہ میں آگئے۔ ان لوگوں کا یقین تھا کہ 'اسلامی ریاست کے قیام کے مقصد کے حصول کے لیے قوت کا استعمال لازمی ہے اور ریاست و معاشرہ سے غیراسلامی عناصر کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اس کا استعمال جائز ہے۔ یہ اساس پرست عام طور سے جدید معاشرہ کے افراد تھے نہ کہ روایتی طبقہ سے اور یہ خود کو دارالاسلام کی شروع کی ہوئی جدوجہد کو جاری رکھنے والا اور مسجوی کا حصہ سمجھتے تھے'(41)۔ ان کی سرگرمیوں میں مختلف جگہوں پر تشدد کے اکادکا واقعات شامل تھے جو کسی منظم تحریک کی شکل اختیار نہ کرسکے۔

گزشتہ دو دہائیوں میں اگرچہ 'جنگجو اسلام' کی تعریف وترجمانی کرنے والے شہ سرخیوں میں رہے لیکن ان کو چیلنج بھی کیا گیا اور دینی و سیاسی زاویہ سے دانشوروں، سیاسی کارکنوں اور حکومتوں نے ان کی مخالفت کی۔ یہ تنقید دو جہتوں سے ظہور میں آئی اوّل تو آزادخیال جدید پسند اور دوسرے معتدل اسلامسٹز۔ اوّل الذکر گروپ کی کاوش ہے کہ عرب اسلامی ذہنیت کو کمزور کیا جائے تاکہ اس کے تاریخی کردار اور اسلامی فقہ کے ارتقا خصوصاً اسلامی ریاست کے تصور پر اس کے اثرات کونمایاں کیا جائے۔ دوسری طرف اسلامی اعتدال پسندوں کا خیال ہے کہ انتہا پسند قرآن کی فہم وترجمانی میں لغزش کا شکار ہوئے ہیں اور واضح کیا ہے کہ دینی امور میں انتہا پسندی اور غلو قرآنی ہدایت اُمۃ وسطاً (منصفانہ طور سے متوازن امت-2:143) کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس حدیث کی جانب بھی توجہ دلاتے ہیں جہاں آپ نے فرمایا ہے کہ 'دینی معاملات میں غلو سے بچو۔ تم سے پہلے کی امتیں اسی لیے ہلاک ہوگئیں کیونکہ وہ دین میں زیادتی کرتے تھے'۔(42) ایسی انتہاپسندی انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اس کی عمر مختصر ہوتی ہے اور یہ دیگر حقوق وفرائض کی ادائیگی میں مانع ہوتی ہے۔ اس سے تعصب، غیر رواداری اور شقیق القلبی کا جنم ہوتا ہے اور یہ سب قرآن اور سنت میں بہت واضح طور سے ممنوع ہیں (43) اس انتہا پسندی کا سبب دراصل دین کے بارے میں علم کی کمی اور اس کے مقصد، روح اور ماہیت سے بے بصیرتی ہے۔ علم کی کمی اور احکام دین کے بارے میں مخصوص سیاق وسباق سے بےخبری کے نتیجہ میں خودساختہ مفروضے

وجود میں آئے جو کہ ناپسندیدہ بدعات کی ابتدا کا سبب تھے اور جس سے امت میں ایک عام نااتفاقی اور فرقہ بندی کا چلن ہوگیا۔

جدید اسلامسٹ اور ملت کے علما کی خاص دھارا اصرار کرتے ہیں کہ عسکریت پسندوں کے اکثر بنیادی عقائد غلط فہمیوں پر قائم ہیں جو علامتی و تمثیلی قرآنی متن پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ غلط فہمیاں، کم علمی اور مطلق ایمان (ایمان مکمل) اور محدود ایمان (نام کا ایمان) کفرِ عظیم جو اسلام سے خارج کردے اور نافرمانی کا کفر، شرک جلی اور شرک خفی، ایمان میں منافقت اور عمل میں منافقت میں فرق کو سمجھنے کی نااہلی کے باعث پیدا ہوئیں (44) جہاں تک علامتی متن کا سوال ہے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ متشابہات پر اصرار اور محکمات سے نظر اندازی دینی امور میں غلط فہمیوں کا ایک بڑا سبب رہی ہے اور بلاشبہ یہ طرز قرآن کے الفاظ (3:7) کے متضاد ہے:

> ''وہی خدا ہے جس نے (اے محمد) تم پر یہ کتاب نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات۔ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''(45)

عسکریت پسندوں کی نظریاتی اور عملی کوتاہیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد اعتدال پسند اسلامسٹ ان عوامل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں جنھوں نے عسکری ذہنیت کے لیے راہ ہموار کی۔ اس صورت حال کے لیے وہ عرب حکومتوں اور ان کی جابرانہ پالیسیوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ ان کی رائے میں مسلمان نوجوانوں میں بیداری کی لہر حقیقی ہے۔ لہٰذا اس کو ناجائز طریقہ سے دبانے کے بجائے اس کی نکاسی بہتر راستوں سے کی جائے۔ ان کی یہ شکایت بجا ہے کہ مغربی ایشیا میں حکومتوں نے مذہبی نوجوانوں پر اس

وقت تک کوئی توجہ نہیں جب تک کہ وہ مذہب کی بنیادوں پر اپنی حکومتوں کی کچھ پالیسیوں کی مخالفت نہ کرنے لگے۔

ایک ممتاز دانشور کا مشاہدہ ہے کہ اگر ہمیں عالم اسلام میں ہونے والی کارروائیوں کو تھوڑا سا بھی سمجھنا ہے تو دو نکتوں کو گرفت میں لینے کی ضرورت ہے۔ اوّل تو مسلمانوں کی آفاقیت کا ایک جز کی طرح ہونا اور دوسرے اس کی مرکزیت (46)۔ چنانچہ اسلام عوام کے درمیان موافقت و ہم آہنگی اور جماعتی شناخت دونوں کی مؤثر اور کارگر شکل ہے۔(47)

اس باب میں عالم اسلام کے مختصر جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ماضی قریب میں اسلامی عسکریت کا عروج ایک جائز اور حقیقی آزردگی کا نتیجہ تھا جو اجنبیت، محرومی اور اعتبار کی تلاش سے ابھرا تھا۔ عسکریت پسندوں نے اس اعتبار کو اس مثالی اسلامی ریاست کے نمونہ میں تلاش کیا جس کا شاید کبھی وجود بھی نہ رہا ہو لیکن جو اسلامی سیاسی فکر کا ایک جز لاینفک ہے۔ دوسری جانب محرومی کا مسئلہ حقیقی اور وسیع ہے لیکن اس سے اس وقت تک نبرد آزما نہیں ہوا جا سکتا جب تک کہ ایک قابل عمل معاشی پروگرام یا اس کا متبادل کوئی ترقی کا نمونہ ساتھ میں نہ ہو اور جو کم سے کم اب تک انقلابی اسلامسٹ پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

فی الحال اکثر مسلم ممالک میں اسلامی عسکریت روبہ زوال ہے اور 11 ستمبر 2001 کے واقعات کے بعد اس کو کاری ضرب پہنچی ہے۔ عسکریت پسندوں کو احساس ہو چلا ہے کہ علاقائی اور مقامی سطح پر ان کی کارروائیوں کو علاقائی اور بین الاقوامی تعاون کے ذریعہ ناکام بنا دیا جائے گا۔ دلوں اور دماغوں کو جیتنے کے لیے جنگ کو یقین بخش طریقوں سے لڑنا ہوگا۔ اس کے لیے عرب (اور غیر عرب) مسلم سوسائٹیوں کے قریبی تجربہ کو شامل کرنا ہوگا جہاں فواد عجمی کے الفاظ میں ایک نسل میں تعمیر کی گئی سیکولر نیشنلزم اور جدیدیت کی دانشورانہ عمارت ڈھے چکی ہے اور جس میں سیکولر والدین اور اصولی اولاد کے درمیان ایک نسل کا فاصلہ واضح طور سے قابل شناخت ہے۔(48)

عسکری اسلام کے نمونہ کی ناکامی کے باوجود معاشرہ کے واضح اسلامی تعمیر نو کے لیے کیا راستے کھلے ہوئے ہیں۔

- برائے نام موافقت کے ساتھ، موجودہ حکومتوں کے نظام کے ساتھ چلا جائے اور اس موافقت و ہم آہنگی کو کس حد تک وسعت دی جاسکتی ہے؟ کیا موجودہ حکومتیں خود حفاظتی کی خاطر لائن نہیں کھینچیں گی؟ اور کیا موجودہ صورت حال دوبارہ پیدا نہیں ہوگی اگر اس لائن کو چھوا جائے گا؟
- ہوسکتا ہے کہ ریاستیں یکطرفہ طور پر مشترکہ حکومت کے حق میں فیصلہ کرلیں اور معتدل اسلامسٹ عناصر کو حکومت میں شریک کرکے ان کو (اردن کے نمونہ پر) انتخابی سیاست کا سامنا کرنے کے لیے چھوڑ دیں جہاں زمام کار عقیدہ و یقین کے بجائے عملی تطبیق اور موافقت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اعتدال پسند اسلامسٹ اب یہ بات مانتے ہیں کہ 'حکمرانوں کی امنگوں اور خواہشوں پر لگام کسنے کے لیے جو سیاسی اصول اسلام نے اس زمین پر وضع کیے ہیں، جمہوریت کے تخلیق شدہ وسائل اور ضمانتیں سب سے زیادہ قریب ہیں'۔(49)
- غیرمسلم اکثریتی سماجوں میں رہنے والے مسلمانوں کو بھی اب سیکولرزم کے فوائد کا احساس ہو چلا ہے اور اسلام اور سیکولرزم کے ایک دوسرے سے متصادم ہونے پر ان کے یہاں اب بحث ومباحثہ کم ہوتا ہے (50) کچھ عرصہ میں یہ رجحانات خود مسلم اکثریتی سماجوں میں سول سوسائٹیز کے معمولات کے فروغ بشمول سیکولرزم میں تعاون دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے اظہار کے اسلوب میں تبدیلی کی ضرورت شاید ان خطوط کے مطابق ہو جن کی جانب انڈونیشین اسلامسٹ لیڈر عبدالرحمان وحید نے اشارہ کیا ہے۔ ماضی قریب میں ایران کا تجربہ ان دشواریوں کو واضح کرتا ہے جو ایسی کسی بھی مہم میں درپیش آسکتی ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام اور جدیدیت کے تصادم میں سوال کا جواب خود مسلمانوں کو دینا ہوگا۔ وقت کی ضرورت توازن کو برقرار رکھنا ہے یہاں تک کہ انقلابی اسلامسٹ بھی چودھویں صدی کے عالم دین ابن تیمیہ کا یہ فتویٰ آسانی سے نظرانداز نہیں کرسکتے:

برائی کو برداشت کرنے کی صرف دوصورتیں ہیں: اگر وہ اپنے
سے بڑی برائی دور کرنے کی راہ دکھائے جو کہ کسی اور صورت
میں ممکن نہ ہو؛ اور اس سے کوئی ایسا فائدہ حاصل ہو جس کو نہ تو
چھوڑا جاسکتا ہو اور جس کے حصول کی کوئی اور صورت ممکن نہ
ہو۔ کوئی فائدہ یا سہولت صرف دوصورتوں میں چھوڑی جاسکتی
ہیں۔ اگر اس سے کسی برتر فائدہ کا فقدان ہوتا ہے یا اس کے
ساتھ کوئی ایسی برائی لگی ہے جو زیادہ بڑی ہے۔ اسی کا تعلق
مذہبی توازن سے ہے۔(51)

ان خیالات کو سماجی اور سیاسی عمل میں ڈھالنا ایک دلچسپ کام ہوگا لیکن تکلیف سے خالی نہ ہوگا۔ ابن تیمیہ اس کہاوت سے متفق ہیں کہ: 'عقلمند وہ نہیں ہے جو اچھے اور بُرے میں فرق کو واضح کردے بلکہ عقلمند وہ ہے جو دو اچھی چیزوں میں سے بہتر کی اور دو بُری چیزوں میں سے کمتر کی نشاندہی کرے۔

حواشی

1۔ لاپی ڈوس، ایرا ایم 'دی ہسٹری آف اسلامک سوسائٹیز (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، 1988) صفحات 83-882، 53-551، XX

2۔ ابوربیع، ابراہیم ایم، ۔'انٹلکچوئیل اوریجنز آف اسلامک ریسرجنس ان دی ماڈرن عرب ورلڈ' (سنی پریس، البانی، نیویارک، 1996) صفحہ 61

3۔ العزمیہ عزیز، اسلام اینڈ موڈرنیٹیز (ورسو، لندن 1993) صفحات 26، 24

4۔ ایسپوسٹو جان، ایل 'دی اسلامک تھریٹ: متھ اور رئیلٹی'؟۔ (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک، 1992) صفحہ 8

5۔ رائے اولیور، 'دی فیلیور آف پولیٹیکل اسلام' (ہارورڈ یونیورسٹی پریس، کیمبرج، میساچوسٹس 1994)' تقریباً ہر جگہ

6۔ گوازن، لارا۔'دی اسلامسٹ ڈلیما' (اتھاکا پریس، ریڈنگ 1995)، صفحہ 4

7۔ شوعیری، یوسف ایم۔'اسلامک فنڈامینٹلزم' (ٹوین، بوسٹن 1990)، صفحہ 9

8۔ ابراہیم، سعید الدین۔'ایجسٹ، اسلام اینڈ ڈیموکریسی' (دی امریکن یونیورسٹی ان کیرو پریس، قاہرہ 1996)، صفحہ 69

9۔ القرضاوی، یوسف۔'اسٹیٹ ان اسلام' (دارالمعارف، قاہرہ 1998) صفحہ 126
10۔ کانٹ ویل، اسمتھ ولفریڈ۔'اسلام ان موڈرن ہسٹری' (پرنسٹن یونیورسٹی پریس، پرنسٹن، نیوجرسی 1957) صفحات 48-47
11۔ عجمی، فواد۔'دی عرب پریڈیکمنٹ' (پینتھوین بکس، نیویارک 1981)، صفحہ 12
12۔ ابراہیم، سابقہ حوالہ صفحہ 5
13۔ ابورابع، سابقہ حوالہ صفحہ 64
14۔ البناء، حسن، 'سکس ٹریکٹس' (انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن، کویت، سن اشاعت غیر مندرج) صفحہ 31
15۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 66-63
16۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 19-217
17۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 61-260
18۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 36-234
19۔ قطب، سید۔ 'مائل اسٹونز' (انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹ آرگنائزیشنز کویت 1978) صفحات 14-7
20۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 17-16
21۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 36-234
22۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 6-105
23۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 10-109
24۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 139
25۔ ندوی، ابوالحسن علی 'اسلام اینڈ دی ورلڈ' (انگریزی ترجمہ، لکھنؤ 1967: یوکے اسلامک اکیڈمی نے 2005 میں دوبارہ شائع کیا) صفحہ 3، عرب مبصرین جیسے کہ ابورابع (حوالہ سابق، صفحہ 139) کا خیال ہے کہ سید قطب پر باہری اسلامسٹ جیسے کہ ندوی یا مودودی کے اثرات ثانوی درجہ کے تھے۔ لیکن احمد ایم موصلی نے

'موڈریٹ اینڈ ریڈیکل اسلامک فنڈامینٹلزم' (یونیورسٹی آف کیلی فورنیا پریس 1999) میں ایک محتاط موازنہ پیش کیا ہے۔

26۔ عجمی، سابقہ حوالہ، صفحہ 61

27۔ نصیح، ایوبی، پولیٹیکل اسلام، (ووٹلیج، لندن، 1991) صفحات 77-72

28۔ ابراہیم، سابقہ حوالہ، صفحات 19-15

29۔ عبدو، جنیوی، 'نو گوڈ بٹ گوڈ: ایجپٹ اینڈ دی ٹرمپھ آف اسلام (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک 2000) صفحات 11-10

30۔ جواجیہ، احمد۔ 'ڈسکورس اینڈ اسٹریٹجی آف دی الجیرین اسلامسٹ موومنٹ' (1992-1986)، ایل گوازون میں، سابقہ حوالہ صفحات 75-74

31۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحہ 81

32۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحہ 96

33۔ اسپوسیٹو جان ایل اینڈ وال جان او، 'اسلام اینڈ ڈیموکریسی' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک، 1996)، صفحہ 166

34۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحہ 167

35۔ ٹراٹسکی، لیون۔ 'دی ہسٹری آف دی رشین ریوولوشن (وکٹر گوالنش، لندن، 1932)، جلد 1، صفحہ 16

36۔ ہالی ڈے فریڈ کی کتاب 'اسلام اینڈ دی متھ آف کنفرنٹیشن' (آئی بی ٹارس، لندن 1996) میں پیش کیا گیا، صفحہ 69

37۔ عادل خان، فریدہ۔ 'بینگ موڈرن ان ایران' (ہرسٹ اینڈ کمپنی، لندن 1999)، صفحات X-IX

38۔ ہالی ڈے، حوالہ سابق، صفحہ 67

39۔ محمد، شعبان ایچ، 'اسلام ان انڈونیشین پالیٹکس (اجنتا بکس انٹرنیشنل، نئی دہلی 1999) صفحہ 93

40۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحہ 105

41۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحہ 20

42۔ القرضاوی، یوسف 'اسلامک اویکننگ بٹوین رجیکشن اینڈ ایکسٹریمزم' (انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، ہرنڈن، ورجینا، تیسرا ایڈیشن 1995) صفحات 22-21

43۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحات 46-33

44۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحہ 60

45۔ حوالہ مذکورہ بالا، صفحہ 67

46۔ لیوی، برنارڈ۔ 'اسلام اینڈ دی ویسٹ' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک 1993)، صفحہ 123

47۔ حوالہ مذکورہ بالا صفحہ 154

48۔ عجمی، فواد۔ 'دی ڈریم پلیس آف دی عربس' (وینٹیج بکس، نیویارک 1998) صفحات XI-XII

49۔ القرضاوی، یوسف، 'پریورٹیز آف دی اسلامک موومنٹ ان دی کمنگ فیز' (دارالنشر فار اسلامک یونیورسٹیز، قاہرہ 1992) صفحہ 209

50۔ غنوشی، الرشید، 'سیکولرزم ان دی عرب مغرب'، عزام تمیمی اور جان اسپوسٹو کی تدوین کردہ کتاب 'اسلام اینڈ دی سیکولرزم ان دی مڈل ایسٹ' (ہرسٹ اینڈ کمپنی، لندن 2000) صفحہ 123-97 میں شامل مقالہ۔ غنوشی تسلیم کرتے ہیں کہ 'ایک جمہوری سیکولر حکومت اس حکومت سے کم بری ہے جو آمرانہ نظام حکومت پر قائم ہو اور اسلامی ہونے کا دعویٰ کرتی ہو۔

51۔ القرضاوی، حوالہ سابق، صفحہ 277

یونائیٹڈ اسٹیٹس اور عالم اسلام

مسلم ذہن کی تشکیل میں جدوجہد

کئی سال پہلے ایک معروف دانشور نے کہا تھا کہ فلسفیانہ تحقیق میں منظم تجدید کا عمل یقینی طور سے شامل ہونا چاہئے تاکہ ان حقائق کی نوعیت کا اظہار ہو سکے جس میں فلسفہ ہی موضوع تحقیق ہو۔ میں اس کا تذکرہ اس لیے کررہا ہوں تاکہ مقالہ کے لیے دیے گئے موضوع میں پیش آنے والی تمہیدی دشواریوں کوشروع ہی میں حل کردیا جائے۔ ان دشواریوں کا تعلق ''مسلم ریاست'' کی اصطلاح اور ان کے زمروں جیسے روایتی، اعتدال پسند اور 'انقلابی' سے ہے۔ پہلا سوال 'مسلم دنیا' اور 'مسلم ریاستوں' کی اصطلاح ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں کیونکہ ہندوستان، چین اور دنیا کے مختلف براعظموں کے ممالک میں بسنے والی بڑی بڑی مسلمان آبادیاں پہلے زمرہ میں شامل ہیں (کم سے کم کچھ خاص مقاصد کے لیے) لیکن دوسرے کا حصہ نہیں ہے۔خود 'مسلم ریاستوں' کی اصطلاح بخوبی واضح نہیں کی گئی ہے۔ آرگنائزیشن آف دی اسلامک کانفرنس (او آئی سی)(1) دفعہ 2 میں 'رکنیت والی ریاستیں اور 'تمام مسلمان عوام' کا تذکرہ کرتی ہے، دفعہ 4 میں 'مسلم اقوام' اور 'مسلم دنیا' کے الفاظ استعمال کرتی ہے اور دفعہ 5 میں 'مسلم ریاست' کی اصطلاح (بغیر اس کی

تعریف بتائے) استعمال کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ او آئی سی نے بہت ہی لچکدار طریقۂ کار اپنایا ہے۔ اس کی رکنیت میں وہ ریاستیں شامل ہیں جہاں مسلم اکثریت ہے (بشمول ترکی جو سیکولرزم کی کٹر حامی ہے) اور وہ بھی جہاں حکومت کا سربراہ مسلمان ہے لیکن آبادی کی اکثریت مسلمان نہیں ہے۔ 1926 میں مکہ میں منعقد ہونے والی اسلامی ورلڈ کانگریس نے اپنے دستور کی دفعہ 4 میں 'اسلامی دنیا کے علاقوں' کو شمار کیا تھا۔(2) لہٰذا ایک جانب ایک وسیع تر مذہبی و ثقافتی وجود ہے جب کہ دوسری جانب سیاسی اکائیوں کا گروپ ہے۔ اور یہ بات قریب عقل ہے کہ ان سے متعلق تصورات اور پالیسیاں ایک جیسی نہیں ہوسکتیں۔ وہ یا تو مختلف ہوں گی یا ان میں امتیاز برتا جائے گا۔ ایسی ہی دشواری کا سامنا دوسرے سوال کے حل میں پیش آتا ہے جہاں مسئلہ کا تعلق نظریاتی یا سیاسی امور یا دونوں سے ہو۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مسلم معاشرہ کی مسلمانیت یا اس کے برعکس کو کسی زمرہ میں بٹھایا جائے۔ اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ اس نوعیت کے موضوع پر جو بھی معلومات حاصل کی جائیں وہ اسی وقت تک مخصوص و محدود رہیں کیونکہ کئی وجوہات کے باعث سیاسی تصورات میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔

اس سلسلہ ایک اور پریشان کن بات 'عرب' اور 'مسلم' الفاظ کا ایک ہی معنی میں استعمال ہے جو اس حقیقت کو نظر انداز کرتا ہے کہ تمام مسلمان عرب نہیں ہیں اور نہ ہی سب عرب اسلام کے ماننے والے ہیں۔

ان حوالوں کی موجودگی میں 'روایتی مسلم ریاست' کی تعریف ان اصطلاحات کی روشنی میں کرنا چاہیے جو اس نے خود اپنی پہچان کے لیے وضع کی ہیں۔ خصوصاً مندرجہ ذیل زاویوں سے متعلق۔ اوّل تو ریاست کی پالیسی پر مذہب کا براہِ راست اثر، دوسرے معاشرہ کی سماجی معاشی بیداری، تیسرے سیاسی سماجی تبدیلی کی جانب اصلاح پسند نظریات کی مقبولیت یا اس کے برعکس چوتھے مقامی، علاقائی اور عالمی مسائل پر خارجہ پالیسی کی سوچ۔ ایسی روایتی مسلم ریاست ایک جدید بزرگانہ طرز کے اقتدار کی حامل ہوگی جس کی بنیاد مذہبی عقیدے اور مقامی روایات پر ہوگی، جو تجارتی قوتوں کو حکمراں کی مجموعی ہدایات کے مطابق معیشت کو ہموار کرنے دے گی، جو بین الاقوامی تعلقات میں مغرب کی ہمنوا اور مغرب اس کا

ہمنوا ہوگا اور جو متحرک، بائیں بازو والے یا انقلابی تحریکوں اور ریاستوں کی مذمت کرے گی۔ اس معیار کے مطابق گلف کوا پریشن کونسل (بحرین، کویت، عمان، قطر، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات) میں شامل کل ریاستیں روایتی مسلم ریاستیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ اس فہرست میں مغرب اقصیٰ کی جانب سے مراکش کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

ایک اور سوال کا حل تلاش کرنا ہے۔ کیا کبھی یونائیٹڈ اسٹیٹس نے دانستہ یا نادانستہ طور پر، مسلم ریاستوں کے اس گروپ یا کلی طور سے تمام مسلم ریاستوں کی جانب پالیسی کو نیا رُخ دینے کی کوشش کی؟ اگر ایسا ہے تو یہ کس وقت اور کب ہوا؟ اور اس کے محرکات کیا تھے؟

ہنری کیسنجر کو سیاست وتعلیم کا کافی تجربہ تھا۔ انھوں نے دنیا کے سیاستدانوں کے بارے میں ایک برمحل مشاہدہ پیش کیا ہے: ''اعلیٰ مراتب پر پہنچنے سے قبل، رہنما لوگ جو عقائد اور نظریات بنا لیتے ہیں وہ دانشورانہ اثاثہ ہے جو وہ اس وقت تک خرچ کرتے رہتے ہیں جب تک وہ عہدوں پر برقرار رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے سیاستدانوں کی پرورش و پرداخت اور اٹھان موقعہ اور محل سے متعلق رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے سیاسی کرداروں کی نظریاتی ساخت موقعہ اور محل کے اعتبار سے ہمیشہ موزوں ہے خصوصاً ان امور میں جو بغیر وضاحت کی گئی تمہیدوں اور تاریخی واقعات سے پیدا ہوئے فہم و ادراک سے متعلق ہیں۔ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم ممالک سے متعلق امریکی تصورات کے بارے میں یہ بات کافی حد تک صحیح ہے۔ اس کی وجہ ابتدائی آبادکاروں کا عیسائی و یوروپی پس منظر ہے۔ ایڈورڈ سعید نے مختلف جہتوں میں مشرق سے یوروپ کے تجربہ کی بہت گہرائی سے تحقیق کی ہے۔ ماضی قریب میں ڈگلس لیٹل نے خصوصی طور پر امریکی احساسات پر روشنی ڈالی ہے۔ سعید کا یہ فقرہ کہ ''مشرق سے متعلق امریکہ کا فہم و ادراک قابل ذکر حد تک کم وزن ظاہر ہوا''۔(3) اس باب کی شروعات کا حصہ بن جائے کہ آخر (مسلمان ممالک سے متعلق امریکہ کی) یہ سمجھ کس طرح پروان چڑھی۔

1776 میں جب امریکی جمہوریہ نے آنکھیں کھولیں تو 'ایک اوسط درجہ کا امریکی مشرق وسطیٰ کے بارے میں جو بھی علم رکھتا تھا اس کے ماخذ دو ذرائع تھے ایک تو کنگ جیمس

بائبل اور دوسرے شہزادکی الف لیلہ × زیادہ تر امریکیوں کو بائبل سینٹ میتھو کے طریقہ کار اور علی بابا چالیس چور کی کہانی کی طرح یاد تھی۔ اکثر صلیب اور صلیبی جنگوں کو یاد کرتے تھے اور اکثر اس حقیقت پر آنسو بہاتے تھے کہ ارض مقدس کافروں یعنی مسلمانوں اور یہودیوں سے آباد ہے اور مسیحی دائرہ اقتدار سے باہر ہے'(4) 1869 میں مارک ٹوئن نے الف لیلہ کے گردبُنی ہوئی بیرونی لفظی تصویر کو یہ کہہ کر پارہ پارہ کردیا کہ ایک قوم کی حیثیت سے'مسلمان فطری اور تربیت کے اعتبار سے ناپاک، وحشی، جاہل، غیر ترقی پذیر اور توہم پرست ہوتے ہیں۔ اس کا اثر عوامی مزاج پر ہوا بہت ممکن ہے کہ صدر تھیوڈر روزویلٹ بھی مسلمانوں کے متعلق اپنی رائے میں ایسے الفاظ سے متاثر ہوئے ہوں اسی لیے انھوں نے کہا تھا کہ'جہاں محمڈنزم کی بالادستی قائم ہے وہاں پر اخلاقی، دانشورانہ اور مادّی بہتری کی تلاش سعی لا حاصل ہے'۔ ابتدائی امریکن مبلغین کا تجربہ بھی مایوس کن تھا۔(5) لیکن تجارت و کاروبار کے معاملات میں ان نقائص کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا اور ایک سے زیادہ عملی اقدام کی جانب توجہ کی جاتی۔ 1833 میں عمان کے ساتھ دوستی اور تجارت کا ایک معاہدہ تحریر ہوا اور 1840 میں ایک عمانی سیاسی مشن کا یونائیٹڈ اسٹیٹس میں استقبال کیا گیا۔(6) 1856 میں ایران کے ساتھ بھی ایک تجارتی معاہدہ ہوا لیکن مرورِ ایام کے ساتھ اس کی افادیت ختم ہوگئی(7) لیکن کاروباری مواقع کی تلاش تندہی سے جاری رہی۔ دسمبر 1879 میں ایک امریکن جہاز' ٹائی کن ڈیروگا' خلیج فارس آیا اور شط العرب اور بصرہ تک سفر کیا۔ ایسے موقعہ پر دل میں بیٹھے ہوئے گہرے اور پختہ خیالات نے اپنا سر اٹھایا خواہ وہ اندرون خانہ رپورٹ ہی میں کیوں نہ ہو۔ کموڈور رابرٹ شوفلیٹ نے لکھا کہ' دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی جگہ ہو جہاں ایک مہذب قوم کے اخلاقی طرز کے نفوذ کے لیے مادّی طاقت کے مظاہرہ کی اتنی ضرورت ہے جتنی (خلیج فارس) پر بسنے والے نیم وحشی لوگوں کے لیے'۔ شوفلیٹ کا یہ خیال بھی تھا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس اس علاقہ میں برطانوی بالادستی کو چیلنج کرسکتی ہے بشرطیکہ وہ' دوئم نمبر کے انگریز کا کردار' جو ہم عرصہ سے چین میں کھیل رہے ہیں، کھیلنا بند کردے۔(8) پہلی جنگ عظیم کے بعد اور تیل کی تجارت میں مراعات حاصل کرنے کی دوڑ کے ساتھ امریکیوں نے ایک کھلے

دروازہ کی پالیسی اختیار کی یہاں تک کہ انھوں نے (برطانوی) عراق پٹرولیم کمپنی کی حاصل کردہ رعایتوں کو اس بنا پر تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ یہ مراعات عراق کی ریاست کے قیام سے قبل کی ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ جنگ میں یونائیٹڈ اسٹیٹس ایک اتحادی طاقت نہیں بلکہ 'ملحقہ طاقت' تھی۔ اس کے علاوہ اس نے لیگ آف نیشنز کے اس معاہدہ کی بھی توثیق نہیں کی تھی جو عراق میں اختیارات کو کنٹرول کرتا تھا۔ اس کے اور دیگر اور رُکاوٹوں کے باوجود باہمی جنگ کے عرصہ میں امریکی کاروباری مفادات نے کافی طویل سفر طے کیا۔(9) اور ان میں سب سے نمایاں کارنامہ 1933 میں سعودی تیل میں مراعات کا حصول تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ تجارتی کاوشیں علاقائی اور عالمی مفادات کے تناظر میں آپس میں بری طرح الجھ گئی تھیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں باہمی تال میل کی بدلتی رفتار کے باوجود عوام الناس کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی: 'دائیں بازو والوں کے لیے اسلام کے معنی وحشت و بربریت ہیں؛ بائیں بازو والوں کے لیے یہ حقارت آمیز غیر ملکی عنصر ہے لیکن اس نکتہ پر سب متفق ہیں کہ اگرچہ اسلامی دنیا کے بارے میں معلومات کافی نہیں ہیں پھر بھی اس کے اندر کچھ بھی قابل تحسین نہیں ہے' سوائے اس کے وہ کمیونسٹ مخالف ہے۔(10) ان افکار کی وضاحت اور شدت سیاسی یا معاشی یا دیگر متعلقہ مسائل کے بارے میں عام رائے کے مطابق بدلتی رہتی تھی۔ ان منفی تصورات کی تعمیر میں ایرانی انقلاب، خلیجی جنگ، 1993 میں عالمی تجارتی مرکز پر بمباری، 1995 میں اوکلوہومہ پر بمباری اور بلاشبہ 11 ستمبر 2001 نے برابر کا کردار ادا کیا ہے(11)۔

اس بحث میں ایک بہت باموقعہ اور برمحل عنصر اس جگہ کا ہے جس پر ستر کی دہائی کے درمیان سے مسیحی بنیاد پرستوں نے ٹیلی ویژن پر اپنی تبلیغی مساعی، سیاست میں اپنی سرگرمیوں اور ریپبلکن پارٹی کے اندر قدامت پرستی کی تحریک کو مضبوط کرنے کی کوششوں کے ذریعہ قبضہ کر رکھا ہے۔ کچھ امریکی مبصرین کا خیال ہے کہ 'دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کی خارجہ پالیسی کی بحثیں' خواہ نادانستہ طور پر سہی، گہرے طور پر قبل الفیہ مقبول تصورات سے

تشکیل ہوئے ہیں۔ جدید دائیں بازو والے عیسائی، جہاں تک مشرق وسطیٰ کا تعلق ہے، انجیل کی پیشین گوئیوں کا حوالہ دیتے ہیں جس میں بابل کی بربادی اور مسجد اقصیٰ کے مقام پر ہیکل کی تعمیر شامل ہے(12)۔ بش انتظامیہ میں اس جدید قدامت پرستی نے جو اثر و رسوخ حاصل کیا ہے اس کے ممکنہ نتائج سے باخبر رہنے کے لیے ان افکار و خیالات کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ تجزیہ اسی وقت نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جب سیاسی طور سے مناسب و موزوں مذہبی رجحان یا عمل اور مذہبی رنگ کا سیاسی رجحان یا عمل میں امتیاز برتا جائے(13)۔

دوسری جنگ عظیم سے 11/ستمبر 2001 تک روایتی مسلم ریاستوں کی جانب امریکہ کی پالیسی وہی تھی جو سعودی عرب کی جانب تھی۔ یہی رجحان دوسری گلف کوآپریشن کونسل (جی سی سی) کی جانب تھا اگرچہ شمولیت اور شدت میں درجات کا لحاظ رکھا گیا۔

ابن سعود کے ہاتھوں جزیرہ نمائے عرب کا اتحاد اور سلطنت کی تخلیق ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔ کچھ حد تک اس کو برطانوی پالیسی نے آسان بنا دیا۔ آنے والے سالوں میں بادشاہ کو مالی پریشانیاں پیش آئیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ سے اس کے تعلقات میں مزید ناخوشگواری اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ برطانیہ اردن اور عراق کی ہاشمی سلطنتوں کا حامی تھا۔ ان مسائل سے چھٹکارا پانے کے لیے بادشاہ نے امریکہ کی طرف دیکھا۔ سعودی عرب 'لنڈلیز ایکٹ سے فائدہ اٹھانے والا ممبر بن گیا۔ فروری 1945 میں صدر روزویلٹ نے ابن سعود کا استقبال ''یو ایس ایس کوئنسی'' پر کیا۔ دسمبر 1947 میں بادشاہ کو ایک سرکاری مراسلہ موصول ہوا جس 'سعودی عرب کی زمینی حدود اور سیاسی یکجہتی' کے لیے یونائٹیڈ اسٹیٹس کی مدد کا یقین دلایا گیا تھا۔ اپریل 1950 میں نائب خارجہ سکریٹری جارج میک گھی نے ریاض کا دورہ کیا اور تعاون کا حتمی اور قطعی خاکہ تیار کیا گیا۔ اس میں یونائٹیڈ اسٹیٹس کی افواج کے ذریعہ سعودی مسلح افواج کی ٹریننگ بھی شامل تھی(14)۔ 1958 میں عراقی انقلاب کے باعث سعودی عرب نے یونائٹیڈ اسٹیٹس پر دباؤ ڈالا کہ وہ سعودی۔عراقی سرحد کی حفاظت کی خاطر بغداد کے خلاف زیادہ فعال موقف اختیار کرے(15)۔ چھٹی دہائی میں ناصر کی قیادت میں ابھرنے والی عرب قومیت کی طاقتوں سے کشمکش کے دوران صدر جانسن نے

سعودی عرب کو اس کی آزادی، حفاظت اور زمینی سالمیت کے لیے امریکی حمایت کی یقین دہانی کرائی (16)۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس سے قریبی تعاون کی یہ پالیسی 1967 کی چھ روزہ جنگ کے بعد بھی حاوی رہی اور جہاں اس سے اور چیزیں حاصل ہوئیں وہیں 1971 میں خلیج فارس سے برطانوی انخلا کے وقت سعودی۔ایرانی افہام وتفہیم تھی۔

سعودی اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کے تعلقات کی آزمائش اکتوبر 1973 کی عرب اسرائیل جنگ کے وقت ہوئی جب سعودی عرب نے تیل پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا۔ معاملہ کی سنجیدگی نے رچرڈ نکسن کو شاہ فیصل کو براہِ راست تنبیہ دینے پر مجبور کیا: ''میں آپ کو صاف صاف بتلا دینا چاہتا ہوں کہ یہ قطعی طور سے لازمی ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کے خلاف تیل اور تیل کی مصنوعات پر سے پابندی فوری طور سے ختم کردی جائے'' ورنہ بصورت دیگر یونائیٹڈ اسٹیٹس کی امن کی کوششیں مکمل طور سے بے اثر ہوجائیں گی۔(17) اس تجربہ سے سعودی یونائیٹڈ اسٹیٹس تعلقات نے ایک نئی کروٹ لی۔ پرانے موکل اور آقائیت والے سادہ تعلقات نے باہمی انحصار پر مشتمل ایک زیادہ پیچیدہ تعلق کے لیے راستہ ہموار کیا جس میں دونوں فریقوں کے مفادات مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ جداگانہ بھی تھے لہٰذا ایک دوسرے سے مقابلہ آرائی اور تضاد، رضامندی اور تعاون کے عناصر بھی موجود تھے۔(18) یہ باہمی انحصار اس وقت مزید واضح ہوگیا جب جون 1974 میں ولی عہد نے معاشی اور فوجی تعاون کے ایک معاہدہ پر واشنگٹن میں دستخط کیے تاکہ 'خصوصی تعلقات' کی بنیاد ڈالی جاسکے(19)۔

1978 اور 1979 مغربی ایشیا کے لیے بڑی گہما گہمی کے سال تھے۔ مصری۔اسرائیلی امن معاہدہ، ایرانی انقلاب، محاصرہ حرم مکہ اور افغانستان پر سوویت یلغار وہ واقعات تھے جو سعودی۔امریکی مفادات کے متضاد بھی تھے اور موافق بھی۔ شاہ ایران کے زوال نے علاقہ کے توازن میں گڑبڑ پیدا کی۔ سعودی عرب کی بڑی مہارت سے تیار کی ہوئی پالیسی جس میں ایک طرف وہ مدمقابل لیکن دوستانہ ایران پر خلیج میں عراق کی امنگوں پر روک لگانے پر بھروسہ کرسکتے تھے اور دوسری جانب امریکہ کے ذریعہ ایران کے ارادوں کو قابو میں رکھ سکتے تھے، کو شاہ کے زوال سے گہرا دھچکا لگا۔ امن معاہدہ میں سعودی مخالفت اور بڑھتی

ہوئی تیل کی قیمت سے بھی سعودی اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کے تعلقات میں مزید تناؤ پیدا ہوا۔ مکہ محاصرہ جو داخلی انتشار کا مظہر تھا، نے سعودی عرب کی اسلامی سند کو بھی کمزور کر دیا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی جانب سے ان سب کا ردعمل ''کارٹر ڈوکٹرائن'' (جنوری 1980) کی صورت میں ظاہر ہوا جس کو اگر چہ ریاض میں پسند کیا گیا لیکن عوامی طور سے اس کا اظہار نہیں کیا گیا اس کے بجائے قومی سلامتی کے مشیر بریزنسکی سے کہا گیا کہ سوویت حملہ سے جو سنجیدہ صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کے پیش نظر 'سعودی عرب' امریکہ اور سعودی تعاون میں مزید استحکام پر غور وفکر کے لیے اگر چہ رازداری کے ساتھ، پہلے سے زیادہ خواہش مند ہے'۔(20) لیکن اس کو خفیہ رکھنے کی ضرورت اس وقت کم ہوگئی جب ایران وعراق جنگ میں عراق کو ہزیمتیں اٹھانی پڑیں اور افغانستان میں سوویت حملہ کے خلاف ایک امریکی۔سعودی اور پاکستانی اتحاد کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔ انجام کار جب خود سعودی عرب 1990 میں مصیبت میں گھرا تو یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ساتھ سلامتی انتظامات کو 1991 کی جنگ کے بعد اور وسعت دی گئی یہاں تک کہ 1997 میں یہ اعلان کیا گیا کہ علاقہ میں مغربی طاقت کی تشکیل میں سلطنت ایک 'اہم کردار' ادا کر رہی ہے۔(21) اس کا ایک مظہر وہ تعاون ہے جو افغانستان میں 1997 تک طالبان حکومت کو حاصل رہا(22)۔ 1991 کی جنگ کے بعد والی مدت میں اور روایت سے انحراف کرتے ہوئے امریکہ نے بھی سعودی سالمیت کو غیر فوجی زاویہ نگاہ سے دیکھنا شروع کیا اور ملک پر ہلکا سا دباؤ ڈالا کہ وہ معاشی اور تدریجی سیاسی اصلاحات کے ذریعہ اور اسلامی تحریکوں کو اپنی مدد، جو آخرکار انتہا پسندی کی جانب لے جاتی ہے، سے ہاتھ روک کر، اپنی داخلی توازن وسالمیت کے لیے اپنے معاشرتی روابط پر نظر ثانی کرے(23)۔

11 ستمبر 2001 کے واقعات نے اس اہم اور مضبوط دوستی کو گہرا صدمہ پہنچایا(24)۔ اور سلطنت امریکہ شدید غم وغصہ والی نکتہ چینی کا ہدف بنی حالانکہ سعودی حکومت نے تعاون کا فوری طور پر یقین دلایا (9 ملین بیرل کچے تیل کی یونائیٹڈ اسٹیٹس کو فوری کھپت جس سے تیل کی قیمت 28 ڈالر فی بیرل سے گھٹ کر 20 ڈالر فی بیرل آ گئی)(25)۔ اس نے سعودی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ اعلیٰ سطح کی اصلاحی مشق اختیار کرے

جس میں ''ہماری خود محاسبی اور تبدیلی کے عمل کا مظاہرہ ہو''(26) مفادات کی یکسانیت نے اب دونوں فریقوں کو ایک محدود نقصان کے عمل کی جانب بڑھا دیا ہے۔ لیکن پردے کے پیچھے سعودی حکومت پر سیاسی اصلاحات کے متعلق دباؤ نے ایک رفتار پکڑ لی ہے اور مستقبل قریب میں اس کے کم ہونے کی کوئی صورت نہیں نظر آتی۔

اس بارے میں کوئی قابل ذکر ثبوت نہیں ہے کہ 1979 کے ایرانی انقلاب سے قبل یونائیٹڈ اسٹیٹس کی کسی بھی انتظامیہ نے 'اسلام کی جانب پالیسی' پر غور فکر کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ انقلاب ایران، اسلامی شعلہ بیانی، یرغمالیوں کا بحران اور ایک نازک علاقہ میں مجموعی طور سے یونائیٹڈ اسٹیٹس کی پالیسیوں پر ضرب نے امریکیوں کے ذہن میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خطرناک حد تک منفی تصورات قائم کر دیے۔ عین اسی وقت ایران کے واقعات سے عرب ممالک میں جو خطرے کی گھنٹیاں بجیں اس کو 'شیعہ اسلام' تک محدود رکھا گیا۔ سرد جنگ کے حالات کے پیش نظر افغانستان کے مسئلہ کو بہر حال اوّلیت حاصل ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسلامی حزب اختلاف کو سوویت یونین کے مقابلہ میں استعمال کیا جائے۔' چنانچہ ایران میں انقلاب کی کامیابی اور مسلم ممالک پر اس کے عالمی اثرات کے باوجود کارٹر انتظامیہ سیاسی اسلام کے تعلق سے ایک جامع پالیسی تو درکنار، اس بارے میں کوئی واضح بیان بھی نہ دے سکی۔ یو ایس کے افسران کے خیال میں اسلامی بیداری سرد جنگ سے عارضی انحراف تھا(27)۔ اس طرز فکر کو ان ہی وجوہات کی بنا پر صدر ریگن اور جارج بش کے زمانہ میں بھی باقی رکھا گیا۔ لیکن آخرالذکر کو مختلف عرب ممالک خصوصاً الجزائر میں اسلامی پارٹیوں کی الیکشن کی کامیابیوں کی جانب متوجہ ہونا پڑا کیونکہ ان کے دعویٰ کے مطابق وہ جمہوریت کی ترقی کے لیے کوشاں تھے۔ یہاں ردعمل محتاط تھا۔ الیکشن کے عمل کو تہس نہس کرنے کا الجزائری فوج کا اقدام جائز قرار دیا گیا؛ اس کی جگہ مسلم دنیا کے سامنے پہلے سے موجود ایک سوال رکھا گیا: کیا اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں یا یہ عمل صرف ایک فرد، ایک ووٹ اور ایک وقت تک ہی محدود ہے؟(28)

آخرکار جون 1992 میں یہ ممکن ہو سکا کہ اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ ایڈورڈ جیریجیان نے اسلام سے متعلق پالیسی کا اعلان کیا جو عام طور سے میریڈیان ہاؤس ایڈریس کے نام سے معروف ہے۔ انھوں نے کہا: ''اسلام کی جانب ایک مربوط و مدلل پالیسی خاکہ وقت کی اشد ضرورت ہے کیونکہ خارجہ پالیسی کے سامنے چیلنجز بحرانوں کی ایک کمان کی شکل میں نمودار ہورہے ہیں۔ یہ (بحران) یوریشیا میں پھیلے ہیں اور ان کا مشترک رشتہ مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کے خلاف اپنی شناخت اور سیاسی مقاصد پر اصرار ہے۔ اس محراب سے آگے 'مسلمان دہشت گرد' دہشت گردی کی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ پالیسی بنانے والے مذہبی، نسلی اور ثقافتی عناصر کو اپنی گرفت میں اس طرح لیں جو سوویت یونین کے ساتھ دو قطبی جنگ کے دنوں میں ممکن نہ تھا۔ اس پس منظر میں اسلام کی جانب یونائٹیڈ اسٹیٹس کی کیا پالیسی ہونی چاہیے اور قائدانہ حیثیت کے ساتھ یونائٹیڈ اسٹیٹس کس طرح ایک سوچی سمجھی اور جامع پالیسی بحرانوں کی کمان اور اس میں اسلام کے کردار کے بارے میں مرتب کرسکتی ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ قوس یا محراب دنیا کے تیل اور گیس کی کم و بیش تین چوتھائی ذخیرہ کا گھر ہے۔ اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا کہ کئی لاکھ مسلمان امریکی شہری ہیں اور اسلام کو اجنبی طرز فکر نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ ہی اسلامسٹ گروپ راہ کا روڑا ثابت ہوئے ہیں۔ تقریر کے درمیان یہ بھی کہا گیا کہ جہاں تک حتمی پالیسی کا تعلق ہے عام اعتدال پسند مسلم ممالک اور انتہا پسندوں کے درمیان امتیاز ہونا چاہیے اور یونائٹیڈ اسٹیٹس کو اعتدال پسند اسلامی حکومتوں کی زیادہ امداد کرنی چاہیے اور ان کے ساتھ زیادہ مل جل کر کام کرنا چاہیے۔ امریکہ کو مسلم حکومتوں کو ابھارنا چاہیے کہ وہ (i) طرز حکومت میں حصہ داری کی جانب قدم بڑھانے کی کوشش کریں، (ii) وسیع جہتوں پر مبنی اپنے سماجوں سے گفت وشنید کریں اور (iii) تجارت میں اصلاح کریں۔ اس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ عرب اسرائیلی تنازعہ کا حل مسلمانوں میں مغرب مخالف جذبات کو مدھم کرنے میں مددگار ہوگا اور یہ کہ یونائٹیڈ اسٹیٹس کو بین الاقوامی امور میں مذہب کی ظاہری طور پر کمزور حالت کو اہمیت اور استحکام بخشنا چاہیے۔ اس تقریر میں انڈونیشیا، ملیشیا، ترکی، مصر اور سعودی عرب کا تذکرہ توصیفی

الفاظ میں ہوا اور یہ رائے دی گئی کہ 'یہ ممالک اپنی سرحدوں سے پرے بھی معتدل اسلام کی مثبت قوتوں کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان کو اسلام کی اصل دھارا اور وسط ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی اسلامی دنیا کے درمیان ایک رابطہ تصور کرنا چاہیے۔(29)

اس تقریر کا اثر کم سے کم ہوا اور اس میں پیش کردہ خیالات کو کبھی بھی عملی پالیسی کی رہنما ہدایات نہیں بنایا گیا۔ روایتی عرب ریاستوں پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا کہ وہ ملک میں جمہوریت کی ترقی کے لیے سیاسی عمل شروع کریں۔(30)

1994 میں یو ایس حکومت نے ایک کتابچہ شائع کیا جس کا نام ''یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا اور اسلامی دنیا: سرکاری متون''(31) اس کتابچہ کا مقصد قطعی طور سے یہ تھا کہ یو ایس حکومت اسلامی دنیا سے اپنے تعلقات کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کتابچہ میں نیشنل سیکوریٹی ایڈوائزر اینتھونی لیک، اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ رابرٹ پلیٹرو اور ڈپٹی اسسٹنٹ سکریٹری ورس ٹینڈگ کے بیانات شامل تھے۔ یہ بیانات 1994 میں مارچ سے مئی تک دیے گئے تھے۔ لیک اسلامی انتہاپسندی کو قومی مفاد کے لیے خطرہ تصور کرتے تھے اور ایسی پالیسی کے حق میں تھے جو ایک علاقائی دفاعی فصیل تیار کر سکے اور جس کے لیے یونائیٹڈ اسٹیٹس کو مسلم اکثریت رکھنے والے ممالک سے، خواہ ان کی حکومتیں سیکولر ہوں یا انتہا پسند، طویل مدت کی دوستی اور اتحاد رکھنا ہوگا۔' پلیٹرو نے کہا 'کسی بھی ملک یا گروپ سے متعلق خارجہ پالیسی میں ہمارے نزدیک اسلام کا کوئی مقام نہیں ہے۔ لیکن یونائیٹڈ اسٹیٹس ان کے بارے میں ضرور فکرمند ہے جو جمہوری عمل کو طاقت کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں اور پھر طاقت پر جمے رہنے کی خاطر اس عمل کو برباد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی تجدید کے کچھ پہلو شدید طور سے مغرب مخالف ہیں اور واضح طور سے یونائیٹڈ اسٹیٹس کے مفادات سے الگ ہیں'۔ خلاصہ کلام یہ تھا کہ انتہا پسندی کو شکست دینے کے لیے طویل مدتی اور دیرپا ذرائع یہ ہیں کہ ان حالات پر قابو پایا جائے جن میں ان کی نشوونما ہوتی ہے، یونائیٹڈ اسٹیٹس کا یہ ارادہ نہیں ہے کہ وہ مغربی طرز کا نظام حکومت تھوپے لیکن یہ یقین رکھتی ہے کہ وسیع تر سیاسی ساجھے داری طویل مدتی استحکام کا باعث ہوتی ہے۔

1994-95 کے دوران صدر کلنٹن کے بیانات میں یہ رواداری نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔(32) کوشش یہ تھی کہ اعتدال پسند اسلامی تحریکوں سے رابطہ کا سلسلہ قائم رہے(33)۔لیکن ساتھ ہی ساتھ بیانات اور اصل پالیسی میں تضاد تھا۔ انتظامیہ نے ایک وسیع اور متنوع علاقہ سے جڑی ہوئی طویل مدتی پیچیدہ پالیسیوں کے فریم میں ایک خاص اکیلے ملک کے فوری مفادات کو جگہ دینی شروع کردی۔ اس موضوع پر اندرونی بحث و مباحثہ نے معاملہ کو اور الجھا دیا اور کلنٹن ٹیم کے اندر داخلی تناؤ کے باعث رواداری کے حامیوں اور مزاحمت کے وکیلوں کے درمیان تفریق ہوگئی۔

دیگر واقعات نے بھی تصورات کو بدلا۔ قیام امن کے عمل میں ست روی پر عربوں کی جھنجھلاہٹ اور امریکی انتظامیہ کی اسرائیل کی غیر مشروط حمایت پر غم و غصہ خلیج کی روایتی مسلم ریاستوں کے بیانات سے گہرے طور پر ظاہر ہوتا تھا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس کا خاص طور سے دہشت گردی کے نشانے پر ہونے سے 1998 تک معاملہ کو مزید پیچیدہ کردیا اور سنجیدہ گفتگو کی توقعات پر پانی پھیر دیا۔ امریکہ نے اسلامیوں کے متنوع مزاجوں کی جانب سے بھی آنکھیں موند لیں اور اس عمل پر ریپبلکن پارٹی کی انتخابی فتح نے مہر لگا دی۔ اس کے نتیجہ میں کچھ ایسے تصورات ابھرے جنھوں نے گزشتہ پالیسی کی بنیادوں پر سوال اٹھائے اور زیادہ سخت رویہ کا مطالبہ کیا۔ ان کے نزدیک نائن الیون کا حادثہ آرزو کے حصول میں صرف ایک مشق تھی۔ حملہ آور مسلمان تھے۔ ان میں سے اکثر ایک روایتی مسلم ریاست کے باشندے تھے۔ ان کے محرکات میں یونائیٹڈ اسٹیٹس سے دشمنی، ان کے اپنے سیاسی نظام کو یوایس کی جانب سے دیئے گئے تعاون کی مخالفت شامل تھے۔ انھوں نے انقلابیت اور جدید ٹیکنالوجی کے ایک مرکب کی مدد سے خیال وخواب میں بھی نہ آنے والے عمل کو کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔

نئی صورت حال کے ردعمل نے رسمی شکل 17 ستمبر 2002 کی نیشنل سیکورٹی اسٹریٹیجی دستاویز میں اختیار کی۔ اس میں دہشت گردی کو دشمنی قرار دیا گیا۔ اور اس کو برباد کرنے کے مقصد کے لیے چھ تجاویز پیش کیں۔ اوّل تو یہ کہ نئی اعتدال پسند خصوصاً اسلامی

دنیا کی حکومتوں کی مدد کی جائے تاکہ دہشت گردی کی نشوونما کے لیے جو زرخیز زمین مطلوب ہے وہ حاصل نہ ہوسکے۔ دوم یہ کہ دہشت گردوں کی مالی ریڑھ کی ہڈی کو ضرب لگائی جائے۔ تیسرے یہ کہ ریاستوں پر زور ڈالا جائے کہ وہ دہشت گردوں کی مدد، پشت پناہی اور پناہ گزینی نہ کریں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ تہذیبوں کا تصادم نہیں ہے۔ لیکن یہ بہرحال خود ایک تہذیب کے اندر کے تصادم کو ظاہر کرتا ہے یعنی اسلامی دنیا کے مستقبل کے لیے جنگ۔ یہ ایک نظریاتی جنگ ہے اور اس میدان میں بہرحال یونائیٹڈ اسٹیٹس کو بہتر کارکردگی کرنی ہے۔ 12/دسمبر 2002 میں سکریٹری آف اسٹیٹ کولن پاول نے ہیریٹیج فاؤنڈیشن کی تقریر میں نئے رجحانات کے نفاذ کی حکمت عملی کی نقشہ کشی کرتے ہوئے ''یو ایس۔مشرق وسطی اتحادی اقدام'' کا اعلان کیا اور اسی دن لندن کے ایک روزنامہ 'القدس العربی' میں دیے انٹرویو میں اس کی تشریح کی۔ پاول نے کہا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس 'حتمی طور سے تبدیلی' اصلاح اور جدید مشرق وسطی کے حق میں ہے۔ یہ تبدیلی بحرین، قطر، کویت اور مراکش میں شروع ہوچکی ہے۔ اور سعودی عرب کو بھی لازمی طور سے اس راہ پر گامزن ہونا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ سعودی قیادت اپنی روایتوں اور سرگرمیوں پر اصلاح کی غرض سے نظر ثانی کرے گی۔ پاول نے مزید کہا کہ ''علاقہ کے عوام کو ایسے رہنماؤں کی مدد کے لیے آگے آنا چاہیے جو عقیدہ اور ایک کھلے ہوئے سیاسی نظام کے درمیان توازن کی تلاش کے حق میں ہیں (34)۔

اس معاملہ کا ایک داخلی پہلو بھی ہے۔ کئی سال قبل نیویارک ٹائمز کے اداریہ میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں نسلی منافرت کی ایک شکل کو اب بھی باعزت سمجھا جاتا ہے اور وہ ہے عربوں کے خلاف تعصب۔(35) 11/ستمبر کے بعد والے زمانے میں 'عرب' کی جگہ لفظ 'مسلم' رکھا جاسکتا ہے۔ این ایس ایس دستاویز نے اجنبی اور وطنی کے امتیاز کی تخفیف کی جانب توجہ دلائی ہے۔ اس کے ایک پہلو میں اسلام کے تعلق سے امریکی مسلمانوں پر بھی زد پڑتی ہے۔ امریکی مسلمانوں کی تعداد چھ سے سات ملین تک ہے۔ ان میں سے 33/فیصد جنوب ایشیائی اصل سے ہیں، 25/فیصد عرب ہیں اور 30/فیصد افریقی

امریکی ہیں(36)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں اسلام کی ترقی کی رفتار سب سے زیادہ ہے۔ اس سے انتظامیہ کو اپنے عوامی فیصلوں میں سیاسی طور سے درست ہونے کی ترغیب ملتی ہے، لیکن سیکورٹی کے نام پر نشانہ بنانے میں مسلمانوں کو بخشا نہیں جاتا۔ یہ دیکھنا بہرحال ابھی باقی ہے کہ انتخابی عمل میں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

عالمی منظرنامہ میں دور رس تبدیلیوں کے پیش نظر پچھلی دہائی میں کیے گئے اعلانات، اسلامزم کا فروغ، دوہری تجدید کی ناکامی اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کی جانب دہشت گردی کا نشانہ ہونا اس بحث کی اہمیت اور نزاکت کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ یہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی پالیسی کی مرکزی محور پر بھی روشنی ڈالتی ہیں۔ ان سب کو چھ زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

i. حکمت و سیاست کے اعتبار سے مسلم ممالک اہم ہیں۔

ii. ان ممالک کی شناخت میں بلا شک و شبہ اسلامی عنصر غالب ہے۔

iii. 'معتدل اسلام' کو برداشت کیا جاسکتا ہے اگرچہ اسلام کی ہر قسم مشکوک ہے۔

iv. 'معتدل' کی تعریف مختلف فیہ ہے لہٰذا سیاسی کاریگری میں فائدہ مند ہے۔

v. جدیدیت کے لیے سیاسی تبدیلی (بشمول بہتر طرز حکومت کا عصری معیار اور جمہوریت کا عمل) لازمی ہے لیکن اس کی حدود پر بحث کی جاسکتی ہے۔

vi. مسلم دنیا کے لیے جنگ نظریاتی میدان میں ہے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس اس میں براہ راست حصہ لے گی اور بلاواسطہ طور سے ہی فائدہ حاصل کرے گی۔

ان خلاصوں کو این ایس ایس 2002 کے دیگر بنیادی عناصر یعنی پیش بندی اور الگ رہ کر کام کرنے کی خواہش کے ساتھ ملا کر پڑھنا ہوگا۔ ماضی قریب میں عراق کے معاملہ میں یہ دونوں ہی نمایاں تھے۔

بین الاقوامی نظام میں عظیم طاقتوں کے طرزِعمل پر ایک مطالعہ میں ہیڈلے بل نے مشاہدہ کیا ہے کہ طاقت کا یکطرفہ استحصال تین صورتیں اختیار کرتا ہے: تسلط، غلبہ اور بالادستی۔ بل نے تسلط کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ بڑی طاقت کی طرف سے چھوٹی

ریاستوں پر دائمی طور پر قوت کا بے جا استعمال ہے جس میں بین الریاستی سلوک کے تمام عالمی ضابطوں کونظرانداز کردیا جاتا ہے۔ غلبہ کے متعلق اس کا خیال ہے کہ یہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب بڑی طاقت قوت کے استعمال یا قوت کے استعمال کی تنبیہ کے بغیر اور اقتدار، آزادی اور مساوات کے ضابطوں کی معمولی خلاف ورزی کے ساتھ حاوی ہوجاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان بالادستی کا تصور ہے جہاں ایک بڑی طاقت وقتاً فوقتاً، ہچکچاتے ہوئے قوت کا استعمال کرتی ہے یا اس کو استعمال کرنے کی دھمکی دیتی ہے(37) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی موجودہ پالیسی کا مقصد، ہیڈلے بل کی تعریف کی روشنی میں، مسلم ممالک میں غلبہ حاصل کرنا ہے۔ اس غلبہ کا مقصد ایسی لچکدار مسلمان ریاستوں کا گروہ تیار کرنا ہے جوتوانائی کی سپلائی، توانائی کی حفاظت اور اس کی قیمت پر معقولیت کا رجحان رکھتا ہو، یونائیٹڈ اسٹیٹس کا معاون ہو اور قومی کا بال کے واحد دائمی نمونہ یعنی آزادی، جمہوریت اور کھلی مارکیٹ پر یقین رکھتا ہو۔

کئی سوالات کے جواب ابھی باقی ہیں۔ ہم 'معتدل' کی تعریف کیسے کریں گے؟ مغربی ایشیا کے مختلف علاقوں میں معاشرتی فروغ کے الگ الگ درجوں کی روشنی میں جدید یا ماڈران سے کیا درآمد ہوتا ہے؟ اس کی سچائی کو ہم کیسے ناپیں گے؟ مغربیت اور جدیدیت میں کیسے امتیاز برتا جائے؟ تبدیلی کے پروگرام سے فوری طور پر کیا سیاسی نتائج برآمد ہوسکتے ہیں؟ اس کی رفتار پر کون قابو رکھے گا اور سیاسی استحکام کے لیے مطلوبہ توازن کی یقین دہانی کرائے گا؟ مقصد کا کون سا معیار اس کی کامیابی کی پیمائش کرے گا؟ اس عمل میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کا کیا کردار ہوگا؟ تبدیلی کے اس پروگرام میں متاثرہ ممالک کی نفاذ کی صلاحیت سے خصوصاً روبہ زوال معاشی کارکردگی، آبادیوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے نکلے ہوئے مطالبات اور نئی نئی امیدوں کی روشنی میں کیا تعلق ہوگا؟ فیصلہ کرنے کی خودمختاری اور فائدہ مند امداد کے عائد کرنے کے درمیان کیا مساوات ہوگی؟ زد پہ آئے ہوئے ممالک کے شہری اور فوجی سرکاری اخراجات میں موجود نابرابری کوئی کردار ادا کرے گی؟ اور علاقہ میں اسلحہ کے سب سے بڑا تاجر ہونے کی حیثیت سے یونائیٹڈ اسٹیٹس پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تبدیلی کی لہر کا منبع یونائیٹڈ اسٹیٹس کے اپنی سلامتی کے بارے میں خدشات اور یہ انکشاف کہ حکمراں طبقہ کے ساتھ خوشگوار تعلقات اور ظاہری سیاسی استحکام سے یہ حاصل نہیں ہوتی، امریکی طاقت کو امن، خوشحالی اور آزادی کے ماہ و سال میں ڈھالنے کا مضبوط ارادہ ہے، ساتھ ہی یہ ارادہ کہ یہ سب کچھ مسلم ممالک میں نظامِ تعلیم میں اصلاح اور جمہوری عمل میں ارتقا کے شانہ بشانہ کرنا ہے تاکہ دہشت گردی کو فروغ دینے والے نظریات اور حالات کو زرخیز زمین میسر نہ ہو سکے۔ لیکن مذکورہ بالا نظریات و حالات ایک غم و غصہ کا نتیجہ ہیں جو خود ناانصافی اور بے بسی کے احساس سے پیدا ہوا ہے۔ ان میں سب سے پہلا نمبر یونائیٹڈ اسٹیٹس کی فلسطین کی پالیسی کا ہے۔ معیشتوں کا ایک عالمی بندھن میں یکجا ہونا کچھ حد تک ایک کائناتی اقدار کے نظام کا مظہر ہے۔ یہ سوچنا کہ بہتر تعلیم اور سیاسی عمل کی جمہوری ساخت کے سبب عوام اس کو بھول جائیں گے، خام خیالی ہے۔ اس کے برعکس یہ ہوگا کہ بہتر تعلیم اور زیادہ آزادی ان کو معاملہ میں زیادہ ہمت بخشے جو کہ درحقیقت فلسطینیوں کے ساتھ ہوا ہے۔ مسلم ممالک اور دوسرے مقامات پر عوام الناس کی رائے ہے کہ 1992 کی پالیسی میں تصور کیے گئے روابط نے این ایس ایس 2002 میں موجود لازمیت کے لیے راہ ہموار کی ہے اور ایک ایسے روڈ میپ کو ابھارا ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ یہ باانصاف امن کے عمل میں اچھا شگون نہیں ہے۔ فلسطینیوں پر ایک حل تھوپا جا سکتا ہے لیکن یہ زبردستی طویل مدتی مسائل کے جراثیم کو پیدا کرے گی۔

آمرانہ اور مطلق انسانی حکومتوں سے تعاون بھی غم و غصہ کا ایک سبب ہے۔ لیکن یہ تعاون بھی مغرب اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کی طویل مدتی پالیسی کا حصہ ہے جو صورت حال برقرار رکھنا چاہتی ہے کیوں نہ اس کی سیاسی اور معاشی پالیسیاں مغرب کے مفاد کی مدد کرتی ہیں۔ نئی مجوزہ تقسیم احتیاط کے ساتھ اس کو گرفت میں لیتی ہے۔ وہ ان معاشروں میں دولت کی تقسیم کے مسئلہ کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ تبدیلی کا پروگرام اس بات کی یقین دہانی کراتی ہے کہ آزادانہ مارکیٹ (اور گلوبلائزیشن) کے ذریعہ معاشی پالیسیاں برقرار رہیں گی۔ اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کے (غیر واضح) غلبہ کے فریم ورک میں سیاسی تدریجی ارتقا کو

پہنچنے دیا جائے گا تاکہ وہ جمہوری طرز حکومت کے مشابہ ہوسکے۔ 12 ردسمبر 2002 کے بیان میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کے سکریٹری آف اسٹیٹ نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ اس طرز فکر کی جانب واضح اشارہ ہیں۔

اس بروقت لمحہ میں یونائیٹڈ اسٹیٹس میں کچھ افراد کو انسانی تاریخ میں گزرے دوسرے بروقت لمحات یاد آئیں گے۔ مورخ ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ ''خود قدرت کاملہ بھی اپنے غیر مطمئن پرستاروں کی دبی زبان سے شکایتوں سے دامن نہیں چھڑا سکتی کیونکہ جو عمل آج کے زمانے امور دنیا میں قابل تعریف ہے دوسرے میں مصیبت سمجھا جاسکتا ہے۔ جان رالس نے تسلیم کیا ہے کہ انصاف سماجی اداروں کی اولین خوبی ہے اور قوانین اور اداروں کی خواہ وہ کتنے ہی مستعد اور منظم ہوں، اصلاح کرنی چاہیے اور اگر وہ غیر منصف ہوں تو ختم کردینا چاہیے۔''

مسلم ممالک میں نئے نظام کے مسئلہ کو اسی پر قائم رہنا چاہیے یہ مسلمان ذہن کی خاطر ایک جنگ ہے، اپنی روایتوں کے معتبر ہونے کی دولت کی سمجھ کے لیے، روایتوں کو روشنی کی کرن کی طرح استعمال کرنے کے لیے جو جدیدیت کے پرزم سے منعکس ہوتی ہوں(38) تاکہ وہ موجودہ حالات پر تنقیدی نظر ڈالے جو کہ اگر چہ جدیدیت پر منحصر ہو لیکن جدیدیت اس کی تنقید کے دائرہ سے باہر نہ ہو اور اسلامی مثالوں کے ذریعہ اس کی افادیت میں اضافہ کرے(39)۔ اس طرح سے جو نظام ظہور میں آئے گا وہ معتدل، جدید، انصاف پسند اور رضامندی پر مبنی ہوگا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور دیگر ممالک صرف اتنی مدد کرسکتے ہیں کہ خارجی ماحول کو سازگار بنائیں۔ کسی دوسرے قسم کی شرکت کارآمد ثابت نہیں ہوگی۔

انصاف کی تلاش

سرد جنگ کے دوران امریکی خارجہ پالیسی کا ایک مستقل جز اعتدال پسند مسلم ریاستوں سے مثبت تعلقات رہا ہے۔ اس کا مقصد توانائی کا حصول، سوویٹ بلاک کے مقابلہ میں حلیفوں کی جماعت اور صورت حال کو برقرار رکھنا تھا۔ انقلاب ایران سے قبل خارجہ پالیسی کی فرہنگ میں اسلام سے مراد وہ معنی و مطالب تھے جو ان حکومتوں نے پیش

کیے تھے۔ عرب نیشنلزم کے مقابلہ میں اسلام کو ایک نظریاتی ہتھیار کی حیثیت سے سراہا گیا اور اخوان المسلمین اور جماعت اسلامی جیسی انقلابی تحریکوں سے کسی خطرہ کا تصور نہیں کیا گیا۔ 1979 کے انقلاب ایران نے اس علاقہ کی سیاست کے توازن میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس کے فوراً بعد ہی سعودی عرب کے سیاسی استحکام پر حملہ ہوا جب اسلامی انتہا پسندوں نے نومبر 1979 میں حرم مکہ پر قبضہ جمایا۔ دسمبر 1979 میں افغانستان پر سوویت حملہ نے معاملات مزید سنجیدہ کرائے۔ اول الذکر دو واقعات نے روایتی اسلام کی اہمیت کو مضبوط کیا۔ تیسرے واقعہ نے یونائٹیڈ اسٹیٹس کے سوویت مخالف عزائم کے لیے اسلام کو تیار کرنے کی عجلت کے احساس سے متعارف کرایا اور اس سلسلہ میں علما قبائلی سردار یہاں تک کہ انقلابی اسلامسٹوں سے مدد کو بھی ضروری سمجھا۔ اس طرح سے مطالبات پر مبنی پالیسی کو اختیار کرنے کی ضرورت ہوئی جو کہ متضاد تھے۔

سرد جنگ کے خاتمہ اور مصر اور الجزائر میں ہونے والے واقعات نے پالیسی پر نظرثانی کی ضرورت کو روشن کیا۔ جون 1992 میں یونائٹیڈ اسٹیٹس کے اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ ایڈورڈ جیریجیان نے سوال اٹھایا: 'یونائٹیڈ اسٹیٹس کی اسلام کی جانب کیا پالیسی ہونی چاہیے؟ ایک عالمی قائد کی حیثیت سے یونائٹیڈ اسٹیٹس کس طرح بحرانوں کے محور اور اس میں اسلام کے کردار کے بارے میں ایک سوچی سمجھی اور جامع پالیسی مرتب کرسکتی ہے'۔ جیریجیان نے کہا کہ (i) یونائٹیڈ اسٹیٹس کے خیال میں اسلام مغرب کے لیے کوئی آنے والا نظریاتی خطرہ نہیں ہے (ii) سرد جنگ کی جگہ کوئی دوسرا مقابلہ نہیں لے رہا ہے۔ (iii) اسلامی تحریکوں اور گروہوں کی پشت پناہی میں کوئی بین الاقوامی مدد شامل نہیں ہے لیکن ایران اور سوڈان کی سرگرمیاں سنجیدگی سے مشکوک سمجھی جاتی ہیں اور (iv) تمام مسائل کی جڑ سماجی ناانصافی اور جمہوری عمل کی غیر موجودگی ہے۔ اس نے مشورہ دیا کہ انتہا پسندوں اور اسلام کی اصل دھارا میں واضح امتیاز برتا جائے اور کہا کہ 'یونائٹیڈ اسٹیٹس اعتدال پسند مسلم حکومتوں کے ساتھ زیادہ مل جل کر کام کرے۔ اس نے تسلیم کیا کہ عرب اسرائیلی تنازعہ کے خاتمہ سے مسلمانوں میں مغرب مخالف جذبات مدھم ہونے میں مدد ملے گی'۔

1994 میں کلنٹن انتظامیہ کے افسران رابرٹ پلیٹرو اور اینتھونی لیک نے بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور 1995 میں وزارت خارجہ کے ایک افسر نے اس کا خلاصہ اس طرح کیا: 'ہماری پالیسی یہ ہے کہ اعتدال پسند اسلامی تحریکوں سے رابطہ کے سلسلہ کو جاری رکھا جائے' (96-1995 کے درمیان یو ایس کی حکومت افغانستان کی طالبان حکومت سے پینگیں بڑھا رہی تھی)۔

1992 کی پالیسی تین عناصر کے مجموعہ پر بنائی گئی تھی جن پر باری باری غور کرنے کے بجائے ایک ساتھ سمجھنا ہوگا: اعتدال پسند حکومتوں کو مسلسل تعاون؛ بتدریج تبدیلی کا نفاذ اور عرب اسرائیلی تنازعہ کا حل۔ اوّل الذکر کا نفاذ آسان تھا لیکن اس کی کامیابی نے دوسرے نمبر کے عنصر کی ترقی کی رفتار کو سست کر دیا۔ جہاں تک تیسرے عنصر یعنی قیام امن کے عمل کا تعلق ہے وہ اسرائیل کے غیر مصالحانہ رویہ اور یو ایس کی نااہلی کے باعث اپنی موت مر گیا لیکن جاتے جاتے انتفادہ کے دوسرے دور کو شروع کر گیا۔ نتیجہ کے طور پر وہ عرب رائے جو یونائٹیڈ اسٹیٹس کو روایتی ریاستوں کا محافظ سمجھتی تھی نے اس کو یو ایس کی سیاسی ارتقا سے غیر دلچسپی سے تعبیر کیا---- قیام امن کے عمل کی ناکامی اور فلسطین کی مقبوضہ سرزمین پر اسرائیلی پالیسیاں عوامی رائے کو انقلابیت کی طرف دھکیلنے لگیں اور ایک ایسی ذہنیت کو بنانے میں مدد کرنے لگیں جو بالآخر 11 رستمبر کے واقعات پر منتج ہوا۔ لہٰذا صورت حال کے اندرونی، علاقائی اور خارجی پہلو ایک ہی کل کے اجزاء بن کر اس لٹریچر کا حصہ بن گئے جس کو انقلابی اسلامسٹ پروپیگیٹ کر رہے تھے۔ اس کی تازہ ترین مثال 24 رنومبر کو شائع ہوئے اسامہ بن لادن کا مراسلہ 'امریکہ کے نام ایک خط' ہے۔

11 رستمبر کے واقعات کے بعد خطرہ سے گھرے ہوئے ماحول نے یہ لازم قرار دیا کہ پالیسیوں پر نظر ثانی کی جائے اور یہ 'یونائٹیڈ اسٹیٹس آف امریکا کی قومی تحفظ کی حکمت عملی' دستاویز سے صاف طور پر واضح ہے جس پر صدر جارج ڈبلیو بش نے 17 رستمبر 2002 میں دستخط کیے۔ اس دستاویز میں عالمی دہشت گردی سے مقابلہ کے حوالے سے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یونائٹیڈ اسٹیٹس 'نئی اور اعتدال پسند حکومتوں کو' خصوصاً اسلامی دنیا میں، تعاون دیتی رہے

گی تا کہ ان حالات اور نظریات جو دہشت گردی کو پروان چڑھاتے ہیں، کو زرخیز زمین میسر نہ ہو سکے۔ اسرائیلی۔ فلسطین تنازعہ کے حل کے لیے بھی حمایت کا وعدہ کیا گیا بشرطیکہ فلسطینی، حتمی طور سے دہشت گردی کو ترک کردیں، اور جمہوریت کو گلے لگائیں۔

رجحان میں ایک حساس لیکن ٹھوس تبدیلی یقینی ہے۔ کچھ سوالات کا جواب بھی دینا ہوگا۔ (1) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جدیدیت کے ہمیشہ بدلتے ہوئے تصور کے ساتھ مدد کو جوڑنے سے یونائیٹڈ اسٹیٹس ترقی کے مختلف مدارج میں ان معاشروں کے اقتدار پر قابو قائم رکھنا چاہتی ہے؟ (2) یونائیٹڈ اسٹیٹس کس حد تک اور کس رفتار سے، بغیر ان کو غیر مستحکم کیے، روایتی ریاستوں پر جمہوری عمل کی ترقی کے لیے دباؤ ڈال سکتی ہے؟ اور یہ کہ اگر اس دباؤ سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہوئے تو پھر کیا ہوگا؟ (3) ان معاشروں میں مخالف گروہوں (یعنی اعتدال پسند اسلامسٹ) کی جانب یو ایس کا کیا رویہ ہوگا (4)۔ 11 ستمبر کے واقعات کے بعد علاقہ میں سب سے زیادہ فائدہ اسرائیل ہی کو ہوا ہے اور وہ یقیناً یونائیٹڈ اسٹیٹس کی پالیسی میں ایک طویل مدتی، انتہاپسند رجحان دیکھنا چاہے گا۔ آخر یہ خواہش کس طرح سے تنازعہ کے جامع اور منصفانہ حل کے امریکی مقصد سے ہم آہنگ ہوگی؟(5) 1992 کی وضع شدہ پالیسی میں جو روابط تصور کیے گئے تھے کیا اب بھی وہ امریکی رجحان کا حصہ ہیں؟

پہلے سوال پر یو ایس کی سوچ غیر واضح ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نئی پالیسی وضع کی جائے جو علاقہ میں زورآور جمہوری عمل پر مبنی ہو اور اگر ضروری ہو تو اس سلسلہ میں تھوڑی نقشہ سازی بھی کی جائے۔ دوسرے افراد کا خیال ہے کہ امریکا کے مفادات کے مجموعہ کو دیکھتے ہوئے پچھلی پالیسی کے وسیع تر فریم ورک کو اختیار کرنا اب بھی بہتر ہوگا۔ دوسرے سوال پر عام اتفاق رائے ہے کہ روایتی ریاستوں پر دہشت گردی اور عراق کے خلاف جنگ میں شامل ہونے اور داخلی اصلاحات کو تیز تر کرنے کے لیے مسلسل دباؤ بنائے رکھنا چاہیے۔ یہ صاف نہیں ہے کہ تکنیکی طور سے ان میں کتنا کچھ عراق کے خلاف گٹھ بندھن بنانے میں استعمال ہو رہا ہے۔ اور نہ ہی اس ممکنہ ناکامی کے اثرات کی طرف کوئی دھیان دیا گیا ہے جو

خارجی دباؤ کے زیر اثر اصلاحات میں ہوسکتا ہے۔ سوال تذبذب میں مبتلا کرتا ہے کیونکہ پرانے طرز فکر کے عرب نیشنلزم کے خاتمہ کے بعد سیاست کی زمام کار، سرکاری حلقوں سے باہر، اعتدال پسند اسلامسٹ گروپوں کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا اگر حصہ داری کے طرز حکومت کو فروغ دینا ہے تو ان گروپوں کے ساتھ عارضی طور پر سہی مگر سمجھوتہ کرنا ہوگا۔ جہاں تک چوتھے سوال کا تعلق ہے تو گزشتہ مہینوں میں اس دلیل کے حق میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ اس کے باوجود ہیری روہن جیسے سخت گیر مبصر کا کہنا ہے کہ عربوں میں امریکن مخالف نظریات کی مزاحمت کرنے کے لیے یونائیٹڈ اسٹیٹس کو اپنے اور اپنے حلیفوں یعنی اسرائیل اور اعتدال پسند عرب ریاستوں کے مفادات کی مسلسل حفاظت ہے۔ یہی واحد راستہ ہے۔ آخر میں پانچویں سوال پر بش انتظامیہ کی سوچ اور عمل گہرے ابہام کا شکار ہے۔

آج امریکہ کی فوجی قوت اور اس کے اثر و رسوخ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ اس کے باوجود ایڈورڈ گبن نے انتباہ دیا ہے کہ 'خود قدرت کاملہ بھی اپنے غیر مطمئن پرستاروں کی دبی زبان سے شکایتوں سے دامن نہیں چھوڑا سکتی۔ مغربی ایشیا کی وہ ریاستیں جنھوں نے 92-1991 کے کویتی بحران میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کے کردار پر بغلیں بجائی تھیں آج ان کو یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ارادے مشکوک نظر آرہے ہیں۔ امریکن پالیسی کا بتایا گیا مقصد یہ ہے کہ اپنی قوت اور اثر کو امن خوشحالی اور آزادی کے فروغ میں ڈھالے۔ لیکن اس کے پورے عمل اور نظریہ میں انصاف کا تصور غائب ہے۔ فلسطین سے متعلق یونائیٹڈ پالیسی کی بے انصافی کا احساس اور اس پر غم و غصہ عرب یا مسلم ممالک تک محدود نہیں ہے اب یہ دوسرے ممالک تک جا پہنچا ہے۔ اور بلاشبہ یہ مغربی ایشیا میں انتہا پسندی کا بڑا سبب ہے۔ اگر فلسطینیوں کی شکایت کا احاطہ ایک کمتر درجہ کے نفرت و محبت کے جذبہ کے ساتھ کیا جائے تو کیا یہ دوستوں کی تعداد میں اضافہ نہ کرے گا اور انتہا پسندی کے عذاب سے نجات کی جدوجہد میں قوت نہ بخشے گا؟

حواشی

1۔ اس کے متن کو اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ 102 کے تحت پہلی فروری 1974 اقوام متحدہ میں رجسٹرڈ کرایا گیا تھا۔

2۔ کریمر، مارٹن۔ 'اسلام اسمبلڈ - دی ایڈونٹ آف مسلم کانگریسز' (کولمبیا یونیورسٹی پریس، نیویارک 1986) دستور کا متن صفحہ 91-186 میں دیا گیا ہے۔ دفعہ 4 کے تحت ہر شریک کو ووٹ دینے کا حق ہوگا'' کیونکہ ہندوستان مسلم آبادی کے لحاظ سے سب سے گھنا ملک ہے، اس کو چار ووٹوں کا اختیار ہوگا''۔

3۔ سفید ایڈورڈ ڈبلیو۔ ''اوریئنٹلزم'' (پینتھیون بکس، نیویارک، 1978) صفحہ 2

4۔ لٹل، ڈگلس۔ ''امریکن اوریئنٹلزم۔ دی یونائیٹڈ اسٹیٹس اینڈ دی مڈل ایسٹ سنس 1945 ''(یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا پریس، چیپل ہل، نارتھ کیرولینا، 2002) صفحہ 11

حوالہ سابق، صفحات 14-12، ساتھ میں دیکھیے پامر، مائیکل اے'' گارجینز آف دی گلف: اے ہسٹری آف امریکاز ایکسپینڈنگ رول ان دی پرشین گلف، 1833-1992 '' (فری پریس، نیویارک 1992)۔ پامر مسیحی تبلیغی مساعی کے

اندازہ کے لیے لارڈ کرزن کا حوالہ دیتے ہیں' اسلام ایک ناقابل تسخیر دیوار ہے۔ اس کے نظام میں زندگی کا ہر عمل، فرض اور پہلو شامل ہے۔ عیسائی مبلغین اسی دیوار سے سر پھوڑ رہے ہیں''۔ (صفحہ 9)

6۔ سفیر کے سفر کے حالات اور استقبال کی کیفیت امبیسیڈر ہرمین رالٹ کے تحقیقی مقالہ ''احمد بن نعمان رمشن ٹو دی یونائیٹڈ اسٹیٹس ان 1840۔ دی وویج آف السلطانہ ٹو نیو یارک سٹی' (اوّلاً 1962 میں طبع ہوئی۔ پٹرولیم ڈیولپمنٹ (عمان) لمیٹڈ نے نقش ثانی نکالا)۔

7۔ پامر، حوالہ سابق: صفحات 9-5، خلیج فارس سے برطانوی قبضہ کو ہٹانے کے لیے روس اور ایران نے جو سیاسی شاطرانہ کھیل کھیلا ہے اس کی تفصیل۔

8۔ حوالہ سابق، صفحات 10-9

9۔ حوالہ سابق، صفحات 19-16

10۔ سعید ایڈورڈ، ''کورنگ اسلام'' (پینتھیون بکس، نیو یارک، 1981)، صفحہ XV

11۔ جارجز، فواز اے ''امریکا اینڈ پولیٹیکل اسلام'' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، 1991) باب 3، صفحات 58-37: ''اسلام اینڈ مسلمز ان دی مائنڈ آف امریکا'' بھی مفید تفصیلات فراہم کرتا ہے۔

12۔ امریکا میں مسیحی تبلیغی مساعی اور وہاں کے سیاسی نظریات پر ان کے اثرات پر کافی مواد موجود ہے۔ ان میں سے کچھ مارٹن ای مارٹی اور آر۔اسکاٹ اپیل بائی کی ''اکاؤنٹنگ فنڈامینٹلزم'' (یونیورسٹی آف شکاگو پریس، شکاگو، ایسلوئیس، 1994)، صفحات 78-18، پیش کی گئی سطور صفحات 59 اور 75-74 میں ہیں۔

13۔ آخرالذکر کی ایک مثال صدر ٹرومین کا سب سے پہلے اسرائیل کو تسلیم کرنا تھا۔' اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹرومین کا فیصلہ اخلاقی، ثقافتی اور مذہبی خطوط کی طرز پر تھا (جیسے کہ انجیل کی یہ پیشین گوئی کہ یہودی ارض موعود کو واپس لوٹیں گے جو کہ عیسائی بنیاد پرستوں اور مبلغین میں خاص طور سے سرایت کر چکا ہے) بجائے قطعی

جغرافیائی، قومی سلامتی کے زاویۂ نگاہ سے‘۔ ابراہیم بن وزدی ’’ڈیکیڈ آف ٹرانزیشن۔آئزن ہاور، کینیڈی اینڈ دی اورتجنز آف دی امریکن۔اسرائیلی الائنس‘ (کولمبیا یونیورسٹی پریس، نیویارک، 1998) صفحہ 6

14۔ سفران نارو، ’’سعودی عربیہ۔ دی سیزلیس کوئیسٹ فار سیکورٹی‘‘ (ہارورڈ یونیورسٹی پریس، کیمبرج، میسا چوسٹس، 1985) صفحات 86-85

15۔ اسرائیلی، سارہ، ’’دی ری میکنگ آف سعودی عربیہ‘‘ (دیان سینٹر، تل ابیب یونیورسٹی، تل ابیب 1997) صفحہ 181، مصنف نے ایک سینئر سعودی افسر سے گفتگو کا امریکن ریکارڈ پیش کیا ہے۔

16۔ حوالہ سابق، صفحہ 122

17۔ یہ متن ہنری کیسنجر ’’ایرس آف اپ ہیول‘‘ (لٹل براؤن اینڈ کمپنی، بوسٹن میسا چوسٹس 1982) صفحہ 890 میں پیش کیا گیا ہے۔ کیسنجر نے اضافہ کیا ہے کہ ’’پابندی کے جاری رہنے سے تکلیف اور بے عزتی دونوں ہی ہوئیں۔ لیکن اس نے ہمیں کوئی بھاری نقصان نہیں پہنچایا: ’’وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ سعودی اتنے بھی ’’غیر ہمدرد نہیں تھے جتنا کہ تقریروں سے ظاہر ہوتا تھا‘‘۔

18۔ سفران، حوالہ سابق، صفحہ 172

19۔ حوالہ سابق، صفحہ 171

20۔ حوالہ سابق، صفحہ 359، برزنسکی کی کتاب ’’پاور اینڈ پرنسپلز‘‘ (فرّاز اسٹراس اینڈ جیرو کس نیویارک 1983) صفحہ 450 سے یہ اقتباس لیا گیا ہے۔

21۔ کورڈس مین، اینتھونی ایچ، ’’سعودی عربیہ۔ گارڈنگ دی ڈیزرٹ کنگڈم‘‘ (ویسٹ ویو پریس، بولڈر، کولاراڈو، 1997) صفحات 91-190

22۔ سعودیوں نے اسامہ بن لادن کے مسئلہ پر طالبان سے تعلقات ختم کر دیے۔

23۔ کورڈس مین، حوالہ سابق، صفحات 187-181

24۔ نائب صدر الگور کا 22/مارچ 1995 کو سعودی عرب میں آمد پر بیان۔ دوسرے

دن انھوں نے کہا کہ ''تعلقات سلامتی، سیاسی اور معاشی امور میں تعاون پر منحصر ہوتے ہیں اور ان تمام میدانوں میں ہمارے مفادات کا فیصد تک مشترک ہیں''۔

25- ڈیوڈ اوٹاوی اور رابرٹ کیسر، 'واشنگٹن پوسٹ' 12 رفروری 2002

26- پرنس ترکی الفیصل، ''اپلیڈ اگینسٹ میٹروورزم، 'واشنگٹن پوسٹ'، 17 رستمبر 2002

27- جارجز، حوالہ سابق، صفحہ 68

28- حوالہ سابق، صفحات 77-70، اسلام اور جمہوریت کے بارے میں کافی کچھ لکھا جاچکا ہے، بنیادی نص کے مطالعہ سے کوئی غیر ہم آہنگی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس، بہتر اور موزوں طرز حکومت کے بارے میں رہنما ہدایات، ایک ذمہ دار اور جوابدہ حکومت ہی کے زیر سایہ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ اس سے باہر، طرز حکومت کے بارے میں انتخاب متعلقہ معاشروں پر چھوڑ دیا گیا ہے جیسا کہ مصری عالم علی عبدالرازق نے 1925 نے اشارہ کیا تھا اور جس کو حال ہی میں مالک بن بنی، رشید غنوشی اور دوسروں نے بار بار دہرایا ہے۔

29- جیریجان، ایڈورڈ پی 'یونائیٹڈ اسٹیٹس پالیس ٹوورڈز اسلام اینڈ دی آرک آف کرائسس'' (بیکر انسٹی ٹیوٹ اسٹڈی نمبر 1، 1995) مضمون جون 1992 میں دی تقریر پر مبنی ہے۔

30- جارجز، حوالہ سابق صفحات 85-84، کورڈزمین، حوالہ سابق صفحہ 195 کے اقتباس سے قطعی صورت حال واضح ہوتی ہے ''مغرب کو سعودی عرب اور دیگر خلیج کی جنوبی ریاستوں پر مغربی طرز کی جمہوریت، قانونی نظام اور سماجی تبدیلی میں سیکولر رجحان لانے پر احتیاط سے دباؤ ڈالنا چاہیے''۔ خلیج میں تعینات ایک برطانوی سفیر نے 1997 میں لندن میں مصنف کے ساتھ اس کی رائے سے اتفاق کیا ''یا تو پانچ سال میں بدل جاؤ یا دس میں مصیبت کے سامنے کے لیے تیار ہو جاؤ''۔

31- یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس، ریاض

32- جارجز، حوالہ سابق، صفحات 97-92، تفصیل کے لیے

ہے، اور زیادہ حصہ، دوبارہ لکھا گیا ہے۔ اس کے اسباب سے وہ خود بہتر واقف ہوں گے۔ لہٰذا ان مضامین میں وقت کی تعیین نہیں ہے جس سے ایک مورخ کو مایوسی ہوگی اور کچھ مبصرین اس کو عقب بینی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ایم جے اکبر نے اپنے عالمانہ مقدمہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی عکاسی امیر خسرو، غالب، اکبرالہ آبادی اور اقبال کی شاعری سے کی ہے اور یہ پیچیدہ سوال اٹھایا ہے کہ آخر مسلم ذہن میں کب اپنے بارے میں اقلیت کا تصور ابھرا۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانی جڑوں سے وابستگی کو یاد رکھنا یا ان کو بھول جانا ہی تمام غلطیوں کا سبب ہے۔ کاش کوئی صرف جڑوں کی خوراک پر زندہ رہتا۔

کتاب کے بارہ حصوں میں جن موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے وہ ہیں: 'مسلمان اور تقسیم ہند' تقسیم کے بعد والے دور اور آج بھی مسلم قیادت کا فقدان، مسلم شناخت اور فرسودگی، ہندو مسلم تعلقات، فرقہ وارانہ تشدد، اور جسمانی علامتی کی تلاش، ہندوتوا کے اثرات، جدیدیت اور اصلاح سے متعلق سوالات۔ قلم وسیع رقبہ کا احاطہ کرتا ہے جس میں ذاتی تجربہ کی آزردگیوں اور درد کی عکاسی ہے۔ اس میں تلخ فیصلے اور اصلاح کے مشورہ بھی شامل ہیں۔ ایک قاری کی خواہش ہوگی اس صورت حال اور چیلنجز کے سامنے مسلم سوسائٹی کے مختلف ٹکڑوں نے ماضی میں کیا ردّعمل دکھایا اور آج بھی کیا ردعمل ہے، کی واقفیت کے لیے مزید سماجی تجدید کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مسلم کمیونٹی کی ایسی شبیہ، جیسا کہ مردم شماری اور نیشنل سیمپل سروے کی رپورٹوں سے ظاہر ہے، مضامین میں بیان کیے گئے سیاسی تصورات کے لیے موزوں پس منظر مرتب کرتی۔

آج کل کے بحث و مباحثہ اور گفتگو کا عام موضوع یہ سوال ہے کہ دوقومی نظریہ اور تقسیم ہند کے لیے مسلمان کہاں تک ذمہ دار ہیں۔ ہندوتوا کے حامیوں نے اس بحث کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کئی سال قبل مسٹر جناح یہ دعویٰ کر سکتے تھے؟ یہ نظریہ کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں اسی بزرگ شخصیت نے پیش کیا تھا اور جس کو تہذیبی قومیت کا نام دیا گیا۔ لہٰذا مسٹر جناح سرقہ کے مجرم تو ہو سکتے ہیں اختراع کے نہیں، جہاں

تک اس نظریہ کا مسلمانوں سے تعلق کا مسئلہ ہے تو کئی سوال سامنے ابھرتے ہیں۔ کیا تمام مسلمان یا ان کی اکثریت نے اس فیصلہ میں شرکت کی تھی؟ اگر نہیں، تو فیصلہ لینے والے کس طریقۂ عمل سے قوم کے نمائندہ ہوئے؟ اور اس فیصلہ کو دوسرے ہندوستانیوں کی تائید کیسے حاصل ہوئی؟ کیا یہ ایک شعوری طریق کار تھا یا غیر شعوری اور کیا یہ آزادانہ عمل تھا یا اس میں خارجی عوامل شامل تھے؟ مزید کہ موجودہ ہندوستانی مسلمان اخلاقی یا قانونی طور سے ان کارروائیوں کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں جو کہ پچھلی نسل سے سرزد ہوئیں؟۔ مسلم ذمہ داری کا یہ سارا مسئلہ، آکسفورڈ فلسفی گلبرٹ رائل کے الفاظ میں 'مسلسل گمراہ کن اصطلاحات' معاملہ ہے جو حقیقت کو جھٹلاتے ہیں اور غلط تصورات قائم کرتے ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے مفاد میں بہتر یہ ہوگا کہ اس بحث کو ختم کر دیا جائے۔ ہمیں یہ مسئلہ مورخین پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ ماضی کو کھنگالیں اور مستند حقائق کو سامنے لائیں۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہم ماضی میں نہیں رہ سکتے ہیں نہ ہی منصوبوں اور تدبیروں کے ساتھ اور نہ ہی اس کے برعکس۔

رفیق زکریا نے فرقہ وارانہ فسادات۔ جو 2002 میں گجرات میں نسل کشی کی حد تک پہنچ گئے۔ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں جس محرومی سے مسلمان دوچار ہیں، پر بہت دکھ کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے مسز اندرا گاندھی کے 1980 کے قائم کردہ ایک اعلیٰ اختیارات کے پینل کی رپورٹ سے اقتباس پیش کیا ہے۔ مسلم محرومیوں کی ایک تصویر ''نیشنل کونسل آف اپلائیڈ اکنامکس ریسرچ'' کی جانب سے حالیہ سالوں میں کیے گئے ایک مطالعہ سے بھی واضح ہوتی ہے۔ اس مطالعہ کا حاصل دو جملوں میں بیان کر دیا گیا ہے: 'ہندوستانی مسلمانوں کا انسانی فروغ بہت کم درجہ پر ہے۔ عمومی ناخواندگی، کم آمدنی، غیر مستقل روزگار جو کہ غربت کی جانب ڈھکیلتا ہے، سب مسلمانوں میں موجود ہیں۔ ایک اور تجزیہ نگار کے الفاظ میں کہ مسلمانوں کو ''دوہرے امتیاز کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اول تو یہ کہ مسلمان ہیں دوسرے یہ کہ غریب''۔ نتیجہ کے طور پر ملک کی سیاست انتظامیہ اور دفاعی ڈھانچہ میں ان کی نمائندگی بہت ہی کم ہے۔ ملک کی داد و دہش میں بینک کے قرضوں، تعلیمی سہولتوں وغیرہ کی شکل میں جو مقدار ان کو حاصل ہوتی ہے وہ بہت ہی مایوس کن ہے۔ اس

نصف صدی کے تجربہ کی روشنی میں، قانون ساز اسمبلیوں میں اس موضوع پر بحث کے لیے دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔

یہ مسئلہ پانچ دہائیوں سے جاری ہے۔ جواہرلعل نہرو نے وزرائے اعلی کے نام اپنے 26 اپریل 1954 کے مراسلہ میں ان میں سے کچھ منتخب مسائل کی جانب توجہ دلائی تھی۔ اور یہی سبب ہے کہ یو پی اے کے کم سے کم مشترکہ پروگرام (CPM) میں مختلف میدانوں میں اقلیتوں کی فلاح کا سوال اٹھایا ہے۔ قومی سرگرمیوں کے تمام میدانوں میں ان کی بھرپور حصہ داری کے لیے ان کی اختیار کاری لازمی ہے۔ مسلمان اور دیگر اقلیتیں ہماری آبادی کا 18 فیصد حصہ ہیں اور کوئی بھی ملک آبادی کے اتنے بڑے ٹکڑے کو حاشیہ پر رکھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

یہی سوال ہمیں کتاب کی اصل تحقیق کی طرف لاتا ہے۔ کیا اپنی موجودہ حالت کے ذمہ دار خود ہندوستانی مسلمان ہیں؟ کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ کہیں، کسی طرح سے غلط راہ پر گامزن ہو گئے ہوں۔ کیا ان سب کا تنہا اور خاص سبب 1947 میں تقسیم کو روکنے میں مسلمانوں کی نااہلی اور ناطاقتی ہے اور اس تقسیم سے جو نفسیاتی اور جسمانی نتائج برآمد ہوتے ہیں ان سے نبردآزما ہونے میں ان کی بیزاری ہے؟ دائل کا یہ راستہ ہمیں کس منزل پر پہنچائے گا؟ کیا ہندوستان جیسے تکثیری سماج جو شعوری طور سے لسانی اور مذہبی اقلیتوں کو جگہ فراہم کرتا رہا ہے پیچیدہ معاشرتی ثقافتی حالات کی تائید و توضیح سوچے سمجھے عمل اور عدم عمل کی روشنی میں کی جاسکتی ہے؟ ڈاکٹر زکریا کا مقصد اعلی اور قابل تعریف ہے۔ لیکن ان کا تجزیہ شناخت کی توثیق اور اس کی مجوزہ کمزوریوں کے درمیان چکر لگاتا رہتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ایک بار مسلمان ہندوؤں سے جھگڑا مول لینے کی اپنی پرانی عادت فراموش کردیں، اور قومی دھارا میں شامل ہوجائیں تو ہندو مسلم اتحاد حاصل ہو جائے گا۔ فرسودہ شناخت کے حوالہ سے وہ اپنی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ یگانگت کے لیے ظاہری حالت بھی کم اہم نہیں ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر عمل میں باہمی گفت وشنید و مذاکرات معقول اور منصفانہ ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے گذشتہ سالوں میں دیکھا ہے زمینی حقیقت اس سے کہیں زیادہ تند وسخت ہے۔

ہمیں واضح طور پر ایک وسیع تر تناظر کی ضرورت ہے۔ دلائل کو قطعیت کے ساتھ دستور کے اصولوں یعنی مساوات اور تنوع کی ضمانت کی توثیق پر ہونا چاہیے۔ لوگوں کے خیال میں اقلیتیں خواہ مخواہ کا بوجھ ہیں۔ ایسے لوگ قومی اور بین الاقوامی ضابطوں سے نابلد ہیں۔ جدید ہندوستان اقلیتوں کو ایک متنوع اور مالامال اکائی کی جہتوں میں اضافہ تصور کرتا ہے۔

تو ہم پھر کس طرح ڈاکٹر زکریا کی بتائی ہوئی مشکلوں یعنی قیادت، اصلاح اور جدیدیت سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کو ایک ہی ساتھ سلجھانا ہوگا۔ ہندوستانی مسلمان اپنی ہی نظر میں اپنے مسائل کی ترجیحی فہرست اس طرح تیار کر سکتے ہیں؛ جان کی سلامتی، روزگار اور تعلیم۔ ان میں سے ہر ایک شدت عمل کے دائرہ میں ہے اور کم سے کم مشترکہ پروگرام، میں فروغ دیے گئے فریم ورک میں ہے اور ایک بااثر نفاذ کا مستحق ہے۔ دوسری جانب مسلمانوں میں مختلف درجہ کے کوتاہ نظر گروہ ہیں جو مسائل کے ایک اور سیٹ کو مقدم سمجھتے ہیں جیسے لڑکیوں کی تعلیم، اصلاح معاشرہ اور ایک صحیح اور اصل سیکولر نظریہ کا فروغ جو کہ مسلمانوں کے مسائل کی جانب محض ایک تنگ غیر فرقہ وارانہ رنگ نہ لیے ہو۔ یہ سول سوسائٹی کی سطح پر ایک نئے رجحان کا طالب ہے جو روایتی قائدین کے ٹکڑوں کو باہر نہ کرے کیونکہ عوامی خیالات پر ان کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بیان ضابطہ کی زبان مختلف ہو اور اس میں امتیاز برتا جائے اور وہ ترغیب دلانے والی ہو نہ کہ طے شدہ ہدایات کی شکل میں۔ وسائل کے پہلے سیٹ کو کامیابی سے حل کرنے میں سبھی دوسرے سیٹ کے تصور میں تبدیلی کے لیے جس اثر پذیری کی ضرورت ہے میں مدد ملے گی۔ پانچ دہائیوں تک ہندوستانی مسلمانوں کی شناخت کی تعریف کو کامیابی کے ساتھ قومی اور زمینی حوالوں میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے فکری عمل میں بنیادی اصلاح کے پیش نظر اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جستجو کے دائرہ کو وسیع کیا جائے اور قوم کے قائدین اور ممتاز افراد بھی وہ طرز فکر اختیار کریں جو دوسرے مقامات کے مسلم معاشرے اور مفکرین جو جدیدیت کا سامنا کر رہے ہیں، سوچتے ہیں۔

قیادت بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ رفیق زکریا مولانا آزاد اور 23 اکتوبر 1947 کو مسلمانان دہلی سے ان کے یادگار خطاب کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ وقت کا تقاضہ ایک شکستہ اور مجروح قوم کی قیادت کا تھا؛ مولانا کی اپنی تقریر طنز و تشنیع اور الزام سے آراستہ تھی اور یہ اس طرز تخاطب سے بالکل جدا تھی جو انھوں نے 1940 میں رام گڑھ کے انڈین نیشنل کانگریس کے صدارتی خطبہ میں اختیار کیا تھا۔ واقعات کے اس رخ پر ان کی تلخی قابل فہم ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ انھوں نے قیادت چھوڑنے کا فیصلہ اس وقت کیا جب اس کی ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ ماضی قریب میں اکثر دوسرے لوگ تقسیم سے متاثر معاون جراثیم کا شکار ہوئے۔ جو دعوی میں مذہب، عمل کے متمنی، جس کو مسلمانوں نے ہچکچاتے ہوئے مانا اور اکثریتی کمیونٹی نے ڈھیلے ڈھالے یقین کے ساتھ تسلیم کیا۔

بلاشبہ ایک نئے رجحان کی ضرورت ہے۔ ایک پر اعتماد اور زور آور نوجوان نسل چاہتی ہے کہ اس کے حق مساوات کو تسلیم کیا جائے اور واضح الفاظ میں اس کا نفاذ کیا جائے۔ وہ ضائع جانے والے مواقع اور رائیگاں جانے والے وقت کا بھی احساس رکھتی ہے۔ اسی کرب کو رفیق زکریا نے 2002 کے حکیم عبدالحمید میموریل لکچر میں اس شعر کے ذریعہ بیان کیا ہے۔

اغیار مہر و ماہ سے آگے نکل گئے
الجھے ہوئے ہیں صبح کی پہلی کرن سے ہم

یہ ارتقا جوش آئند ہے۔ اس میں عمل سے تعاون بھی ہے اور تیزی بھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کا دعوی ہے جیسا کہ اکتوبر 1947 میں مولانا آزاد نے کہا تھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ اس کی قسمت کا ہر فیصلہ اس وقت تک نامکمل ہوگا جب تک کہ اسے ہماری رضامندی حاصل نہ ہو۔

اس کا حقیقت کا روپ دھارنا ہی ان کی اختیار کاری کی آزمائش ہوگا اور یہی اس خواب کی تعبیر ہوگی جو اس کے بانیوں نے دیکھا تھا۔

دوسرا حصہ

بھنور کے گھیرے میں

خلیج فارس کی پاسبانی-I

نومبر 1970 میں یو ایس نیشنل سیکورٹی کونسل نے اعلان کیا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کا خلیج فارس سے کم سے کم سلامتی مفاد وابستہ ہے۔ 1980 میں،''کارٹر ڈاکٹرائن'' میں ایک متضاد بیان میں کہا گیا کہ''کسی بھی خارجی قوت کی یہ کوشش کہ وہ خلیج فارس کے علاقہ پر قابو پا لے یونائیٹڈ اسٹیٹس کے اہم مفادات پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ (1) پچھلی دو دہائیوں کے واقعات نے مؤخرالذکر اعلانیہ کو باقی رکھا ہے اول الذکر کو نہیں۔ علاقہ کی جغرافیائی سیاست میں خلیج کی مرکزیت اب بدیہی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات میں خلیج فارس ایک علاقائی ذیلی نظام تصور کی جاتی ہے۔ یہ تصور 1958 میں لیونارڈ کے نظریہ میں بائنڈر نے متعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد سے اس نظریہ کو بشمول مائیکل برلیشر دوسروں نے بھی پروان چڑھایا اور وضاحت کی۔ مائیکل بریسٹر نے اس تصور کو علاقائی ماہرین اور بین الاقوامی تعلقات کے مفکرین کے درمیان فاصلہ کو مٹانے کا ذریعہ بنایا۔ ایک علاقہ کے آپسی تال میل پر توجہ مرکوز رکھنے کی وجہ سے اس کے علاحدہ پسندی، ایک ملکی اور الگ مطالعہ کے رجحان پر جیت حاصل کی۔ لہٰذا یہ تصور تجزیہ و تحلیل کا ایک ذریعہ ہے، بجائے خود مقصد نہیں ہے (2) جہاں تک سالمیت و حفاظت کا

سوال ہے بیری بزان نے کہا ہے یہ ان ریاستوں کا مجموعہ ہے جن کے بنیادی حفاظتی رشتے آپس میں اتنی مضبوطی کے ساتھ مربوط ہیں کہ حقیقتاً ان میں کسی کی بھی قومی سلامتی دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھی جاسکتی۔ اس تعریف کے مطابق خلیج فارس کا علاقائی نظام، خلیج کی علاقائی ریاستوں پر مشتمل ہے جس میں ایران، عراق، کویت، سعودی عرب، بحرین، قطر، امارات اور عمان شامل ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی نظام خلا میں قائم نہیں ہوتا، دیگر نزدیکی نظاموں جیسے مغربی ایشیا، وسطی ایشیا، بحر احمر/افریقہ کا سسپنگ سے کچھ اقدار میں اشتراک ناگزیر ہے۔ تجزیہ کے مقصد کے لیے ذیلی ریاستوں کے کردار، نسلی اور گروہی مفادات پر معنی چھوٹی بڑی تنظیمیں جیسے اوپیک، اواے پی اے سی، جی سی سی، عرب لیگ اور اقوام متحدہ بھی شامل کی جاسکتی ہیں۔

ابن خلدون نے کہا ہے کہ ''تاریخ نگاری میں ایک پوشیدہ خطرہ اس حقیقت کا نظرانداز کرنا ہے کہ وقت اور زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ قوموں اور نسلوں کے حالات بدلنے لگتے ہیں''(3) اس وجہ سے یہ مناسب ہوگا کہ علاقہ کے خاص کرداروں کے اندازنشست، مقام اور مفادات کو سمجھنے کے لیے جدید زمانہ میں خلیج فارس کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔

جے۔ پی۔ کیلی نے انیسویں صدی میں خلیج میں برطانوی وابستگی سے متعلق اپنی معروف تاریخ میں لکھا ہے کہ ''خلیج فارس طاقت کے حصول کے لیے سمندر میں برتری لازمی ہے''(4) اس کے اس بیان کی تائید علاقہ کی تاریخ کے موضوع پر جدید، وسطی اور قدیم تحریروں کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔ ہمارے محدود مقصد کی خاطر یہ کافی ہوگا کہ ہم یہ ذہن نشیں کرلیں کہ پندرہویں صدی کے آخر میں ایک طاقتور ایرانی قومی ریاست کا قیام اس علاقہ میں پرتگالیوں کی آمد سے ٹکرایا۔ پرتگالی بادشاہ نے اپنے لوگوں کو اس وقت ''ایران، عرب، حبشہ اور ہندوستان کی فتح، سمندری مہارت اور تجارت کے آقا'' کا خطاب دیا(5)۔ 1515 میں ہرمز پر پرتگالی قبضہ اور خراج کی ادائیگی سے انکار پر شاہ ایران نے کہا کہ ''ہمارے قومی وقار اور سلطنت کی خوشحالی کے منافی ہے''۔ پرتگالی قبضہ نے یوروپ اور ایشیا کے درمیان پرانے اور روایتی تجارتی راستے کو درہم برہم کردیا۔ دوبارہ کیلی ہی کے مطابق

''اپنی روایتی کارکردگیوں سے محروم و عاری، خلیج ایک صدی تک پرتگالی قبضہ میں سسکتی رہی۔ پرتگالیوں کا اس کے پانی پر قبضہ تھا، پرتگالی گورنر حکم ناموں کے ذریعہ تجارت کو سنبھالتے تھے اور ہرمز کا عظیم قلعہ، جو کہ پرتگال قوت کا مظہر بھی تھا، خلیج میں داخلہ پر نظر رکھتا تھا۔ خلیج کی کوئی بھی ریاست، یہاں تک کہ ''صفوی ایران بھی پرتگالی گرفت کو ڈھیلا نہیں کرسکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان میں سے کوئی اور، سب سے کم ایران، پرتگالیوں کو سمندر میں للکار نہیں سکتا تھا''۔ یہ بالادستی 1622 تک قائم رہی۔ اس وقت ایران کی طاقتور سلطنت کو انگریزوں کی صورت میں ایک بحری حلیف میسر آیا۔ خود انگریزوں کو اپنی تجارت کے بارے میں پرتگالیوں کی جانب سے خدشات تھے۔ نتیجہ کے طور پر آخرالذکر کو باہر نکال پھینکا گیا اور خلیج اور ایران کے بازاروں کے دروازے انگریزی تجارت کے لیے کھل گئے۔ اس وقت انگریزوں کی دلچسپی قیام سلطنت سے زیادہ تجارتی فروغ پر تھی۔' 1747 میں نادر شاہ کی وفات کے ساتھ ہی تسلط کی برقراری کی ایرانی کوششیں ختم ہوگئیں اور اب یہ شط العرب کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ خلیج کے پانیوں پر اقتدار کے لیے آپس میں مقابلہ آرائی کریں، (6) اس صورت حال نے نزاع اور بحری قزاقی کو جنم دیا۔ آخرکار انگریزوں کو مداخلت کرنا پڑی اور ساحل کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو مجبور کرنا پڑا کہ وہ 1820، 1839 اور 1853 کے معاہدوں پر دستخط کریں۔ اس پر برطانیہ کی خوشنودی کا اظہار تشکر ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے 1903 میں ان الفاظ میں کیا ''ان پانیوں کا امن یقینی طور سے باقی رہنا چاہیے۔ آپ کی آزادی برقرار رہے گی اور برطانوی حکومت کا اقتدار اعلیٰ یقیناً باقی رہنا چاہیے''۔(7) یہ صورت حال ڈیڑھ سو سال تک جاری رہی اور 30 نومبر 1970 کو اس کا خاتمہ ہوا۔

اس پس منظر میں خلیج فارس کی ساحلی ریاستوں کی قومی سلامتی کا اندازہ کرنے کے لیے اور ساتھ میں خاص اہم کارکنان، کیونکہ ضرورت کے وقت انھوں نے برطانیہ کے انخلا سے قبل اور اس کے بعد حالات کے ارتقا میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، ساٹھ کی دہائی کے درمیانی اور آخر کے سال مناسب نکتہ فراہم کرتے ہیں۔

ابتدا ایران سے کی جا سکتی ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے وسط میں ایرانی شہنشاہیت نے (سی آئی اے کی کھلم کھلا مدد کے ساتھ) مصدق کے ضرر رساں ماہ و سال پر فتح پالی تھی اور مذہبی مخالفین کو زیرزمین جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اندرونی محاذ پر بے فکر ہونے کے بعد شاہ ایران میں یہ اعتماد پیدا ہوا کہ اب ایران خلیج کی قیادت کی دعویداری کر سکتا ہے۔ اس اعتماد کے پیچھے مندرجہ ذیل عناصر کارفرما تھے۔ اوّل تو خلیج کا ساحل 1200 رکلومیٹر تک ایران سے ملتا تھا۔ دوم یہ کہ آبنائے ہرمز میں ٹینکروں کے راستے کے لیے وہ عمان کے ساتھ مشترک کنٹرولر تھا۔ سوم تیل کی برآمدات کے لیے خلیج کے ذریعہ اپنی بقا کی لائف لائن۔ چہارم یہ کہ خلیج کے ساحل پر ایران واحد غیر عرب ریاست تھا۔ پنجم سرد جنگ میں ایران مغرب کا صف اول کا حلیف تھا اور ششم یہ کہ اس کے اسرائیل سے دوستانہ تعلقات تھے اور جون 1967 کی چھ روزہ جنگ کے بعد اس کو عرب نیشنلزم سے بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس سے قبل شاہ نے سوویت یونین کی جانب پالیسی میں تبدیلی کا اشارہ کیا تھا جب 1962 میں انھوں نے ایرانی سرزمین پر امریکی میزائیلوں کی تنصیبات سے انکار کر دیا اور 1965 ہند پاک تنازعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سینٹو کی حفاظتی چھتری کا 'یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مقامی خطروں، جیسا کہ شاہ کا خیال تھا، کے مقابلہ میں ان کا دفاع کرے گا'۔ لہٰذا اب ان کی توجہ ایران کی اپنی دفاعی صلاحیت کی طرف مبذول ہوئی۔ مارچ 1965 میں انھوں نے اعلان کیا کہ ان کی دفاعی تیاریاں اب سے خلیج فارس پر مرکوز ہوں گی۔ اس میں ایران، ترکی اور پاکستان کے دسمبر 1967 کے مشترکہ اعلانیہ نے مزید وزن پیدا کیا جس میں کہا گیا تھا کہ خلیج فارس کی اُس سلامتی کی ذمہ داری صرف ساحلی ریاستوں پر ہی عائد ہوتی ہے(8)۔ برطانوی انخلا کے بعد اور خلیج میں ان سے متعلق یونائیٹڈ اسٹیٹس کی 'جڑواں ستون' کی پالیسی کے رجحان کی وجہ سے، ایران کے یہ تصورات زیادہ مضبوط ہو گئے۔

اس قوس قزح کے دوسری جانب عراق تھا۔ 1958 کے انقلاب نے خلیج کی ساحلی ریاستوں میں عراق کو واحد غیر مطلق العنان حکومتی ریاست بنا دیا تھا۔ عراق کی عرب نیشنلزم کے ساتھ ہم آہنگی اور اس کی مغربی نظامِ اتحاد کی مذمت نے اس کو ایران کا صف

اوّل کا حریف بنا دیا اور دونوں پڑوسیوں کے پرانے سرحدی تنازعات، شط العرب کا مسئلہ اور 1937 کا معاہدہ بھی ابھر کر اس میں شامل ہوگئے۔ سابق ایرانی سفیر جعفر رائڈ کے مطابق صدر عبدالرحمٰن عارف اور شاہ ایران کے درمیان مارچ 1967 میں یہ طے پایا تھا کہ شط العرب کا مسئلہ ایران کی تسلی اور اطمینان کے مطابق حل کیا جائے گا اور اس کے بدلہ میں ایران عراق کے ساتھ دوسرے تنازعات بھی سلجھائے گا اور کردوں کو امداد دینا بند کرے گا۔ اس ملاقات کے بعد ایک مشترکہ اعلانیہ میں یہ بھی کہا گیا کہ سرحدوں پر بہنے والے دریاؤں کا پانی بین الاقوامی قانون کے مطابق استعمال کیا جائے گا (9) لیکن اس اعلانیہ کے نفاذ میں کچھ تاخیر ہوئی۔ 1967 کی عرب اسرائیل جنگ نے ممکن ہے خیالات میں تبدیلی پیدا کی ہو۔ عارف کو جولائی 1968 کی بعث پارٹی بغاوت نے اقتدار سے محروم کردیا اور نئی عراقی حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے حالات مزید ابتر ہوگئے۔ اپریل 1969 میں ایران نے یکطرفہ طور پر 1937 کے معاہدہ کو رد کردیا۔ علاقائی واقعات اور سرد جنگ میں جھکاؤ نے حالات میں اور شدت پیدا کی۔ اس پس منظر میں خلیج کے جزیروں پر ایران کے قبضے پر عراق کی مذمت پالیسی کے معروف تصورات کے خطوط پر تھی۔ ہنری کیسنجر نے آنے والی نسلوں کے لیے اپریل 1973 میں چواین لائی کے ساتھ ہونے والا ایک مکالمہ محفوظ کیا ہے جس میں چینی وزیراعظم نے زور دیا تھا کہ 'یونائیٹڈ اسٹیٹس کو چاہیے کہ وہ انقلابی عراق کو خلیج فارس پر بالادستی حاصل کرنے سے روکے' اور بعد میں یہ بھی اضافہ کیا کہ 'اس کے برعکس شاہ ایران ایک دوراندیش قائد ہیں جنھیں دنیا کی سمجھ بوجھ ہے' (10) کیسنجر نے یہ خبر بھی دی کہ شاہ نے کہا کہ وہ عراق کو مصروف رکھنے کے لیے کرد باغیوں کی مدد جاری رکھے اور ساتھ ہی محاذ کے نزدیک ایک بڑی فوج کو تیار رکھے گا (11)۔ اس رجحان کی معقولیت کے پس پردہ وہ اندیشے اور خدشات تھے جو علاقہ کی اعتدال پسند مغرب کی حمایتی حکومتوں کو انقلابی عراق کی جانب سے لاحق تھے۔ مزید اپریل 1972 کی ''عراق۔ یو ایس ایس آر فرینڈشپ ٹریٹی'' میں جو اشارے تھے ان کی روشنی میں روس کے زبردستی چڑھ دوڑنے کا خوف بھی تھا۔ (لیکن معاہدہ میں موجود یقین دہانی کے باوجود روس نے شعوری طور پر ایران سے تعلقات میں ایک

توازن قائم رکھا۔ خلیج کے جزیروں پر عراق کے موقف کی حمایت نہیں کی اور اکتوبر 1972 میں ایران کے ساتھ معاشی اور تکنیکی تعاون پر ایک پندرہ سالہ سمجھوتہ پر دستخط بھی کیے)(12)۔ ایران وعراق میں تعلقات کے مابین یہ تناؤ چلتا رہا حالانکہ اس دوران خاموشی کے ساتھ صلح وصفائی کی کوششیں بھی کی گئیں۔ جنوری 1975 میں ایران کے وزیر خارجہ نے استنبول میں اپنے عراق ہم منصب سے ملاقات میں 1967 کے سمجھوتہ کو پھر سے دوہرایا اور مشورہ دیا کہ اگر عراق شط العرب کے معاملہ میں ایران کے مقاصد کو قبول کرلے تو ایران کو بھی دوسرے زمینی سرحدی معاملات میں لچکداری دکھانا ہوگی (13)۔ یہ تمام خیالات وآرا آخرکار مارچ 1975 میں جو دو معاہدہ وجود میں آئے ان میں دعویٰ کیا گیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان تمام متنازعہ معاملات کا آخری اور مستقل حل، ڈھونڈ لیا ہے۔

خلیج کی ساحلی ریاستوں میں تیسرا بڑا کھلاڑی سعودی عرب ہے۔ ان کی پرانی تشویش اپنی سرحدوں سے متعلق ہے اور ساتھ میں جزیرہ نمائے عرب میں بالادستی کی کوشش ہے۔ 67-1964 کی مدت میں سعودی عرب اپنی سرحدوں پر یمن کی جانب سے انقلابیت کے خطرہ سے دوچار تھا۔ چھ روزہ جنگ میں مصر کی شکست نے یہ مسئلہ حل کردیا لیکن ایک اور ابھر کر سامنے آگیا اور یہ عدن سے برطانوی انخلا کے بعد، پی ڈی آر وائی، کا اقتدار میں آیا تھا جو مارکسی نظریات کی حامی تھی۔ سعودیوں نے پی ڈی آر وائی کے اثر کو زائل کرنے کے لیے وائی اے آر کا استعمال کیا لیکن اس کو محدود کامیابی حاصل ہوئی۔ ذوفار باغیوں کو جنوبی یمن کی حمایت (اور دنیا کی کمیونسٹ طاقتوں اس میں شمولیت) نے سعودی عرب کو مجبور کیا وہ عمان کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لائے اور ذوفار جنگ میں سلطان آف عمان کی حمایت میں ایران کی فوجی امداد کو صحیح ٹھہرائے۔ ان وسیع حکمت عملیوں کے پیش نظر سعودی عرب نے اپنی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایران کی مدد چاہی اور اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کے اصول پر (شاہ کے بحرین کی آزادی پر راضی ہونے کے بعد) وہ شاہ کو چھوٹ دے گا کہ برطانوی انخلا کے بعد وہ خلیج کی سلامتی میں اپنے کردار کو نمایاں کرسکتے ہیں۔ یہ آرام دہ بندوبست 1973 کے تیل کے بحران اور تیل برآمد کرنے والے ملکوں میں تیل کی نئی دولت

کی آمد نے درہم برہم کر دیا اور اس کا پہلا نتیجہ خلیج میں ایک ایک نئی سینہ زوری تھی اور دوسرا نتیجہ عراق کے رویہ میں اعتدال اور یونائیٹڈ اسٹیٹس اور قدامت پرست عرب حکومتوں کے ساتھ تعلقات کی گنجائش کی تلاش کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لہٰذا 75-1973 تک سعودی پالیسی کا انحصار یونائیٹڈ اسٹیٹس ایران پر نگاہ رکھے اور ایران عراق کی خوش فعلیوں کو چیک کرتا رہے، پر تھا۔ اس طرح ایک ایسا توازن قائم رہے گا جو ریاض کا پسندیدہ ہو۔ لیکن الجزائری سمجھوتہ کے بعد والی مدت میں سعودی عرب کی کوشش یہ تھی کہ شاہ کے ایک کل علاقائی سلامتی سمجھوتہ کی اسکیل کی رفتار کم کرنے یا اُسے بے اثر کرنے (جس کی کامیابی یقیناً ایران کو بالادستی دے گی) کے لیے عراق کا استعمال کرے، اور ساتھ ہی ساتھ عراق اور دیگر خلیجی ریاستوں کے درمیان دو طرفی معاہدوں کی مخالفت کے لیے (یہ معاہدے عراق کے ایک مرکزی مقام کو یقینی بنا دیتے) ایران کو استعمال کرے۔ اپریل 1975 میں معاملہ کو آگے بڑھانے کے لیے ایرانی اصرار پر سعودی عرب کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اپنے پتے کھولے اور اس نے اپنے نظریات کو پانچ اصولوں میں بیان کیا: (i) خلیج میں سے عالمی طاقتوں کا اخراج، (ii) کسی بھی عالمی طاقت کو خلیج میں اڈے بنانے سے انکار، (iii) آبنائے ہرمز میں آزادانہ جہازرانی کے لیے خلیجی ممالک کا باہمی فوجی تعاون، (iv) علاقائی تنازعات کا پرامن حل اور (v) تمام خلیجی ریاستوں کی سرحدوں کی حفاظت و سالمیت کے لیے ایک مجموعی ضمانت۔ (14) شاہ کے خیال میں یہ اصول خلیج کی مجموعی حفاظت و سالمیت کے بارے میں اس کے اپنے نظریہ سے کمتر تھے۔ دوسری جانب عراق کو بھی کسی ایسے بندوبست میں ایران کی بالادستی نظر آئی۔

اس مرحلہ پر عمان نے، غالبًا ایران کے اشارے پر، مسقط میں ساحلی ریاستوں کے وزرائے خارجہ کی میٹنگ بلائی (26-25 نومبر 1975) (15) اس میٹنگ میں گفتگو چھ نکات پر مرکوز رہی: (i) علاقہ میں باہری قوتوں کی موجودگی کو محدود کرنا، (ii) ریاستوں کی زمینی حدود کی حفاظت کی ضمانت، (iii) غیر حملہ آوری پر معاہدہ، (iv) تخریب کاری کے خلاف باہمی امداد اور خفیہ اطلاعات میں تعاون، (v) آزادانہ جہازرانی کے تیقن کے لیے اقدام اور

(vi) خلیج کے پانیوں کی حد بندی اور کونٹینٹل شیلف (زم لحافوں) کی حدود کا قیام۔ شرکا نے کئی مقالے داخل کیے اور ان پر مباحثہ بھی ہوا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ مشکلیں اس وقت بڑھیں جب ایران نے مشترکہ کمانڈ کے تحت ایک متحدہ، کثیر جہتی فوج کی تشکیل کی تجویز پیش کی تا کہ اندرونی اور خارجی دفاعی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے اور ساتھ ہی آبنائے ہرمز میں خطروں سے عاری راستہ کے لیے ایک زیادہ قانونی تنظیم بنائی جائے۔ عراق نے دونوں ہی تجاویز کی مخالفت کی۔ سعودی عرب نے ان اختلافات میں کوئی حصہ نہیں لیا اور مفاہمت کی کوئی کوشش رائیگاں ثابت ہوئی۔ ایک مہینہ قبل سعودیوں نے خلیج کی عرب ریاستوں کی داخلی سلامتی کے لیے ایک معاہدہ کی تجویز پیش کی تھی۔ اس کو بھی خاطر خواہ حمایت حاصل نہ ہو سکی۔

آخرکار جون 1978 میں افریقہ کے سینگ میں ہونے والے واقعات کے پیش نظر تیل کے راستوں کی حفاظت سے متعلق اندیشوں نے دوبارہ سر اٹھایا اور شاہ نے مشترکہ دفاعی انتظامات کی اپنی تجویز کی پھر تجدید کی (16)۔ افغانستان میں اپریل 1978 میں واقع تراکی بغاوت نے شاید عراق کے نظریہ کو متاثر کیا اور عمان کی جانب سے مئی 1978 میں جاری کردہ تجاویز کو بغداد کی جانب سے مثبت جواب ملا۔ نتیجہ کے طور پر جون میں ایران، عراق اور سعودی عرب میں مذاکرات ہوئے لیکن ایران کے شکوک پھر آڑے آئے۔ اس کے باوجود بھی ولیعہد فہد کی جانب سے فاصلوں کو پاٹنے کی ایک اور کوشش ہوئی جب انھوں نے اگست میں بغداد کا دورہ کیا۔ لیکن اس وقت تک ایران کے اندرونی معاملات اور ان کے باعث شاہ پر دباؤ نے ریاض اور بغداد کے سامنے نئے مسائل لا کھڑے کیے۔

علاقہ اور حکومتوں کے تحفظ کے مسئلہ پر ایران و سعودی عرب کی کوششوں نے کتنے رقبہ کا احاطہ کیا اس کا اظہار ایک سعودی مصنف نے 1993 میں کیا جس کو اپنی حکومت کی رائے کا خفیہ علم تھا۔ اس کے مطابق دونوں ملک کئی نکتوں پر ایک دوسرے سے وسیع پیمانے پر راضی تھے: (i) خلیج کے علاقہ کو عظیم طاقتوں کی مسلح کشمکش سے دور رکھنے کی ضرورت، (ii) اس یقین دہانی کی ضرورت کہ بیرونی فوجی اڈے خلیج میں قائم نہیں ہوں گے، (iii) اپنے دفاع کے لیے خلیجی ممالک کی اپنی فوجی طاقت بنانے کی ضرورت، (iv) خلیج میں ایک اجتماعی حفاظتی

انتظام کی ضرورت، (v) تمام خلیجی ممالک کے لیے ایک قابلِ اعتماد اندرونی حفاظتی فوج بنانے کی ضرورت جو لا اینڈ آرڈر قائم کرنے کے ساتھ ساتھ گھریلو خطروں سے بھی کامیابی کے ساتھ نمٹے، (vi) ہر قسم کی دہشت گردی کا ہر ممکن ذریعہ سے مقابلہ (vii) ان تمام انقلابی اور انتہا پسند گروپوں اور تحریکوں کے راستہ میں بندش لگانا جن کا مقصد عموماً مشرق وسطیٰ اور خصوصاً علاقہ میں استحکام اور سلامتی کو خطرہ میں ڈالنا ہے: (17) دونوں ملکوں نے 'سفری کلب' کے ذریعہ جس کے دیگر اراکین فرانس، مصر اور مراکش تھے، خفیہ اطلاعات کا تبادلہ بھی کیا۔(18)

انقلابِ ایران (فروری 1979) نے حالات مکمل طور پر بدل دیے: 'اس نے علاقہ میں حکمتِ عملی کا توازن بگاڑ دیا'(19) اور 1975 کے بعد ہونے والی ان تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا جو تحفظ و سلامتی کے مسئلہ پر علاقہ میں ایک رائے بنانے کے لیے کی گئی تھیں۔ نومبر 1979 میں حرم مکہ کا محاصرہ اور دسمبر میں روس کی افغانستان پر چڑھائی نے ایک نئے خطرہ کا تصور پیدا کیا اور خاص کرداروں کو اکسایا کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر دوسرے راستے تلاش کریں۔ ان حالات کا بدیہی انجام 'کارٹر ڈوکٹرائن' تھا۔

اَسّی کی دہائی کے اوائل میں منظر نامہ کا مشاہدہ کرنے والا اس بات کو ضرور دھیان میں رکھے گا کہ اب تک کے تصورات پر پچھلی صدی کی گہری چھاپ تھی اور اس کا مکمل انحصار برطانیہ کی 'بحری بادشاہت' کے نظریہ کو بدلنے پر تھا۔ تجزیہ کی آسانی کے لیے ان کو پانچ زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (i) ایک تنہا ملک خلیج کا پولیس مین ہونے کا دعویٰ کرتا ہو یعنی ایران، (ii) دوہرے ستون کی پالیسی یعنی ایران اور سعودی عرب کے کاندھوں پر ذمہ داری ڈالنا، (iii) خلیج کی بڑی طاقتوں تک رسائی، ایران سعودی عرب اور عراق پر مرکوز، (iv) خلیج کے عرب حصہ کی جانب دوطرفہ حفاظتی انتظامات اور (v) تمام ساحلی ریاستوں کا ایک جامع معاہدہ میں شامل ہونا۔ ان تمام ممکنہ انتظامات کے حوالے سے تجاویز کا دائرہ آبنائے ہرمز میں آزادانہ جہازرانی سے لے کر تنازعات کے پرامن تصفیہ، ریاستوں کی زمینی سرحدوں کی حفاظت کی اجتماعی گارنٹی اور بیرونی طاقتوں اور اڈوں کے افواج تک تھا۔ 1980-1990 کی مدت کے واقعات نے یہ واضح کیا کہ اول الذکر کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے تیسرے

کے مقصد کو الٹ دینا پڑے گا اور دوم نمبر کی تجویز کے ترجیحی درجہ میں کمی کرنا ہوگی! خواہ اس سے کچھ حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن عراق و ایران جنگ نے آبنائے ہرمز میں آزادانہ جہازرانی کے اصول کی آزمائش ضرور کی۔ اس راستہ کو یو ایس بحریہ اور اپنے مفادات کی مجبوریوں کی خاطر تمام فریقوں نے کھلا رکھا۔ اس کا اظہار اکتوبر 1983 میں رفسنجانی اپنے بے لاگ تبصرہ میں کیا 'اگر ہم تیل برآمد نہیں کر سکے تو ہم آبنائے ہرمز بند کر دیں گے: اور انھوں نے محتاط طریقہ سے یہ اضافہ بھی کیا 'اگر وہ (عراق) ہمارا آدھا تیل بھی برباد کر دیں تو بھی آبنائے ہرمز کو بند کرنا ہمارے حق میں نہ ہوگا'۔ مئی 1984 میں بات کی تہہ ابھر کر سامنے آئی'' اگر خلیج فارس کو ہم استعمال نہیں کر سکے تو ہم آبنائے ہرمز بند کر دیں گے۔ اور اگر خلیج فارس ہمارے مفاد میں استعمال نہ ہوئی تو ہم اسے دوسروں کے فائدہ کے لیے بھی استعمال نہ ہونے دیں گے''(20)۔

سلامتی و تحفظ کی روایتی گفتگو کی روشنی میں خلیج کی دونوں جنگوں (1991-1990 اور 1988-1980) نے بہت بڑے پیمانے پر یہ ظاہر کر دیا کہ علاقہ میں غیر مستحکم ہونے کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ اسی دوران حالات کو قابو میں کرنے کے لیے دو کوششیں یعنی 1981 میں گلف کوآپریشن کونسل (جی سی سی)، اور 1991 کا دمشق ڈکلریشن گروپ کی تشکیل بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ کر سکیں۔ ان کی ناکامی کے اسباب کو ان گروپ کی نوعیت، ان کے مقاصد کے حصول کا طریقۂ کار اور خود ان مقاصد کی تعریف میں تلاش کیا جائے گا(21)۔

خلیج کی سلامتی و تحفظ کے بارے میں یہ نہایت موزوں و مناسب تبصرہ ہے کہ 'اس سے بہت پہلے کہ خود خلیج کی ریاستوں کے لیے مسئلہ ہے، یہ باہری دنیا کے لیے ایک مسئلہ تھا'(22)۔ بیس سال کی مدت (1991-1971) پر مذکورہ بالا جائزہ اس تصور کا جواز فراہم کرتا ہے۔ اسباب بدیہی طور سے واضح ہیں: خلیج کے اطراف کا علاقہ توانائی کا منبع ہے اور یہ توانائی دنیا کی صنعت کار قوموں کے لیے بہت اہم ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ فراہمی کا یہ سلسلہ بغیر کسی روک کے ساخت کار اور صارف کے درمیان جاری رہے۔ اور کیونکہ توانائی کا یہ نقل و حمل خصوصاً سمندر کے راستے سے ہوتا ہے علاقہ میں سمندر کی کھلی راہیں ایک بنیادی

شرط ہے۔ سمندری بادشاہت کی اصطلاح کا یہی پس منظر ہے۔ اسی اصطلاح نے 1971 کے بعد کے زمانہ میں خود کو ''دوستانہ ہاتھوں میں اختیار'' سے بدل دیا۔ یہ تصور باہر سے آیا تھا اور اوّلاً اس نے باہری طاقتوں کے مفاد ہی کی دیکھ بھال کی۔ لیکن یہ علاقائی استحکام اور تحفظ کی پیش رفت میں ناکام رہا۔ 1991 کے بعد والے انتظامات کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ ایک طرف تو یہ خارجی طاقتوں کے ساتھ دوطرفہ دفاعی بندوبست میں جڑا ہوا تھا اور دوسری جانب 'دوہری تحدید' کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ انقلاب ایران، اور شاید اس میں خاصی صداقت ہے، نے 'خلیج کی عرب ریاستوں کے درمیان سیاسی یکجہتی کی سطح کو بلند کرنے میں مدد کی(23)، اس سیاسی یکجہتی کا ایک مظہر بریگیڈ سائز، سریع الانتقال علامتی فوج کی تشکیل تھی جو سعودی عرب کی سرزمین پر رہے گی اور جس کی افرادی قوت جی سی سی کی ریاستوں سے تیار ہوگی۔ 1990 کے کویتی بحران کے وقت یہ کلی طور سے ناکافی ثابت ہوئی(24)۔ عمان کی اس رائے کو اس فوج کی تعداد کو بڑھا کر ایک لاکھ کر دیا جائے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ جی سی سی ملک کے ایک ذمہ دار تبصرہ نگار نے یوں کہا کہ 'میری ذاتی رائے میں اس کا (اجتماعی دفاعی بندوبست کے بارے میں دوبارہ غوروفکر کرنے کی ضرورت پر) ''جزیرہ نما کی ڈھال'' جیسی فوج میں نہیں ہوسکتا جس میں سیاسی ملحوظات بھی اتنے ہی ہوں جتنے کہ فوجی، (25)۔ ایک اور مبصر کا خیال ہے کہ ''اکثر جی سی سی حکومتوں کے موجودہ رویہ اور فوجی اور دفاعی فیصلوں میں خودمختاری کو چھوڑنے کی ہچکچاہٹ کی وجہ سے اجتماعی تحفظ ایجنڈے میں شامل نہیں ہے''(26)۔ ان سیاسی ملحوظات سے قطع نظر اینتھونی کورڈز میں جو دفاعی معاملات میں چوٹی کے ماہرین نے خود جی سی سی میں الگ الگ خطروں کے تصورات کی جانب توجہ دلاتی ہے: 'ہوسکتا ہے کہ مغرب میں اکثر کو اس میں دلچسپی ہو کہ خلیج کو تین حصوں یعنی ایران، عراق اور جنوبی خلیج میں تقسیم کر دیا جائے اور پھر جنوبی خلیج کو مختصر نویسی کی اصطلاح میں، جی سی سی کے مترادف استعمال کیا جائے۔ خلیج کا ہر تجزیہ اس حقیقت پر مرکوز ہونا چاہیے کہ جنوبی خلیجی ریاستوں کے اختلافات بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنی کہ مماثلتیں۔ ہر جنوبی خلیجی ریاست کی اپنی الگ الگ

ضرورتیں اور کمزوریاں ہیں۔ لہٰذا بالائی خلیج کی ترجیحات وتوازن کے ناپنے کا پیمانہ یقیناً وسطی اور زیریں خلیج سے مختلف ہوگا''(27)۔

قومی، علاقائی اور عالمی تناظر میں خود لفظ 'تحفظ' و 'سلامتی' کے مفہوم میں بتدریج تبدیلیاں آئی ہیں۔ والٹرلپ مین نے 1943 میں اس کی تعریف کسی ملک کی خاص اقدار کی حفاظت سے کی ہے۔ دو دہائی کے بعد آرنلڈ وولفرز نے اس کو 'کسی قوم کے خود پر حملہ کو روکنے یا شکست دینے کی صلاحیت' سے تعبیر کیا۔ پام کمیشن (1982) کے خیال میں اس کا مفہوم 'مادی اور نفسیاتی تحفظ ہے جس کو اندرونی یا بیرونی خطرات لاحق ہوں'۔ حال ہی میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ''کسی ریاست کی اس کے متن عناصر یعنی خطہ زمین، معاشرہ اور حکومت پر اٹدتے ہوئے خطرات سے مقابلہ کی صلاحیت''۔ (28) تحفظ کے جامع تصور کے لیے اس میں وسائل، ماحولیات اور آبادی کے عناصر کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ خلیج فارس کی ساحلی ریاستوں کے لیے ان میں سے ہر ایک برمحل ہے۔

ایک نئے رجحان کی ضرورت یقیناً ہے۔ چیلنج مشترکہ خطرہ کے تصور (کم سے کم) کو آگے بڑھانا اور اس کو عرصہ تک باقی رکھنا ہے ساتھ ہی مشترکہ تحفظ کی سلامتی کے خطروں کو کم سے کم کرنا اور تعاون کے فوائد کو زیادہ سے زیادہ کرنا ہے۔ پام کمیشن نے مشترکہ یا کواپریٹو سلامتی کا تصور پیش کیا۔ اس نے ملکوں پر زور دیا کہ 'باہمی غیر مداخلت کے نظریہ کو مشترک تحفظ سے بدل دیا جائے' اور اسلحہ پرمبنی حفاظت سے آگے بھی دیکھا جائے کیونکہ یہ ہمیشہ چلنے والی چیز نہیں ہے اور ایک ایسے طریقۂ عمل کی تلاش کی جائے جو امن اور تخفیف اسلحہ کی طرف لے جاتا ہو اور جو کچھ ایسے اصولوں پرمبنی ہو (تفصیل کے ساتھ بیان کردیتے ہیں جو اگرچہ یکساں ہوں لیکن جن کا نفاذ وقت کے مخصوص فوجی اور سیاسی حالات کے مطابق ہو۔)(29) ان تصورات کے فروغ میں دوسروں نے بھی حصہ لیا ہے اور مجموعی طور سے مندرجہ ذیل فریم ورک تیار کیا جاسکتا ہے:

- اس ضرورت کو تسلیم کرنا کہ خلیج فارس کی ساحلی ریاست کو اس مشق میں شامل ہونا ہے۔

ہر ساحلی ریاست کے خطروں کے اندیشوں کے بارے میں ایک مسلسل اور وسیع تر گفتگو کے لیے ایک سرکاری یا غیر سرکاری فورم کا قیام جو اُن مشترکہ ذرائع کی بھی تلاش کر جو ان اندیشوں کو گرفت میں لا سکے۔

حصوں میں تقسیم پروگرام پر مبنی مشترکہ اور پرمنظور اعتماد سازی کے اقدامات (CBMs) کا ایک ہی ساتھ نفاذ اور اس بات کی یقین دہانی کہ یہ مشق انفرادی اعتماد سازی اقدامات (CBMs) کی مشینری پر توجہ مرکوز کرنے سے شروع نہیں ہوتی بلکہ ایسے اقدامات جن کا مقصد باہمی مفاہمت ہے کے جائزہ کی ضرورت سے شروع ہوتے ہیں۔

گفتگو کی بنیاد یہ ہونی چاہیے کہ ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے گی، سرحدوں کا احترام کیا جائے گا، سرحدی تنازعات اور زمینوں پر دعووں کو مساوات کے اصول پر سلجھایا جائے گا خواہ ان کا تاریخی پس منظر کچھ بھی رہا ہو، ہائیڈروکاربن پیداوار اور اس کی برآمد، اور وسیع تر دوطرفہ اور علاقائی معاشی تعاون (ایسے تعاون کی حدود اور قابل تعریف نوعیت سے قطع نظر) سے متعلق پالیسیوں میں باہمی رابطہ اور تعاون کیا جائے گا۔ اس عمل کے کسی مرحلہ پر کسی علاقائی یا بین الاقوامی کانفرنس کا، ساخت کاروں اور صارفین کے مفاد کی ضمانت کے لیے آبنائے ہرمز میں آزادانہ جہاز رانی کا، انعقاد کیا جا سکتا ہے۔

خلیج میں پالیسی کی سہ قطبی نوعیت کے پیش نظر بلاشبہ یہ ایجنڈا بہت جرأت مندانہ ہے۔ اس میں سب سے بڑی مشکل عراق کی شمولیت ہے اور اس کے متبادل یعنی حکومت بدلنے کے انتظار سے گفتگو شروع کرنے کے بنیادی مقصد پر ضرب لگتی ہے جو انفرادی حکومتوں کے درجۂ بصیرت سے لاتعلق ہو۔ سی بی ایمز کا سوال بھی مشکلات پیدا کرے گا جن کا تعلق اطلاعات کے غیر متوازن ہونے، اطلاعات کے تبادلے اور تیسرے فریقوں کے دخل سے ہوگا۔ ان میں سے کچھ کو اوپن۔سورس انٹیلیجنس (او ایس ٹی آئی این ٹی) کی جدید تکنیک اور علم کے انتظام (نالج مینجمنٹ) کے ذریعہ قابو میں لایا جا سکتا ہے(30)۔ اگر ایک بار

نفسیاتی رکاوٹیں ختم ہو جائیں تو پھر تخفیف اسلحہ اور علاقائی سلامتی پر گفتگو شروع کی جاسکتی ہے۔ ایسی کسی کوشش میں جی سی سی ریاستوں کے سرکاری اور عوامی حلقوں میں ایران سے متعلق شکوک و شبہات اور خوف کا سایہ چھایا رہے گا۔ حالات کے کسی بھی حقیقت پسندانہ تجزیہ میں ان کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے لیکن اسی سبب سے یہ سمجھنا ایک بھول ہوگی کہ یہ تصورات وقت کے ساتھ جامد ہو چکے ہیں اور اب نہ ابھریں گے۔ تفصیلی تجزیہ جی سی سی کی ہر ریاست کی راجدھانی میں ایران سے متعلق رایوں کی ایک وسیع حد دکھاتا ہے(31)۔ اس نئی فکر کو 1997 سے جاری سعودی، ایرانی مشکوک امن ثابت کرتا ہے۔ عمان، قطر اور کویت سے بھی پہلے ایسے اشارے ملے تھے۔ ایران کی طرف سے ولایتی نے 1994 میں دفاعی تحفظ کے تصور کی وکالت کی تھی اور خطرہ کے تصور اور سلامتی کے تعلقات پر بحث کرنے کے لیے ایک فورم کے قیام کی تجویز کی تھی(32)۔ اس کے بعد دسمبر 1995 میں تمام خلیج فارس کی ریاستوں کے درمیان غیر جارحیت کے معاہدہ پر دستخط کی پیش کش کی گئی(33)۔ ان میں سے کسی پر بھی ابھی تک کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ نظریات کو علاقہ کے بہتر ہوتے ہوئے ماحول میں آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ جزیروں کے سوال پر یو اے ای کا رویہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے اور اس کے لیے ایک بالکل نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔

رکاوٹوں کے اس سلسلہ میں ایک باوزن رکاوٹ باہری طاقتوں کی موجودگی ہے۔ ایران میں، جیسا کہ شاہ کے زمانے میں تھا، اس بات پر پکا یقین کیا جاتا ہے۔ غیر ملکی فوجوں کی موجودگی علاقائی تحفظ کو محفوظ کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہوگی بلکہ وہ خود تناؤ کا ایک جز بن جائے گی، دوسری جانب جی سی سی کا خیال ہے کہ ان کی اور علاقہ کی حفاظت قوت کی مغربی منصوبہ بندی کی لیاقت سے مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ بلا شک و شبہ یہ متضاد انداز صرف ایران اور یونائٹیڈ اسٹیٹس کے بدلے ہوئے سیاسی تعلقات کے حوالہ ہی سے ہم آہنگ کیے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ عراق کے حقہ پانی بند کرنے کی حالت کو ختم کرنے کے لیے کچھ پیش رفت ہو۔ اگر بغیر علاقے کے استحکام کو کمزور کیے اور بغیر اپنے خصوصی مفادات کو نقصان پہنچائے خلیج میں اپنی موجودگی کو کم کرنا ہے۔

اس علاقہ میں سلامتی کے داخلی فیصلہ کن عوامل پر بحث و مباحثہ برابر جاری رہتا ہے۔ 98-1997 میں تیل کی قیمتوں میں تیزی سے گراوٹ کا تیل پیدا کرنے والے نتائج کا جائزہ لیں اور مسائل کو نمایاں کریں خاص طور سے وہ جو آبادی کے پھٹ پڑنے سے پیدا ہوئے ہیں اور جن کا سلسلہ اب تک ہر ملک میں جاری ہے۔ اس بارے میں محتاط امریکی مبصرین کا اس حوالہ سے یہ کہنا ہے کہ شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ملکوں میں 'معاشرتی رابطہ' کی از سرِنو تعریف کی جائے۔ ایران میں سول سوسائٹیز کا دوبارہ ظہور اور اثر کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے لیکن ہمسایہ خلیج ممالک میں ابھی اس کا ممکنہ اثر دیکھنا باقی ہے۔ علاقہ میں ایران کی مرکزیت کو ماپنے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ ماضی قریب میں اس کے انقلابی اور تھرمیڈ درین زمانہ میں واقع اندرونی تبدیلیوں نے ہمسایہ ممالک پر بھی اثر چھوڑا ہے اور یوں سلامتی کا ایک عنصر بن گئی ہیں۔

آخرکار پھر خلیج کی سلامتی کے کیا امکانات ہیں؟ ایک مورخ کو یہ دہرانا کافی دلکش لگے گا کہ بیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ کا طوطی بول رہا تھا؛ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ صدی کی آخری دہائی میں امریکہ کا ڈنکا بجنے کی وجہ ایک مسلح امن تھا جس میں کہ دوہری تحدید ناکام ہوگئی لیکن عراق کی تحدید جاری رہی، اور جس میں ایران کی علاقہ میں منظوری کے بغیر اس کا اکیلا پن ماضی کا قصہ بن گیا، اور جس میں نئے عالمی نظام نے چنی ہوئی جگہوں کے لیے نمائندہ حکومت کی وکالت کی ہے۔ اور جس میں اسلامسٹ دباؤ نے روایت پرست حکومتوں کو مجبور کیا کہ وہ طرزِ عمل میں اصلاح کریں اور اس طرح اندرونی توازن کو پھر سے حاصل کیا اور جس میں مکمل امن کے خواب اور 'سلامتی بشرط شمولیت' -حتیٰ کہ ایک خلیجی منشور بھی- کو اکیسویں صدی کے لیے مؤخر کردیا گیا۔

پس نوشت

دسمبر 2004 میں بحرین اور آئی آئی ایس ایس، لندن کے مشترکہ تعاون سے بحرین میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بحرین کے بادشاہ نے خلیج کے لیے ایک نئے ڈھانچہ کی مانگ رکھی جس میں تمام ممالک شریک ہوں۔ اسی کانفرنس میں سعودی وزیر خارجہ

نے توجہ دلائی کہ ایک اجتماعی قدم کی فوری ضرورت ہے جس کا مقصد خلیج کی سلامتی کے لیے نئے اور زیادہ مضبوط فریم ورک کو فروغ دینا ہو، جس میں قومی، علاقائی اور بین الاقوامی عناصر شامل ہوں۔ انھوں نے کہا کہ قومی عنصر کا مطلب ہے کہ نفاذ کی رفتار میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ جس کا انحصار اپنی اپنی سماجی حالت پر ہے، ہمارے ملکوں میں جامع اصلاحات کی فوری ضرورت ہے۔ علاقائی فریم ورک چار ستونوں پر مبنی ہونا چاہیے: جی سی سی، یمن، ایران اور عراق - اس کے بین الاقوامی پہلو میں ساحلی ریاستوں کی زمینی سالمیت، آزادی اور اقتدار اعلیٰ کے لیے بین الاقوامی ضمانتیں شامل ہیں جن کو سلامتی کونسل کی پشت پناہی حاصل ہو۔ ''خلیج کے زیر تجویز حفاظتی فریم ورک کے بین الاقوامی رخ میں ابھرتی ہوئی ایشیائی طاقتیں خصوصاً ہندوستان اور چین بھی مثبت طور پر شامل ہوں گے۔''

خلیج فارس کی ساحلی ریاستوں کے مقام اور درجہ میں بتدریج ارتقا اپنی جگہ یقینی ہے۔ ساتھ ہی ان کی یہ نااہلی بھی یکساں طریقہ سے یقینی ہے کہ وہ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور اس کے حلیفوں پر، جو 21رنومبر 1903 کے کرزن کے استعماری اعلان کے سو سال بعد بھی ''ان پانیوں کے امن'' کو برقرار رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔

حواشی

1۔ پامر، مچل اے، ''گارجینز آف دی گلف: اے ہسٹری آف امریکاز ایکسپینڈنگ رول اِن دی پرشین گلف'' (دی فری پریس، نیویارک 1992) صفحات 85-111

2۔ اینڈرسن، ولیم ڈی، ''دی پرشین گلف ایز اے ریجنل سب سسٹم'' -محمد مغیث الدین (ایڈٹ) کی کتاب ''کانفلکٹ اینڈ کواپریشن اِن دی پرشین گلف'' (پریجز نیویارک، 1977)، صفحات 1-4

3۔ ابن خلدون ''دی مقدمہ'' (پرنسٹن یونیورسٹی پریس۔ پرنسٹن، نیو جرسی، 1967) صفحہ 24

4۔ لیکی، جے۔پی۔ ''برٹش اینڈ دی پرشین گلف 1795-1880'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، آکسفورڈ، 1958) صفحہ 1

5۔ لوریمر جے جی ''گزیٹیر آف دی پرشین گلف، عمان اینڈ سینٹرل عربیہ، (گورنمنٹ آف انڈیا، کولکاتا 1915) جلد 1، صفحہ 2

6۔ لیکی، حوالہ سابق، صفحات 1-2

7- لوریمر، حوالہ سابق، جلد 1، صفحہ 2، صفحہ 39

8- کوٹربل، ایون جے، ایران اینڈ دی پرشین گلف: پولیٹیکل، ملٹری، اینڈ اکنامک کنسیڈریشنز، مشرق ادنیٰ اور جنوب ایشیا پر یو ایس ہاؤس آف ریپریزینٹیٹو سب کمیٹی کے سامنے 24 رجولائی 1973 کو گواہی۔

9- صدر اسرافیل بہروز۔ ''دی ایران۔عراق وار'' (پلین ویو، نیویارک 1989) صفحہ 14

10- کیسنجر ایچ، ''ایبرس آف اپ ہیول'' (لٹل، براؤن اینڈ کمپنی، بوسٹن 1982) صفحہ 14

11- حوالہ سابق، صفحہ 675

12- شیمیش، ہیم ''سوویت عراقی ریلیشنز: 1988-1968'' (ویسٹ ویو پریس، بولڈر، کولاراڈو 1992) صفحہ 85، اکتوبر 1972 کے سوویت ایرانی مشترکہ اعلامیہ نے بھی یہ تسلیم کیا کہ ''خلیج فارس سے متعلقہ مسائل اسی علاقے کی ریاستوں کو بغیر کسی خارجی مداخلت کے اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق خود حل کرنا چاہئیں''۔ موازنہ کیجیے شوبین ایس اور ذبیح ایس ''دی فارن ریلیشنز آف ایران'' (یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس، 1974) صفحہ 265

13- صدر اسرافیل بہرو، حوالہ سابق، صفحہ 19

14- سفران ناڈو۔ ''سعودی عربیہ: دی سیزلیس کوئیسٹ فار سیکورٹی'' (ہارورڈ یونیورسٹی پریس، کیمبرج، میساچوسٹس، 1985) صفحہ 267، ساتھ میں دیکھیے ہولڈن، ڈیوڈ اینڈ جانز رچرڈ، ''دی ہاؤس آف سعود'' (پان بکس، لندن 1981) صفحہ 625

15- چوبن شاہ رام، ''سیکورٹی ان دی پرشین گلف۔4، دی رول آف آؤٹ سائڈ پاورز، (دی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار اسٹریٹجک اسٹڈیز 1982) صفحات 153-152

16- سفران، حوالہ سابق، صفحات 75-272

17- بادیب، سعید ایم، ''سعودی ایرانین ریلیشنز: 1982-1923'' (سینٹر فار عرب

اینڈ ایرانین اسٹڈیز اینڈ ایکوز، لندن 1993) صفحہ 125

18۔ حوالہ سابق، صفحات 31-130

19۔ بکش، شال، ''دی رین آف آیت الندز: ایران اینڈ دی اسلامک ریوولوشن'' (بیسک بکس، نیویارک 1984) صفحہ 4

20۔ رمضانی، آر۔ کے۔''ریوولوشنری ایران: چیلنج اینڈ ریسپونز ان دی مڈل ایسٹ'' (دی جان ہوپکنس یونیورسٹی پریس، بالٹیمور، میری لینڈ، 1986) صفحات 16-15

21۔ میگنس، رالف۔ ایچ، 'دی جی سیس سی اینڈ سیکورٹی۔ دی ایلیمی ودھاؤٹ اینڈ دی ایلیمی ودان' ''دی جرنل آف ساؤتھ ایشیا اینڈ مڈل ایسٹرن اسٹڈیز'' (20:3 اسپرنگ 1997)۔ صفحات 94-72، دمشق ڈکلریشن اور اس کے بعد کی تفصیلات کا تجزیہ ہولس۔ روزمیری میں موجود ہیں۔ 'وہاٹ ایور ہینڈ ٹو دی ڈیمسکس ڈکلریشن: ایوولونگ سیکورٹی اسٹرکچرزان دی گلف کے لیے دیکھیے ایم جین ڈیوس (ایڈٹ) ''پالیٹکس اینڈ انٹرنیشنل ریلیشنز ان دی مڈل ایسٹ'' (ایڈورڈ ایلگر، ایلڈرشاٹ، 1995) صفحات 60-37 اور ولسن، پیٹر ڈبلیو اینڈ گراہم ڈگلس ایف ''سعودی عربیہ: دی کمنگ اسٹورم'' (ایم ای شارپ، نیویارک 1994) صفحات 32-131 اور 65-164

22۔ بادیب، حوالہ سابق، صفحہ 123

23۔ سویدی جمال ایس 'دی گلف سیکورٹی ڈیلیما: دی عرب گلف اسٹیٹس' دی یونائیٹڈ اسٹیٹس اینڈ ایران' کے لیے دیکھیے جمال ایس سویدی (ایڈٹ) ''ایران اینڈ دی گلف'' (دی ایمیریٹ سینٹر فار اسٹریٹیجک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، ابوظہبی، 1996) صفحہ 339

24۔ تیز رائل ایکسیلنسی جنرل خالد بن سلطان، ''ڈیزرٹ وارمیر'' (لینسر، نئی دہلی، 1997) صفحات 49-248، المزیدی فیصل ''دی فیوچر آف دی گلف'' (آئی بی ٹارلس، لندن 1993) صفحات 71،70

25۔ خالد بن سلطان، حوالہ سابق، صفحہ 475

26۔ المزیدی، حوالہ سابق، صفحہ 72

27۔ کورڈزین، اینتھونی ایچ ''بحرین، عمان، قطر اینڈ دی یو اے ای۔ چیلنجز آف سیکورٹی'' (ویسٹ ویو پریس، بولڈر 1997) صفحات 1، 16، 17 اور 32

28۔ مارٹن، لینور جی (ایڈٹ) ''نیو فرنٹیرز ان مڈل ایسٹ سیکورٹی'' (پال گریو، لندن 1998) صفحہ 7

29۔ ''کامن سیکورٹی۔ دی رپورٹ آف دی انڈیپینڈنٹ کمیشن آن ڈس آرمامنٹ اینڈ سیکورٹی ایشوز انڈر دی چیئرمین شپ آف اولاف پام'' (لندن، 1982) صفحات IX اور 100

30۔ رتھ میل، انٹرویو۔ 'بلڈنگ کانفیڈنس ان دی مڈل ایسٹ' ''جرنل آف پیلسٹائن اسٹڈیز'' (2912 ونٹر 2000) صفحات 19-5

31۔ گرین، جیرالڈ ڈی 'ایران اینڈ گلف سیکورٹی' کے لیے دیکھیے ڈیوڈ ای لانگ اینڈ کرسچین کوچ (ایڈٹ) ''گلف سیکورٹی ان دی 21 سنچری'' (دی ایمپریٹس سینٹر فار اسٹریٹیجک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ، ابوظہبی 1997) صفحہ 286۔ ''خلیج میں بھی ایران کے لیے مختلف الخیال رویے پائے جاتے ہیں۔ مختلف ریاستوں کے ایران سے تعلقات پر مختلف رجحانات ہیں جن کا انحصار ان کے اپنے حالات پر ہے۔

32۔ 'کانفرنس آن ڈس آرمامنٹ (سی ڈی/پی وی 690، صفحات 14-8) میں یکم ستمبر 1994 کی تقریر

33۔ پیٹر لارنس، جی 'کانفیڈنس بلڈنگ میوزر ان دی پرشین گلف' کے لیے دیکھیے گیری سک اینڈ لارنس جی پوٹر (ایڈٹ) ''دی پرشین گلف ایٹ دی ملی نیم'' (سینٹ مارٹنز پریس، نیو یارک 1997) صفحات 239 اور 246n36۔

خلیج فارس کی پاسبانی-II

سلامتی کے تصورات تجربہ کی روشنی میں پروان چڑھتے ہیں اور وہ نظریہ کی مہمیز کے ابھارے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔ 13 ستمبر 2002 کی صدر بش کی ''نیشنل سیکورٹی اسٹریٹجی آف دی یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا'' پر تقریر میں دونوں ہی عناصر واضح طور پر موجود تھے۔ 2003 میں عراق پر حملہ مشرق وسطیٰ کو نیا ڈھانچہ دینے کی جانب سوچا سمجھا پہلا قدم تھا۔ اس کا رخ عظیم تباہی کے ہتھیاروں (WMDs) کو نیست و نابود کرنا، دہشت گردی کو ختم کرنا، سرپھری حکومتوں سے نبرد آزما ہونا، علاقہ میں جمہوریت کو قائم کرنا، اعتدال پسند اور جدید مسلم ریاستوں کی تخلیق کرنا، اسرائیل کی حفاظت کرنا اور روڈ میپ کو نافذ کرنا (ان چودہ تحفظات کے ساتھ جس کو شیرون حکومت نے مشروط رکھا) تھا۔ لیکن نتیجہ کچھ مختلف تھا:

> جنگ سے قبل جنگ کے بانیوں کو یہ امیدیں تھیں کہ ایک سریع اور دبدبہ والی فتح عراق میں ایک جمہوری حکومت کی تخلیق کرے گی اور علاقہ میں جمہوری قوتوں کو متحرک کرے گی۔ لیکن یہ امیدیں بر نہیں آئیں۔ جنگ کے منصوبہ بندوں نے یہ توقعات بھی کی تھیں کہ صدام کے زوال سے ایران میں

> آیت اللہ کی حکومت کی مخالفت کی حوصلہ افزائی ہوگی اور یہ
> حکومت گرانے میں اپنی کوششیں تیز کردیں گی۔ ایسی کسی بھی
> تبدیلی کا ابھی تک انتظار ہے۔(1)

یہ دونوں واقعات خلیج فارس کی سلامتی کے تصورات پر اثر انداز ہوئے۔ کویت کی جنگ اور 1991 کے دمشق ڈکلریشن میں تصور کیے گئے حفاظتی ڈھانچہ کی ناکامی کے بعد، یونائیٹڈ اسٹیٹس اور دیگر مغربی ممالک کی توجہ جی سی سی ریاستوں سے دوطرفہ دفاعی معاہدوں پر مرتکز ہوگئی۔ اس بندوبست میں بنیادی عنصر سعودی عرب تھا۔ لیکن یونائیٹڈ اسٹیٹس کی سمجھ میں سعودی عرب کا غیر رسمی تعاون اور کم ظاہر ہونے والی سرگرمیوں پر اصرار، نہیں آتا تھا، کیونکہ 'سعودیوں کا اندرونی اور باہری استحکام طویل عرصہ سے اس امر پر منحصر تھا کہ نازک تعاون کے معاملات کو جہاں تک ممکن ہوسکے مدھم سروں ہی میں رکھا جائے(2)۔ بعد میں ہونے والے واقعات نے یونائیٹڈ اسٹیٹس کو مجبور کیا کہ وہ اکثر سہولتوں کو منظر منتقل کردے۔ عراق پر حملہ اور اس کے اثرات نے ان تعلقات پر نئی روشنی ڈالی۔ ایک سینئر امریکی افسر نے جنوری 2004 میں ان کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> بلاشبہ اس موقعہ پر کلیدی سوال عراق پر حملہ، یونائیٹڈ اسٹیٹس اور خلیج کی ریاستوں کے فوجی تعلقات پر اثر کا ہے۔ اتحادی فوجوں میں علاقہ کی عدم نمائندگی، خلیج میں جنگ کے خلاف عام ناراضگی اور عراق کی جنگ کی وجہ سے ہی تحت کشیدہ تعلقات نے یونائیٹڈ اسٹیٹس اور خلیج کے بندھنوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اب یونائیٹڈ اسٹیٹس کو خلیج اور اس کے گرد ونواح میں ایک نیا فوجی بندوبست اور انداز لانا ہوگا اور تحفظ کے مسئلہ پر دوہری تحدید کی پالیسی کے مرکز کو ہٹانا ہوگا۔ ان سب کے کیا نتائج نکلیں گے یہ ابھی دیکھنا باقی ہے۔(3)

یہ سب یو ایس کانگریس کی سرکاری دستاویز میں اچھی طرح سے واضح ہے:

> یو ایس کی قیادت میں لڑی جانے والی جنگ نے عراق کی عظیم تباہی کے ہتھیار بنانے کی صلاحیت کو ختم کردیا ہے، اور علاقہ میں عراق کی کسی بھی روایتی فوجی دھمکیوں کو یکسر خارج کردیا ہے۔ لیکن خلیج فارس کی ریاستوں (سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عمان اور متحدہ امارات) کو ڈر ہے کہ عراق (ب) ایران کے مدمقابل کی حیثیت سے کام نہیں کر سکے گا اور شاید ایران کے حمایتی شیعہ مسلمانوں کی جماعتیں عراق جنگ کے بعد اقتدار کے بڑے حصہ کو حاصل کریں۔ عراق کے تنازعہ کے اوپر اس میں دو سمتوں میں ابال آنے کی صلاحیت ہے۔ خلیج کی شیعہ کمیونٹیز، جو عام طور سے اقلیت میں ہیں، کو عراق میں ہونے والے واقعات سے اضافی قوت حاصل کرنے کی شہ ملے اور عراق میں عسکریت پسند سنی مسلمان خواہ وہ عراقی ہوں یا غیر عراقی خلیج میں در آنے کی کوشش کریں تا کہ وہاں تشدد اور غیر استحکامیت پھیلائیں۔ عراق کی مستقل غیر مستحکم حالت کی وجہ سے یونائٹیڈ اسٹیٹس کو خلیج میں فوج کی بڑی تعداد کو رکھنا پڑ رہا ہے۔ جو کہ اگر عراق کی حالت جلدی مستحکم ہو جاتی تو نہ رکھنی پڑتی اس طرح سے ان میں سے کچھ منافع کی نفی ہوتی ہے جو صدام حسین کے اخراج سے وابستہ کیے گئے تھے۔(4)

اس کی اور وسیع تر اہم اسباب کی وجہ سے سرکاری فوجی اصول اقدامی سہولتوں اور صلاحیتوں کے نیٹ ورک سے چپکے رہے خصوصاً چار اہم علاقوں یعنی یوروپ، شمالی مشرقی ایشیا، مشرقی ایشیا کے سواحل، مشرق وسطی اور جنوب مغربی ایشیا جو کہ یونائٹیڈ اسٹیٹس کو عالمی

سطح پر کام کرنے کی ایک بے مثال لیاقت مہیا کرتا ہے اور ساتھ ہی اس عمل کی آزادی تک رسائی اور تحفظ فراہم کرتا ہے۔(5)

ان سرکاری نظریات سے الگ ایک نئی بحث پیدا ہوئی۔ یہ بحث امریکی اسٹریٹجک کمیونٹی سے شروع ہوئی لیکن بعد میں وہ ممالک بھی شامل ہوگئے جن کا مفاد۔ خلیج پر امریکی ماہرین کی دلیل (6) تھی کہ (i) 1991 کے بعد یونائیٹڈ اسٹیٹس اور انفرادی جی سی سی ریاستوں کے درمیان دوطرفہ معاہدوں کا جال اگرچہ اہم ہے لیکن علاقہ میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کے مفادات کے فروغ کے لیے کافی نہیں ہے لہٰذا اس کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے، (ii)ایک سیاسی ضرورت یہ بھی تھی کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس اب اپنی چھاپ کو ہلکا کرے اور جی سی سی کی چھوٹی ریاستوں کو ایسا فورم دے جہاں وہ اپنی سلامتی اور مفادات کی نقشہ سازی کرسکیں، (iii) کسی بھی نئے بندوبست کا مقصد ایک ایسا توازن پیدا کرنا ہو جس میں عراق مضبوط، لیکن بہت زیادہ مضبوط نہ ہو، ایران کو قابو سے باہر نہ ہونے دیا جائے لیکن اس کو آزاد خیالی کی جانب دھکیلا جائے، اور جی سی سی ریاستوں کو اصلاحات کے لیے کچھ وقفہ فراہم کیا جائے لیکن ان کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے محفوظ رکھ کر - لہٰذا اس بنیاد پر تین بڑی گزرگاہوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ (i) 1980 سے قبل کی صورت حال، افق کے اوپر، کی حکمت عملی کی طرف واپسی، (ii) ناٹو کے خطوط پر ایک مقامی دفاعی معاہدہ جس میں عراق اور جی سی سی ممالک شامل ہوں لیکن ایران نہیں۔ اور (iii) ایک علاقائی حفاظتی باہمی انصرام کا قیام جو اطلاعات کے تبادلے کے لیے مذاکرات کا فورم، اعتماد سازی کے اقدامات اور اسلحہ پر نگرانی کے انتظامات جیسی شمولیت پر مبنی ہو۔ آخرالذکر کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ خلیج کے تحفظ کے لیے ایک کانفرنس ہو جہاں تین نمونے، جو باہمی طور سے خصوصی نہیں، کو جاری و ساری طریقۂ عمل میں پیش رفت تصور کیا جائے:

- خلیج کے حفاظتی مسائل پر مذاکرات کے لیے ''ایشین ریجنل فورم (اے آر ایف)'' بھی نمونے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔
- خود خلیج کی ریاستیں اس انٹرپرائز کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہیں تاکہ یونائیٹڈ

اسٹیٹس کو زیادہ قانونی جواز حاصل ہو سکے اور یہ پردے کے پیچھے اس کوشش کو آگے بڑھانے کا کام کرسکیں۔

- کیونکہ کوئی ایک گردان کافی نہیں ہوگی لہٰذا تین باہمی مربوط عناصر پر مبنی نیا نظام تشکیل دیا جائے یعنی طاقت کا توازن، اصلاح اور تکثیریت جو دو ہمکار اجزا پر مشتمل ہو یعنی روایتی عمودی محور جس میں ایران، عراق اور جی سی سی کے مابین فوجی طاقت کا توازن شامل ہو اور ان میں سے ہر ایک معقول طریقہ سے استحکام سے مطمئن ہو، اور ایک افقی محور جو بہتر طرز حکومت، آزادانہ مارکیٹ کی اصلاحات، جدیدیت، قانون کی حکمرانی اور جمہوریت پر شامل ہو۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس پر مرتکز یہ تصورات (امریکنوں کو اندر کرو، ایرانیوں کو باہر کرو اور عراق کو دبائے رکھو) بنیادی طور سے اس سرکاری پالیسی کے مطالبات کا دوبارہ نفاذ تھا جو محسوس کرتی تھی کہ موجودہ اہلیتوں کو جاری اور مضبوط رکھنا ہے تاکہ روایتی حریفوں، دہشت گردی اور شورش پسندوں کا بے ترتیب ظہور، عالمی تباہ کار ہتھیاروں (WMDs) کی شکل میں خوفناک تباہی کا چیلنج اور جدید ٹیکنالوجی کی انتشار انگیزیوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔

حال ہی میں ایک امریکی تجزیہ نگار نے 1987 کے اقوام متحدہ سلامتی کونسل کے ریزولوشن 598 دفعہ 8 (جس نے ایران عراق جنگ کا خاتمہ کیا) کا حوالہ دیتے ہوئے ایک خلیجی سلامتی کونسل بنانے کا مشورہ دیا ہے جس میں ایران، عراق، سعودی عرب، دیگر جی سی سی ممالک کے علاوہ یو این سلامتی کونسل کے پانچوں مستقل اراکین بھی شامل ہوں۔ (7)

گزشتہ دو سالوں میں خلیج کی سلامتی پر ناٹو کی پالیسی پروان چڑھی اور مشتہر کی گئی۔ اس کی ابتدا راؤنڈ کانفرنس (خلیج کی سلامتی میں ناٹو کا کردار) قطر سے ہوتی ہے۔ یہ اپریل 2004 میں منعقد ہوئی تاکہ اس رول کی تلاش کی جائے جو خلیج اور وسیع تر مشرق وسطیٰ کی سلامتی میں ناٹو ادا کرسکتا ہے۔ جون 2004 میں تنظیم کی استنبول کواپریشن انیشیٹو (آئی سی آئی) کے ذریعہ ایک فریم ورک کا اعلان کیا گیا۔ اس کا مقصد تھا کہ علاقہ کے ساتھ نئے ٹرانس اٹلانٹک رابطوں کے ذریعہ علاقائی سلامتی اور استحکام میں اضافہ کیا جائے۔ اس

فہرست میں دہشت گردی سے مقابلہ، عالمی تباہ کار ہتھیاروں کی مزاحمت، ڈرگ ٹریفکنگ کی روک تھام، ناٹو کی مشقوں میں شرکت اور خواہش مند ممالک کے ساتھ تعاون کے میدان میں فوجی تال میل شامل تھے۔ اس موضوع پر دوسری راؤنڈ کانفرنس میں دسمبر 2005 میں ناٹو کے سکریٹری جنرل نے شرکت کی جو دوحہ میں منعقد ہوئی اور یہ بیان دیا کہ تنظیم خلیج کی سلامتی سے حسب ذیل کی وجہ سے دلچسپی رکھتی ہے: (i) سلامتی کا بدلتا ہوا ماحول، (ii) خود راؤنڈ کی بدلتی ہوئی نوعیت اور (iii) خود خلیج کے علاقہ میں گزشتہ چند سالوں سے نئے متحرکات ظہور میں آرہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قطر، کویت، بحرین اور متحدہ عرب امارات آئی سی آئی جوائن کر چکے ہیں اور سعودی عرب اور عمان نے دلچسپی ظاہر کی ہے۔(8)

جی سی سی ممالک کے ساتھ اہم پارٹنر شپ میں یوروپین یونین بھی دلچسپی ظاہر کرچکی ہے جس میں عراق کے مسائل، مشرق وسطی میں امن کے قیام کا عمل، ایران، دہشت گردی کے خلاف جنگ اور عالمی تباہی کے ہتھیاروں کی روک تھام پر زور ہوگا۔ یونائٹیڈ اسٹیٹس اور یوروپین یونین کے مذاکرات میں مزید وزن یوروپین سیکورٹی اسٹریٹجی (ای ایس ایس) نے پیدا کیا جو جون 2004 میں تھیسالونیکا میں یوروپین کونسل کی میٹنگ میں ظہور میں آئی۔ ایک وسیع فریم ورک میں اس نے امریکی ترجیحات کو گرفت میں لیا۔(9)

خلیج کے اندر علاقائی سلامتی پر سعودی عرب نے دسمبر 2004 میں ایک نئی پالیسی کی وضاحت کی۔ اس نے زور دیا کہ فوری ضرورت ہے کہ ایک اجتماعی کوشش جس کا مقصد خلیج کی سلامتی کے لیے ایک نیا اور ٹھوس فریم ورک بنانا اور پروان چڑھانا ہو، اور یہ مندرجہ ذیل پر مبنی ہو۔

- ایک دوسرے پر منحصر تین اجزا (قومی، علاقائی اور بین الاقوامی) اور چار ستون، جی سی سی، یمن، عراق اور ایران: 'ایک متحدہ جی سی سی، خوشحال یمن، مستحکم عراق اور ہمدرد ایران خلیج کی سلامتی سے متعلق مطلوب مقاصد کے حصول کا فی ممد و معاون ثابت ہوں گے' یمن کی شمولیت اس لیے لازمی تصور کی گئی ہے کہ 'خلیج کو بقیہ جزیرہ نما سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا'۔

- ایک محفوظ، مستحکم اور متحدہ عراق شرط اولین ہے عراق کویتی معاہدہ جس کو بین الاقوامی ضمانت حاصل ہے، جی سی سی اور ایران کے درمیان ایک ایسے ہی معاہدہ کے لیے نمونہ کا کام کرسکتا ہے۔ اس تعمیری عمل میں عراق ایک علاقائی نمونہ بن سکتا ہے۔
- ایک ہمدرد، خوشحال اور محفوظ ایران علاقائی سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے اہم رول ادا کرسکتا ہے۔ اس کا مطلب اعلیٰ سطح پر باہمی تعاون اور اندرونی معاملات میں غیر مداخلت ہے۔
- بین الاقوامی ضمانتیں یکطرفہ طور سے نہیں دی جاسکتیں چاہے وہ دنیا کی واحد سپر پاور ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں بین الاقوامی کمیونٹی کی اجتماعی رضامندی شامل ہوگی اور جو سلامتی کونسل کے متفقہ اعلانیہ جس میں خلیج کے تمام ممالک کے اقتدار اعلیٰ، آزادی اور زمینی تحفظ کی ضمانت کے ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی ہوگا کہ کسی بھی بیرونی خطرہ کا مقابلہ (سلامتی کونسل) طاقت سے کرے گی۔
- مجوزہ خلیج سلامتی فریم ورک کے بین الاقوامی جز کے تحت ایشیا کی ابھرتی ہوئی طاقتوں مثلاً ہندوستان اور چین کو بھی مثبت طور سے شامل ہونا چاہیے۔
- عرب اسرائیل قیام امن کی طرف اثر پذیر واپسی ہو جو کہ 'کسی بھی خلیج سلامتی کے کامیاب فریم ورک کے لیے حتمی طور سے لازمی ہے۔
- 'جبکہ ہم مکمل طور سے خلیج کو عالمی تباہی کے ہتھیاروں سے پاک علاقہ بنانے کی حمایت کرتے ہیں لیکن یہ تصور اس وقت تک حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتا جب تک یہ پورے مشرق وسطیٰ پر، بشمول اسرائیل، لاگو نہ کیا جائے'۔(10)

اسی موقعہ پر بحرین کے بادشاہ نے عمومی طور سے ایک نئے علاقائی حفاظتی نظام کی جانب دعوت دی جس میں جی سی سی ریاستوں کے علاوہ 'علاقہ کے دیگر فریق' بھی شامل ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایسا کوئی بھی نظام اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب تک اسرائیل فلسطین کے قضیہ کا اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہو جاتا۔

خلیج فارس کی دوسری جانب یو ایس کی زبردست فوجی موجودگی پر منحصر سرگرم عمل مقابلہ جاتی حفاظت کے تصور کے متبادل کے طور پر ایران پچھلے دس سال سے زیادہ عرصہ سے ایک باہمی امدادی حفاظت کے فریم ورک کی حمایت کررہا ہے (11)۔ عراق کی جنگ کے بعد اس بارے میں ایرانیوں کی دلیل میں زیادہ تیزی آ گئی ہے اور یہ کہنا ہے کہ ایک اجتماعی حفاظت کی عدم موجودگی، بیرونی فوجی موجودگی کی جانب لے جاتی ہے جس سے مقامی طور پر ناراضگی پیدا ہوتی ہے اور جو انجام کار انتہاپسند سلفی (سنّی) مذہبی رجحانات کو پروان چڑھاتے ہیں اور علاقہ کی سلامتی کو خطرہ میں ڈالتے ہیں۔ (12) علاقہ میں کچھ اس دلیل سے متاثر ہیں۔ لیکن جی سی سی کا عام رویہ بہرحال یو اے ای اور ایران کے ان تین جزیروں کی ملکیت، جن پر ایران نے 1970 میں قبضہ کرلیا تھا، کے حل پر منحصر ہے۔ ایران کی فوجی صلاحیت کے بارے میں جی سی سی ریاستوں کے اندیشوں کو اس کی اثر پذیری اور کچھ جی سی سی ممالک کے زبردست دفاعی اخراجات کے ترازو میں تولنا ہوگا۔ ایک یو ایس ماہر کے خیال میں ''ایران نے اپنے موجودہ وسائل کی ایک بتدریج گرتی ہوئی فیصد کو فوجی اخراجات اور اسلحہ کی درآمد کے لیے مختص کررکھا ہے اور شاہ کے وقت کی فوجی طاقت کی سطح کو پانے کے لیے وہ پچیس سے پینتیس فیصد صرف کررہا ہے۔ (13)

جہاں تک ایران اور سعودی تعلقات کا سوال ہے ان میں او آئی سی اور دوطرفہ فریم ورک میں پختگی اور گہرائی آئی ہے۔ دونوں ممالک نے 17 /اپریل 2001 میں ایک حفاظتی معاہدہ پر بھی دستخط کیے جس میں دہشت گردی، منظم جرائم اور ڈرگ ٹریفکنگ سے مقابلہ شامل ہے۔ سعودی عرب نے اعلانیہ طور پر عراق میں ایران کے رول اور اس کی جوہری پالیسی پر خدشات ظاہر کیے ہیں۔

اس بحث میں خلیج کی 'چھوٹی ریاستیں' بھی شامل ہوگئی ہیں جن کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ایک چھوٹی ریاست جس کے پاس سیاسی اور فوجی طاقت مفقود ہو اپنی معاشی طاقت کو دفاعی پالیسی کے لیے ایک اتحادی قوت کے مفادات سے سر ملاتے ہوئے فطری ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتی ہے۔ اس طرح سے خلیج کی زیادہ دولت مند ریاستیں ایران و

عراق کو باہمی مالیاتی معاملات کے جال میں مثبت طریقہ سے لاسکتی ہیں جو ایک وسیع تر علاقائی سلامتی پیدا کرے گا۔ خلیج میں طاقت کے توازن کی تعمیرنو کے لیے ایک موقعہ ہے جو صرف فوجی ذرائع سے نہ ہو بلکہ کثیر جہتی رویوں کے ذریعہ ہو جہاں خود علاقہ کے معاشی، تکنیکی اور سیاسی وسائل کا استعمال کیا جائے۔ ایسا اقدام تین مراحل میں نافذ کیا جاسکتا ہے:

- عراق، ایران، جی سی سی اور سی بی ایم کے درمیان دوطرفہ اور تکثیری معاہدوں کا عبوری دور۔ اس میں ایرانی فوج کی خلیج کے ساحلوں سے دور دوبارہ نفسیاتی (ابو موسیٰ اور بڑے اور چھوٹے متنب کے تینوں جزیروں سے بھی دور) اور جنوبی اور مشرقی عراق میں یہی عمل عراق بھی دہرائے۔ جی سی سی کے مما لک پر ایسی کوئی ذمہ داری، فوجی طاقت میں فرق کی وجہ سے، عائد نہیں ہوگی۔
- ایک وسطی مدت وقفہ جو جی سی سی ریاستوں کی طرف سے معاشی امداد کے پیکیج اور مالی سرمایہ کاری کو ایک دوسرے سے باندھ سکے اور موجودہ ایرانی و عراقی فوجی سرگرمیوں کی جو حملہ آور ہتھیاروں کی یافت سے متعلق ہیں میں ٹھوس منتقلی رونما ہو۔ خلیج کے تینوں جزیرے معاشی زون قرار دیے جائیں گے اور ان پر حاکمیت کے سوال کو ایران اور امارات کے درمیان معاہدہ پر چھوڑ دیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ معاشی تعاون پر کیے گئے تمام معاہدوں کو نافذ کرتے ہوئے ایک ''ناردرن گلف کامن اکنامک زون'' کی تخلیق کی جائے گی۔
- طویل مدتی وقفہ جس میں 'شمالی عراق سے شروع ہوتی ہوئی جنوبی عمان تک ایک امن کی پٹی ہوگی'۔ (14)

امریکن برتری کے پیش نظر فی الوقت یہ تجاویز محدود طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن اتنے حساس موضوعات پر مختلف الخیال آرا کا اظہار اس بات کی علامت ہے کہ صورت حال سے بے اطمینانی موجود ہے۔ اس بحث کی ترقی اور جہت کی اچھی طرح نگرانی کرنی چاہیے اور جو نظریات اس سے برآمد ہوں ان کی تنقیح، وضاحت ہونی چاہیے تا کہ وہ علاحدہ علاحدہ مفادات کے لیے کام آسکیں۔

نظریاتی اصطلاحات میں علاقائی سلامتی تین قسم کی ہو سکتی ہے۔ (i) بزور بالادستی، (ii) حقیقی یا (iii) باہمی تعاون۔ ان میں سے ہر ایک کا مقصد تعلقات کے ایسے مستحکم اور پرامن ڈھانچہ کی تخلیق ہے جو ہر ریاست کو اس کی سلامتی کی کم سے کم ضروریات پورا کرنے اور اپنے سیاسی اور معاشی اداروں کو، بغیر پڑوسیوں کے لیے خطرہ بنائے، ترقی اور فروغ کی اجازت دے۔ ایسے فریم ورک کو قانونی جواز اور حاکمیت کے لیے عام رضامندی حاصل کرنا ہوگی ساتھ ہی باہمی افادیت کا ایک احساس بھی۔ (15)

خلیج فارس کے لیے بالادستی کا تصور دو صدیوں کے بیرونی تسلط کی وراثت ہے۔ اس کا بدستور جاری رہنے کا براہ راست تعلق غاصب طاقت کی اس صلاحیت سے ہے کہ وہ محکوم کو اس بندوبست کی افادیت اور قانونی جواز سے مطمئن کردے۔ یو ایس کی طاقت نے اَسی کی دہائی میں خلیج فارس میں قابل ذکر کامیابیاں حاصل کیں اور 1991 کی جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ لیکن اس کے بعد کا ریکارڈ خود نوے کی دہائی کی دوہری تحدید کی پالیسی سے متعلق ہو یا 2003 میں عراق پر حملہ کے بعد، ملا جلا ہے۔ خود جی سی سی ریاستوں نے بھی یو ایس کی طاقت کی ان حدود کو نظر میں رکھا ہے اور وہ جوہری توانائی کے مسئلہ پر ایران اور امریکہ کی چپقلش پر گہری نظر سے مطالعہ کررہے ہیں۔ ان کو ایران اور اس کی داخلی سیاست میں کثیر جہتی اندرونی اور بیرونی عناصر سے خدشات ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ متبادل کہ علاقائی سپر پاورس (ایران اور سعودی عرب) کو خلیج کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ دی جائے، بھی آگے نہیں بڑھ پارہا ہے کیونکہ جی سی سی کے امور میں آخرالذکر نے اپنے تفوق کو کھو دیا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی جی سی سی ریاستوں کے یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ساتھ آزادانہ فوجی اور سیاسی رشتے قائم ہو چکے ہیں۔

خلیج کے منظرنامہ میں وجدانی، دوطرفی اور مخصوص تکثیری نظام کارفرما ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی تنازعات کے حل کے لیے کسی مستحکم نظام کو نہیں پیش کیا ہے۔ لہٰذا متبادل کے طور پر تکثیریت کو اپنایا جاسکتا ہے جو اس اصول پر مبنی ہو کہ 'حفاظت و سلامتی کا مطلب دوسرے ممالک کے ساتھ ہونا ہے نہ کہ ان کی مخالفت میں'۔ (16) خلیج سے متعلق مخصوص

اجزائے ترکیبی کو تین وسیع زمروں میں سمیٹا جاسکتا ہے: (i) خلیج فارس وار آبنائے ہرمز میں جہازرانی کی آزادی، (ii) ساحلی ریاستوں کو اپنے ہائیڈرو کاربن وسائل کی کھوج اور برآمد کرنے کی آزادی اور (iii) ان دونوں کو ممکن بنانے کے لیے علاقائی امن اور داخلی استحکام کی یقین دہانی۔ اوّل الذکر دو تو بین الاقوامی کمیونٹی کی عام منظوری سے انجام پاسکتے ہیں کیونکہ مفادمشترک آسانی سے پہچانا جاسکتا ہے۔ خلیج کی ساحلی ریاستوں کے تعلق سے تیل اور گیس کی پیداوار اور برآمد میں مفاد کی یکجہتی کو پہچاننا اور برقرار رکھنا بھی آسان ہے۔ علاقائی استحکام کے لیے بھی یہی کہا جاسکتا ہے اور جہاں تک داخلی استحکام کا تعلق ہے بیرونی معاہدے اس کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ بالآخر اس کو داخلی سیاسی طاقتوں اور شہریوں کے حسن ظن پر چھوڑنا ہوگا۔ وہ سیاسی اصلاحات جن کا مقصد جمہوری طرز حکومت ہو بلاشبہ حکومت کی قانونی جواز میں اضافہ کریں گی۔ ان کا متن اور رفتار ہر معاشرہ اپنے حالات کے مطابق طے کرے گا۔ اس سلسلہ میں بیرونی مداخلت پیچیدہ نتائج کی ذمہ دار ہوگی۔

مذکورہ بالا سے قطع نظر، انیسویں صدی کے نظریہ 'وسائل پر قابو' اور ماضی قریب میں مارکیٹ سے متاثر نظریہ 'دستیابی' کا تصادم مسلم ہے۔ اور یہ تضاد خلیج کی سلامتی پر دو آرا کے جھگڑے سے ظاہر ہے۔ عالمی برادری اور علاقہ کی ریاستوں کے سامنے چیلنج یہ ہے کہ وہ عملی اور منظم سی بی ایم حکومتوں کے ذریعہ کھنچاؤ کو کم کرنے اور مشترکہ مفاد کے فریم ورک میں تمام تصورات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں ناگزیر اولین و بنیادی شرط شمولیت ہوگی کیونکہ گزشتہ تین دہائیوں کے تجربہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ مقابلہ جاتی سلامتی کا انتخاب خلیج فارس میں ناقابل عمل ہے۔ (17)

واقعات کے اس تسلسل میں ہندوستانی مفادات پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ خلیج فارس اور ہندوستان کے تعلق کو معین کرنا ایک جغرافیائی اور تاریخی مشق ہے۔ اگر علاقہ میں اس کے تجارت کے میزان کو سامنے رکھا جائے جو (2006 میں) 22 ملین امریکی ڈالر سے زیادہ ہوتا ہے، 45 لاکھ ہندوستانی شہریوں کی افرادی قوت، چھ سے آٹھ ملین امریکی ڈالر کی ترسیلی درآمد اور خلیج کی توانائی پر ہمیشہ بڑھتے ہوئے انحصار کے پیش نظر

ہندوستان کے نظریہ کے مطابق خلیج کا ایک مستحکم اور پائیدار سلامتی نظام حسب ذیل اجزائے ترکیبی پر منحصر ہوگا:

- آبنائے ہرمز کے ذریعہ خلیج کے پانیوں میں آنے جانے کی آزادی۔
- خلیج فارس کے بین الاقوامی پانیوں میں تجارتی جہازرانی کی آزادی۔
- ایسے تنازعات سے احتیاط جو تجارت اور جہازرانی کی آزادی کو متاثر کریں۔
- خلیج کی تمام ساحلی ریاستوں کو اپنے ہائیڈرو کاربن اور قدرتی وسائل کی کھوج اور برآمد کی آزادی۔
- ہر انفرادی ساحلی ریاست میں امن و استحکام کے دائمی حالات۔
- علاقائی اور غیر علاقائی حالات جو مذکورہ بالا شرائط کو مجروح نہ کریں۔

خلیج فارس ہندوستانی سلامتی کی حدود میں ہے۔ خلیج کی ساحلی ریاستیں ہندوستان اور ہندوستانیوں کی ہمدرد ہیں۔ ہندوستان کے بارے میں علاقہ کے اندر بیداری بڑھ رہی ہے اور وہ یہ جانتی ہیں کہ 2010 تک ہندوستان (i) پی پی پی کے اعتبار سے دنیا میں چوتھی سب سے بڑی معیشت اور توانائی کا چوتھا سب سے بڑا صارف ہوگا؛ (ii) ٹیکنالوجی اور سائنس پر مبنی بہت بڑی معیشت ہوگا اور (iii) خلیج کے بارے میں جو نئی دلچسپی پیدا ہوئی ہے اس کے سبب وہ اپنی بحری سلامتی، فوجی ٹریننگ اور دہشت گردی کے خلاف تجربہ سے وہ علاقہ کے استحکام میں حصہ لے گا۔ (18) یہ امیدیں باہمی تعلقات میں کئی پیمانوں پر پوری اتری ہیں جیسے کہ 'انڈیا جی سی سی سیاسی مذاکرات' اور 'معاشی تعاون کے لیے انڈیا جی سی سی فریم ورک معاہدہ'۔

نظر آنے والے مستقبل میں یہ ضروری ہے کہ ان تعلقات کو پختگی اور باہمی منفعت کے فریم ورک میں برقرار رکھا جائے۔ رہا مسئلہ تجارت اور توانائی کی سپلائی کے بحری راستوں کا تو اس کو ایک باہمی تعاون کے فریم ورک اور ہندوستانی ضروریات کے مطابق ایک خودمختار امتناعی صلاحیت کی تعمیر سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ سلامتی کے بندوبست میں مغرب کا برائے نام کردار، لازمی طور سے ایک ہی انتخاب نہیں ہے۔

حواشی

1۔ رابنو وچ، اتامر: ''اسرائیل اینڈ دی عربس 1948-2003'' (پرنسٹن یونیورسٹی پریس، پرنسٹن، نیو جرسی 2004) صفحہ 312

2۔ کورڈزمین، اینتھونی ایچ۔''سعودی عربیہ: گارڈنگ دی ڈیزرٹ کنگڈم'' (ویسٹ ویو پریس، بولڈر، کولاراڈو، 1977) صفحہ 192

3۔ زنی، جنرل (ریٹائرڈ) اینتھونی سی۔'دی امپیکٹ آف یو ایس پالیسی آن گلف سیکورٹی: دی ملٹری ویو پوائنٹ' کے لیے دیکھیے ''دی گلف: چیلنجز آف دی فیوچر'' (دی امیریٹس سینٹر فار اسٹریٹجک اینڈ ریسرچ اسٹڈیز ابوظہبی، 2005) صفحہ 147

4۔ کاٹزمین، کینتھ۔'دی پرشین گلف اسٹیٹس: ایشوز فار یو ایس پالیسی 2004' (کانگریس کے لیے سی ایس آر رپورٹ، 4/اکتوبر 2004) صفحہ 2

5۔ ''دی نیشنل ڈیفنس اسٹریٹجی آف دی یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا'' (دی ڈپارٹمنٹ آف ڈیفنس، واشنگٹن ڈی سی مارچ 2005) صفحات 13، 16 اور 19

6۔ انڈریو راتھ میل، تھیوڈور کاراسک اور ڈیوڈ گومپرٹ، اے نیو پرشین گلف سیکورٹی سسٹم''۔ ''رانڈ ایشو پیپر 2003'': پولاک، کینتھ ایم 'سیکیورنگ دی گلف'۔ ''فارن افیئرز'' (82:4، جولائی/اگست 2003) صفحات 75-161، رسل جیمز

ایلے''سرچنگ فارائے پوسٹ صدام ریجنل سیکورٹی آرکی ٹیکچر ،میریا جرنل (7:1 مارچ 2003)۔ اس سے پہلے کا ایک مقالہ''بی اونڈ کینٹن منٹ: ڈیفنڈنگ یو ایس انٹرسٹس ان دی پرشین گلف'' آئی این ایس ایس اسپیشل رپورٹ، نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی، ستمبر 2002۔

7۔ لیوریٹ، فرنٹ'دی گلف بٹوین اس' دیکھیے دی نیویارک ٹائمز 24 رجنوری 2006

8۔ تقریر کا متن

http://www.nato.int/docu/speech/2005/5051201a.html

9۔ دیمو، انطونیا، کویتی' عراقی اینڈ یوروپین پرسپکٹوز، دیکھیے ''مڈل ایسٹ پالیسی'' (IX:3، فال 2004) صفحات 51-48

10۔ 'ٹوورڈز اے نیو فریم ورک فار ریجنل سیکیورٹی'۔ پہلی آئی آئی ایس ایس ریجنل سیکورٹی سمٹ میں ہزرائل ہائی نس پرنس سعود الفیصل' وزیرخارجہ سعودی عرب کی تقریر۔''دی گلف ڈائیلاگ'' بحرین دسمبر 2004

11۔ پہلی ستمبر 1994 پر کانفرنس آن ڈس آرمامنٹ (سی ڈی/پی وی 690، صفحات 14-8) میں وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی کی تقریر دفاعی سلامتی اور خطروں کے تصور اور سلامتی کے مسائل پر بحث کرنے کے لیے ایک فورم کے قیام کی تجویز پیش کرتے ہوئے۔ اس کے بعد دسمبر 2005 میں خلیج فارس کی تمام ریاستوں کے درمیان ایک غیر تشدد معاہدہ کی تجویز آئی...خلیج فارس میں اجتماعی سلامتی کے لیے علاقائی بندوبست کے آئیڈیا کو 17 رفروری 2004 میں وزیر خارجہ فرازی نے کئی بار دوہرایا۔''دی ایرانین جرنل آف انٹرنیشنل افیئرز'' (XVI:1، اسپرنگ 2004) صفحات 88-187

12۔ ابتاہی، محمد علی،'ایران اینڈ انٹرنیشنل ریلیشنز: امپیکٹ آن پولیٹکل اسٹیبلٹی ان دی گلف'۔ دیکھیے ''دی گلف: چیلنجز آف دی فیوچر'' (ای سی ایس ایس آر ابوظبی، 2005) صفحہ 159

13۔ کورڈزمین، اینتھونی ایچ۔ ''دی ملٹری بیلنس ان دی مڈل ایسٹ: دی ناردرن اینڈ سدرن گلف (سینٹر فار اسٹریٹجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز، واشنگٹن، 2004) صفحہ 25

14۔ الفراج، سمیع ایم کویتی۔ 'عراقی اینڈ یوروپین پرسپکٹیوز'۔ دیکھیے ''مڈل ایسٹ پالیسی'' (IX:3، فال 2004) صفحات 45-40

15۔ کریگ، میئیکل۔ ''اسیسنگ الٹرنیٹو سیکوریٹی فریم ورکس فار دی پرشین گلف'' حوالہ سابق۔ صفحات 56-139

16۔ حوالہ سابق، صفحہ 154

17۔ دانشوروں نے باہمی تعاون میں سلامتی اور غیر حملہ آور دفاع کے نظریوں کی حمایت کی ہے۔ مثال کے طور پر کوپن ہیگن پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے جورن مولر نے اپنی متعدد تحریروں بالخصوص اپنے مضمون ''ریزولونگ دی سیکورٹی ڈیلیما ان دی گلف ریجن'' طبع شدہ ''دی ایمیریٹس اکیسرنل پیپرز، تمبر 9، ای سی ایس ایس آر، ابوظبی 1997 میں ایسا ہی کیا ہے۔

18۔ ساگیر، عبدالعزیز، اسٹریٹیجک روڈ میپ فار روبسٹ سعودی۔ انڈیا ٹائمز، http://Corp.gulfinthemedia.com/gulf_media/view_editiorial_en.php?id-1684, 22 January 2006

فلسطینی عسکریت پسندی اور امن کا عمل

سیاسی اور صحافتی حلقوں میں 'مذہبی بنیاد پرستی اور عسکریتی رجحان' کو اکثر و بیشتر موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ اور کم سے کم کچھ تبصرہ نگاروں کے نزدیک دونوں کے درمیان تعلق کو فرض کر لینے کے بعد اظہار کی ضرورت اب لازمی نہیں رہی۔ عام سوچ کی مغالطہ آمیزیوں سے قطع نظر' یہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ پاکٹ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق اساس پرستی یا بنیاد پرستی کا مفہوم 'روایتی مذہبی عقائد و ایمانیات سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہنا' ہے۔ لہٰذا کسی بھی مذہب کا پیرو اگر ان عقائد پر سختی سے عمل کرتا ہے جو پہلے سے کتابوں میں موجود ہیں تو وہ مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ معاشرتی پہلو سے مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ان عقائد پر عمل اس آزادی سے متصادم ہوتا ہے جو سماج میں دیگر گروپ کو حاصل ہے جس میں کہ وہ فرد یا گروپ اقامت پذیر ہے۔ ایسی صورت حال میں باہمی مساوات، احترام اور شناخت کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے گنجائش نکالنا لازمی ہے تاکہ مساوی اور مشترکہ وجود برقرار رہے۔ غیر رواداری سماجی بے چینی کے لیے جائز سبب ہے۔

مغربی ایشیا میں مذہبی بنیاد پرستی کی دو قسمیں ہیں: یہودی بنیاد پرستی اور اسلامی بنیاد پرستی۔ جہاں تک عسکریت پسندی کی اصطلاح کا تعلق ہے تو ہماری اس میڈیا کے زیر اثر

والی دنیا میں اس کے بین السطور کئی مفہوم ہیں لیکن اس کو عام طور سے دہشت گردی کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور خود دہشت گردی کی ابھی تک مناسب تعریف نہیں کی گئی ہے (1) اس رجحان کے دوسرے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں اور ایڈورڈ سعید نے اپنے ایک حساس مضمون میں، شناختوں کی اس خلط ملط کو صحیح کرنے کی جانب مفید مشورے دیے ہیں۔

اس مضمون میں ان فعال اور عسکری اسلامی اور یہودی تنظیموں سے بحث کی گئی ہے جن کے مقاصد اور اہداف کا تعلق براہ راست مغربی ایشیا کے امن عمل سے ہے۔ عربوں کی جانب سے اس مضمون میں اسلامی جہاد، مقبوضہ سرزمین کی اسلامی مزاحمت کی تحریک حماس اور جنوبی لبنان کی تحریک حزب اللہ کو لیا گیا ہے اور اسرائیل کی جانب سے 'گوش ایمونیم' اور گولان لابی کے علاوہ انتہائی دائیں بازو والے صیہونی گروپوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جیسے تیہیہ، کاچ اور موراشا۔

مغربی ایشیا میں ماضی اور حال کے تانے بانے ایک دوسرے سے مضبوطی سے گتھے ہوئے ہیں اور اس کے پیش نظر یہ مناسب ہوگا کہ فلسطین میں برطانوی حکمرانی کے آخری دنوں میں، سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے یہودی گروپوں کے رجحان کو یاد کیا جائے جو جدید دور میں عسکریتی استعمال کی بہترین مثال ہے۔ برطانوی ناکامی کے اسباب پر تجزیہ کرتے ہوئے برطانوی عوامی شخصیت پال جانسن کا مشاہدہ ہے کہ 'اصل سبب جدید دنیا کی تعمیر میں ایک اور یہودی کاوش ہے یعنی روشن خیال حکمرانوں کے ارادوں کو ختم کرنے کے لیے دہشت گردی کا سائنٹفک استعمال۔ اگلے چالیس سالوں میں اگرچہ یہ عام بات بن گئی لیکن 1945 میں یہ نئی بات تھی، (3) ابا ایبان نے اس تجزیہ کو درست ٹھہرایا ہے۔ 'یہ تاریخی مسلمہ ہے کہ ان دو تنظیموں (یعنی آئی زیڈ ایل اور لیحی) نے ناقابل برداشت ماحول پیدا کرنے میں مدد کی جس کی وجہ سے برطانیہ نے اپنے کردار کو تیاگ دیا' (4) ابھی حال ہی میں ہیبرو یونیورسٹی کے ڈاکٹر سیمون سوفر نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اس زمانے کی یہودی عسکریت پسندی کی معقولیت پر بحث کی ہے۔ 'فوجی سطح پر یہ ایک شہری گوریلا فورس کی دہشت گردانہ کارروائیاں تھیں جن کا نشانہ برطانوی فوج تھی اس کے ساتھ ساتھ شہری بغاوت

اور کار آمد عناصر کی حمایت کی پالیسی۔ آخری نتیجہ میں انقلاب تاریخی رضا کارانہ عمل پر منحصر رہا اور کسی بیرونی قانونی جواز کی ضرورت نہیں پڑی۔'(5)

مغربی ایشیا کے سیاق وسباق کو سمجھنا چاہیے۔ 1948 میں اسرائیل کی ریاست کے ظہور کے نتیجہ میں فلسطینیوں کے قومی حق کا انکار ہوا اور اس کی وجہ سے فلسطینی آبادی کا انتشار وجود میں آیا۔ عرب اور فلسطینی کئی سال تک ناامیدی اور دل شکستگی کی حالت میں رہے۔ آخرکار 1964 کی قاہرہ میں عرب چوٹی کانفرنس نے فلسطینیوں کو سیاسی طور سے پی ایل او کی قیادت میں منظم ہونے کی اجازت دی اور حوصلہ افزائی کی۔ کچھ اور فلسطینی گروپ بھی آزادانہ طور سے وجود میں آئے۔ 1965 تک فلسطینی گروپس نے اسرائیل کے سرحدی نشانوں پر گوریلا طرز کے حملے کیے جس کے نتیجہ میں اسرائیل نے بھی انتقامی کارروائی کی۔ 1967 کی جنگ نے فلسطین کے علاقہ پر اسرائیل کے قبضہ کو مکمل کردیا۔'اسرائیلی حکومت میں فلسطینی جو زیادہ تر اوقات خود کو متحد پاتے تھے' نے ایک علاحدہ اور آزاد وجود کا مطالبہ کیا(6) آخرکار' 1968 کے شروع میں وہ خود اٹھ کھڑے ہوئے اور قومی آزادی کی خاطر ایک گوریلا جنگ کے آغاز کا اعلان کیا'(7) دوسرے محرکات کے علاوہ ان کے سامنے فرانس کے نوآبادیاتی نظام کے خلاف الجزائریوں کی کامیاب جدوجہد کی مثال تھی جو ہر لحاظ سے قابل تقلید تھی۔ لیکن عرب سیاست کی باطنی کشمکش کے باعث جلد ہی فلسطینیوں اور ان عرب ممالک کے درمیان جہاں انھوں نے اسرائیل کے خلاف حملہ کے لیے اڈے بنائے تھے جیسے اردن، شام اور لبنان میں جھڑپیں ہوئیں کے بعد دیگرے ان حکومتوں نے اپنی حدود میں خودمختار فلسطینی گروپس کے وجود کو ناقابل برداشت قرار دے دیا۔ اس طرح تاریخ کے ایک عجیب موڑ میں فلسطینیوں نے بھی 'بابل کی قید وبند' کا تجربہ کیا جبکہ ان کی قیادت کو دور افتادہ تیونس میں پناہ حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ایک فرانسیسی صحافی اور سفارت کار جنھیں مغربی ایشیائی امور پر بے پناہ جانکاری ہے نے کچھ سال پہلے تبصرہ کیا تھا کہ عرب اسرائیل تنازعہ کا کوئی منصفانہ حل نہیں ہوسکتا صرف ایک قابل قبول سمجھوتہ ہوسکتا ہے'(8) اس سمجھوتہ کی شرائط پر مذاکرات 1967 سے

جاری ہیں لیکن بات ہمیشہ اسرائیل کی مقبوضہ علاقہ سے واپسی پر اٹک جاتی ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ریزولوشن نمبر 242 اور 338' اور اوسلو معاہدہ اور اس کے بعد کے معاہدوں کے مطابق یہ بحث بین الاقوامی سطح پر جاری ہے لیکن یہ اسرائیل کی خانگی سیاست کا مرکزی نقطہ بھی ہے۔ یہ بحث مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی شہریوں کو بسانے کی شعوری پالیسی، تاکہ اِن علاقوں پر ان کے پُرکھوں کے قدیم دعویٰ کو مزید تقویت ملے، اور پیچیدہ ہوگئی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اسرائیل میں اعتدال پسندوں کا ایک ایسا طبقہ ہے جو 'زمین کے بدلے امن' کی پالیسی کے حق میں ہے۔ لیکن انتہا پسند جن کی نمائندگی پارلیمنٹ میں لکوئیڈ اور این آر پی اور پارلیمنٹ کے باہر گوش ایمونیم اور دائیں بازو کی دوسری پارٹیاں کرتی ہیں، کسی ایسے سمجھوتہ کو خام خیالی قرار دیتے ہیں اور اس کے بجائے عظیم اسرائیل کی پالیسی کی وکالت کرتے ہیں جس میں زمین کے کسی بھی ٹکڑے کی واپسی کو قطعی خارج از امکان مانا جاتا ہے یا زمین کے تھوڑے سے ٹکڑے کی واپسی اس شرط پر کہ اسرائیلی نوآبادیوں کو نہیں چھیڑا جائے گا۔ تیہیہ کے ربی ایلیزا والڈمین اس سخت گیر رویہ کی نمایاں مثال ہے۔ اس کا یقین ہے کہ قانون الٰہی یہ ہے کہ ارضِ موعود کا ایک انچ ٹکڑا بھی الگ نہ کیا جائے۔ اسی مقام پر تیہیہ کی عسکریت پسندی پر دوغلے رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ 'ایک پارٹی کی حیثیت سے ہم یہودی دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں لیکن ہم پارٹی کے اراکین کی انفرادی دہشت گردانہ کارروائیوں پر روک نہیں لگا سکتے۔'(9) ووٹ اور پارلیمنٹ کی نشستوں کے اعتبار سے ان گروپس کا وزن محدود ہے لیکن یہ عوامی رائے کو بنا سکتے ہیں اور پارٹی سے الگ حمایت پر قابو رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ امن عمل میں ایک رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

مقبوضہ علاقوں میں فلسطینی عسکری گروپ جیسے اسلامی جہاد اور حماس کی اصل کو 1967 کی ناکامی کے بعد خود احتسابی، عرب حکومتوں کا فلسطینیوں کے ساتھ برتاؤ، اسرائیلی قبضہ کا تجربہ اور 1970 کے بعد کے زمانہ میں پی ایل او کی زوال پذیری میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ایک نظریاتی تنظیمی بنیاد اخوان المسلمین کی شکل میں موجود تھی۔ لیکن 1967 کے بعد اس تنظیم نے خود کو سیاست سے دور رکھا اور اپنی پوری توجہ مذہبی مدارس،

خیراتی تنظیموں اور سماجی انجمنوں کے قیام کے ذریعہ ایک اسلامی نسل کو پروان چڑھانے پر مرکوز رکھی۔ ساتھ ہی ساتھ مساجد پر بھی کنٹرول قائم رکھا۔ اس بات کے بھی کچھ شواہد ملتے ہیں کہ اسرائیلی حکام نے ان سرگرمیوں کے پھیلاؤ کی اجازت اس لیے دی کہ اس سے پی ایل او کی حمایت میں کمی آئے گی (11) لہٰذا اس زمانے میں اخوان کی سرگرمیوں نے 'قبضہ' کی وجہ سے عوام کو پیش آنے والی مشکلات کا سامنا نہیں کیا، اسی درمیان آخرالذکر سیکولر طاقتوں جیسے کہ پی ایل او کی اسرائیلی پالیسیوں کو نقصان پہنچانے کی ناکامی کی وجہ سے بددل ہوگئیں۔ مقبوضہ علاقوں میں ایم بی کے قائد شیخ احمد یٰسین نے اخوان کی سوسائٹیوں اور مسجدوں کو اسلامک سینٹر غزہ سے براہِ راست جوڑ کر ان پر تنظیمی کنٹرول کو مضبوط کیا جس کو انھوں نے اسی سال قائم کیا تھا۔ 81-1980 میں اخوان المسلمین اور پی ایل او کے تعلقات، جو کبھی بھی خوش گوار نہ تھے، اس حد تک خراب ہوگئے کہ مغربی کنارہ اور غزہ میں کئی مقامات پر دونوں کے حمایتیوں کے درمیان پرتشدد جھڑپیں ہوئیں۔

اسلامی جہاد جو اخوان کا ایک الگ ہوا ٹکڑا ہے 1980 میں وجود میں آیا۔ اس نے اپنے نظریات میں ایرانی انقلاب کے اثرات کو تسلیم کیا۔ اس نے مقبوضہ علاقوں کے مصیبت زدگان کی جانب توجہ کی اور مذہب اور جہاد کے راستوں میں جدلیاتی رشتہ قائم کرتے ہوئے مذہب اور قوم پرستی کا ایک مرکب پیش کیا۔ اس نظریاتی پیش کش کو مقبوضہ علاقہ میں اچھی طرح قبول کیا گیا جہاں پر اس گروپ کا احترام کیا جاتا ہے۔ اسی سبب سے اس کی کامیابی فلسطینی مزاحمت کے سیکولر گروپ اور ایم بی دونوں کے لیے خطرہ تھی۔ اسلامی جہاد کے خیال میں 1948 اور 1967 کی ناکامیاں بالترتیب آزاد اور سماجی رجحان کی ناکامیاں تھیں۔ عربوں کی تباہی دراصل ذہنی تباہی ہے۔ صیہونیت کی شکل میں مغربی چیلنج کے سامنے جدید عرب فکر بہت ذلت آمیز طریقہ سے ناکام ہوتی ہے۔ اس چیلنج کا تنہا دانشورانہ جواب اسلامی رجحان میں ہے جس میں مسلح جدوجہد سیاسی حکمت عملی میں شامل ہے۔ ایم بی کے برعکس اسلامی جہاد نہ تو معاشرہ کو اسلامیت میں تبدیل کرنے کو فلسطین کی آزادی کی اوّلین شرط مانتا ہے اور نہ ہی یہ اس میں کوئی اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اخوان کی

طرح یہ بھی تمام مجوزہ سیاسی تصفیوں اور ان میں اسرائیل کی شرکت کی منظوری کو مسترد کرتا ہے۔ اخوان کے برعکس یہ عرب حکومتوں کے خلاف ہے اور ان کو 'اسرائیل کی حقیقی حفاظتی پٹی' قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنی توجہ مقبوضہ علاقہ کے محرومین پر مرکوز کی ہے۔ پی ایل او کی جانب ان کا رویہ ملا جلا ہے حالانکہ یہ فتح کی ٹکڑی کو 'تمام فلسطینی عوام کے مفادات' سے جڑا ہوا سمجھتا ہے۔ انتفاضہ سے قبل کے دور میں اسلامی جہاد کی کچھ فوجی سرگرمیاں بہت نمایاں تھیں اور اس وقت اور بعد میں ان کو دبانے کی خاطر لیے گئے اقدام ناکام ثابت ہوئے۔ اسی وجہ سے ایک اسرائیلی صحافی نے یہ تبصرہ کیا تھا اسلامی جہاد ایک ایسے پودے کی طرح ہے جو کاٹنے کے بعد پہلے سے زیادہ بڑا اور مضبوط بن کر اُگتا ہے' (12) اس کے عقیدہ کا رجحان اس کو بہت زیادہ سیاسی کارروائیوں کی گنجائش نہیں دیتا۔

حماس انتفاضہ کی خالق نہیں تخلیق تھی۔ 8 دسمبر 1987 کا واقعہ غیر ارادی تھا لیکن غیر معمولی شدت کے ردّعمل کے ساتھ اور ایک ایسا واقعہ جس کی وجہ سے زمینی حقیقت اور اس کے تصور کے بارے میں معاشرہ میں کیفیتی تغیر رونما ہوا۔ اس صلاحیت کو پہچاننے اور اس کو ایک موقعہ میں تبدیل کرنے کا سہرا ایم پی کے سر جاتا ہے جس نے دوسرے دن ہی غزہ کے اسلامک سینٹر میں ایک میٹنگ بلائی اور شیخ یٰسین کے مشورہ پر اس نئی تحریک کے لیے علاحدہ تنظیم بنائی جو مغربی کنارہ سے اس کے روابط قائم کرے گی اور مالی امداد فراہم کرے گی۔ جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ نئی تنظیم اور اخوان کے درمیان غیر معمولی احتیاط کے ساتھ فاصلہ قائم رہے اور سیاسی سرگرمیوں کے متعلق برادرہڈ کا نظریاتی موقف برقرار رہے۔ ابھرتی ہوئی صورت حال سے واقف ہوتے ہوئے اخوان نے 14 دسمبر کو ایک بیان کے ذریعہ عوام کو اسرائیلی قبضہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی۔ اس نے حماس کو اعتبار بخشا اور تھوڑے عرصہ میں وہ ایک نہ نظرانداز کرنے والی قوت اور پی ایل او کے زیر قیادت سیکولر طاقتوں کے لیے ایک چیلنج بن گئی۔ جب اگست 1988 میں حماس کا منشور شائع ہوا تو اس میں رسمی طور پر اخوان اور حماس کے رشتہ کو تسلیم کیا گیا۔ لیکن حماس کا پروگرام اخوان کے پروگرام سے مختلف تھا۔ اور مضبوطی کے ساتھ قبضہ کے خلاف جہاد سے بندھا ہوا تھا۔ اس

کے مطابق فلسطین ایک اسلامی وقف تھا لہٰذا اس کے اوپر کوئی سودے بازی نہیں ہوسکتی تھی، قوم پرستی مذہبی نظریہ کا حصہ اور تحریک بجائے خود بین الاقوامی نوعیت کی حامل تھی۔ اس نے پی ایل او کی خدمات کو تسلیم کیا لیکن اس کی سیکولر ذہنیت کو واضح طور سے غیر اسلامی قرار دیا۔ اپنے عمل کے لیے انھوں نے صلیبی جنگوں اور برطانیہ سے ان کے تعلق سے ایک تاریخی پل بنایا۔ برطانیہ کا فلسطین پر 1918 پر قبضہ اور پھر صیہونی نوآبادی ایک ہی سلسلہ کی کڑی تھی۔ مجموعی طور سے یہ دستاویز (جس میں موزوں اور برمحل قرآنی آیات کی کثرت تھی) ان جیالے کارکنوں کے لیے نظریات کی ہینڈ بک تھی جن کی سرگرمیاں ساجی زندگی کے ہر پہلو پر محیط اور عوام کے لیے فائدہ مند تھیں۔ کارکنوں اور خواتین کو متحرک بنانے کا عمل خصوصی طور سے دیکھنے کے قابل تھا جس کو جوسٹ ہلٹر مین نے اپنی کتاب 'بی ہائینڈ دی انتفاضہ' میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ بہت جلد فلسطینیوں کے لیے انتفاضہ ایک طرز زندگی بن گیا اور حماس کو ایک بڑی سیاسی قوت سمجھا جانے لگا(14)۔

حماس اور اسلامی جہاد دونوں کے نزدیک 1993 کا معاہدہ ایک دھوکہ ہے اور فلسطین میں سیکولر نیشنلسٹ ترجیح کو سوچے سمجھے طریقہ سے صحیح ثابت کرنا ہے(15) گزشتہ چند سالوں سے حماس اور پی این اے کے تعلقات ڈگمگا رہے ہیں اور آخرالذکر پر اسرائیلی دباؤ صاف نظر آرہا ہے۔

جنوبی لبنان کی حزب اللہ ایک الگ ہی قسم کی تحریک مزاحمت ہے اس کا ظہور اس علاقہ کے شیعاؤں کے درمیان ہوا اور اس کو اسرائیل کے 1982 کے حملہ اور قبضہ کے دوران فروغ حاصل ہوا۔ جس کو شیعاؤں نے پہلے پہل اپنی خاموش منظوری دی تھی(16)۔ دس محرم (16 اکتوبر 1983) کے دن ایک واقعہ نے عوام اور اسرائیلی فوج کے درمیان کشیدگی پیدا کردی۔ اگلے دن ایک سینئر شیعہ عالم دین نے جنوب کے قبضہ کے خلاف مزاحمت اور شہری نافرمانی کا فتویٰ جاری کردیا اس کے مطابق اسرائیل سے کسی بھی قسم کا تعلق قطعی طور پر ناجائز تھا۔ اس میں مزید کہا گیا کہ ہر نسل کا اپنا کربلا ہوتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہر شخص فیصلہ کرے کہ وہ عروج اور قربانی کے راستہ پر چلے گا یا ذلت اور فریب

کو اپنائے گا۔ اس دعوت کا اثر ڈرامائی انداز میں ہوا۔ 23 اکتوبر کو دو خودکش ڈرائیوروں نے یوایس میرین بیرکس اور ملٹی لیٹرل فورس کے فرانسیسی دستہ کے ہیڈکوارٹر پر حملہ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جنوبی لبنان میں صرف 1984 میں اسرائیلی فوجیوں کے خلاف 900 سے زیادہ حملہ ہوئے ہیں۔ شیعہ قائد نبیہ بیری نے کہا کہ 'فلسطین پر زر کثیر صرف کیا گیا۔ ہم نے عربوں کو ہمت اور شہادت کا سبق سکھایا'۔ ایرانی اثرات نمایاں تھے اور ساتھ ہی 'آزادی کا دینی فلسفہ' کی ایک مقامی مشکل شیخ فضل اللہ کی تعلیمات سے پھیل رہی تھی جن کے انقلابی عزائم لبنان کی خانہ جنگی میں سامنے آئے اور جس کو انھوں نے اپنی 1972 کی کتاب ''الاسلام ومنطعہ القوۃ'' میں بیان کیا ہے اور شیعہ خاموشی کو بغاوت اور مزاحمت سے بدلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ''اگر اپنی ذات، زمین اور تقدیر کا دفاع جائز ہے تو ذاتی مدافعت کے لیے ہر ذریعہ بھی جائز ہے'' (17) جنوبی لبنان پر اسرائیلی قبضہ کے تجربہ پر ان تعلیمات کا محرکاتی اثر مسلم الثبوت ہے اور حزب اللہ کے لیے وسیع تر عام حمایت اب غیر متنازعہ ہے۔

ان تحریکوں کی مالی امداد کے بارے میں کافی حقیقی اور ظنی شواہد دستیاب ہیں۔ حماس اپنے مالیاتی فنڈ کے وسائل کے لیے خصوصی طور سے یہ مقامی چندہ، انفرادی عطیات، بیرونی ممالک کی اسلامی تحریکات سے مدد، اور کچھ حکومتوں پر بھروسہ کرتا ہے (18) یہاں ان حکومتوں سے مراد گلف کوآپریشن کونسل (جی سی سی) کی دولت مند ریاستیں ہیں۔ اسلامی جہاد کی عرب ریاستوں سے معروف بیزاری کے باعث اس کے مالی وسائل کے بارے میں معلومات کم ہیں۔ حزب اللہ کا بیرونی سرپرست ایران ہے اگرچہ مدد کی مقدار بدلتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایران نے حزب اللہ اور اسلامی جہاد کے کارکنوں کو ٹریننگ کی سہولتیں بھی مہیا کی ہیں۔

کیا مغربی ایشیا کے منظرنامہ کے مذکورہ بالا مختصر سے جائزہ سے کوئی ماحصل نکلتا ہے؟ غالباً مندرجہ ذیل پر غور کیا جا سکتا ہے:

- 1967 کی جنگ تاریخ کا ایک اہم موڑ تھی کیونکہ اس نے زمینی حقیقتوں کو بدل دیا اور ایک نئی طرز فکر کو جنم دیا جس کی توجہ اسرائیل کی توسیع پسندی اور عربوں کی سعی بازیافت کی جانب ہے۔

مغربی کنارہ اور غزہ میں بستیاں بسانے کی اسرائیلی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ اقوام متحدہ سلامتی کونسل کی قرارداد 242 اور 338 کے شرائط کے مطابق مسئلہ کے تصفیہ کو روکا جائے اور مغربی کنارہ پر ایک فلسطینی مملکت کے قیام کے امکان کو ختم کیا جائے۔

ستر کی دہائی میں عربوں کی جانب سے مکمل تصفیہ کی طرف پیش قدمی میں ناکامی اور امریکہ کے ایک جزوی تصفیہ کی طرف جھکاؤ نے اسرائیل کو خوب کھیل کھیلنے کا موقعہ دیا۔ دائیں بازو والے نوآبادکار گروپ کے مفادات کو سیاسی فرقہ وارانہ انتخابی حساب وکتاب اور سرد جنگ کے دوران یہودی تارکین وطن کے تصور نے مزید طاقت بخشی۔ پی ایل او کے حاشیہ پر آجانے اور مجموعی طور سے اسرائیل پر ضرب لگانے میں فلسطینی سیکولر گروپس کی ناکامی کی وجہ سے ان کو دوبارہ نافذ کیا گیا۔

نتیجہ کے طور پر پیدا عوامی دل شکستگی اور نظریوں کی عدم موجودگی نے اسلامی گروپس کو یہ موقعہ دیا کہ وہ موجودہ اضطراب کو ایک جہت دیں اور اس کو ایک گہرے اور وسیع پیمانہ پر سمجھے جانے والے لہجہ میں بیان کریں۔

ان اسلامی گروپس کو عوامی تحریک کا نام دینا حق بجانب ہے۔ اسلامی جہاد، حماس اور حزب اللہ کی حکمت عملی کو بیرونی مشاہدین اور اسرائیلی تبصرہ نگاروں نے بھی سراہا ہے۔ اس نے اسرائیل میں بھی سوچ کا نیا انداز پیدا کیا اور اس واہمہ سے نجات دلانے میں مدد کی کہ 'حفاظت کے ساتھ ساتھ زمین بھی' ایک پائیدار پالیسی ہے۔ ابا ایبان نے کہا ہے کہ ''امن عمل کے فروغ میں ایک سبب اسرائیلی توسیع پسندی اور بالادستی کے تجربہ کی ناکامی بھی تھا'(19)۔

اگر چہ ٹھہر ٹھہر کر لیکن 1993 کے معاہدوں کے نفاذ نے اسرائیل میں دائیں بازو والے عظیم اسرائیل گروپس کی حمایت کو کم کر دیا، گو کہ وہ اس کو یکسر ختم نہیں کر سکا۔

اسلامی گروپس نے امن معاہدوں کے خلاف اپنی مہم جاری رکھی۔ نومبر 1999 کے ایک انٹرویو میں شیخ یٰسین نے تسلیم کیا کہ امن عمل 'پسپائیوں کا ایک سلسلہ' ہے اور یہ کہ ان مذاکرات کی انتہا یہ ہے کہ فلسطین کے مسئلہ کو دفن کر دیا جائے: ''وہ ہم کو ایک ریاست دینا چاہتے ہیں جس کی سرحدیں تو ہیں لیکن اقتدار اور سلامتی نہیں ہے جب کہ وہ خود ایک ایسی ریاست کے مالک ہیں جس کے پاس مکمل اقتدار، واضح سرحدیں، سلامتی اور ساتھ میں یہودی بستیاں ہیں۔ ہمارے پاس اس ناجائز قبضہ کے خلاف کوئی اور چارہ نہیں ہے سوائے اس کے ہم اس وقت تک مزاحمت کریں جب تک کہ حالات اس کے برعکس نہیں ہو جاتے (20)۔

1996 میں لکھتے وقت ایک باریک بین تبصرہ نگار نے اس وقت کے منظرنامہ کو جن الفاظ میں محصور کیا ہے وہ آج بھی موزوں ہیں۔ 'فلسطینی سیاست میں سیاسی اسلام کی مرکزی حیثیت برقرار ہے اور اسرائیل فلسطین تنازعہ میں کسی بھی فیصلہ میں اس پر غور کرنا لازمی ضرورت ہے کہ مغربی کنارہ اور غزہ پٹی میں سیاسی اسلام کو فوجی طاقت' جلاوطنی گرفتاریوں اور قتل سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسرائیل اور فلسطینی حکام دونوں کو اس بات کو قبول کرنا ہوگا کہ سیاسی اسلام کے اثر سے نمٹنے کے لیے انھیں سیاسی اور فوجی دونوں طریقے استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ طریقے زیادہ سے زیادہ جمہوری اور شفاف ہوں اور جبر و زبردستی پر ان کا انحصار نہ ہو۔' (21)

کئی برمحل سوالات اب بھی تشنہ ہیں۔ کیا اسلامسٹ گروپس امن عمل کی مخالفت جاری رکھیں گے خواہ عوام کی اکثریت اس کے فیصلہ کو قبول کرلے؟ (22) کیا کوئی ایسی سیاسی تدبیر عمل میں لائی جاسکتی ہے جس کے ذریعہ اسرائیل اور پی این اے حماس کو امن عمل میں شامل کرنے کو تیار ہو جائیں؟ کیا حزب اللہ، جو پہلے ہی لبنانی سیاسی نظام کا حصہ ہے، اسرائیل کے خلاف اپنی کارروائیوں کو ختم کردے گی اگر اسرائیل جنوبی لبنان کو چھوڑ دیتا ہے؟ کیا اسلام جو مزاحمت کی حکمت عملی بنانے میں کامیاب ہے، ان معاشروں میں (فلسطین اور لبنان) جہاں آبادی کا قابل ذکر حصہ غیر اسلامی ہو، ریاست کی تعمیر و تشکیل

میں ایک موزوں اور پائیدار نظریہ ثابت ہوسکتا ہے؟ معاشرہ میں دین کے مقام کے موضوع پر اسرائیل میں جاری بحث کس نہج پر پہنچے گی خصوصا جب کہ رپورٹس بتاتی ہیں کہ نئی نسل مذہبی تجدید کے لیے مضطرب ہے؟(23) کیا نوآبادیوں، پانی، پناہ گزین اور یروشلم کے مسائل مساوی طور سے ایک معقول وقت کے اندر سلجھ جائیں گے اس سے پہلے کہ کوئی اور نئی یا دوبارہ زندہ ہوجانے والی تحریک عوام کے بھڑکے ہوئے جذبات کو اپنی لپیٹ میں نہ لے؟ اور آخر میں کیا دونوں جانب کے 'اوّل مفروضوں پر دوبارہ غور کرنا ایک نئے، بہتر مساویانہ علاقائی نظام کی تعمیر میں مدد نہ دے گا؟

مغربی ایشیا کے کسی بھی پس منظر کے ادراک کے لیے ہشام شربی کے اس قول سے آگاہی ہونی چاہیے کہ 'عقل کی یاسیت سے مقابلہ کرنے کے لیے، آدمی کو ارادہ کی رجائیت کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنا چاہیے'۔

حواشی

1۔ دہشت گردی کی قابل قبول تعریف کی تلاش کے مسئلہ پر دیکھیے کارتھا، تارا 'کاونٹرنگ ٹرانس نیشنل ٹیررزم' ''اسٹریٹیجک انالیسس (23:11، فروری 2000) خصوصی طور سے صفحات 53-1850
2۔ سعید، ایڈورڈ ڈبلیو'' آئی ڈینٹٹی، نکیلن اینڈ واٹلنس ان دی پالیٹکس آف ڈس پزیشن'' (ونٹیج، لندن 1995) صفحات 59-341
3۔ جانسن پال، ''اے ہسٹری آف دی جیوز'' (ہارپر اینڈرو، نیویارک 1987) صفحہ 521
4۔ ایبان، ابا'' این آٹوبائیوگرافی'' (رینڈم ہاؤس، نیویارک 1977)، صفحہ 136
5۔ سوفر، سیسون ''زائیونزم اینڈ دی فاؤنڈیشنز آف اسرائیلی ڈپلومیسی'' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، 1998) صفحہ 420
6۔ ہورانی البرٹ ''اے ہسٹری آف دی عرب پیوپل'' (ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ہارورڈ، کیلی فورنیا، 1991) صفحہ 414
7۔ عجمی، فواد''دی عرب پریڈی کیمنٹ'' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج 1981) صفحہ 91

8۔ رولیو، ایرک 'دی پیس پروسس اینڈ پولیٹکل اسلام' (انٹرویو) ''جرنل آف پیلسٹینین اسٹڈیز' (22:4 اپریل 1993) صفحہ 52

9۔ مرگوئی رافیل اور سمونات فلپ ''اسرائیلز آیت اللہ۔ میر کہانے اینڈ دی فار رائٹ ان اسرائیل'' (ساقی بکس، لندن 1987) صفحات 15-114، کاچ کے ایک سرگرم کارکن کی دہشت گردی کی مثال کے لیے دیکھیے اری، ساور ''دی پروسس'' (رینڈم ہاؤس، نیویارک 1996) صفحات 23-121، ان مذہبی یہودیوں کا موازنہ ان نہایت قدامت پرست یہودیوں سے نہ کیا جائے جن کے اسرائیلی معاشرہ میں رول اور مقام کے بارے میں دیکھیے ایلیام ڈوو اور ٹریمونٹی انا ماریا، 'اسرائیل اے ہاؤس ڈیوائڈڈ'۔ ''انٹرنیشنل جرنل، ٹورنٹو (53:4، فزاں 1998) صفحات 21-609

10۔ اسلامی جہاد اور حماس کے لیے دیکھیے عمرو، ابوزید ''اسلامک فنڈ امینٹلزم ان دی ویسٹ بینک اینڈ غزہ'' (انڈیانا یونیورسٹی پریس، بلومنگٹن، انڈیانا، 1994)، اس کے علاوہ ان کا مقالہ 'حماس: اے ہسٹوریکل اینڈ پولیٹکل بیک گراؤنڈ' بھی دیکھیے، 'جرنل آف پیلسٹینین اسٹڈیز (22:4)، گرما 1993) صفحات 19-5، مزید دیکھیے بورغولی عیاض 'دی اسلامسٹس ان جارڈن اینڈ پیلسٹینین اکو پائیڈ ٹیریٹریز' لورا کوازون (ایڈیٹ) کی کتاب ''دی اسلامسٹ ڈیلمیا'' (اتھاکا لندن 1995) صفحات 60-129، کسی بیرونی مبصر کے تفصیلی مشاہدہ کے لیے دیکھیے ملٹن، ایڈورڈ بیورمی ''اسلامک پالیٹکس ان پیلسٹائن'' (آئی بی ٹورِس، لندن 1996)، جس میں یہ سوال کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے انھوں نے زیتون کی شاخ کو چھوڑ کر بندوق کو اپنا لیا؟ کو بہت محتاط طریقہ سے زیر بحث لایا گیا ہے۔

11۔ شپلر، ڈیوڈ کے، ''عرب اینڈ جیو۔ وونڈڈ اسپرٹس ان اے پرومزڈ لینڈ'' (ٹائمز بکس، نیویارک، 1986) صفحہ 177۔ پی ایل او کے افسران کا بھی یہی خیال تھا۔ موازنہ کیجیے عمرو ابوزید (1994) صفحات 36-33، اور ملٹن، ایڈورڈز، حوالہ

سابقہ، صفحات 8، 53-151 اور حماس اور اسرائیلی حکام میں رابطہ کے ثبوت کے لیے 236n18: ''اسرائیلی پالیسی کے معماروں نے ہمیشہ حماس کو ایک اعتدال پسند اسلامی تحریک کی نظر سے دیکھا جس کا مقصد سماجی اصلاحات تھا بجائے ایک ایسی اسلامی تنظیم کے جس کا مقصد جہاد ہو جب تک کہ سارے فلسطین سے اسرائیلی قبضہ کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کے علاوہ اسرائیلیوں نے اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند کر لیں کہ حماس کے خزانوں کے لیے ملک میں زر کثیر آ رہا ہے جب کہ دوسری طرف انتفاضہ کی حمایت میں پی ایل او کی رقوم کی آمد کو سختی سے روکا گیا۔'

12۔ حوالہ سابق، ابوعمرو نے حوالہ دیا۔ صفحہ 108

13۔ ''جرنل آف پیلسٹینین اسٹڈیز'' (22:4) میں حماس کے منشور کا انگریزی متن۔ صفحات 34-122

14۔ ملٹن، ایڈورڈز، حوالہ سابق، صفحہ 153

15۔ مذکورہ بالا حوالہ، صفحہ 173

16۔ عجمی فواد، ''دی وینشڈ امام۔ موسیٰ صدر اینڈ دی شیعاز آف لبنان'' (کورنل یونیورسٹی پریس، لندن، 1986) صفحات 222-200

17۔ حسین فضل اللہ کے نظریات کے لیے دیکھیے ابو ربیع، ابراہیم ''انٹلکچو ئیل اوریجنز آف اسلامک ریجرنس ان دی موڈرن عرب ورلڈ'' (ایس یو این وائی پریس، نیویارک، 1996) صفحات 47-220

18۔ ابوعمرو، حوالہ سابق (1993) صفحات 17-16 اور (1994) صفحات 89-87

19۔ ایبان، ابا، 'ڈپلومیسی فار دی نیکسٹ سنچری' (ییل یونیورسٹی پریس، نیو ہیون، کونیکٹی کٹ، 1998) صفحہ 159

20۔ شیخ احمد یٰسین کا انٹرویو المشاہد السیاسی ویکلی (مڈایسٹ مرر) کو، 23 نومبر 1999، پارٹ 1، صفحات 3-2

21۔ ملٹن ایڈورڈ، حوالہ سابق، صفحات 212 اور 219

22۔ ایک سرگرم اسلامسٹ کارکن اور اسلامک یونیورسٹی غزہ کے سابقہ کارگزار صدر ڈاکٹر محمد الشیخ صیام نے 30 مارچ 2000 میں جے این یو کے سامعین سے کہا فلسطینیوں میں امن عمل کی مخالفت کے مختلف درجے ہیں اور یہ اس وقت زیادہ ظاہر ہوتے ہیں جب رکاوٹیں سر اٹھاتی ہیں۔ انھوں نے مقبوضہ علاقہ میں ان فلسطینیوں کی فی صد کا اندازہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی جو امن عمل کے فطری طور پر مخالف تھے لیکن زور دیا کہ 'حقیقی امن' کا مطلب اسرائیلی ریاست کا نیست و نابود ہونا ہے۔

12۔ ایلیام اینڈ ٹریمونٹ، حوالہ سابق، دیکھیے لیبلر اسی ریلجس زاؤنزم ریچیسز دی کراس روڈز۔ ''دی جیروسلم پوسٹ'' 26 جون 1998

افغانستان: ایک خصوصی ہمسایہ

'میرے دوست! اس حکومت کے تعلقات افغانستان کے اصل حکمرانوں سے ہیں'

وائسرائے ہند کا والئی کابل سے خطاب

11 جولائی 1866

'جہاں تک ہندوستان اور افغانستان کا تعلق ہے مجھے نہیں یاد پڑتا کہ ان کے درمیان کوئی نقطہ اختلاف ہو' وہ ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں۔

جواہر لعل نہرو

5 فروری 1959

افغانستان کی مملکت اٹھارھویں صدی کے وسط میں وجود میں آئی۔ اس کی حدود میں مغل اور صفوی سلطنتوں کے کچھ صوبے آتے تھے۔ اس کی آبادی نسلی، مذہبی اور سیاسی طور سے غیر متحد تھی۔ 1896 میں امیر عبدالرحمٰن خان کے پورے ملک پر قابض ہونے اور سراج الملت والدین کا لقب قبول کرنے سے قبل ملک کا نظام حکومت اعلیٰ طبقہ کے فوجی امرا کے ہاتھ میں تھا۔(2) اس کی موجودہ سرحدیں بیسویں صدی کے آغاز تک واضح نہیں ہوئی تھیں اور یہ دو عظیم طاقتوں برطانیہ اور زاری روس کے مفادات کا براہِ راست نتیجہ تھا۔

ایک ہزار میل کے دائرہ اور اختیارات کا مرکز کابل میں، کے اس ملک میں بلاشبہ جغرافیائی، لسانی، مذہبی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی محاذ پر غیر معمولی اختلافات کی گنجائش ہے۔ افغانستانی عوام آج بھی اپنے ملک کی تخلیق اور اس کے جغرافیائی طور سے حساس ہونے کی قیمت ادا کرر ہے ہیں۔

مغل سلطنت نے کابل۔غزنی۔قندھار کی لائن کو ہندوستان کی منطقی اور حساس سرحد تسلیم کیا اور اسی سبب سے قندھار ہمیشہ مغل اور صفوی سلطنت کے درمیان تنازعہ کی وجہ بنا رہا(3)۔ جب انگریزوں نے برصغیر پر اپنا تسلط قائم کیا تو ان کے سامنے ذرا مختلف قسم کے نازک حالات سامنے آئے۔ خارجہ پالیسی میں کئی راستوں کی جستجو کی گئی: 'اس تنازعہ نے دو واضح طبقہ خیال کو جنم دیا جو عمومی طور سے متحرک ومنجمد کہلائے۔ اور اس طرح شمال مغربی سرحد میں سیاسی حکمت عملی کے سوال پر اہم کشمکش شروع ہوئی'(4) انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں پالیسی کا کل زور دو جڑواں ضرورتوں یعنی حریف کے غاصبانہ قبضہ کو روکنا اور برطانوی اثرات کی بالادستی کو قائم رکھنے کی جانب تھا(5) اس کا اظہار افغانستان کے بارے میں خصوصی جوش کے ذریعہ ہوا جو کچھ تکلیف دہ پسپائیوں کا بھی ذمہ دار تھا۔ 1880 میں امیر عبدالرحمٰن خان کو انگریزوں نے یہ ترغیب دی کہ وہ وسط ایشیا میں اپنی جلاوطنی ختم کر کے افغانستان آجائیں اور زمام کار اپنے ہاتھوں میں لیں(6) اس موقعہ پر انھوں نے حکومت ہند کے چیف پولیٹکل افسر سے یہ ناکام درخواست کی تھی کہ ''میری ذمہ داریوں، فرائض اور حدود کو ایک معاہدہ کے ذریعہ واضح کردیا جائے''(7) نتیجہ کے طور پر وہ برطانوی نظروں میں بہت معتبر ہوگئے لیکن وسیع تر مفادات نے حکومت ہند کو مجبور کیا کہ جب تک وہ حیات ہیں ان کے غیر مصالحانہ سیاسی رویہ کو نظرانداز کیا جائے اور اس کے بجائے معاملات کو ان کے جانشین تک محدود رکھا جائے اور ان پر دوبارہ غور وفکر کیا جائے۔ لیکن یہ طریقہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ نئے امیر حبیب اللہ نے ہندوستان کے دورہ کا دعوت نامہ موخر کردیا اور انگریزوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ فارن سکریٹری لوئی ڈین کو خصوصی سفیر کی حیثیت سے کابل روانہ کرے۔ ان کو افغانستان کے تعلق سے برطانوی مفادات کی تفصیل سے آگاہ کردیا

گیا تھا اور کابل میں ایک دوست حکمراں کی اہمیت بھی بتلا دی گئی تھی۔ ''لہٰذا گفتگو دوستوں اور حلیفوں کے درمیان ہونی چاہیے۔ آپ کی ابتدا اس مفروضہ سے ہونی چاہیے کہ دونوں ممالک کے مقاصد، مفادات اور دشمن ایک ہیں۔ لہٰذا ان کی پالیسی بھی یکساں اور باہمی تعاون کی ہونی چاہیے'' (8) اس کے علاوہ ''اس پورے معاملہ میں ہمارا مقصد امیر کو اس کے مفادات سے وابستہ رکھنا ہے'' اور کچھ ہتھیاروں کی درآمد پر دی گئی مراعات و سہولیات کے بدلہ میں اس کے (i) خارجی تعلقات پر کنٹرول، (ii) سرحدی قبیلوں سے سازشوں کا خاتمہ، (iii) ہندوستان کے دفاع کے لیے ایک مضبوط دیوار کی مانند سرحد پر ایک دوستانہ طاقت کی برقراری اور (iv) ممکنہ تجارتی سہولتیں حاصل کرنا ہیں(9)۔ لیکن آخر میں حبیب اللہ جو چاہتے تھے وہی ہوا(10) اور ان کی تحریر کردہ دستاویز کے مطابق ان کے والد کے زمانے کے پرانے معاہدے قائم رہیں گے، کو برطانوی حکومت نے اپنی تجاویز پر ترجیح دیتے ہوئے قبول کرلیا۔ جس سے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کافی جھنجھلائے اور اس کو ایک ذلت آمیز خودسپردگی سے تعبیر کیا۔(11) اس واقعہ نے وسط ایشیا کی سیاست میں افغانستان سے معاملات کرنے کے عمل کی پیچیدگی کو کافی اجاگر کیا۔ عجیب بات یہ کہ معاہدہ نے افغانستان میں برطانوی ہندوستان کے تجارتی مفادات کو آگے نہیں بڑھایا حتیٰ کہ ایک ریلوے لائن اور ٹیلیگراف لائن کی تجاویز کو بھی مسترد کردیا گیا(12)۔

سفارت کاری اور طاقت کی یہی بازیگری 1907 کے اینگلو رشین کنونشن کی تشکیل میں بھی دیکھی گئی جس میں وسط ایشیا کی صورت حال کو مستحکم کرنے کی بات کہی گئی تھی (13) برطانیہ نے اقرار کیا کہ انھیں افغانستان کے موجودہ سیاسی مقام میں تبدیلی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی وہ حکومت افغانستان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ان کا ارادہ افغانستان کے کسی ایسے اقدام کی حوصلہ افزائی ہے جو روس کے لیے خطرہ ثابت ہوسکے۔ آخرالذکر نے یہ کہتے ہوئے دامن چھڑا لیا کہ افغانستان روس کے دائرہ اثر سے باہر ہے اور اس کے ساتھ تمام سیاسی معاملات برطانیہ کی شاہی حکومت کے ذریعہ طے پائیں گے۔ اس نے افغانستان میں کوئی ایلچی بھی نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کنونشن میں اس

ذمہ داری کی توثیق بھی کی گئی کہ دونوں فریق افغانستان میں مساوی تجارتی مواقع کے اصول پر چلیں گے۔ انھوں نے اس پر بھی اتفاق کیا کہ اب کے بعد برطانیہ یا برطانوی ہند کی تجارت اور تاجروں کو ملنے والی کوئی بھی افغانی سہولت میں روسی تجارت اور تاجر یکساں طور سے شریک ہوں گے۔(14) اس پورے عمل میں ابتدا سے انتہا تک امیر افغانستان کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ کنونشن پر دستخط ہونے کے بعد حکومتِ برطانیہ نے وائسرائے ہند کو ہدایت کی وہ اس کارروائی کی خبر افغان حکمراں تک پہنچا دیں اور ''ان کو یقین دلائیں کہ وہ اس پر ایک ہمدردانہ نظر ڈالیں کیونکہ اس نے ہندوستان اور روس کے درمیان میں افغانستان کی سالمیت کو برقرار رکھا ہے اور دفعہ III اور IV کو بغیر کسی تاخیر کے اپنی منظوری دیں (یہ دفعات بالترتیب سرحدی چوکیوں پر مقامی نوعیت کے غیر سیاسی افغانی روسی تعلقات اور افغان روسی تجارت سے متعلق تھیں)۔ امیر اس طرز عمل سے یقیناً بہت غصہ میں تھے۔ انھوں نے ایک سال کے بعد جواب دیا اور ان فوائد کی وضاحت چاہی جو ان کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ آنے والے سالوں میں امیر کی خاموشی جاری رہی یہاں تک 'ہندوستانی حکومت کے طرز عمل کے خلاف افغان ناراضگی نے تیسری افغان جنگ'' کو جنم دیا(15)۔

پہلی جنگ عظیم کے پھوٹ پڑنے پر امیر حبیب اللہ نے افغانستان کی غیر جانبداری کا دعویٰ کیا جب تک کہ افغانستان کے وقار، وجود، خودمختاری اور آزادی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا'(16) لیکن کیونکہ عثمانی ترک جرمنی کے ساتھ تھے لہٰذا عوام نے پین اسلامسٹ جذبات کا مظاہرہ کیا۔ اس کے علاوہ عوامی رائے میں زبردست یوروپین مخالفت کا عنصر بھی شامل تھا۔ کابل میں ترک جرمن مشن کی آمد دراصل جرمنی اور ترکی کی اس کوشش کی طرف اشارہ تھا کہ افغانستان کو بھی جنگ میں گھسیٹ لایا جائے اور ہندوستانی سرحد کی قبائلی پٹی پر زبردست ہلچل پیدا کریں۔ مشن نے کچھ ہندوستانی انقلابیوں (مہندر پرتاپ، عبداللہ سندھی اور برکت اللہ) سے ملاقات کی جنھوں نے 1916 میں کابل میں ایک عارضی ہندوستانی حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن ترک جرمن مشن ناکام رہا اور امیر نے کامیابی سے برطانیہ اور جرمنی کے ساتھ ایک فائدہ مند غیر جانبداری قائم رکھی۔ 1917 کا انقلاب روس

اور زاری سلطنت کے انتشار نے افغان قوم پرست قوتوں پر اہم اثرات مرتب کیے، امیر نے اس کو وسط ایشیا میں افغانی اثر کو پھیلانے کا ایک موقعہ جانا۔ انھوں نے فروری 1919 میں وائسرائے ہند کو ایک خط بھی لکھا جس میں پیرس امن کانفرنس میں افغانستان کی مکمل خودمختاری، عمل کی آزادی اور افغانستان کی مستقل آزادی کے لیے بین الاقوامی سطح پر منظوری کا مطالبہ کیا تھا۔ برطانیہ جس نے ابتدائی 1918 میں 1907 کے اینگلو رشین کنونشن کو مسترد کر دیا تھا، نے جنگ کے دوران حبیب اللہ کی غیر جانبداری کو احسان مندی کے ساتھ مانتے ہوئے اعلان کیا کہ برطانیہ کو "امید ہے کہ افغانستان ہندوستان کے دفاع میں ایسا ہی مثبت کردار ادا کرتا رہے گا اور ممکن ہے کہ وہ وسط ایشیا کی سیاسی قیادت کا بھی رول ادا کرے" (18)۔

حبیب اللہ کی آہستہ روی کی پالیسی، برطانیہ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کی ہر شرط پر عمل کی پابندی پر ان کا اصرار اور ترکی کی شکست کی وجہ سے ابھرتے ہوئے اسلامی جذبات پر گرفت میں ان کی ناکامی سے آبادی کا قوم پرست طبقہ ان سے ناراض تھا جن کی امیدیں جنگ کے دوران کافی بڑھ گئی تھیں۔ بالآخر ان سب کا نتیجہ فروری 1919 میں ان کے قتل کی صورت میں نکلا۔ ان کے صاحبزادہ امان اللہ جو اصلاح پسند اور جدید ذہن کے حامل تھے ان کے جانشین بنے۔ انھوں نے پہلی فرصت میں وائسرائے کو اپنی جانشینی کی اطلاع دی اور افغانستان کی مکمل آزادی کا اعلان کیا۔ برطانیہ نے ردعمل میں لیت ولعل سے کام لیا اور مکمل آزادی کے اعلان پر کوئی براہ راست تبصرہ نہیں کیا اور اس عذر سے کام لیا کہ ڈین حبیب اللہ معاہدہ کیونکہ نوعیت کے اعتبار سے شاہی تھا لہٰذا اس کو یکطرفہ طور پر رد نہیں کیا جاسکتا (19)۔ نئی سوویت حکومت نے اپنی جانب سے فوراً افغانستان کے نئے درجہ کو قبول کرلیا (20)۔ ان اختلافات نے مسلح تنازعہ کو جنم دیا جو ہند افغان سرحد پر ایک مختصر مدت تک جھڑپوں کی شکل میں جاری رہا۔ آخرکار راولپنڈی معاہدہ (8اگست 1919) میں یہ قضیہ طے ہوا اور افغانستان کو ایک مکمل خودمختار ریاست تسلیم کرلیا گیا۔ امیر نے بھی ڈیورینڈ لائن کو تسلیم کرلیا اور برطانوی سبسڈی سے دست بردار ہوگئے (21)۔ انھوں نے ایک آزادانہ اور متوازن خارجہ پالیسی کے تانے بانے بنے جس کی بنیاد سوویت یونین سے سفارتی تعلقات کے قیام،

برطانیہ سے تعلق کی بتدریج بحالی اور اسلامی دنیا سے برادرانہ تعلقات کے فروغ پر تھی۔ آخرالذکر جہت کی حوصلہ افزائی ذاتی طور سے لینن نے کی تھی(22)۔ سوویت اور ہندوستانی انقلابیوں جیسے کہ ایم این رائے نے افغانستان کی سرزمین کو ہندوستان میں انقلابی کارروائیوں کے لیے ایک اڈا بنانے کے امکانات پر بھی غور کیا(23)۔ امیر کو یہ سب گوارا نہیں تھا بلکہ انھوں نے ان ہندوستانیوں کو جنھوں نے 1916 میں کابل میں عارضی حکومت قائم کی تھی افغانستان چھوڑنے کا حکم دیا۔ جہاں تک امیر پر اثر ڈالنے کا تعلق ہے لینن کو برطانیہ کی اس صلاحیت میں کوئی مغالطہ نہ تھا اس نے ایم این رائے سے کہا تھا کہ 'انگریز امان اللہ کے قلعہ پر سونے اور چاندی کی گولیوں سے بمباری کریں گے'(24) اس کے باوجود ستمبر 1920 کے سوویت افغان معاہدہ نے افغانستان کو برطانیہ کے ساتھ ایک بہتر سودے بازی کے قابل بنا دیا۔ اسی طرح سے ترکی اور ایران (دونوں ہی 1921 میں) سے کیے گئے معاہدوں نے افغانستان میں جدیدیت لانے کے لیے امیر کے ہاتھ مضبوط کیے اور ساتھ ہی بیرونی اسلامی برادری کے ذریعہ بھی۔

جدیدیت، معاشرتی اور تنظیمی اصلاحات کی تلاش میں کئی پیچیدہ نتائج ظاہر ہوئے اس نے امیر کی اسلامی قانونی جواز اور قبائلی حمایت کی بنیاد کو کمزور کر دیا(25)۔ جس کی وجہ سے ان کو حکومت چھوڑنا پڑی اور تاجک بچہ سقہ نے ان کے جانشین کی حیثیت سے سابقہ امیر کی تمام معاشرتی اور تنظیمی اصلاحات کو مسترد کر دیا اور خالص اسلامی قانون کے دوبارہ نفاذ کے لیے اقدامات کیے۔ سوویت یونین نے اقتدار پر قبضہ کی مذمت کی لیکن برطانیہ نے اگرچہ کابل سے اپنے سفارت خانہ کو واپس بلا لیا مگر پس منظر میں اس کو حقیقی طور سے تسلیم کیا۔ بچہ کی حمایت کا دائرہ مختصر تھا۔ لہٰذا درّانیوں کی محاسبان شاخ کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ پختون حمایت کو اس کے خلاف صف آرا کر سکیں جس کے باعث اسے 1929 میں اقتدار چھوڑنا پڑا۔ اپنی گرفتاری کے بعد اس نے کہا ''میں نے لالچ کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا۔ مجھے پکڑنے کے لیے بڑی بڑی رقوم کا اعلان کیا گیا۔ لیکن مجھے نہتے پہاڑیوں نے پکڑا نہ کہ کابل سے آئے ہوئے شمشیر بازوں نے(26)۔

نئے بادشاہ نے جولائی 1931 میں 'افغان نیشنل کنسٹیٹیو اسمبلی' میں اپنی خارجہ پالیسی کا اعلان بہت محتاط طریقہ سے کیا۔

> ''میری رائے میں افغانستان کے حق میں سب سے بہتر اور مفید پالیسی جس کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ غیر جانبداری کی پالیسی ہے۔ افغانستان کو اپنے تمام ہمسایوں سے خوش گوار تعلقات قائم رکھنا چاہیے اور ان دوستانہ طاقتوں سے بھی جو ملک کے قومی مفاد کے خلاف نہ ہوں۔ افغانستان کو پڑوسیوں کو اپنے دوستانہ رویہ کی یقین دہانی کرانی چاہیے اور بدلے میں اسی رویہ کی ان سے توقع رکھنی چاہیے۔ یہی طریقہ عمل افغانستان کے مفاد میں سب سے بہتر ہے''۔(27)

یہ رائے قائم کرنے کے لیے کہ نادر شاہ کے حکومت پر قابض ہونے کو برطانیہ کی حمایت حاصل تھی، کافی شواہد موجود ہیں۔ انھوں نے نادر شاہ کو مالی تعاون بھی فراہم کیا۔ نادر شاہ نے جلد ہی دکھا دیا کہ اس کی ''پالیسیاں ہندوستان میں برطانوی مفادات اور منصوبوں سے بہت بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں''۔ زیادہ حتمی طور پر برطانوی مفاد اس جانکاری سے وابستہ تھا کہ کیا 'افغانستان خان عبدالغفار خان کی خدائی خدمتگار تحریک (سرخ قمیص) آفریدی اور مہمند قبائل کی شورشوں کی حمایت کرے گی'۔ دونوں ہی مقام پر افغانی ردعمل مثبت تھا۔ افغانی حکومت کی مکمل سرحدی پالیسی کا انحصار سرحد کے دونوں جانب امن کی تمنا اور ہزمیجسٹی کی حکومت کی جانب مخلصانہ دوستی پر ہوگا'(28) اس رجحان کو برطانوی افسران بھی کھلے طور پر تسلیم کرتے تھے۔ ''موجودہ حکمراں، بادشاہ نادر شاہ نے اپنی ذمہ داریاں بخوبی نبھائی ہیں اور خود کو وفادار اور انصاف پسند ثابت کیا ہے۔ حقیقت میں انھوں نے اپنے یہاں کی شورشوں کو اپنی سرحدوں تک محدود رکھا جو ہم اتنے بہتر طریقہ سے نہیں کر پائے۔ یہ ان ہی کی شخصیت کا اثر ہے کہ سرخ قمیص کی تحریک آزاد ملک میں اس سے زیادہ نہیں پھیلی جتنی کہ پھیل چکی ہے''(29) اسی طرح سے سوویت وسطی ایشیا میں غیر دخل اندازی کی پالیسی بھی

سوویت یونین کی جانب اپنائی گئی جس کو 1931 کے غیر حملہ آوری کے معاہدہ کی صورت میں رسمی شکل دی گئی اور جس کی تکمیل 1933 کے ایک معاہدہ میں، جس میں حملہ کی تعریف کی وضاحت کی گئی تھی، ہوئی۔ ایران اور ترکی سے موجودہ تعلقات کو فروغ دینے کی کوششیں بھی کی گئیں ساتھ ہی ایک طرف جرمنی، فرانس اور اٹلی اور دوسری طرف امریکہ اور جاپان سے تعلقات بہتر بنانے کی جانب توجہ کی گئی۔ دونوں ہی معاملات میں مقصد یکساں تھا یعنی مذہبی اداروں اور قبائلی مفادات کی مانگوں کی آہنی پابندیوں کے دائرہ میں افغانستان کی جدیدیت کے لیے مواقع تلاش کرنا۔ اس عمل میں جو تناؤ اور دباؤ آئے بالآخر وہ 1933 میں نادر شاہ کے قتل پر منتج ہوئے۔ ان کے انیس سالہ فرزند ظاہر شاہ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے دو بااثر وزراء اعظم۔ اپنے چچا ہاشم خان اور اپنے کزن سردار محمد داؤد۔ کی مدد سے حکومت کا کام شروع کیا۔ نادر شاہ کی پالیسیوں کو جاری رکھا گیا۔ لیکن سعد آباد معاہدہ (1937) کی رکنیت حاصل کرکے اور جرمنی سے تعلقات بڑھانے کے عمل کو تیز کر کے ایک نئی جہت کو شامل کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے پھوٹ پڑنے پر افغانستان کی غیر جانبداری پر دباؤ پڑنے لگے۔ زیادہ تر یہ دباؤ محوری طاقتوں کی جانب سے تھے۔ افغان حکومت کی شدید خواہش تھی کہ جرمن معاشی امداد سے شروع ہونے والے پروجیکٹس کی جلد سے جلد تکمیل ہوجائے بلکہ آخرالذکر (بشمول اٹلی) اپنی برطانیہ مخالف سرگرمیوں کو افغانستان اور برطانوی ہندوستان سے ملحق قبائلی پٹی میں تیزی سے پھیلانا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں قبائلی علاقوں میں افغان عوام کی سادہ لوحی اور ملاؤں اور پیروں کے زیراثر رہنے کے میلان کا خوب بے جا استعمال کیا گیا۔ شام سے آئے ہوئے سعید جیلانی نے خود کو بغداد کے شاہ عبدالقادر جیلانی کی اولاد بتایا اور ان کو فوراً ہی 'شامی پیر' کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا۔ انھوں نے قبائل کو کابل کی حکومت کے خلاف اکسایا یہاں تک کہ حکومت ہند نے ان کو وہ علاقہ چھوڑنے اور واپس شام جانے کے لیے مجبوراً بیس ہزار اسٹرلنگ پاؤنڈ ادا کیے۔ اطالویوں نے بھی اپی کے فقیر کے ساتھ ایسا ہی کھیل کھیلا (30)۔ کچھ سینئر افغان سرکاری افسران بھی برطانیہ مخالف سازشوں کو

ہوا دے رہے تھے۔ اب دستیاب شدہ نازی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ افغان نیشنل بینک کے صدر اور وزیر معاشیات عبدالمجید زبولی نے 'جنگ کے بعد افغانستان کے حق میں سرحدوں میں تبدیلی' اور نئی افغان سرحد میں سندھ اور کراچی بندرگاہ کی شمولیت کے بارے میں سلسلہ جنبانی کی تھی۔(31)

جنگ نے افغانستان کے جدیدیت کے پروگرام کو درہم برہم کردیا اور زبردست معاشی دھچکا پہنچایا۔ جنگ کے خاتمہ اور ہندوستان سے متوقع برطانوی انخلا نے افغانستان کو اپنی سلامتی کے ماحول پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس کرائی۔ نومبر 1944 میں برطانوی حکومت کو دی گئی ایک عرضداشت میں یہ مدلل طور سے بیان کیا گیا کہ قبائلی علاقہ کے پختنوں کو اس انتخاب کا اختیار ہونا چاہیے کہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں یا پھر 'مادر وطن' کی جانب لوٹنا چاہتے ہیں۔ اس عرضداشت میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ افغانستان کو بلوچستان کے راستے سمندر کی جانب ایک کاریڈور دیا جائے۔ جب پاکستان نے ستمبر 1947 میں اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کی تو افغانستان نے ابتدا میں مخالفت میں ووٹ دیا۔ اس نے یہ مانگ بھی کی کہ سرحد پر پختون بستیاں ایک 'خودمختار اور بااقتدار صوبہ' کی شکل میں ترتیب دی جائیں اور افغانستان کو مغربی بلوچستان کے راستے سے سمندر کے لیے کاریڈور دیا جائے یا کراچی کی بندرگاہ پر ایک فری زون دیا جائے۔ مزید یہ کہ دونوں ملک ایک معاہدہ کریں کہ اگر ایک ملک پر حملہ ہوتا ہے تو دوسرے ملک کو غیر جانبدار رہنے کا اختیار ہوگا۔ جولائی 1949 میں افغان نیشنل اسمبلی نے ایک قرارداد پاس کی جس کی وجہ سے پاکستان کی تخلیق سے قبل برطانوی حکومت سے کیے گئے تمام معاہدے، راضی نامے اور سمجھوتے منسوخ کردیے اور ڈیورینڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد ماننے سے انکار کردیا۔(32) اس کے نتیجہ میں جو تناؤ پیدا ہوا اس نے افغانستان حکومت کو مجبور کیا کہ وہ معاشی معاملات میں پاکستان پر اپنے انحصار کو کم کردے اور اس مقصد کے پیش نظر اس نے جولائی 1950 میں سوویت یونین سے ایک تجارتی معاہدہ کیا۔ اس سے سوویت افغان تجارت اور معاشی تعاون میں کافی فروغ ہوا۔ (نتیجہ کے طور پر 1978 میں افغانستان کی کل برآمد کی 64 فیصد اور کل درآمد کی 34 فیصد یو ایس ایس آر

سے تھی۔ 1978 میں ہی افغانستان پر سوویت قرضوں کی رقم 1.26 بلین یو ایس ڈالرز پہنچ چکی تھی جب کہ اس کے مقابلہ میں امریکی قرضوں کی رقم 470 بلین ڈالر تھی) ان معاشی رشتوں سے قطع نظر اور یو ایس ایس آر کے ساتھ ایک لمبی مشترک سرحد کے باوجود افغانستان نے سرد جنگ کے عروج کے زمانے میں اور 1978 کے آخر تک اپنی خارجہ پالیسی کے اعلانات اور بیانات میں سوویت یونین سے ایک فاصلہ برقرار رکھا۔ لہٰذا افغانستان کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ اپنی روایتی مثبت غیر جانبدارانہ پالیسی کو، 1961 میں غیر وابستہ ممالک کی تحریک (نام) کے قیام کے وقت، غیر وابستہ تحریک میں شامل کرے۔ افغانستان نے غیر وابستہ ممالک کی تحریک کی چوٹی کی کانفرنسوں میں، بلغراد (1961) سے کولمبو (1976) تک ایک مثبت رول ادا کیا۔ لیکن 1978 میں واقع انقلاب اور 5 دسمبر 1978 کے دستخط شدہ سوویت افغان معاہدہ برائے دوستی، خوش ہمسائیگی اور تعاون، نے کابل کی حیثیت کو مجروح کیا۔ یہ حقیقت اس وقت اور واضح ہوگئی جب سوویت دخل اندازی کے بعد اس مسئلہ کو ''نام کوآرڈینٹنگ بیورو'' میں اٹھانے کی کوشش تعطل کا شکار ہوگئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ مسئلہ نام وزراء خارجہ کی نئی دہلی میٹنگ میں زیر بحث لایا جائے گا (فروری 1981)۔

امریکہ سے افغانستان کے تعلقات کی استواری آہستہ روی سے ہوئی۔ یونائٹیڈ اسٹیٹس نے 1934 تک افغانستان کو تسلیم نہیں کیا۔ اور اس کے بعد کابل میں کوئی سفارتخانہ اس بنیاد پر نہیں کھولا کہ ''بلاشبہ اس وقت دنیا میں افغانستان سب سے زیادہ شدت پرست دشمن ملک ہے''(33) لیکن جنگ کی ضرورتوں نے 1942 میں کابل میں سفارتخانہ قائم کیا۔ جنگ کے بعد افغانستان نے اپنی معاشی ترقی کے لیے اور سوویت تعاون میں توازن پیدا کرنے کے لیے یونائٹیڈ اسٹیٹس سے قرض مانگا۔ لیکن واشنگٹن میں اس کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ جنگ کے بعد ہندوستان میں چھوڑے ہوئے امریکی اسلحہ کی خریداری کی افغان پیش کش کو بھی ایسے ہی انجام سے دو چار ہونا پڑا۔ نومبر 1950 میں یونائٹیڈ اسٹیٹس نے پیش کش کی وہ مسائل کے حل کے لیے کراچی اور کابل کے درمیان ایک غیر رسمی رابطہ کا رول ادا کرسکتا ہے(34) 1954 میں فوجی امداد کی ایک درخواست پر یہ ردعمل ابھر کر آیا کہ ایسی کوئی

بھی مدد''ان مسائل کو پیدا کرے گی جو قوت سے ابھریں گے، بجائے اس کے کہ اسلحہ کی مانگ کی جائے بہتر یہ ہوگا کہ افغانستان اس تنازعہ کو پاکستان کے ساتھ حل کرے۔' اور زخم پر نمک چھڑکنے کے لیے اس مراسلت کی ایک نقل حکومت پاکستان کو ارسال کردی گئی۔ ایک مہینہ بعد یعنی جنوری 1955 میں افغانستان نے سوویت یونین کی ایک طویل مدتی فوجی امداد کی پیش کش کو منظور کرلیا(35)۔ اس سے قطع نظر 60 کی دہائی میں بھی افغانستان کے ساتھ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی سرد مہری برقرار رہی۔

1947 میں اپنی تخلیق کے بعد سے پاکستان کی افغان پالیسی کو ماضی قریب کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ پاکستان کا خیال تھا کہ وہ سابقہ برطانوی ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں میں برطانوی ذمہ داریوں کا وارث ہے۔ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ برطانوی ہندوستانی فارورڈ پالیسی کے تصورات سے وابستہ رہنا چاہتا تھا جن کو 1862 میں لارڈ ایلگن نے بہت خوش بیانی سے واضح کیا تھا:

> میں اس شہوت انگیز چوماچاٹی کی پالیسی کا مکمل طور پر مخالف ہوں جو ہندوستان افسروں کے کچھ طبقوں میں پسندیدہ ہوتی جارہی ہے۔ یہ مسلسل ہمیں ان مشکوک حالتوں کی طرف لے جارہے ہیں جو دوسری اقوام کی آزادی کے لیے ہماری مسائی اور باعزت پیشوں کے متضاد ہے۔ اور جس کی وجہ سے ہمارا یہ طریقہ کار خود غرضی اور غیر مستقل مزاجی کے دوہرے الزام کی وجہ سے بدنما ہوگیا۔ میرے خیال میں ہمارے قانونی دبدبہ اور وقار کے لیے اس سے مہلک کچھ اور نہ ہوگا(36)۔

نتیجہ کے طور پر تعلقات کی عمارت کی خشت اول ہی دشمنی تھی (37) ستمبر 1947 میں کابینہ کے ایک ہنگامی اجلاس میں جناح نے سرد جنگ کے حوالہ سے سرحد کے مسئلہ کی وضاحت کی کوشش کی اور زور دے کر کہا کہ ''شمال مغربی سرحد کی حفاظت صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالمی مسئلہ ہے''(38) ایوب خان نے بھی 1959 میں

آئزن ہاور اور 1961 میں کینیڈی سے گفتگو کرتے وقت ان کو افغانستان کے خلاف سخت رویہ اپنانے کے لیے اکسایا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کینیڈی نے 1961 میں اپنا ایک مخصوص نمائندہ مقرر کیا۔ اس کے مطابق مسئلہ 'مشکل اور پیچیدہ' تھا۔ اور مشورہ دیا کہ اس سلسلہ میں پاکستان جیسے مضبوط حلیف پر 'مزید دباؤ' ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔(39) لہٰذا پاک افغان تعلقات 60 کی دہائی کے دوران اور 1971 کی ہند و پاک جنگ تک کشیدہ رہے۔ بنگلہ دیشی دور کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم ہوئے تو بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں کچھ سیاسی مسائل اور باغیوں نے سر ابھارا۔ 'پاکستان کا ٹکڑے ہونا' بلوچستان اور سرحدی صوبہ سے نیپ حکومتوں کی بے دخلی اور (کابل میں) داؤد کا عنان حکومت سنبھالنا تین ایسے واقعات تھے جو پاکستان افغانستان کے نئے تنازعہ کی بنیاد بنے۔ پاکستانی فوج نے افغانستان پر حملہ کرنے کا ایک منصوبہ ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے رکھا جس میں افغانستان کے کچھ علاقوں بشمول جلال آباد پر فوری قبضہ شامل تھا' تاکہ ''داؤد کو مجبور کیا جائے کہ وہ ڈیورینڈ لائن کو تسلیم کرے اور بلوچ اور پختون قوم پرستوں سے اپنی حمایت واپس لے۔ بھٹو نے اس مشورہ کو مسترد کر دیا اور داؤد سے سیاسی محاذ پر مقابلہ کی ٹھانی۔ (40) سب سے پہلے تو انھوں نے اپنے سب سے زیادہ قابل اعتماد مشیروں کی ایک خفیہ کمیٹی تشکیل کی جس کا مقصد 'بلوچ مسئلہ کے لیے ایک تسلی بخش طویل مدتی حل ڈھونڈنا تھا' ایسا جو پائیدار اور باوقار ہو اور جس میں کوئی مجبوری نہ جھلکے (41)۔ بھٹو نے مبینہ تباہ کن افغان سرگرمیوں کو روکنے کے لیے افغانستان میں انتہا پسند بائیں اور انتہا پسند دائیں بازو والے عناصر سے رابطہ قائم کیا اور ان کو کافی رقوم عطا کیں۔ وہ ماسکو بھی گئے تاکہ سوویت قیادت سے اصرار کریں کہ پختون مطالبہ کے بارے میں وہ داؤد پر اپنے اثرات کا استعمال کریں۔ اپنی واپسی پر انھوں نے کہا تھا کہ ''میں نے ڈور ہی کاٹ دی جس پر پتنگ (افغان) اڑتی تھی'' (42) ان کے اقدام نتیجہ خیز ثابت ہو رہے تھے۔ افغانستان کے روایتی حلیف بھی پختونستان کے بارے میں اس کی حمایت میں پرجوش نہیں تھے۔ بھٹو نے 1976 میں کابل کا دورہ کیا اور دو ماہ بعد داؤد نے بھی پاکستان کو مہمان نوازی کا موقعہ دیا۔ ایک

رپورٹ کے مطابق ''داؤد نے ایک خودمختار پختونستان اور بلوچستان کی وکالت کو چھوڑ دیا تھا اور پختون اور بلوچ قائدین کی رہائی سے مطمئن ہوگئے تھے اور اس رہائی کے صلہ میں انھوں نے دونوں ملکوں کے درمیان ڈیورینڈ لائن کو بین الاقوامی سرحد کے طور پر مان لیا تھا'۔ لیکن جلد ہی دونوں لیڈر اپنے عہدوں سے باہر ہوگئے اور دونوں کے درمیان اس افہام وتفہیم کا نفاذ نہیں ہو سکا(43)۔

افغانستان میں اپریل 1978 کے انقلاب کے بعد ایسی ہی ایک کوشش ضیاء الحق اور حفیظ اللہ الامین نے بھی کی۔ لیکن دسمبر 1979 میں سوویت دخل اندازی نے ان تمام سرگرمیوں پر ایک یقینی مہر لگا دی۔ ضیاء نے فیصلہ کیا کہ وہ سوویت اقدام کی کھل کر مخالفت کریں گے اور 'افغان مزاحمت کو پوشیدہ فوجی امداد فراہم کریں گے لیکن اس کو تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ (پاکستان) ایسا کررہا ہے'(44) اگلے دس سال تک پاکستان نے افغانستان میں سوویت موجودگی کے خلاف صف اول کے مقابلہ آرا کا رول ادا کیا اور افغانستان پر دورخی پالیسی یعنی ایک طرف تو افغان مزاحمت کی حمایت اور دوسری جانب اقوام متحدہ کی تنظیموں کے ذریعہ سوویت انخلا کے لیے ایک مذاکراتی سمجھوتہ کی کوشش کو خاصی کامیابی کے ساتھ نبھایا۔

افغانستان کے بارے میں ہندوستانی عوام کے دل و دماغ میں، جیسا کہ ہمیشہ سے ہے، ایک سے زیادہ تصورات قائم ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے مختصر افسانے 'کابلی والا' کے قارئین ہمیشہ قابل محبت کابلی والا کے کردار کو یاد رکھیں گے لیکن ہندوستانیوں کے دوسرے طبقہ کو افغانی مہاجن اور اس کے سودخوری کے طریقوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ تاریخ کا طالب علم 'بابرنامہ'' میں ارغوان کے شگوفوں کے کھلنے کے انداز اور کابل کی بے مثال خوبصورتی کے وجد آفریں بیان سے متاثر ہوتا ہے اور یہی طالب علم شیرشاہ سوری کے بے نظیر انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہے اور احمد شاہ ابدالی کی تباہ کن ذہنیت سے خوف زدہ بھی ہوتا ہے۔ بعد کے زمانے میں ہندوستانی مجاہدین آزادی جیسے کہ راجہ مہندر پرتاپ، عبیداللہ سندھی اور برکت اللہ کو کابل میں دی گئی پناہ نے پھر سے دلوں کے رشتہ کو جوڑا اور یہی کام سرحدی

گاندھی کی قومی تحریک میں شرکت نے انجام دیا۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ شمالی اور وسطی ہندوستان میں ایسے افراد اور کمیونٹیز کی کثیر تعداد موجود ہے جو ماضی قریب یا بعید میں اپنا رشتہ افغان پُرکھوں سے جوڑتے ہیں۔ اور یہی بات ہندوستانی اصل کے ان افغان کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ جن کو حکومت ہند سرکاری طور سے 'افغان ہندو اور سکھ' کہہ کر پکارتی ہے۔

ایک ایسے سانچہ میں جہاں سیاسی، معاشرتی اور خاندی تعلقات مسلسل ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہوتے رہتے ہوں اور وسیع تر ثقافتی باہمی میل جول اور پوشیدہ کوٹلیائی نسخوں کی چھاپ ہو، خارجہ پالیسی کے تصورات کی خاکہ نگاری عمومی طور پر ہوگی نہ کہ منتخب طریقہ پر بلکہ کہیں کہیں تو مفروضوں پر کام چلانا پڑے گا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کے ابتدائی سالوں میں ایسا ہی معاملہ تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان 1950 میں دوستی کے معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ بادشاہ ظاہر 1958 میں ہندوستان آئے اور مشترکہ اعلامیہ میں زور دیا گیا کہ کسی بھی قسم کا اختلاف ان بہتر تعلقات کو زد نہیں پہنچا سکے گا جس کو مضبوط کرنے کا انھوں نے فیصلہ کیا ہے (46)۔ ایک سال کے بعد نہرو نے اسی ارادہ کو مزید شدت کے ساتھ پیش کیا جب وزیراعظم سردار داؤد ہندوستان تشریف لائے:

> ہندوستان کی آزادی کے بعد کئی وجوہات سے ہم لوگ ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوگئے ہیں۔ ہمارے ماضی کے رابطوں کی طویل یادداشت موجود تھی اور جب ہمیں اس کی تجدید کی ضرورت محسوس ہوتی تو ہم نے ان کی تجدید کی۔ اس کے بعد باہمی مفادات کا نمبر آتا ہے جو کہ ایک مضبوط عنصر ہے۔ اس کے علاوہ ہم دونوں ممالک کے باہمی مفادات ایسے امور میں بھی ہیں جن کا اثر دنیا پر پڑتا ہے۔ ہم دونوں ملکوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم کسی بین الاقوامی تنازعہ، جس کو سرد جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے، کا حصہ نہیں ہوں گے اور

نہ ہی طاقتور ممالک کے فوجی گٹھ جوڑ اور بلاک میں شامل
ہوں گے۔ نظریات کی یہی بنیادی یکسانیت ہمیں ایک
دوسرے سے قریب سے قریب تر لائی ہے۔ اور ہم ان
پالیسیوں کو مشکلات اور دباؤ کے باوجود اپنائے ہوئے ہیں۔
اور خواہ وہ اقوام متحدہ ہو یا کوئی اور پلیٹ فارم، ہم دونوں ایک
دوسرے سے نظریاتی طور سے متفق رہے ہیں(47)۔

لیکن اس کے باوجود دونوں ممالک محتاط رہے اور کسی تیسرے ملک سے متعلق ایک دوسرے کے معاملہ میں دخل اندازی نہیں کی۔ ہندوستان نے افغانستان کی پختونستان اور 1893 کی ڈیورینڈ لائن پر نظرثانی کے معاملہ کی کبھی حمایت نہیں کی۔''1961 کے پاکستان افغان بحران کے دوران نہرو نے اس کو ذہن نشین کرتے ہوئے کہ ڈیورینڈ لائن سے جو فائدہ غیر منقسم ہندوستان کو حاصل تھا' پاکستان اس کا وارث ہے ان دونوں ملکوں کے تعلقات پر تبصرہ کرنے سے انکار کردیا۔ کراچی میں اس عمل کو پاکستانی قانونی موقف کی تائید سمجھا گیا(48)۔ افغانستان نے بھی ہند و پاک تعلقات کے سلسلہ میں یہی طرز عمل جاری رکھا۔ ظاہر شاہ نے 1949-1947' 1965 اور 1971 میں ہند و پاک تنازعہ میں ہندوستان کی حمایت نہیں کی۔ کشمیر کے مسئلہ پر بھی ان کے بیانات ذومعنی تھے۔(49) واخان علاقہ میں تیس میل لمبی افغانی چینی سرحد پر مذاکرات کے وقت افغان نمائندوں نے 'چین کی اس درخواست کو مسترد کردیا کہ پاکستان کے ذریعہ دفاع کی گئی زمین سے ملی ہوئی سرحدوں کی حدود متعین کردی جائیں۔ یعنی کشمیری تنازعہ پر اپنی مکمل غیر جانبداری برقرار رکھی'(50)۔

ان مبہم تحفظات کے باوجود نئی دہلی اور کابل کے باہمی تعلقات خوش گوار اور حقیقی رہے۔ صدر رادھا کرشنن 1963 میں کابل گئے۔ جون 1969 میں وزیراعظم اندرا گاندھی نے افغانستان کا سرکاری دورہ کیا اور معاشی، تجارتی اور تکنیکی تعاون کے لیے ایک جوائنٹ کمیشن جس کی ذمہ داری زراعت، آبپاشی توانائی، صحت، صنعتی تعاون، افرادی قوت کی تربیت کے پروگرامز کو بنانا ہو، کے قیام کے لیے افغانی پیش کش کو فوراً منظور کرلیا۔ ہندوستان

نے وعدہ کیا کہ وہ (i) چاول، گندم اور آلو کے لیے بامیان، قندھار اور کابل میں زرعی تحقیقی ادارے قائم کرے گا (ii) چار دے غور بند آبپاشی بمعہ مائیکرو ہائیڈل اسکیم اور دیگر پروجیکٹس افغان راجدھانی میں سو بستروں والا بچوں کے اسپتال کی تعمیر کرے گا اور اس کو کمیشن کرے گا۔ سیاسی امور میں دونوں وزیراعظم متنازعہ معاملات جیسے کشمیر اور پختونستان سے صاف پہلو بچا گئے لیکن انھوں نے اختلافی امور میں ریاستوں کے درمیان صلح وصفائی میں تاشقند اعلانیہ میں مذکور اصولوں پر زور دیا اور اس یقین کو دہرایا کہ ان اصولوں کے نفاذ سے علاقائی امن و امان میں مدد ملے گی۔ شریمتی اندرا گاندھی وزیراعظم کو سیجن کے اس مشورہ کو بھی نظرانداز کر گئیں کہ ہندوستان پاکستان اور افغانستان کے درمیان علاقائی تعاون قائم ہونا چاہیے۔ بلکہ انھوں نے کہا کہ پہلے دو ملکوں کے درمیان باہمی تعاون قائم ہو پھر اس کے بعد اس کو علاقائی تعاون کی شکل دی جاسکتی ہے۔

1972 میں دوطرفہ تعلقات میں تیز رفتاری سے پیش قدمی ہوئی۔ فروری میں دونوں ملکوں نے ایک نئے تجارتی معاہدہ پر دستخط کیے جس میں 'صحت مند خطوط' پر تجارت کو فروغ دینے کے علاوہ دونوں حکومتوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ان طبی نباتات جو افغانستان میں پیدا ہوتے ہیں اور ہندوستان دواسازی کی صنعت ان کا استعمال کرتی ہے، کا عرق نکالنے کے لیے افغانستان ہی میں ایک مشترکہ کمپنی قائم کی جائے۔ وزیرخارجہ سورن سنگھ نے اپریل کے مہینہ میں کابل کے اندر دونوں ممالک کے تعلقات پر نظرثانی کرتے ہوئے معاشی اور تکنیکی تعاون پر خصوصی زور دیا۔ اس کے لیے نئے گوشے دریافت کیے گئے۔ ان میں کابل میں ایک آئی سٹوپ ڈس پننگ یونٹ کا قیام' ساٹھ اضافی مدرسین اور بامیان آثار قدیمہ کی حفاظت و بحالی کے لیے تکنیکی ماہرین کا بھیجنا شامل تھا۔ جولائی کے مہینے میں، شملہ معاہدہ سے صرف نو دن بعد، صدر وی وی گری کابل میں تھے جہاں انھوں نے افغانستان کو خراج عقیدت پیش کیا کہ وہ ''دنیا کے اس حصہ میں آزاد ترقی کی پالیسی جو کسی بھی خارجی طاقت کے اثر اور قابو سے پاک ہے کو شروع کرنے والا پہلا ملک ہے'' (51)۔ انھوں نے مستقبل میں آنے والے چیلنجز کا تذکرہ کیا اور ہندوستان اور

افغانستان کے درمیان باہمی تعاون کے مقامات کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے زور دیا کہ امن اور ترقی لازم وملزوم ہیں۔ مزید یہ کہ ''برصغیر کے مسائل ہمارے افغانی بھائیوں پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔'' اس کے بعد سال کے آخر میں افغانستان کے ولی عہد ہندوستان آئے اور اس موقعہ پر اس بات کو نظر میں رکھا گیا کہ دوطرفہ تعلقات اور تجارتی و معاشی تعلقات تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ پانچ سال کے بعد، کابل میں 1973 اور دہلی میں 1977 میں حکومتوں کی تبدیلیوں سے قطع نظر، عالمی اور علاقائی مسائل پر رجحان کی یکسانیت کو وزیرخارجہ اٹل بہاری باجپئی نے اپنے ستمبر 1977 کے دورہ کابل میں پھر سے دہرایا۔ انھوں نے کہا ''ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اور بحران کے لمحوں میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے ہیں۔''(52)

بہت ممکن ہے کہ داؤد حکومت کے ساتھ خوشگوار تعلقات نے ہندوستانی حکومت کو افغانی سیاسی نظام میں جاری ان متضاد عناصر کی اہمیت کو صحیح طور سے سمجھنے نہ دیا ہو جو اس وقت افغانی سیاسی نظام میں برسرعمل تھے اور بالآخر جو 1978 میں داؤد حکومت کی برطرفی اور ان کے قتل کا سبب بنے۔ یہ تبدیلی ہندوستان کی حکومت کے لیے حیران کن تھی اور ہندوستان نے اس کو مناسب ترین طریقہ سے قبول کیا(53)۔ لیکن ہندوستان کے لیے اس سے بھی زیادہ پریشانی کا باعث 27/دسمبر 1979 کی سوویت دخل اندازی تھی۔ کارگزار وزیراعظم چرن سنگھ نے کہا کہ یہ اقدام 'قابل قبول' نہیں ہے اور سوویت فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔(54) 28/دسمبر کے ایک سرکاری بیان میں توازن قائم کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا کہ ''ہندوستان نے ہمیشہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دوسرے ملک کی مداخلت کی مخالفت کی ہے اور ہندوستان کی یہ خواہش ہے کہ کوئی اور ملک یا بیرونی طاقت کوئی ایسا اقدام نہ کرے جس سے حالات مزید ابتر ہوں۔'' 30/دسمبر کو سرکاری ترجمان نے کہا ''ہم کسی کی حمایت یا مخالفت نہیں کررہے ہیں۔ ہم اب بھی یہ جاننے کی کوشش کررہے ہیں کہ آیا یہ سوویت مفروضہ کہ انھوں نے کابل میں ایک قانونی اور دستوری حکومت کی درخواست پر اپنی مدد بھیجی ہے صحیح یا غلط۔'' پھر اس میں یہ اضافہ بھی کیا کہ ''ہم نے سوویت نقطۂ نظر کو بھی

زیرغور رکھا ہے۔'' (55) 18 رجنوری 1980 کو ہندوستان کے مستقل نمائندہ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بیان دیا کہ ہندوستان کو سوویت یونین کے اس وعدہ پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جب بھی کابل کی حکومت ان سے واپسی کے لیے کہے گی وہ اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے۔ اور ہندوستان کو یقین ہے کہ سوویت یونین افغانستان کی خودمختاری کا احترام کرے گا اور اپنی فوجیں ضرورت سے ایک دن زیادہ بھی نہ رکھے گا۔ اور یہ کہ اس بارے میں ہندوستان کو یونائیٹڈ اسٹیٹس، چین، پاکستان اور دیگر ممالک کے ردعمل پر سخت تشویش ہے۔ جس میں افغان باغیوں کو اسلحہ فراہمی اور بحر ہند میں سمندری کارروائیوں کی تیزرفتاری شامل ہے کیونکہ یہ سب سرد جنگ کے ساتھ ساتھ بڑھتے جارہے ہیں اور ہندوستان کے لیے ایک خطرہ ہیں۔ ہندوستانی بیان اور قرارداد میں اس کی غیر حاضری، جو کہ 18 کے مقابلے میں 104 ووٹوں سے کامیاب ہوئی اور جس میں 18 اراکین غیر حاضر تھے، غیر جانبدار ملکوں کے لیے مایوس کن ثابت ہوئی۔

دو متضاد پالیسیوں کے نقطہ نظر میں تال میل پیدا کرنے کی گومگو کیفیت سے دو چار، وزیراعظم اندرا گاندھی نے اپنے ظاہری موقف میں التوا سے کام لیا (56) بہرحال پس منظر میں ایک زیادہ نازک ردعمل بحران کے مقابلہ میں ابھر رہا تھا۔ 5 رفروری کو سکریٹری وزارت خارجہ ساٹھے کو پاکستان بھیجا گیا تاکہ وہ پاکستانی سوچ کا اندازہ لگا سکیں۔ ان کے پاکستانی ہم منصب نے واضح طور سے کہا کہ 'جو صورت حال سامنے آئی ہے اس کے بارے میں ہند و پاک کے نظریے مختلف ہیں'۔ سوویت وزیرخارجہ گرومیکو جو 13 رفروری کو دہلی آئے انھیں ہندوستانی قیادت کو یہ باور کرانے میں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا کہ سوویت عمل ایماندارانہ تھا۔ حتیٰ کہ ان کے دورہ کے اختتام پر جو مشترکہ اعلانیہ جاری کیا گیا اس میں افغانستان کا ذکر بالواسطہ طور پر کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ طرفین نے 'بین الاقوامی صورت حال اور علاقہ اور اس کے آس پاس رونما ہونے والے حالات کا جائزہ لیا' (57) ہندوستان نے سوویت یونین پر زور دیا کہ وہ علامتی طور سے اپنی کچھ فوجوں کو واپس بلائے اور یہ اعلان کرے کہ فوج کا زیادہ تر حصہ ایک متعینہ مدت کے اندر واپس آجائے گا (58)۔

اس مسئلہ میں ایک اور پیچیدہ جہت اس وقت شامل ہوئی جب اپریل میں سوویت افغان معاہدہ کے تحت افغانستان میں سوویت فوج کی موجودگی کو رسمی طور پر سرکاری منظوری دے دی گئی۔ 14 رمئی کو افغانی حکومت کے ایک بیان میں کہا گیا کہ مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ ایک طرف افغانستان و پاکستان اور دوسری جانب افغانستان و ایران کے درمیان براہ راست مذاکرات ہوں۔ اس کو متعلقہ حکومتوں کے ساتھ ساتھ او آئی سی نے بھی مسترد کردیا جس نے بحران سے متعلق ایک خصوصی اجلاس کی دعوت دی تھی۔ اس صورت حال کے سامنے ہندوستان نے جون میں سوویت قیادت کو فوری طور پر فوجی انخلا کے فائدہ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور کثیر جہتی سلامتی انتظام کی تجویز کی تاکہ کابل میں ایک غیر جانبدار حکومت قائم رہے(59)۔ یہ کام وزیرخارجہ نرسمہا راؤ کے ماسکو کے دورہ کے درمیان ہوا۔ اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر پیش قدمی نہیں ہوئی بلکہ سوویت موقف ایک لفاظانہ شان و شوکت کے ساتھ دوہرایا گیا'(60) ایک بار پھر مشترکہ اعلانیہ میں افغانستان کا کوئی قطعی حوالہ نہیں دیا گیا تھا اور نکتہ نظر کے اس اختلاف کا علم اس وقت عام ہوگیا جب ماسکو سے واپسی پر نرسمہا راؤ نے 17 رجون کو لوک سبھا میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ امید کہ افغانستان میں سوویت فوج کا قیام وقت کے ساتھ محدود ہوگا' بر نہیں آرہی اور یہ ہندوستان کے لیے تشویش کی بات ہے:

> وقت آگیا ہے کہ ہم خود سے پوچھیں کہ کیا وہ سوویت فوجیں
> جو افغانستان میں مدد کرنے کی غرض سے داخل ہوئی تھیں، اس
> ملک میں مزید عدم استحکام پیدا کرنے والوں کے لیے ایک
> بہانہ نہیں بن گئی ہیں یا بننے جارہی ہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ سوویت یونین تسلیم کرتی ہے کہ 'ایک غیر جانبدار ملک کے لیے یہ قدرتی بات ہے کہ وہ بعض بین الاقوامی مسائل پر مختلف نقطہ نظر رکھے'(61) جب برژنیف دسمبر میں نئی دہلی آئے تو انھوں نے اراکین پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان کے 'جنوبی پڑوسیوں' (یعنی پاکستان اور اس کے حلیف) کو چاہیے کہ وہ 'افغان

حکومت کے ساتھ بہتر ہمسائیگی کا معاہدہ کریں۔ نتیجہ کے طور پر صورت حال کے مکمل طور پر نارمل ہونے بشمول سوویت فوج کے انخلا کے لیے بنیادی شرائط خود سامنے آ جائیں گے۔' مشترکہ اعلانیہ میں ایک بار پھر افغانستان کے براہ راست حوالہ سے احتراز کیا گیا اور دونوں ملکوں کے اس موقف پر زور دیا گیا کہ علاقے کے ممالک کے اندرونی معاملات میں بیرونی مداخلت جائز نہیں ہے اور یہ کہ ایک پائیدار حل صرف مذاکرات کے ذریعہ حاصل ہوئے سیاسی تصفیہ سے ہوسکتا ہے(62) نظریوں کے اس مسلسل تصادم کا سامنا کرتے ہوئے ہندوستان نے ہندوستان اور سوویت فریم ورک جو وسیع ترین تعاون پر مبنی تھا، سے افغانستان کے عنصر کو علیحدہ کر دیا اور اپنی افغان پالیسی کے لیے ایک چھ نکاتی تصوراتی فریم ورک کی بنیاد رکھی اور اس کو افغانستان حکومت کی اعلیٰ ترین سطح کو ارسال کر دیا۔ اس میں زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان:

- کی بنیادی دلچسپی عوام سے عوام کے درمیان تعلقات میں ہے۔
- کی خواہش ہے کہ وہ افغانستان کی ترقی کے عمل میں مدد کرے اور ملک میں امن اور خوشحالی لائے۔
- کی داخلی معاملات میں دخل اندازی کی کوئی خواہش نہیں ہے اور وہ برسرعمل حکومت سے ہی رابطہ رکھے گا۔ عمومی طور سے افغانی انقلاب کے مقصد کی حمایت کرتے ہوئے، ہندوستان تشدد اور سوویت دخل اندازی کی مخالفت کرتا ہے۔
- سوویت اقدام پر اپنے سنجیدہ تحفظات سے سوویت یونین کو آگاہ کیا لیکن اس کو عام کرنے سے پرہیز کیا۔
- یہ بات پوری طرح سمجھتا ہے کہ خارجی اسلامی قوتوں اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کے زیر اثر والا افغانستان ہندوستان کے مفاد میں نہیں ہوگا اور
- ہندوستان کی خواہش ہے کہ باہمی تعاون خصوصاً صحت، آبی توانائی اور چھوٹی سطح کی صنعت کاری کے میدان میں جاری رہے۔(63)

ہندوستان کے قومی مفاد کے سوچے سمجھے لوازمات کے تحت یہ رجحان قطعی طور سے ہم آہنگ تھا۔ لیکن اس نے بھی اپنی قیمت وصول کی۔ ایک عام افغانی اور غیر بی ڈی پی اے طبقہ کو دھوکہ کا احساس ہوا۔ سفارتکاری کے محاذ پر، افغانستان کے مسئلہ پر جو بین الاقوامی کوششیں جاری تھیں اس میں بھی ہندوستان کو حاشیہ پر رکھ دیا گیا' (64) باہمی سیاسی میدان میں نئی دہلی سے کابل کے دوروں میں کمی آئی اور جو بھی ہوئے وہ اعلیٰ سطح سے کمتر تھے۔ لیکن افغانی مہمانوں کو ہر سطح پر خوش آمدید کہا گیا اور ایک قلیل المقدار غیر فوجی تعاون اور امداد کو جہاں تک زمینی حقیقتیں اجازت دیتی تھیں جنگ کے زمانے کے دوران بھی جاری رکھا۔ افغان رہنما ہندوستانی مہمانوں سے صاف گوئی سے کہتے تھے کہ 'ہندوستان سے وسیع تر تعلقات کی برقراری ہی شاید وہ واحد ذریعہ ہے جس میں سے افغانستان اپنی خودمختارانہ غیر جانبدار حیثیت کو کچھ حد تک قائم رکھ سکتا ہے'۔ ان کا خیال تھا کہ یہ تعلقات اس لیے بھی ضروری ہیں کہ ''موجودہ علاقائی اور بین الاقوامی تناظر میں ہندوستان اور افغانستان کے مشترکہ مفادات، سلامتی کے مشترک تصورات اور مشترک سیاسی، معاشی اور حساس مقامات کو یکساں خطرہ ہے''۔ (65)

اگرچہ پاکستان نے کابل کی 14 رمئی کی تجاویز کو مسترد کردیا تھا لیکن اقوام متحدہ اور متعلقہ فریقوں کی جانب سے بحران کے حل کے لیے مذاکرات شروع کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ ان کے نتیجہ میں پاکستان و افغانستان کے بیچ بالواسطہ گفتگو کا سفارتی عمل جون 1982 میں اقوام متحدہ کی زیرنگرانی شروع ہوا جو کہ بالآخر 14 راپریل 1988 کے جنیوا معاہدہ پر منتج ہوا۔ جس کی رو سے (i) ''باہمی تعلقات خصوصاً غیر مداخلت اور غیر دخل اندازی کے اصولوں'' پر پاکستان اور افغانستان کے درمیان دوطرفہ معاہدہ، (ii) 'یونائٹیڈ اسٹیٹس اور یو ایس ایس آر کا ضمانتی اعلان، (iii) افغانستان اور پاکستان کے درمیان مہاجروں کی رضاکارانہ واپسی پر باہمی معاہدہ اور (iv) افغانستان اور پاکستان کی صورت حال کے تصفیہ کے لیے ایک باہمی معاہدہ جس پر یونائٹیڈ اسٹیٹس اور یو ایس ایس آر گواہ ہوں۔ پیراگراف پانچ اور چھ میں پروگرام کی ابتدا کا شیڈول اور سوویت فوجیوں کی واپسی کے آخری مرحلہ سے متعلق تھا۔

15رفروری 1989 میں سوویت فوجیوں کی واپسی کی تکمیل کے بعد مجاہدین نے جلال آباد سیکٹر پر زبردست حملہ کیا جو ناکام ہوا اور نجیب اللہ حکومت نے اقتدار کی پائیداری کا غیر متوقع مظاہرہ کیا۔ (66) اس کو 1987 کی اعلان شدہ قومی یکجہتی کی پالیسی پر کچھ حمایت حاصل ہوئی۔ اس عمل کے دوران حکومت نے دیہی علاقوں میں معاشرتی تبدیلی سے متعلق پی ڈی پی اے کے سارے پلان کو یکسر نظرانداز کردیا اور صدر نے ''انقلابی طریقہ کار کے ہر پہلو کو الٹا کرنے کے عمل کی صدارت کی'' (67) دوسری جانب پاکستان میں موجود مجاہدین کے سات سنی گروپ کے حالات سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ بھی نزع کے عالم میں ہیں۔ سوویت فوج کے انخلا کے فوراً بعد کے زمانے میں انھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ ان کے مفاد کے خلاف ہی پڑا۔ وہ سرکاری فوجوں کی جنگی صلاحیتوں سے بے خبر اور ان کو کمتر سمجھتے ہوئے جنگ میں کود پڑے۔ وہ جنگی تنازعہ میں بنیادی اصول یعنی اپنی صفوں میں ترتیب، مشترکہ قیادت اور فوجی ڈھانچہ پر گرفت کو نافذ نہیں کرسکے۔ تہران میں جمے ہوئے مزاحمتی گروپ کو اپنے لائحہ عمل میں لانے کے لیے ان کی ناکامی نے اس بات کو ثابت کردیا کہ وہ فوجوں کی واپسی کے بعد پیدا ہونے والے جدید مطالبات اور منظرنامہ سے کتنے بے خبر تھے۔ ان سب سے الگ اور زیادہ، پی ڈی پی اے حکومت کے خلاف مقامی کمانڈروں کو لڑنے کی ترغیب دینے میں ان کی ناکامی نے نہ صرف یہ کہ حکومت کو اپنی قوتیں صرف جلال آباد اور خوست تک مرکوز کرنے سے باز رکھا بلکہ عوام تک کامیابی کے ساتھ یہ پیغام پہنچایا کہ مقامی کمانڈروں اور پشاور کی قیادت کے مفادات لازمی طور سے یکساں نہیں ہیں۔ آخرکار پشاور کے گروپوں نے خوشامد کے بعد 'شوریٰ' کی ایک مجلس طلب کی جس کے ذریعہ 'عارضی اسلامی حکومت افغانستان' (آئی آئی جی اے) کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں آئی ایس آئی اور سعودیہ کا ہاتھ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مشق کو انجام دینے کے لیے سعودیہ نے 26رملین ڈالر صرف کیے اور ایک ملین ڈالر ماہانہ دینے کا وعدہ کیا۔ (68) ابتدائی یورشوں سے کامیابی کے ساتھ نبردآزما ہوکر نجیب اللہ حکومت نے کارروائیوں کی لگام اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے مخالفین کو نئی حقیقتوں کے پیش نظر مذاکرات کی دعوت دی۔ اگلے دو سال میں نجیب اللہ حکومت نے

کم و بیش تمیں تجاویز پیش کیں اور ایک شق ہر ایک میں مشترک تھی یعنی جنگ بندی یا دل و دماغ ٹھنڈا رکھنے کا وقفہ، مخالف گروپوں اور حکومت کے درمیان مذاکرات، ایک مشترکہ نگراں تنظیم کا قیام جس کی ذمہ داری نئے دستور اور انتخابی قانون کی تحریر ہو اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں انتخابات کا قیام۔ 23/جون 1990 کے امن پلان میں حکومت کی اس رضامندی کی صراحت کی گئی کہ 'ہم اپنی اقتدار کی اجارہ داری کو اتار پھینکیں گے اور دوسروں کو بھی اقتدار میں شریک کریں گے لیکن ہم بزاج اور انتشار کے بدلے میں اقتدار کی قربانی کے لیے تیار نہیں ہیں'۔ اسی نقطہ نظر کا اظہار جولائی 1990 میں ہونے والی یو ایس سوویت مذاکرہ میں ہوا۔ یہاں آخرالذکر کا اصرار تھا کہ افغانی مزاحمت کاروں کو مذاکرہ کی میز پر وہ نہیں ملنا چاہیے جو وہ میدان جنگ میں کھو چکے ہیں۔

سوویت یونین کی سیاسی اور فوجی امداد سے قطع نظر نجیب اللہ نے اپنی خارجہ پالیسی میں روسی فوجی انخلا کے بعد کے زمانے کے لیے ہندوستان سے سیاسی امداد کی توقع رکھی۔ نئی دہلی نے بھی اس مدد کو کافی مقدار میں دیا۔ افغانستان کے صدر کے اگست 1990 کے دورۂ ہندوستان پر جو مشترکہ اعلانیہ جاری کیا گیا تھا اس میں ہندوستان نے ان کی قومی یکجہتی کی پالیسیوں کی حمایت کی اور اپنے اس موقف کو دوہرایا کہ افغان مسئلہ کا واحد ممکن سیاسی حل گفت وشنید کے ذریعہ ہوسکتا ہے جو کہ موجودہ حقیقتوں اور سب کے جائز مفادات پر مبنی ہو۔(69) دورہ کے فوراً بعد ہندوستان نے دواؤں اور غلہ کی ایک کھیپ روانہ کی۔ وسیع تر معاشی امداد سپلائی کے راستے کی پیچیدگی (زمینی راستہ سوویت یونین کے درمیان) اور دیگر اسباب کے باعث تاخیر کا شکار ہوگئی۔ لیکن بالآخر نجیب اللہ کی حکومت قائم نہ رہ سکی۔ اس کے زوال کا باعث جنوب کا بیرونی دباؤ نہیں تھا بلکہ دنیا کے اسٹیج سے سوویت ریاست کا خاتمہ اور اس حمایت کا فقدان تھا جو وہ افغانستان کو دیتی تھی۔ بقیہ کام پی ڈی پی اے کے اندر پختون اور غیر پختون عناصر کی آپسی تباہ کن چپقلش نے انجام دیا اور اپریل 1992 میں اس کی قسمت پر مہر لگا دی۔ لہٰذا اقوام متحدہ کا پروگرام کہ ایک عبوری حکومت کو منظم طریقہ سے انتقال اقتدار کر دیا جائے، رائیگاں چلا گیا۔ کابل کا کنٹرول احمد شاہ مسعود کے وفاداروں کے ہاتھ

میں آ گیا اور پاکستان میں مجاہدین کی ٹکڑیوں نے 'پشاور معاہدہ' باری باری کی بنیاد پر طے کیا اور افغانستان اسلامی جمہوریہ کا اعلان کیا۔'' شاید یہ وجود اسلامی تھا لیکن یہ کوئی ریاست نہیں تھی اور یقینی طور سے اس کی حکومت افغانستان پر نہیں تھی'(70) اس کے باوجود اس کو کئی ممالک بشمول ہندوستان نے تسلیم کیا۔ ہندوستان نے اس کے ساتھ گرم جوشی اور دوستانہ تعلقات کی امید رکھی۔ یہ دراصل نتیجہ تھا اس سے قبل کی ہوئی مشق کا جس میں تمام گروہوں کے قائدین سے رابطہ بنائے رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی تاکہ بالآخر جو بھی اقتدار پر قابض ہو ہندوستان اسی سے معاملات طے کرے۔'' (71)

پشاور معاہدہ کے مطابق دو مہینے کے بعد مجددی نے برہان الدین ربانی کے حق میں صدارت کو چھوڑ دیا۔ ربانی انتقالِ اقتدار کی گردش کو مزید آگے بڑھانے سے کترائے اور ان کے کمزور اقتدار کو 1992 سے 1996 تک مسلسل مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اندرونی طور سے ان کا مقابلہ خود اپنے وزیراعظم گلبدین حکمت یار جن کے آئی ایس آئی سے پرانے تعلقات تھے' سے تھا اور باہر پاکستان سے جو''ابتدا ہی سے ربانی حکومت پر اعتماد نہ کرتا تھا اور اس فکر میں تھا اس کو ایسی حکومت سے تبدیل کردے جو اس کے کسی ایک پٹھو کے ہاتھ میں ہو'(72)۔ نتیجہ کے طور پر اسلام آباد اور کابل میں جماعت اسلامی کے زیر اثر والی حکومت میں تعلقات اتنے کشیدہ ہوگئے کہ 1995 میں وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کھلے طور پر ربانی کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی اور ان کی حکومت کو 'ناجائز' قرار دیا۔

اپنی علاقائی جائے وقوع کی مناسبت سے افغانستان کو مزید اہمیت اس وقت اور حاصل ہوئی جب وسط ایشیا کے ممالک آزاد ہوگئے اور علاقہ میں ایک نیا ریاستی نظام ظہور میں آیا۔'نسلی بنیاد پر جانی ہوئی وسط ایشیا کی ریاستوں کی آزادی نے افغانستان میں نسلی شناختوں کو تقویت بخشی۔ وسط ایشیا سے تجارت اور پائپ لائن کے راستوں پر کنٹرول رکھنے کے مقابلہ نے ایران اور پاکستان کے تعلقات کو یکسر بدل دیا'(73) بے نظیر بھٹو کی حکومت کے وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے پاکستان کے مفاد کے پیش نظر وسط ایشیا کے لیے ایک متبادل زمینی راستہ ڈھونڈا جو کوئٹہ سے قندھار اور ہرات ہوتا ہوا ترکمانستان جاتا تھا۔ یہ کام 1994 کے

موسم خزاں میں کیا گیا اور اسلام آباد میں متعین چھ مغربی سفیر (بشمول امریکہ) کے ایک گروپ کو دونوں مقامات پر لے جایا گیا تاکہ ان کو پروجیکٹ کی پائیداری کا مشاہدہ کرایا جائے اور اس کے لیے مالی تعاون حاصل کیا جائے۔ راستہ کی حفاظت کی ضمانت مدرسہ میں پڑھنے والوں (طالبان) کے ایک مختصر گروپ نے لی۔ رجحان کے اعتبار سے یہ گروپ پختون قبیلے کے مجاہدین قائدین میں موجود بدعنوانیوں سے ناراضگی کا آئینہ دار تھے اور کابل حکومت میں غیر پختونی عناصر کے زبردست اثر سے نالاں تھے۔ یہ نئی طاقت مقامی جنگجوؤں کو زیر کرنے میں کامیاب ہوگئی اور سپین بولڈاک اور قندھار پر اپنا قبضہ جما لیا۔ بنیادی طور سے یہ ایک فوجی تحریک تھی جس کا مقصد وعظ ونصیحت اور اسلحہ کی مدد سے ملک کو دوبارہ متحد کرنا تھا۔ ''طالبان عنصر کو سمجھنے کے لیے بنیادی بات یہ ہے کہ اسلحہ کی قوت کیسے حاصل ہوئی اور اس کا استعمال کیسے کیا گیا۔'' (74) اس کے قابل ذکر پہلوؤں میں ایک متحدہ قیادت اور کنٹرول سسٹم، بہترین ذرائع نقل وحمل اور 17 رسالہ جنگی مدت کبھی نظر نہ آنے والی تیز رفتاری تھے۔ ''یہ سمجھنا کہ نیم خواندہ طالبان کے کمانڈرز جن کا فوجی تجربہ گوریلا جنگی طریقہ کار کے 'مارو اور بھاگو' تکنیک تک محدود تھا، منصوبہ بندی اور نفاذ کی اس سطح تک پہنچ سکتے ہیں خود اس مفروضہ کو جھٹلاتا ہے' (75) تمام سنجیدہ مبصرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ صرف پاکستان کی پوشیدہ حمایت اور مدد سے ممکن ہوا جس کا مقصد افغانستان میں دوبارہ پختون بالادستی کا قیام تھا جس کے ذریعہ تجارتی اور عملی مقصد حاصل کیا جا سکے۔ کیونکہ اس منصوبہ سے ایران تنہا ہو جاتا تھا اور اس کی وسط ایشیا کی توانائی کی سپلائی کی سب سے اہم گزرگاہ بننے کی امنگوں پر زد پڑتی تھی یونائیٹڈ اسٹیٹس بھی نئے حالات کی پشت پناہی کرنے لگا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس کو یہ بھی امید تھی کہ طالبان ایک جنگ دریدہ ملک میں امن بحال کریں گے اور اس ڈرگ سپلائی کو بند کریں گے جو افغانستان سے پوری دنیا کی مارکیٹ میں پہنچ رہی ہے۔ سعودی عرب اور یو اے ای نے جلد ہی اس کو منظوری دے دی اور مدد ارسال کی۔ لیکن رفتہ رفتہ طالبان حکمرانوں نے جس جبر، انتہا پسندی اور غیر رواداری کا اظہار کیا اس نے اس کے باہری حمایتوں، سوائے پاکستان، کو سخت مایوس کیا۔ اس طرز عمل کی وجہ سے ایران، روس، وسط

ایشیا کی ریاستوں (سوائے ترکمانستان) اور ہندوستان نے بھی کان کھڑے کیے اور ان سب نے متحد ہوکر 'شمالی اتحاد' جو ملک کے شمالی حصہ میں طالبان مخالف قوتوں کا ایک گروپ تھا، کو سیاسی اور مالی امداد فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔

افغانی حالات کے ایک محتاط طالب علم نے 1995 میں مشاہدہ کیا: 'اگر بین الاقوامی کمیونٹی افغانستان کی تعمیر نو کے لیے کوئی راستہ نہیں نکالتی تو اسلحہ، نقد اور غیر قانونی اشیا کا ایک سیلاب ملک کی دراڑوں دار سرحد سے اندر آ جائے گا اور پھر یہ دینا سب کے لیے غیر محفوظ ہوجائے گی' (76) یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی جب طالبان کو کامیابی حاصل ہوئی اور بین الاقوامی کمیونٹی نے غیر دلچسپی یا تجارتی اور دوسرے اسباب کی خاطر اس نئی قوت کی تباہ کن جہتوں کو نظر انداز کردیا۔ جس کی شروعات ایک پناہ گاہ کی حیثیت سے ہوئی تھی اس نے خود کو جلد ہی ایک لانچنگ پیڈ میں ڈھال لیا جہاں سے مختلف شہروں کے جان پر کھیلنے والے اسلامی انتہا پسندوں کو بے درد دہشت گردانہ کاموں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ ان حملوں کی ابتدا 1998 میں مشرقی افریقہ میں یو ایس سفارتخانوں پر بمباری سے ہوئی اور اس کا عروج 11 ستمبر 2001 میں عالمی تجارتی مرکز کی ڈرامائی تباہی تھی۔ یونائٹیڈ اسٹیٹس کا ردعمل جس کو اقوام متحدہ کی حمایت حاصل تھی طالبان کے لیے موت کی گھنٹی اور بچے کھچے افغانستان کی تباہی ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ہی راتوں رات پاکستان کا یہ خواب بھی کہ وہ کابل میں اپنی زیر اثر حکومت کے ذریعہ کوئی گہری بنیاد بنالیں گے ایک بھیانک تعبیر میں تبدیل ہوگیا جس کے وسیع تر اثرات ابھی ظاہر ہونے کو ہیں۔

1992 سے 1996 تک کی مدت میں ربانی حکومت سے ہندوستان کے تعلقات محدود نوعیت کے تھے اور ان میں دم نہیں تھا۔ طالبان سے تعلقات قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ طالبانی قیادت کے ایک حصہ نے کچھ اشارے دیے تھے لیکن افغانی ہندوؤں اور سکھوں سے طالبان کے برتاؤ کی وجہ سے ان کی شروع ہی میں نفی کردی گئی۔ ہندوستان کی نظروں میں زیادہ سنجیدہ مسائل کشمیر سے متعلق طالبان کے بیانات، کشمیریوں کی ٹریننگ، افغانستان میں پاکستان اور بیرونی جنگجوؤں کے کیمپ اور

جموں وکشمیر میں ان کا داخلہ اور انڈین ایرلائنز کے جہاز کی قندھار میں ہائی جیکنگ تھے۔ ہندوستانی مفادات کے یہ حساس مقامات تھے اور ان ہی وجوہات نے ہندوستان کو نمایاں طور سے غیر پختونی ربانی و مسعود افواج کی حمایت اور امداد کی ترغیب دی۔ اس پالیسی سے کثیر فائدے حاصل ہوئے خصوصاً 11 ستمبر کے بعد والے زمانے میں۔ اسی طرز عمل کو یونس قانونی نے اپنے دسمبر 2001 کے دورہ میں بہت مناسب الفاظ میں بیان کیا ''ہمیں ان ممالک کی ضرورت ہے جو خراب وقت میں ہمارے دوست تھے اور اب افغانستان کی تعمیر نو میں ہمارے دوست رہیں گے''۔

اقوام متحدہ نے بون معاہدہ کے تانے بانے جوڑے (جو تعمیر نو کے واسطے دس بلین ڈالر کی مدد سے آراستہ تھا) اور 22 دسمبر 2001 کو حامد کرزئی کی عارضی حکومت نے حلف لیا، جو 1992-1991 کے بوجھل اور لاحاصل انتظام سے بہتر قدم تھا لیکن اس کی ناپائیداری پہلے ہی سے خوب روشن تھی کیونکہ اس کے مختلف اجزا اور بیرونی متعلقہ قوتوں کے درمیان برابری اگر فریب نہیں تو غلط فہمی کے لیے کافی جگہ چھوڑتی ہے۔ پچھلی دو دہائیاں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ افغانستان کی نجات کے لیے کوئی بھی تجویز بارآور نہیں ہوئی اور یہ کہ ایک زیادہ باشعور راستہ اب بھی بادشاہ نادر شاہ کی غیر جانبدارانہ پالیسی میں پوشیدہ ہے جس کو افغانستان کے ایک غیر جانبدارانہ ادارہ کے ذریعہ دوبارہ نافذ کیا جاسکتا ہے اور جو (i) ایک منتخب مجلس قانون ساز کا 'غیر جانبداری' کا وعدہ، (ii) اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی توثیق، (iii) اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بدلے کے فرائض کا افغان حکومت کی جانب سے قبول کرنا اور دوسری جانب دلچسپی رکھنے والی بیرونی طاقتوں (بشمول اس کے قریبی ہمسائے) پر بھی۔ اس سیاق میں تخفیف اسلحہ کی جانب قدم رکھنا آسان ہوگا جو بالآخر تخفیف افواج کی جانب لے جائے گا۔

بیرونی طور سے ضمانت شدہ اور اداراتی افغانی غیر جانبداری کا نظریہ یوروپین اکنامک کمیشن اور یونائٹیڈ اسٹیٹس نے 1980 کے شروع میں اور سوویت یونین نے 1986 میں پیش کیا تھا۔ آخرالذکر کی نقل کرتے ہوئے پاکستان فارن آفس نے بھی ایک ''ٹھوس

تجویز تیار کی'' جس میں ''9/جولائی 1982 کے لاؤشین ڈیکلریشن اور بعد میں آنے والے 'ضامنوں کے معاہدہ'' کو شامل کیا گیا تھا اور'' خطرہ اور غیر جانبدارانہ حیثیت کو نقصان پہنچنے کے وقت اس میں سلامتی کونسل کو دخل دینے کا کردار دیا گیا تھا''۔ ان تجاویز کی نقول سوویت یونین، یونائیٹڈ اسٹیٹس، چین، سعودی عرب اور ایران کو روانہ کردی گئیں۔ اس تجویز کو سات اتحادی لیڈروں نے بالاتفاق مسترد کردیا کہ یہ اسلامی طرز اخلاقیات کے منافی ہے افغانستان کو ایک باصلاحیت قوم سمجھنے میں ان کے تصور میں اس میں کوئی کشش نہیں تھی (77) پندرہ سال اور ایک بدلی ہوئی دنیا میں، خود اسلامی طرز اخلاقیات اور اپنی رجولیت کے متعلق زیادہ پختہ رائے رکھتے ہوں گے!

افغان کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ایک کی پہلی خواہش ہے کہ وہ اثر انداز ہو اور پھر امداد دے۔ پہلی خواہش سے ایک یکساں انکار دوسرے کی حیثیت کو بڑھا دے گا اور افغان شاعر خان اللہ خلیلی نے جس کو بڑے ولدوز انداز میں 'وعدہ فردا' سے تعبیر کیا ہے سے مل جائے گا۔ کسی بھی ایسی کاوش میں ہندوستان افغانی عوام کے روایتی رفیق کی طرح پھر اپنے پرانے رول کو نبھا سکتا ہے۔ وہ تعمیر نو، کیڈرز کی ٹریننگ میں مدد کرسکتا ہے اور انجام کار جنوبی ایشیائی اقوام کی کمیونٹی میں افغانستان کا استقبال کرسکتا ہے اور جنوبی اور وسطی ایشیا کے درمیان ایک قابل اعتماد رابطہ بنا سکتا ہے۔

حواشی

1۔ کاکر، حسن ''افغانستان: اے اسٹڈی آف انٹرنل پولیٹیکل ڈیولپمنٹس 1880-1892 ''(پنجاب ایجوکیشن پریس، لاہور/کابل 1971)صفحہ 4

2۔ حوالہ بالا،صفحہ 208

3۔ الاسلام، ریاض'انڈو پرشین ریلیشنز'' (ایرانین کلچرل فاؤنڈیشن، تہران 1970) صفحات 86-176 اور 25-210

4۔ گھوش، ڈی پی ''انگلینڈ اینڈ افغانستان: اے فیز اِن دیر ریلیشنز'' (دی ورلڈ پریس، کلکتہ 1960)صفحہ 3

5۔ گوپال، ایس ''برٹش پالیسی ان انڈیا 1905-1858'' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، 1965)صفحہ 228

6۔ کاکر، حوالہ سابق صفحہ 271

7۔ حوالہ بالا،صفحہ 269

8۔ ترپاٹھی، جی پی ''انڈو افغان ریلیشنز 1907-1882'' (کمار برادرز، نئی دہلی 1973)صفحہ 175

9۔ حوالہ بالا، صفحات 82-181، فارن سکریٹری کو دی گئی ہدایات کے مکمل متن کے لیے دیکھیے صفحات 87-175، پیراگراف 13 میں 'کچھ غلط فہمیوں کے اسباب' کا ذکر ہے جس کی وضاحت کی ضرورت تھی۔

10۔ گوپال، حوالہ سابق، صفحہ 285

11۔ ترپاٹھی، حوالہ سابق صفحہ 159۔ برٹش ڈرافٹ اور معاہدہ کا متن صفحات 90-188 میں دیا گیا ہے۔

12۔ حوالہ بالا، صفحہ 126

13۔ حوالہ بالا، صفحہ 161

14۔ حوالہ بالا، صفحات 92-191 متن کے لیے

15۔ حوالہ بالا صفحات 67-166

16۔ گریگوریان ورتاں ''دی ایمرجینسی آف ماڈرن افغانستان'' (اسٹینفورڈ یونیورسٹی پریس، اسٹینفورڈ، کیلی فورنیا، 1969) صفحات 17-216

17۔ اس رائے کو صاف صاف الفاظ میں امین کے بھتیجے شیخ احمد عبداللہ نے 11 ردسمبر 1915 کے ''ہارپرویکلی'' کے شمارہ میں اپنے مضمون ''ایشیا اینڈ وار'' میں بیان کیا ہے ''ہم پر قتل و غارت گری ناقابل بیان تکلیفوں اور مکمل تباہی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بہت سادہ اور واضح ہے۔ مغربیت کو جس سے تکلیف ہوتی ہے وہ ہماری مدد کا سامان ہے۔ لہٰذا اس سے ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ ہم یوروپین سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ ہم اسے ایک ناقابل برداشت وحشی سمجھتے ہیں جو ورغلانے کے ناکام ہونے پر دھونس اور دھمکی سے کام نکالتا ہے۔ یوروپین نے ہم کو تلوار سے پڑھایا ہے۔ اب ہم اس کو تلوار سے پڑھائیں گے'' (گریگوریان، حوالہ بالا، صفحہ 216)

18۔ گریگوریان، حوالہ بالا، صفحات 26-225

19۔ حوالہ بالا، صفحہ 229

20۔ روبن، برنیٹ آر ''دی فریگ مینٹیشن آف افغانستان'' (ییپل یونیورسٹی پریس، نیو ہیون کنیکٹی کٹ، 1995) صفحہ 54

21۔ گریگوریان حوالہ سابق صفحات 31-230

22۔ حوالہ بالا صفحہ 232

23۔ رائے ایم این ''میموآئرز'' (ایلیڈ، بمبئی 1964) صفحہ 407

24۔ حوالہ بالا، صفحہ 493

25۔ روبن، حوالہ سابق، صفحہ 57، گریگوریان، حوالہ سابق، صفحات 74-263

26۔ گریگوریان، حوالہ بالا، صفحہ 286، اولیور رائے (اسلام اینڈ ریزسٹنس ان افغانستان، کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج 1986، صفحات 68-66) کو عام رائے سے اختلاف ہے۔ ان کے مطابق بچہ سقہ کا معاملہ ''پہلی اور اولین ثقافتی بغاوت تھی نہ کہ سیاسی'' اور اس کو بنیاد پرستی کے نیٹ ورک کے ظہور کی طرح دیکھنا چاہیے۔ صفحات 68-66

27۔ گریگوریان، حوالہ سابق صفحہ 321

28۔ حوالہ بالا، صفحات 23-322

29۔ حوالہ بالا، صفحہ 329، سرمائیکل اوڈائر کا اقتباس

30۔ حوالہ بالا، صفحات 85-384، شامی پیر کے قصہ کے لیے دیکھیے اولاف کیرو ''دی پٹھان'' (1958) صفحات 9-408

31۔ گریگوریان، حوالہ بالا، صفحات 89-386

32۔ برک، ایس ایم ''پاکستانز فارن پالیسی: این ہسٹوریکل انالیسس'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن 1973) صفحات 74-72، افغان موقف کو برطانیہ نے مسترد کر دیا۔ 30 جون 1950 کو ہاؤس آف کامنز کے ایک بیان میں اس پر زور دیا گیا تھا کہ ''ان خطوں میں بین الاقوامی قانون کے مطابق پاکستان غیر منقسم ہندوستان کی حکومت اور یونائیٹڈ کنگڈم میں ہز میجسٹی کی حکومت کے تمام حقوق و فرائض کا وارث

ہے۔ اور یہ کہ ڈیورینڈ لائن بین الاقوامی سرحد ہے۔'' اولاف کیرو حوالہ سابق، صفحہ 465

33۔ پولاڈا لیون بی'دی روڈ ٹو کرائسس 1980-1919' کے لیے دیکھیے روزان کلاس (ایڈٹ) ''افغانستان: دی گریٹ گیم ری وزیٹیڈ'' (فریڈم ہاؤس، نیویارک 1987) صفحہ 40

34۔ کنس ڈینس ''دی یونائیٹڈ اسٹیٹس اینڈ پاکستان 2000-1947'' (ووڈرو ولسن سینٹر پریس، واشنگٹن ڈی سی 2001) صفحہ 42

35۔ پولاڈا، حوالہ سابق، صفحہ 43

36۔ گوپال، حوالہ سابق صفحہ 41

37۔ برک، حوالہ سابق، صفحہ 68

38۔ لکس، حوالہ سابق، صفحہ 20، اگست 1948 میں پاکستان نے 'یو این کمیشن فار انڈیا اینڈ پاکستان' کو بتایا کہ 'جموں وکشمیر کی سرزمین میں پاکستان کی باقاعدہ فوج کے داخلہ کی وجہ یہ تھی پختونستان کی تحریک آزادی سے ہندوستان کے ایک ممکنہ مادی رابطہ کو روکا جائے اور ساتھ ہی پاکستان کے خلاف ہندوستان اور افغانستان کے دو پہلو حملہ کے امکان کو ختم کیا جائے''۔ مزید دیکھیے جوزف کوربیل ''ڈینجر ان کشمیر'' (پرنسٹن یونیورسٹی پریس، پرنسٹن، نیوجرسی 1966) صفحات 9-138

39۔ حوالہ بالا، صفحات 109 اور 125

40۔ انور، راجا، ''ٹریجڈی آف افغانستان: اے فرسٹ ہینڈ اکاؤنٹ'' (ورسو، لندن 1988) صفحات 79-78

41۔ وولبرٹ اسٹینلے، ''زلفی بھٹو آف پاکستان'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیو یارک 1993) صفحات 17-216

42۔ انور، حوالہ سابق، صفحات 81-80

43۔ حوالہ بالا، صفحہ 82، دنیا کے بارے میں داؤد کے نظریہ میں تبدیلی ہنری کیسنجر نے

اپنی کتاب ''ایرس آف اپھول'' میں منظوری کے بعد پیش کی ہے۔ (لٹل، براؤن اینڈ کمپنی، بوسٹن 1982) صفحہ 677

44۔ ٹکس، حوالہ سابق، صفحہ 246۔ جنرل کے ایم عارف سے اقتباس

45۔ خان، ریاض ایم ''ان ٹائینگ دی افغان ناٹ: نگوشیٹینگ سوویت وڈرال'' (ڈیوک یونیورسٹی پریس، ڈرہم، نارتھ کیرولینا 1991) صفحہ 11، کتاب میں مذاکرات کے طریقۂ کار کو پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو پاکستانی وفد کے ایک رکن کا مشاہدہ ہے۔ انھوں نے 'سیاسی عمل اور مقاصد سے پرے ملٹری آپریشن میں کامیابی میں آئی ایس آئی کے آزادانہ مفاد' کے متعلق دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔

46۔ اے اپا ڈورائی ''سلیکٹ ڈوکومنٹس آن انڈیاز فارن پالیسی اینڈ ریلیشنز 1972-1947'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی 1985) جلد 11، صفحات 4-3 میں متن ہے۔

47۔ حوالہ بالا، صفحہ 5، مزید دیکھیے ہیمساتھ چارلس ایچ اینڈ مان سنگھ سرجیت ''اے ڈپارلیمنٹ ہسٹری آف موڈرن انڈیا'' (الائیڈ، نئی دہلی 1971) صفحات 94-293

48۔ حوالہ بالا، صفحہ 294، خان عبدالغفار خاں نے 1969 میں نئی دہلی میں کہا کہ 'ہندوستان آزاد پختونستان کے بارے میں کبھی سنجیدہ نہیں تھا، انھوں نے اس نعرہ کو صرف پاکستان کو پیٹنے کے لیے ایک چھڑی کی طرح استعمال کیا۔' کلدیپ نیر ''رپورٹ آن افغانستان'' (ساؤتھ ایشیا بکس، نئی دہلی 1981) صفحہ 123

49۔ دکشت جے این ''این افغان ڈائری'' (کونارک، نئی دہلی 2000) صفحہ 19

50۔ ہیمساتھ اینڈ مان سنگھ، حوالہ سابق صفحہ 294

51۔ ستیش کمار (ایڈٹ) ''ڈوکومنٹس آن انڈیاز فارن پالیسی 1972'' (نئی دہلی 1975) صفحات 87-286 میں متن ہے۔

52۔ باجپئی اے پی ''نیو ڈائمینشنز آف انڈیاز فارن پالیسی'' (پبلی کیشنز ڈویژن، منسٹری

آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ، نئی دہلی 1979)، صفحہ 198

53۔ ڈکشٹ، حوالہ سابق، صفحہ 19، یونائیٹڈ اسٹیٹس کی حکومت بھی یکساں طور سے حیرت زدہ تھی کیونکہ بغاوت سے ایک ماہ قبل ان کی تحقیق کے مطابق اندرونی حالت مستحکم تھی اور صدر کی کوئی اہم مخالفت نہ تھی، کلدیپ نیر ''رپورٹ آن افغانستان'' (ساؤتھ ایشیا بکس، نئی دہلی 1981) صفحہ 19

54۔ ڈکشٹ، حوالہ بالا، صفحہ 21

55۔ مکرجی، سادھن ''افغانستان فروم ٹریجڈی ٹو ٹرمپھ'' (اسٹرلنگ، نئی دہلی 1984) صفحات 203-4)

56۔ ڈکشٹ، حوالہ سابق صفحہ 22

57۔ ایشین ریکارڈر، جلد XXVI، نمبر 11، صفحہ 15355

58۔ سین گپتا، بھابانی ''دی افغان سینڈروم: ہاؤ ٹو لیو ود سوویت پاور'' (کروم ہیلم، لندن 1982) صفحہ 123

59۔ ڈکشٹ، حوالہ سابق، صفحہ 128

60۔ ڈکشٹ جے این ''ایکروس بارڈرز: ففٹی ایرز آف انڈیاز فارن پالیسی'' (پائی کس بکس، نئی دہلی 1998) صفحات 139-40

61۔ ''ایشین ریکارڈز'' جلد XXVI، نمبر 31، صفحات 15572-73

62۔ حوالہ بالا، جلد XXVII، نمبر 2، صفحات 15827-29

63۔ ڈکشٹ، حوالہ سابق، صفحات 142-43

64۔ حوالہ بالا صفحہ 144، مزید دیکھیے ریاض ایم خان، حوالہ سابق، صفحہ 20: 'نئی دہلی میں فروری 1981 میں منعقدہ نام وزراء خارجہ کی میٹنگ اس اعلیٰ آبی نقش کی نمائندہ بھی تھی جو بین الاقوامی سطح پر افغان مسئلہ پر ہندوستان کی حصہ داری سے متعلق تھا۔ ایک بڑی علاقائی طاقت ہونے کے باوجود ہندوستان افغانستان سے متعلق سفارتکاری کے عمل میں حاشیہ پر ہی رہا کیونکہ اس عمل کو او آئی سی اور اقوام

متحدہ کے رنگ لیے ہوئے مقاصد کنٹرول کرتے تھے۔

65۔ ڈکشٹ، حوالہ بالا، صفحات 388 اور 430

66۔ خان حوالہ سابق، صفحہ 302

67۔ روبن، حوالہ سابق، صفحہ 147، ریاست کے منہ موڑنے کا یہ عمل اور ساتھ ہی اسلامی اور افغانی علمی گفتگو پر اس کا قابض ہونا کی کچھ تفصیل صفحات 75-146 میں پائی جاتی ہے۔

68۔ حوالہ بالا، صفحات 51-249

69۔ ''ایشین ریکارڈر، جلد XXVI نمبر 44، صفحات 9-21408

70۔ روبن، حوالہ سابق، صفحہ 272

71۔ ڈکشٹ جے این ''مائی ساؤتھ بلاک لیبرز: میموائرز آف اے فارن سکریٹری'' (یو بی ایس پی ڈی، نئی دہلی 1996) صفحہ 108

72۔ سیکل امین 'دی ربانی گورنمنٹ 1996-1992' کے لیے دیکھیے ولیم مالے کی کتاب (ایڈٹ) ''فنڈامینٹلزم ری بورن؟ افغانستان اینڈ دی طالبان'' (ہرسٹ اینڈ کمپنی، لندن 1999) صفحات 29 اور 39-38

73۔ روبن بارنیٹ آر، 'ویمن اینڈ پائپ لائنز: افغانستانز پروکسی وارز۔ ''انٹرنیشنل افیئرز'' (1977، 73:2) صفحہ 284

74۔ ڈیوسن اینتھونی، 'ہاؤ دی طالبان بی کیم اے ملٹری فورس' کے لیے دیکھیے ولیم مالے، (ایڈٹ) حوالہ سابق، صفحہ 43

75۔ حوالہ بالا، صفحہ 68

76۔ روبن (1995) حوالہ سابق صفحہ 280

77۔ خان، حوالہ سابق صفحات 41-239، مزید دیکھیے سین گپتا حوالہ سابق صفحہ 127، اور سلیگ ایس ہیریسن، ''ڈیٹ لائن افغانستان: ایگزٹ تھرو فن لمیٹڈ؟'' ''فارن افیئرز'' (1980، موسم سرما، 41) صفحات 87-163

فلسطین: سفارتکاری کی گنجائش؟

فلسطین کے ''مسئلہ'' کا استقرار سفارتکاری میں ہوا اور آج تک یہ اسی میں مقید ہے۔ شاید اس کے بانی میکاولی کے اس نظریہ سے متاثر تھے کہ محتاط ہونے سے تندرو ہونا زیادہ بہتر ہے۔

بیسویں صدی میں فلسطین کا مستقبل گرما گرم بحث کا موضوع بنا رہا۔ یہ اس لیے زیادہ حیران کن ہے کہ خود صدی کے آغاز میں اس مسئلہ کا کوئی وجود نہیں تھا اور وجود میں آتا بھی نہیں اگر پہلی جنگ عظیم کے دوران اتحادی حکمت عملی کی مجبوریاں نہ ہوتیں۔ ان مجبوریوں کو مورخ آرنلڈ ٹوئن بی نے بہت مناسب طریقہ سے ملخص کیا ہے: ''2 نومبر 1917 کا بالفور ڈیکلریشن دراصل پہلی جنگ عظیم کے دوران دو محارب فریقوں کے درمیان جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور۔ سب سے اہم۔ امریکی یہودیوں کی حمایت حاصل کرنے کے گندے کھیل میں ترپ کا پتہ تھا''۔ اس ڈیکلریشن کے نفاذ کی ذمہ داری برطانیہ عظمیٰ کے سپرد کی گئی تھی۔ اور اس کا آلہ کلاس اے کے اختیارات تھے جو لیگ آف نیشنز کے عہد نامہ میں دیے گئے تھے۔ اختیارات (مینڈیٹ) کی ابتدا یعنی 1918 میں ''عرب فلسطینیوں کی تعداد ملک میں %90 سے زیادہ تھی''۔ 1947 میں عربوں کی تعداد 1237000 تھی اور اس کے

مقابلہ میں یہودی 625000 تھے۔ٹوئن بی نے کہا کہ تعداد میں یہ اضافہ ''فلسطینی عربوں پر برطانیہ کی فوجی طاقت نے تھوپا تھا'' (1) برطانوی مینڈیٹ کے آخری مراحل میں یہودی جنگجو گروپس نے '' آزاد خیال حکمرانوں کے ارادوں کو کمزور کرنے کے لیے دہشت گردی کے سائنسی استعمال کا طریقہ'' اختیار کیا (2) یونائیٹڈ اسٹیٹس کے صدر ٹرومین نے مدد کا ہاتھ بڑھایا اور رہی سہی کسر فلسطینیوں کی الجھن و حیرانی اور عرب حکومتوں کے غیر دانشمندانہ رجحان نے پوری کردی۔ اسرائیل کی ریاست 14 مئی 1948 کو وجود میں آئی اور سرکاری فلسطین کے 656000 باشندے اسرائیلی مقبوضہ علاقہ سے بھاگ نکلے(4) اس طرح یہودیوں کو دیے گئے اللہ کے وعدہ کو ایک ٹھوس شکل دے دی گئی (5) اور فلسطینی عربوں کو ''یوروپ میں کی گئی یہودیوں کی نسل کشی کی قیمت چکانی پڑی جو عربوں نے نہیں بلکہ جرمنوں نے کی تھی'' (6)۔

اسرائیل جون 1967 کی جنگ تک اپنی 1948 کی سرحدوں تک محدود رہا۔ ۱۰ لیکن چھ دنوں کے اندر ہی اندر جمال عبدالناصر کا بنایا ہوا ڈھانچہ زمیں بوس ہوگیا(7)۔ جنگ کا خاتمہ مغربی کنارہ، غزہ پٹی اور کچھ مصری و شامی علاقوں پر اسرائیل کے قبضہ پر ہوا۔ مزید فلسطینی پناہ گزین ہوگئے ان میں سے کچھ دوسری بار اس تجربہ سے گزرے(8)۔ پانچ مہینے کے مذاکرات اور بحث و مباحثہ کے بعد سلامتی کونسل نے قرارداد 242 کے ذریعہ اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ 'حالیہ تنازعہ میں قبضہ کیے ہوئے علاقوں سے نکل جائے' اور 'پناہ گزینوں کے مسئلہ کے ایک منصفانہ حل کی ضرورت' پر زور دیا۔ اس کے نفاذ کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا اس قرارداد میں فلسطینیوں کو محض ایک پناہ گزینی مسئلہ کی طرح دیکھا گیا۔ چنانچہ ایک ممتاز اور علاحدہ تنظیم کی حیثیت سے فلسطینی قومی تحریک کا ظہور جو ایک الگ اور آزاد قومی وجود کا مطالبہ کررہی تھی تنازعہ کا ایک غیرارادی اور مختلف قسم کا ماہیتی نتیجہ تھا۔ لیکن دوستوں اور دشمنوں نے یکساں طور پر اس کا آتشی استقبال کیا جو طویل اور تکلیف دہ تھا۔ لہٰذا دسمبر 1987 کا انتفاضہ ان مایوس کن حالات کا نتیجہ تھا جو پچھلے بیس برس سے فلسطینی عوام اسرائیل کے قبضہ میں جھیل رہے تھے۔ یہ ایک بے ساختہ وقوعہ تھا جس کی ضخامت و جسامت

غیر معمولی عوامل کی حامل تھی جس نے زمینی حقیقتوں اور نظریوں میں ماہیتی تبدیلی پیدا کی: ''اس بغاوت کا سب سے اہم پیغام جو اسرائیلی معاشرہ اور امریکی قانون ساز یکساں طور سے تسلیم کرتے تھے یہ تھا کہ مغربی کنارہ اور غزہ پر طویل اسرائیلی قبضہ اور فلسطینیوں کو ان کے قومی حقوق دینے سے انکار قابلِ قبول راستہ نہیں ہے'' (9) اس کا فوری طور پر ایک اثر یہ ہوا کہ یونائٹیڈ اسٹیٹس نے قیامِ امن کے لیے نیا قدم اٹھایا اور ایک بین الاقوامی کانفرنس کی تجویز کی جو مسئلہ فلسطین کا جامع حل ڈھونڈے اور جس کی توجہ ''فلسطینیوں کی خودمختاری کے بجائے ان کی خودحکمرانی پر مرکوز ہو'' (10) دسمبر 1988 میں فلسطینی قومی کونسل نے نئی صورت حال پر ردِعمل کا اظہار کیا اور خود کو خوداختیاری کے حقوق سے تحریک آزادی میں ڈھال لیا اور اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد 181 (تقسیم) (1947)، سلامتی کونسل کی قرارداد 242 (1967) اور 338 (1973) کی بنیاد پر اسرائیل سے براہِ راست مذاکرات کرے گی۔

خلیجی جنگ کے دوران بین الاقوامی اور علاقائی ماحول نے اکتوبر 1991 میں کثیر جہتی میڈرڈ کانفرنس کا انعقاد کرایا۔ اس سے اسرائیل کے لیے شام، اردن اور فلسطینیوں سے دوطرفہ مذاکرات کا راستہ کھلا۔ چالیس ملکوں، اقوام متحدہ، یوروپین یونین پر مبنی پانچ علاقائی مسائل پر مذاکرات کے لیے ایک فریم ورک تیار کیا گیا۔ ایک حساس مبصر کی نظر میں یہ سفارتی سلسلہ جنوبی عربوں کی جانب سے شکست کو آخری بار تسلیم کرنا تھا۔ (11) واشنگٹن میں منعقد اسرائیل اور فلسطینیوں کے مذاکرات بے نتیجہ رہے اور دونوں فریقوں کو کوئی اور راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرنی ہوگی اور 'بجائے کسی ثالث کے آسانیاں پیدا کرنے والا ڈھونڈنا چاہیے' (12) ناروے نے امداد کی پیش کش کی اور اوسلو میں کامیابی کے ساتھ خفیہ مذاکرات ہوئے۔ 13 ستمبر 1993 کو واشنگٹن میں وہائٹ ہاؤس کے لان پر بڑی دھوم دھام کے ساتھ ان مذاکرات کے نتائج کا اعلان کیا گیا جس میں عبوری خودمختارانہ حکومت کے انتظامات کے اصولوں کے اعلان کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کے دستاویزات کا تبادلہ بھی شامل تھا۔ ڈکلریشن میں یہ بات واضح تھی کہ خودمختارانہ حکومت کے

میں شامل تھے۔(18) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت محتاط طریقہ سے نامنظوریوں کے لیے زمین ہموار کی جارہی تھی!

'حتمی حیثیت' پر گفتگو کی تکمیل کی متوقع تاریخ آ گئی لیکن اس وقت تک مذاکرات کی ابتدا بھی نہیں ہوئی۔ اسرائیل میں ایک اور الیکشن ہوا اور ایہود باراک کی قیادت میں لیبر پارٹی کی اقتدار پر واپسی نے مذاکرات کو دوبارہ شروع کرنے کا ایک اور موقعہ فراہم کیا۔ لیکن نئے اسرائیلی قائد نے شام کے مسئلہ کو اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھا لہٰذا فلسطینیوں کے ساتھ بات چیت مارچ 2000 میں رکھی گئی جب کلنٹن اور اسد چوٹی کانفرنس ناکام ہوگئی۔ اس مرحلہ پر اسرائیل کی اس رائے کو کہ پوری تیز رفتاری کے ساتھ چند ہی مہینوں میں تمام مسائل کے 'قطعی معاہدہ' پر پہنچا جائے کو عرفات نے گہرے شبہہ کی نظر سے دیکھا اور اس کو ایک 'جال' سے تعبیر کیا۔ عرفات نے اوسلو معاہدہ کے موجودہ نہ پورے ہونے والے وعدوں خصوصاً وائی ریور میمورنڈم' کی جانب توجہ دلائی۔ نتیجہ کے طور پر فلسطینیوں کی ایک کثیر تعداد میں یہ تاثر تھا کہ ''معاہدہ (اوسلو) کے چھ سال بعد اب یہودی بستیوں کی تعداد زیادہ ہے' نقل و حمل کی آزادی میں کمی ہے اور معاشی حالت پہلے سے بدتر ہے''۔ ان سب کے باوجود صدر کلنٹن کو جولائی 2000 میں کیمپ ڈیوڈ میں چوٹی کی سطح کی کانفرنس منعقد کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

مذاکرات میں شریک اسرائیلی، فلسطینی اور امریکی شرکا کی گفتگو کا نقش اولین دستیاب ہے لہٰذا یہ بہت حد تک ممکن ہے کہ مذاکرات کی ایک اصل تصویر اور ان کی حدود سامنے آسکیں(19)۔ فلسطینی محتاط تھے اور بغیر مناسب تیاریوں کے محدود اوقات میں گفتگو نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کو خطرہ تھا کہ وہ ان اصولوں کے ساتھ رہ جائیں گے جو اتنے مفصل تھے کہ کسی بھی بین الاقوامی قرارداد کی جگہ لے سکتے تھے لیکن اس کے باوجود اتنے مبہم تھے کہ کوئی معاہدہ نہیں بنا سکتے تھے'۔ لہٰذا انھوں نے سلامتی کونسل کی قرارداد 242 اور 338 کے زیادہ محفوظ سائے میں پناہ ڈھونڈی۔ ایہود باراک جو اسرائیلی شرائط پر معاہدہ کے لیے بے تاب تھے اور چاہتے تھے کہ عرفات کو ان کی ہٹ دھرمی کا سبق سکھائیں، تین

اصولوں کے زیر اثر تھے۔' اول تو اوسلو قسم کے درجہ بدرجہ معاہدوں سے فطری بیزاری، دوسرے یہ یقین کہ فلسطینی قیادت سمجھوتہ پر اسی وقت راضی ہوگی جب ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں رہے گا اور آخر میں یہ اندازہ کہ اسرائیلی عوام کا ردِّعمل بہتر ہوگا اگر تمام مراعات و مفادات کو ایک ساتھ ایک جامع پیکیج میں ریفرنڈم کے لیے پیش کیا جائے۔ امریکن باراک کو ایک 'خصوصی دوست سمجھتے تھے۔ اسرائیلی وزیراعظم نے انھیں متنبہ کیا کہ بغیر چوٹی کی کانفرنس کے 'اس کی حکومت (کم سے کم موجودہ شکل میں) گر جائے گی' انھوں نے اس کے تدبیرانہ اندازوں پر سوال اٹھائے لیکن یا تو جھک گئے یا دستبردار ہو گئے اور چار و ناچار ایہود باراک کے طریقہ کار سے اتفاق کرلیا کیونکہ جن چیزوں کے لیے وہ کام کرر ہے تھے وہ زیادہ عزیز تھیں۔ کلنٹن نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک بڑے بین الاقوامی مسئلہ کو سلجھانے کا آخری موقعہ تھا' ایک ایسا مسئلہ جس میں ذاتی طور سے انھوں نے اپنا کافی وقت اور توجہ صرف کی ہے۔

''اسرائیلی فیاضانہ پیشکش'' کے بارے میں کافی کچھ کہا گیا ہے۔ کیا کوئی ایسی پیشکش تھی؟ کیا وہ فیاضانہ تھی؟ کیا اس کو مسترد کرنے میں فلسطینیوں نے کوتاہ اندیشی سے کام لیا؟ اس بارے میں رابرٹ میلے جو عرب اسرائیلی معاملات میں صدر کے خصوصی معاون اور مذاکرات میں شریک تھے کے بیان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے: ''حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل نے ایسی کوئی پیش کش نہیں کی، بلکہ اس کے بجائے 'نظریوں کا ایک رواں ہدف، دونوں فریقوں کے سامنے یو ایس کیا شرائط رکھے گا کا لچکدار تاثر، ایک مائل بہ ترقی عمل جس نے دونوں فریقوں کے دباؤ اور اصرار پر ردِّعمل کیا (لہٰذا غیر محفوظ تھا)۔ عرفات سے کہا گیا کہ وہ ان کو مذاکرات کی عام بنیاد کی طرح قبول کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مشوروں کو دیتے ہوئے (لیکن بغیر کوئی ذمہ داری لیے) باراک اس سے پہلے کی تمام سودے بازیوں سے آگے جارہے تھے خصوصاً بیلن ایتان معاہدہ سے۔ فلسطینیوں کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ یہ سلامتی کونسل کے قراردادوں کے ہم پلّہ نہیں ہیں۔ اور 13 ستمبر 1993 کے ڈی او پی کی دفعہ 1 کی شرائط کی رو سے اسرائیل جن کو ماننے کا ذمہ دار تھا۔

کیمپ ڈیوڈ کی ناکامی کے باوجود کلنٹن نے ہمت نہیں ہاری۔ شاید ایک نئے انتفاضہ کی شروعات نے تیزرفتاری کی جانب فوری توجہ دلائی(20)۔ 17راکتوبر 2000 میں شرم الشیخ میں یو ایس اور مصری چوٹی کانفرنس میں یہ طے پایا کہ سابق یو ایس سینیٹ اکثریتی لیڈر جارج مچل کی قیادت میں ایک اعلیٰ سطح کی حقائق کی جستجو (فیکٹ فائنڈنگ) کمیٹی قائم کی جائے۔ اپنی مدت کے ختم ہونے سے کچھ دن قبل کلنٹن نے زبانی طور سے فریقین کو قریب آنے کے کچھ مشورے دیے جو جولائی کے مشوروں سے بہتر تھے(21)۔ کلنٹن نے 7رجنوری 2001 میں نیویارک کی ایک تقریر میں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''میں نے وہ حدود سامنے رکھیں جن کے متعلق میں چاہتا تھا کہ وہ ایک جامع تصفیہ کی جانب رہنمائی کرسکیں (باراک اور عرفات دونوں نے) اس کو مزید کوشش کی بنیاد بنانا تسلیم کرلیا ہے۔ دونوں ہی نے کچھ تحفظات رکھے ہیں'' اس کے نتیجہ میں اسرائیلی اور فلسطینی نمائندوں کے درمیان براہ راست مذاکرات مصر کے شہر طابہ میں 21 سے 27 جنوری منعقد ہوئے۔ بہرحال اسرائیلی وزیراعظم نے ان کوختم کردیا کیونکہ فروری کے پہلے ہفتہ میں اسرائیل میں نئے عام انتخابات ہونے جارہے تھے۔ اجلاس کے بعد مشترکہ اعلانیہ کے الفاظ خاصی اہمیت کے حامل ہیں: ''فریقین اعلان کرتے ہیں کہ اس سے پہلے وہ کبھی کسی معاہدہ کے اتنے نزدیک نہیں پہنچے ہیں لہٰذا یہ ہمارا مشترکہ یقین ہے کہ دیگر فاصلوں کو بھی پاٹا جاسکتا ہے (جب الیکشن کے بعد مذاکرات دوبارہ شروع ہوں گے)۔ ہم طابہ سے امید اور باہمی کامیابی کے ساتھ رخصت ہورہے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ باہمی اعتماد کی بنیادیں دوبارہ قائم ہوچکی ہیں اور تمام اہم مسائل پر ٹھوس پیش قدمی ہوئی ہے''۔ اس بیان میں اس حمایت اور حوصلہ افزائی کے لیے جس کا مظاہرہ یوروپین یونین نے مذاکرات کے سلسلہ میں کیا اس کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا گیا۔ یوروپین یونین کے نمائندہ ایمبیسڈر موراٹینوز نے ایک تفصیلی نان پیپر مرتب کیا جس میں مختلف مسائل پر فریقین کا موقف واضح کیا(22)۔ اس سلسلہ میں یوروپین یونین کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صورت حال درجہ بدرجہ آگے بڑھی۔ اس ارتقا کا پہلا مرحلہ 1991 میں میڈرڈ کانفرنس پر ختم ہوتا ہے جہاں پہلی بار دوطرفہ اور کثیر جہتی راستے کھلے۔ اس طریقہ عمل کی تحریک صدر جارج بش نے کی۔ انھوں نے 6/مارچ 1991 میں کانگریس کے ایک اجلاس میں کہا کہ ''اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان اور اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان فاصلے ختم کرنے کے لیے سفارتکاری سے بہتر متبادل نہیں ہوسکتا ہے۔'' میڈرڈ میں فلسطینی اردنی وفد کا حصہ تھے۔ کیونکہ اسرائیلی حکومت پی ایل او سے براہ راست معاملات کرنے پر راضی نہیں تھی: شمیر اور لکوئیڈ حکومت میں ان کے دوسرے ساتھیوں نے ایک آزاد 'فلسطینی مذاکراتی ٹیم کو مسترد کردیا کیونکہ ان کے خیال میں یہ آزاد فلسطین کی جانب پیش قدمی ہوگی اور یہ بات ان کے لیے قابل قبول نہ تھی'(23) دو سال بعد باہمی منظوری کے مکتوبات کا تبادلہ اور عوام کے سامنے مصافحہ ممکن ہوسکا۔ اوسلو، اسرائیلی قبضہ سے خوداختیاری کی ایک غیر موزوں شکل جو کہ پانچ سال کی مدت میں نافذ ہوگی اور آخر میں تمام مسائل پر حتمی حیثیت کے لیے مذاکرات پر منتج ہوگی، کے لیے ایک وسیع تر فریم ورک تھا۔ میڈرڈ سے پہلے اور اس کے بعد اسرائیلی کوششیں یہی تھیں کہ مغربی کنارہ پر زیادہ بستیوں کو بسا کر زمینی حقیقتوں کو بدل دیا جائے۔

ایک ارتقائی صورت حال میں فریقین کی پوزیشن کا اندازہ لگانے کے لیے، بین الاقوامی قانونی جواز کے حوالہ سے سلامتی کونسل کی قرارداد 242 اور 338 ہی بنیاد ہوں گے۔ لیکن ان کے جواز کو جزوی طور ہی سے 13 ستمبر 1993 کے ڈی او پی کی دفعہ 1 میں نافذ کیا گیا۔ یہ دفعہ ایک پیراگراف میں مستقل تصفیہ کے لیے دونوں قراردادوں کو بنیاد بتاتی ہے اور ایک دوسرے پیراگراف میں جو مستقل حیثیت سے متعلقہ مذاکرات پر ہے مذکورہ قرارداد کے نفاذ کی جانب لے جاتی ہے۔ آخرالذکر الفاظ قاہرہ معاہدہ کی تمہید میں دہرائے گئے۔ یہ اور اس کے ساتھ ساتھ قرارداد 242 کے زبردست ابہام (انگریزی ورژن میں حتمی شق کا غائب ہونا اور فرانسیسی ورژن میں اس کا موجود ہونا) نے مقبوضہ علاقوں سے نکلنے پر اسرائیل کو گفتگو کے لیے کافی ڈھیل دی۔

بنیادی مسائل یعنی علاقہ' یروشلم' پناہ گزین اور سلامتی پر جو مذاکرات (جنوری 2001 تک) ہوئے ہیں ان سے دونوں فریقوں کے مقاصد اور طریقہ کار پر روشنی پڑتی ہے۔

ا۔ علاقہ: سرحدوں کے بارے میں فلسطینی مطالبہ ہے کہ 4/جون 1967 کی طرح ہونا چاہیے۔ جو کہ ان کے خیال میں قرارداد 242 اور 338 سے ہم آہنگ تھا۔ اسرائیلی موقف حزب اقتدار اور صاحب اقتدار کے اعتبار سے بدلتا رہا۔ 1967 میں ڈیوڈ بن گوریون تمام اسرائیلی مقبوضہ علاقوں سے فوری اور یکطرفہ انخلا کی رائے دینے والے تنہا فرد تھے۔ 1968 کے ایلون پلان کی تجویز (لیکن بغیر اسرائیلی کابینہ کی منظوری کے (24)) تھی کہ دریائے اردن کی وادی کو سیکورٹی زون کی طرح قبضہ میں رکھا جائے۔ اوسلو کے بعد والے وقفہ میں شیرون پلان اس مقصد کے لیے آیا کہ فلسطینی ریاست کی تشکیل نہ ہو سکے۔ اس میں مغربی کنارے کے 50% علاقہ کو ضم کرنے کی تجویز تھی۔ نیتن یاہو کا ایلون پلس پلان (مئی 1977) ایک قدم اور آگے گیا اور اس میں مغربی کنارہ کے علاقہ کو ضم کرنے کی تجویز رکھی۔ (25) 1996 کے بیلن ایتان معاہدہ (اسرائیلی پارلیمنٹ کی تمام سیاسی پارٹیوں کی متفقہ رائے کا آئینہ دار) نے 1967 کی سرحدوں پر واپس جانے کو خارج از امکان قرار دیا اور مغربی کنارہ کی بستیوں پر اسرائیلی اقتدار اور زمینی رابطہ پر زور دیا۔ ایک خصوصی سیکورٹی زون یا وادی اردن پر اقتدار کا مطالبہ کیا۔ جولائی 2000 کی کیمپ ڈیوڈ میٹنگ میں یو ایس کی تجویز (اسرائیلی رضامندی کے ساتھ) جیسا کہ اس کو فلسطینی وفد نے سمجھا تھا یہ تھی کہ اسرائیل وادی اردن اور بحر مردار کی سرحدوں کا 15 سے 20 فیصد اور مغربی کنارہ کا 10.5 فیصد علاقہ اپنے پاس رکھے گا۔ باراک کے مطابق: 'سو فیصد غزہ پٹی اور مغربی کنارہ کا 92 فیصد علاقہ پر غیر فوجی فلسطینی ریاست ہوگی۔ اس میں 1967 سے قبل والے اسرائیلی علاقہ میں سے فلسطینیوں کو کچھ زمینی مراعات دی جائیں گی'

زیادہ تر بستیوں کو منہدم کردیا جائے گا اور بسنے والوں کی اکثریت کو اسرائیل میں ضم کیے ہوئے 8 فیصد علاقے میں بسایا جائے گا'۔ دسمبر 2000 میں یہ تجویز کیا گیا کہ'94 سے 96 فیصد تک فلسطینیوں کو واپس کردیا جائے گا اور اس کے بدلے میں 1 سے 3 فیصد کے مساوی علاقہ جو اصل اسرائیل کی زمینوں میں ضم ہو چکا ہے اور ایک مستقل محفوظ زمینی راستہ'۔ اور اس واضح شرط کے ساتھ کہ کم سے کم علاقہ اور کم سے کم فلسطینی اسرائیل میں ضم کیا جائے گا اور 80 فیصد یہودی بستیوں کے رہنے والے بستیوں کے بلاک میں رہیں گے جو ایک دوسرے سے مربوط ہوں گے۔ طابہ میں فریقین نے پہلی بار، اپنے اپنے نقشے پیش کیے۔ اسرائیل نے 6 فیصد انضمام کی تجویز رکھی اور فلسطینیوں نے 3.1 فیصد زمین کی ادلا بدلی پیش کی۔ دونوں پارٹیوں نے زمین کی ادلا بدلی کے اصول کو تسلیم کیا لیکن ادلا بدلی کا توازن بحث کا موضوع بنا رہا۔ فلسطینیوں کا اصرار تھا کہ ادلا بدلی رقبہ اور قدر و قیمت میں مساوی ہو اور فلسطینی سرحدوں سے ملحق ہو اور ان ہی گردونواح میں ہو جو اسرائیل نے ضم کیے ہیں۔ اسرائیل نے 2 فیصد اراضی کو پٹے پر حاصل کرنے کا بھی مطالبہ کیا جس پر فلسطینیوں کا ردعمل یہ تھا کہ اس پر فلسطینی ریاست کے قیام اور تمام زیر بحث علاقہ فلسطینی اقتدار میں آجانے کے بعد غور کیا جاسکتا ہے۔ فریقین نے اس پر اتفاق کیا کہ مغربی کنارہ اور غزہ پٹی کے درمیان زمینی رابطہ ہونا چاہیے لیکن اس زمینی رابطہ پر اقتدار اور کنٹرول پر اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ اس مفروضہ سے کسی نے اختلاف نہیں کیا کہ غزہ پٹی مکمل طور سے فلسطینیوں کے زیر اقتدار رہے گی۔

2۔ یروشلم: 1967 کی جنگ میں اسرائیل نے شہر کے اردنی سیکٹر پر قبضہ کرلیا اور بالآخر شہر کی میونسپل حدود کو قابل ذکر حد تک بڑھا کر اس کو رسمی طور سے ضم کرلیا (26) فلسطینی اس قبضہ اور انضمام کو غیر قانونی گردانتے تھے لہٰذا وہ سلامتی کونسل کی قرارداد 242 اور 338 کی رو سے اس کو خالی کرانا چاہتے تھے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس

نے نہ ہی انضمام کو قبول کیا اور نہ ہی اس کی منظوری دی (27)۔ اوسلو معاہدہ سے قبل ہونے والے مذاکرات میں عرفات نے یروشلم کے مسئلہ کو 'حتمی حیثیت' پر مذاکرات تک کے لیے موخر کر دیا تھا (28)۔ بیلن ایتان معاہدہ میں ایک سخت موقف اختیار کیا گیا اور یروشلم کو اسرائیل کی راجدھانی اور اسرائیلی اقتدار کے تحت ایک متحدہ شہر قرار دیا گیا۔ جہاں مسلم اور عیسائی مقدس مقامات کو خصوصی حیثیت دی جائے گی۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ میں اسرائیل نے تجویز رکھی کہ یروشلم کے مسئلہ کو کئی مرحلوں میں غور کیا جائے۔ اور ہر مرحلہ کی الگ قانونی حیثیت ہو اور فصیل بند شہر میں شرم الشیخ کی نگرانی فلسطینیوں کو سونپ دی جائے لیکن اسرائیل کے اقتدار کے تحت جو کہ فصیل بند شہر کے دیگر مقامات پر بھی کنٹرول رکھے گا سوائے مسلم آبادی میں فلسطینی صدارتی کمپلیکس کے۔ فصیل بند شہر سے باہر کچھ علاقوں کو فلسطین اور کچھ علاقوں کو اسرائیلی کنٹرول میں رکھنے کی سفارش کی گئی۔ دسمبر 2000 میں کلنٹن نے یہ اصول پیش کیا کہ 'عرب علاقے فلسطینی ہیں اور یہودی علاقے اسرائیلی ہیں'۔ مزید یہ کہ فلسطینیوں کا شرم پر اور اسرائیلیوں کا مغربی دیوار پر کنٹرول ہونا چاہیے اور شرم کے نیچے اور مغربی دیوار کے پیچھے کھدائی کے مسئلہ پر مشترکہ کنٹرول ہو۔ طابہ مذاکرات میں دونوں فریق نے کلنٹن کے دسمبر 2000 فارمولے پر کافی حد تک اتفاق کیا۔ اسرائیل نے قبول کرلیا کہ یروشلم دونوں ریاستوں کی راجدھانی ہوگا۔ دونوں فریق اس پر بھی متفق تھے کہ یروشلم ایک کھلا ہوا شہر ہوگا۔ اگرچہ دونوں فریق کلنٹن کے نظریہ کو قبول کرنے کے کافی نزدیک آگئے تھے لیکن شرم الشیخ / ہیکل ماؤنٹ پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا'

3۔ پناہ گزین: تمام مسائل میں یہی مسئلہ سب سے پیچیدہ تھا اور اب تک ہے۔ اس کی تاریخ 1948 سے شروع ہوتی ہے۔ یو این آر ڈبلیو اے (اقوام متحدہ کا پناہ گزینوں کی بہبود کا ادارہ) نے 1948 کے موسم میں 3.5 ملین پناہ گزین رجسٹر کیے تھے اور 1967 کی جنگ کے بعد پناہ گزینوں کی تعداد 400,000 سے

500,000 تک ہوگئی۔ اس میں سے 1.2 ملین پناہ گزین کیمپ میں رہ رہے ہیں۔ پناہ گزینوں کے مسئلہ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد 194 اور سلامتی کونسل کی قرارداد 242 میں تسلیم کیا گیا۔ مؤخرالذکر نے ''پناہ گزینوں کے مسئلہ کے منصفانہ حل'' کا مطالبہ کیا۔ اسی سے پیوستہ فلسطینیوں کی مانگ ہے کہ اس مسئلہ کی تخلیق میں اسرائیل کے کردار کو تسلیم کیا جائے، فلسطینیوں کی واپسی کے حق کو تسلیم کیا جائے' ان کو معاوضہ دیا جائے اور آبادکاری میں ان کی مدد کی جائے۔ ابتدائی اسرائیلی ردعمل کو بیلن ایتان معاہدہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں اسرائیل میں ان کی واپسی کے حق کو مسترد کر دیا گیا لیکن اصولی طور پر ان کے فلسطینی ریاست میں واپسی پر اتفاق کیا جو 'حتمی حیثیت' پر مذاکرات اور اسرائیل کے تحفظ سے مشروط ہوگا اور ایک بین الاقوامی تنظیم کے قیام کا مطالبہ کیا جس میں معاوضہ اور باز آبادکاری کے پروجیکٹس میں اسرائیل 'اہم رول' ادا کرے گا۔ کیمپ ڈیوڈ میں اسی موقف کو پھر دوہرایا گیا بلکہ اس نکتہ کا بھی اضافہ کیا گیا کہ مجوزہ بین الاقوامی تنظیم ان یہودیوں کو بھی معاوضہ دینے کی ذمہ دار ہو جو عرب ممالک سے ہجرت کر کے اسرائیل آئے ہیں۔ فلسطینی وفد کا خیال تھا کہ چوٹی کانفرنس میں رفیوجی کمیٹی کا کام سب سے بڑی ناکامی تھی۔ کلنٹن تجاویز نے بہرحال بات آگے بڑھائی۔ ''میرا یقین ہے کہ اسرائیل 1948 کی جنگ کے نتیجہ میں فلسطینی عوام کو پیش آنے والے اخلاقی اور مادّی مصائب کو تسلیم کرنے اور پناہ گزینوں کے مسئلہ کو حل کرنے میں بین الاقوامی کمیونٹی کی مدد کی ضرورت کے لیے تیار ہے''۔ لوٹنے کے حق کے نفاذ میں درپیش عملی مشکلات کو سامنے لاتے ہوئے اس کے بجائے انھوں نے ایسا حل تجویز کیا جو فلسطینیوں کے منظورشدہ دو ریاستی اصول سے ہم آہنگ ہو اور جس کے تحت رہنما اصول یہ ہے کہ لوٹنے والے فلسطینیوں کا مرکز فلسطینی ریاست ہوگی لیکن اس کی بھی گنجائش ہے کہ کچھ پناہ گزینوں کو اسرائیل بھی قبول کرے گا۔' اس کے علاوہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی ذمہ داری

ہوگی کہ وہ امداد کی ایک بین الاقوامی مہم کی قیادت کرے گا۔ طابہ میں فریقین نے اس موضوع پر نان پیپرز کا تبادلہ کیا۔ یہ اس بات کی عکاسی کرتے تھے کہ قرارداد 242 کی روشنی میں کیا ہوا منصفانہ حل اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد 194 کے نفاذ کے لیے راہ ہموار کرے گا'۔ انھوں نے پناہ گزینوں کے متعلق معاہدہ کے نفاذ کے طریقہ کار پر بھی بحث کی اور فلسطینی پناہ گزینوں کے اہلیہ کے بارے میں ایک مشترک بیان کی ضرورت کو بھی زیرغور لائے۔

4۔ سلامتی: 1967 کی جنگ نے اسرائیل کو اپنی سلامتی کے بارے میں بہتر صورت حال فراہم کی اور تب سے کوشش یہی ہے کہ اس کو برقرار رکھا جائے۔ یہ بات 1968 کے ایلون پلان سے ظاہر ہوتی ہے خاص طور سے دریائے اردن کو حفاظتی حد قرار دینے سے۔ بیلن ایتان معاہدہ نے اس کو برقرار رکھتے ہوئے ایک غیر فوجی فلسطینی وجود کا تصور پیش کیا اور یہ کہ اگر وہ 'وجود' کسی تیسری پارٹی سے کوئی فوجی یا حفاظتی امور میں ملوث ہوتا ہے تو اس پر اسرائیل کا مکمل کنٹرول رہے گا۔ کیمپ ڈیوڈ میں وادی اردن میں اسرائیلی موجودگی کو بارہ سال تک محدود کردیا گیا تھا لیکن اس مانگ کے ساتھ کہ مغربی کنارہ میں اس کو چھ فوجی اڈے اور تین نگرانی کی چوکیاں دی جائیں گی اور ساتھ ہی بین الاقوامی کراسنگ پر بھی اس کی موجودگی رہے گی۔ اسرائیل نے مغربی کنارہ پر فضائی اور الیکٹرومیگنیٹنگ علاقہ پر کنٹرول کا بھی مطالبہ کیا۔ فلسطینی وفد نے ان میں سے ہر ایک کی مخالفت کی اور اس کے بجائے سرحدوں پر بین الاقوامی اور کثیرالاقوامی فوج کی تجویز پیش کی۔ دسمبر 2000 کی کلنٹن تجاویز نے ایک غیر فوجی ریاست کا تصور پیش کیا تھا اور سرحدوں پر بین الاقوامی موجودگی جو صرف باہمی رضامندی ہی سے ختم کی جاسکتی تھی۔ بقیہ مقبوضہ علاقوں سے اسرائیلی فوج 36 مہینوں میں واپس چلی جائے گی اور بین الاقوامی فوج ساتھ ساتھ اس کی جگہ لیتی جائے گی۔ اس کے علاوہ 36 مہینوں تک بین الاقوامی فوج کے تحت اسرائیل چھ مقامات پر اپنی موجودگی برقرار

رکھے گا۔ اس فوج کی موجودگی کو محدود کیا جاسکتا ہے اگر علاقائی حالات سے اسرائیلی سلامتی کو خطرہ کم ہوجائے۔ طابہ میں فلسطینیوں نے اس پر بھی رضامندی ظاہر کردی کہ ان کو "محدود اسلحہ والی ریاست" کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مغربی کنارہ سے انخلا کے لیے اٹھارہ مہینے اور وادی اردن سے انخلا کے لیے دس اضافی مہینوں کی تجویز پیش کی۔ تین وارننگ اسٹیشن کی اسرائیلی درخواست کو منظور کیا گیا۔ فضائی کنٹرول کی بابت فریقین اس بات پر راضی ہوئے کہ فلسطینی فضا پر فلسطینی ریاست کا کنٹرول رہے گا۔

فروری 2001 کے الیکشن اور اریئل شیرون کے وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر متمکن ہونے سے اسرائیلی مذاکرات کی حکمت عملی یکسر تبدیل ہوگئی۔ حزب اختلاف کے قائد کی حیثیت سے شیرون ہمیشہ اوسلو معاہدہ کی ناکامی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ انتفاضہ کے جاری رہنے، اور فلسطینی خودکش بامبنگ کے بھیانک اثرات نے ایک انتقامی پالیسی کو جنم دیا جوخود اسرائیلی قبضہ کاروں کے معیار کے لحاظ سے بھی کافی سخت تھی۔ اس درمیان میں فلسطینی دہشت گردانہ حملے نہ روکنے پر ذاتی طور سے یاسرعرفات کی اور فلسطینی اتھارٹی کی غیر دلچسپی اور نااہلی پر بہت کچھ کہا گیا (29)۔ اپریل 2001 میں امریکی صدر نے ستمبر 2000 کے بعد مغربی کنارہ پر قبضہ کی ہوئی پوزیشنوں سے اسرائیلی افواج کے فوری انخلا کا مطالبہ کیا۔ شیرون نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ مئی 2001 میں مچل رپورٹ نے یہودی بستیوں کی تعمیر کے روکنے کی سفارش کی تاکہ تشدد ختم ہو، اعتماد سازی کی فضا قائم ہو اور مذاکرات کو آگے بڑھایا جائے (30)۔ اسرائیل نے اس کو بھی نظرانداز کردیا۔ اور سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینٹ کے 13 جون 2001 کے اس پلان پر بھی کوئی عملی قدم نہیں لیا جس میں مچل رپورٹ کی سفارش کردہ سلامتی انتظامات کی توثیق کی گئی تھی اور جامع باہمی جنگ بندی اور یو ایس کی شرکت کے ساتھ مشترکہ سلامتی کی میٹنگ کے دوبارہ اجرا کی تجویز رکھی گئی تھی (31) گیارہ ستمبر میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ سے صرف دو ہفتہ قبل اگست کے مہینے میں سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ نے صدر بش سے اصرار کیا تھا کہ وہ مسئلہ کے مساویانہ حل کے لیے

کوشش کریں۔ کچھ ہی دنوں میں امریکی صدر کی جانب سے ردعمل کا اظہار ہوا جس کو سعودیوں نے اطمینان بخش قرار دیا اور اس کی نقول تمام عرب قائدین بشمول یاسر عرفات کو ارسال کردیں (32)۔

اس سکون کی مدت بہت کم تھی۔ گیارہ ستمبر کے بعد یونائٹیڈ اسٹیٹس کی ترجیحات اور نظریات میں زبردست تبدیلی آئی اور 24 جون 2002 کی ایک تقریر جس میں مرکزی موضوع مشرق وسطی تھا (33) صدر بش نے امن عمل جاری رکھنے کے لیے شرائط کا اضافہ کیا: ''امن کا عمل ایک نئی اور مختلف فلسطینی قیادت کا متقاضی ہے تاکہ ایک فلسطینی ریاست وجود میں آسکے۔ میں فلسطینی عوام سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ نئے قائدین کا انتخاب کریں، ایسے قائدین جو دہشت گردی سے سمجھوتہ نہ کرتے ہوں''۔ اس تقریر میں حکومت کی تبدیلی کا اشارہ کافی واضح تھا۔ اس تقریر نے 28 مارچ 2002 کے عرب لیگ کے اعلانیہ (جو سعودی پلان پر مبنی تھا) کو نظرانداز کردیا اور نہ ہی یہ تقریر 12 جون 2002 کے اس فلسطینی نان پیپر کو خاطر میں لائی جس میں پہلی بار تحریری طور پر طابہ مذاکرات میں فلسطینی موقف کو قلمبند کیا گیا تھا (34) اس کے باوجود یوروپین یونین اور کچھ عرب ریاستوں نے اس میں مثبت پہلو ڈھونڈ نکالے۔ اس تقریر کو یوروپین یونین، روس اور اقوام متحدہ نے 15 جولائی کے ایک بیان میں خوش آمدید کہا۔ 17 ستمبر کو یونائٹیڈ اسٹیٹس کی نیشنل سیکورٹی اسٹریٹجی نے جون کی تقریر کی روشنی میں اپنی مشرق وسطی کی پالیسی کو دوہرایا: ''اگر فلسطینی جمہوریت اختیار کرتے ہیں، قانون کی بالادستی کو اپناتے ہیں، بدعنوانیوں سے مزاحم ہوتے ہیں اور مستحکم طور پر دہشت گردی کو مسترد کرتے ہیں تو وہ ایک فلسطینی ریاست کی تخلیق کے لیے امریکی حمایت پر بھروسہ کرسکتے ہیں'' (35)۔

17 ستمبر ہی کو نیویارک کے ایک اعلان سے معلوم ہوا کہ ایک نئے منصوبہ کے لیے تیاریاں کی جارہی ہیں۔ کوارٹیٹ پلان جس کو یو ایس، یوروپین یونین، روس اور اقوام متحدہ نے تیار کیا تھا دسمبر میں منظرعام پر آگیا۔ اس نے تین مرحلوں میں سیاسی تصفیہ کے لیے ایک روڈ میپ (جو مچل اور ٹینٹ منصوبوں کے نقوش پر مبنی تھا) کی سفارش کی جو 2002 سے

شروع ہوکر 2005 پر ختم ہوتا ہو۔ اسرائیل نے کھلے طور پر بش کی تقریر کے اصولوں کو مان لیا اور ساتھ ہی کوارٹیسٹ پلان کو بھی لیکن وہ یونائیٹڈ اسٹیٹس حکومت سے اس کی تفصیل کی اشاعت کو ملتوی کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے فلسطینی اتھارٹی کی مرحلہ وار جنگ بندی پر گفتگو کی درخواست کو بھی ٹھکرا دیا کہ گفتگو اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب تشدد ختم ہوجائے (36)۔ ایک علاحدہ کوشش میں اسرائیل نے روڈ میپ کے خاکے کے تحفظ کے لیے سو سے زیادہ تبدیلیوں کی تجویز کی لیکن اس کے نفاذ کے ٹائم ٹیبل کو مٹا دیا اور فلسطینی اقتدار اور اصلاحات سے متعلق مسائل پر بہت سخت مطالبات پیش کیے۔ اس نے مجوزہ فلسطینی ریاست کی 'آزاد نوعیت کی وضاحت چاہی اور یہودی بستیوں کی کارروائیوں کے معطل کرنے کے خیال پر سوال اٹھائے (37)۔

سال کے دوسرے حصے کے واقعات نے یوایس کے نظریات کو مزید قوت بخشی۔ کیونکہ اب عراق مرکزی نقطہ بنتا جارہا تھا لہٰذا ایک یہ رائے بنتی جارہی تھی کہ فلسطین کے مسئلہ کو کچھ اور وقت کے لیے پس پشت ڈال دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ مشرق وسطیٰ میں پھیلی ہوئی انتہا پسندی اور دہشت گردی کا حل وسیع تر اور زیادہ مداخلت کار افواج کی زمین پر موجودگی میں ہے۔ تاکہ وہ دہشت گردی کے سوتوں سے مقابلہ کرے اور عرب دنیا میں جمہوریت اور اسرائیل کی بقا کے آپس میں جڑے ہوئے اسباب کو فروغ دے۔ (38) اس طرح سے علاقہ میں موجودہ تمام مسائل اور فلسطینی مسئلہ۔ اتنے طویل عرصہ تک اس کی مرکزیت سے انکار کرنے کے بعد۔ کو ایک دوسرے سے جوڑا اور اصل مسئلہ کا حل دیگر مسائل کے حل پر منحصر کیا گیا! یہ بات کہ یہ طرز عمل سرکاری سوچ کا آئینہ دار تھا اس وقت ثابت ہوگئی جب عراق پر حملہ کے وقت ایک رجحان میں تبدیلی کے زیر اثر صدر بش اپنی 24 جون کی تقریر کی روشنی میں مشرق وسطیٰ میں امن کے تصور پر بولے، روڈ میپ کی تفصیلات کے ظہور کو نئے فلسطینی وزیر اعظم کے تقرر سے جوڑا اور یہ کہتے ہوئے کہ ''فلسطینی ریاست بلاشبہ اصلاح شدہ، پرامن اور جمہوری ریاست ہونی چاہیے جو دہشت گردی کے استعمال کو ہمیشہ کے لیے ترک کردے، یہ محسوس کیا کہ ''وقت آگیا ہے کہ محفوظ کیمپ گاہوں

سے باہر نکلا جائے'' اور روڈ میپ کے نفاذ کو اپنی ذاتی اور امریکا کی ذمہ داری قرار دیا(39)۔ اسرائیل میں پہلا ردعمل اطمینان کا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ اس میں عرفات کو حاشیہ پر رکھا گیا تھا اور حتمی مذاکرات فلسطینی اصلاحات سے مشروط تھے(40) دوسری جانب فلسطینیوں کو مایوسی ہوئی تھی۔''ہم اس راستہ پر پہلے بھی چل چکے ہیں۔ اس تجویز میں نہ مکمل انخلا کا کوئی وعدہ ہے اور نہ ہی یہ پناہ گزینوں کے المیہ کا منصفانہ حل کا تذکرہ کرتا ہے۔''ایک ایسا روڈ میپ جو منزل کی نشاندہی نہ کرتا ہو سرے سے روڈ میپ کہلانے ہی کا مستحق نہیں ہے''(41)۔ مجوزہ تبدیلیوں کے متعلق ابتدائی امریکی ردعمل یہ تھا کہ انھیں مسترد کردیا جائے۔ قومی سلامتی کی مشیر کنڈولیزا رائس اور سکریٹری آف اسٹیٹ کولن پاول نے طاقتور امریکن اسرائیلی پبلک افیئرز کمیٹی (اے آئی پی اے سی) کو عراق میں جنگ چھڑ جانے کے بعد بتایا کہ روڈ میپ کا نفاذ ضروری ہے اور''اس پر کوئی گفت وشنید نہ ہوگی''۔(42)

ابا ایباں نے لکھا ہے کہ'' دانشمندی اوہام کی موت سے پیدا ہوتی ہے اور افراد اور اقوام اسی وقت عقلمندی سے کام لیتے ہیں جب اور دروازے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ عمل کئی مراحل میں تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اسرائیلی فلسطینی مذاکرات سے کم سے کم یہ سبق تو ضرور ملتا ہے۔'' اپنے قیام کے ابتدائی سالوں میں گفتگو کی اسرائیلی خواہش کو عربوں نے ٹھکرا دیا تھا جو فلسطین کے نقصان پر غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ عربوں کی فارورڈ پالیسی کو 1967 میں شرمناک شکست ہوئی۔ نتیجہ میں ہونے والے مشاہدہ نفس نے حقیقت کی ایک خوراک پلائی۔ 1973 کی جنگ، جس کا منصوبہ انور سادات نے بڑی جانفشانی سے تیار کیا تھا، نے اسرائیل کی ناقابل تسخیریت اور عربوں کی نامردی کا مفروضہ ختم کردیا اور اپنا بنیادی مقصد حاصل کرلیا اور یوں مذاکرات کے تعطل کی نفسیاتی بنیاد ہی کو مکمل طور سے بدل دیا(43) تکنیکی اعتبار سے یہ بازی کامیاب ہوئی لیکن بات پھر الٹی ہوگئی جب 1979 کے مصر اور اسرائیلی معاہدہ کی وجہ سے عرب صفوں میں انتشار پیدا ہوگیا۔ اس معاہدہ کا ایک اثر یہ ہوا کہ اسرائیل شام جنگ کے امکانات ختم ہوگئے لہٰذا عربوں کے لیے فوجی حل کا راستہ بند ہوگیا۔ اس سے قبل اپنی انقلابی شناخت کی تلاش میں فلسطینیوں نے 1970-1971 میں اردن

کے اندر کافی نقصان اٹھایا تھا اور کچھ سال بعد لبنان میں۔ دوسری طرف اسرائیل کو بھی 1982 کے لبنانی حملہ میں اپنی طاقت کی حدود کا اندازہ ہوا۔ پہلے انتفاضہ کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ قبضہ جاری نہیں رہ سکتا۔ زمینی حقیقتوں نے ہی میڈرڈ اور اوسلو کے معاہدوں کو جنم دیا تھا۔ پھر ایک ابتدا کے بعد اسرائیل نے عمداً ڈھیل ڈھال شروع کردی خصوصاً اس وجہ سے کہ نئی زمینی حقیقتیں ظہور میں آرہی تھیں اور شعوری طور سے یہودی بستیوں کی شکل میں نمودار ہورہی تھیں۔ ایسا کرنے اور معاملات کو اسرائیل کے حق میں استوار کرنے کے آخری مرحلہ کے بعد اسرائیل نے کیمپ ڈیوڈ میں گفتگو کا آغاز کیا جو ہوتے ہوتے طابہ تک گئی جہاں کچھ مسائل کو طے کیا گیا اور کچھ میں اختلافات کے نکتوں کی نشاندہی کی گئی۔ ستمبر 2000 کے انتفاضہ نے اس عمل کو مزید تحریک بخشی۔ اس رائے کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس شورش کی ذمہ دار فلسطینی قیادت تھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ 1988 کے انتفاضہ کی طرح اس نے بھی ان کی مذاکراتی قوت میں اضافہ کیا۔ لیکن اس کی بہت بڑی قیمت انسانی جانوں میں چکانی پڑی۔

شیرون حکومت کے آنے کے ساتھ ہی سفارتی سرگرمیاں جو جنوری 2001 تک اپنے عروج پر تھیں سست پڑ گئیں۔ اس سے اسرائیل میں بھی فکرمندی کے آثار ظاہر ہوئے۔ انتفاضہ کے دو سالوں میں 750 اسرائیلیوں کی موت، تاریخ میں سب سے ابتر کساد بازاری اور 10.5 فیصد بے روزگاری کی شرح نے ملک کے سیاسی عمل سے بیزاری پیدا کی(44)۔ سرکاری موقف سے قطع نظر اب اس نظریہ کو حمایت حاصل ہورہی ہے کہ ایک فوری حل خود اسرائیل کے حق میں فائدہ مند ہے۔ جنوری 2003 کے الیکشن سے پہلے لیبر پارٹی کے لیڈر اسرام مترنا نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر ایک سال کے اندر اندر کسی حل پر نہیں پہنچا جاتا تو اسرائیل یکطرفہ طور سے ان علاقوں کو خالی کردے اور آزادی نافذ کرے۔ اس نے کہا کہ یہ فلسطینیوں کے ساتھ کوئی رعایت نہ ہوگی بلکہ خود اسرائیل کے حق میں بہتر ہوگا۔ ''اگر وہ خالی نہیں کرتے تو یہودی اپنے ہی ملک میں اقلیت میں آجائیں گے، کیونکہ آبادی کے ماہرین کی یہی منطق ہے(45)۔ اسی طرح سے سابق وزیر خارجہ شولوموبن ای کی دلیل ہے کہ مسلسل

عوامی بے چینی ایک ایسی صورت حال پر پہنچا سکتی ہے جہاں 'کوئی قابل اعتماد فلسطینی سیاسی قوت ہی باقی نہ رہے جس کے ساتھ امن قائم کیا جائے۔(46) اس سے قبل جولائی 2002 میں جب کورٹیٹ پلان کا مسودہ تیار ہورہا تھا تو انٹرنیشنل کرائسس گروپ برسلز نے یونائیٹڈ اسٹیٹس کی سلامتی کی شرطوں، اصلاحات کی شرطوں اور جزوی سیاسی اقدام پر مبنی طریقہ کار پر سوال اٹھائے اور اس کے بجائے یہ مشورہ دیا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی قیادت میں بین الاقوامی شرکا اسرائیل فلسطین کے دائمی تصفیہ، اسرائیل اور شام تصفیہ اور اسرائیل لبنانی امن معاہدوں پر ایک واضح، مفصل اور جامع بلیو پرنٹ ٹیبل پر رکھیں اور ان کی منظوری کے لیے زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالیں۔ یہاں پر مقصد اس منصوبے کا دونوں فریق پر تھوپنا نہیں بلکہ فریقین کو اسے اپنانے کے لیے تیار کرنا ہوگا(47) رپورٹ نے مجوزہ اقدامات کی تفصیل پیش کی اور اس کے نفاذ کے لیے ایک موثر اور طاقتور بین الاقوامی کردار کی وکالت کی۔ اس میں متبادل کے طور پر معاہدہ کے بعد والی مدت میں ایک ٹرسٹی شپ کا نمونہ تجویز کیا گیا جس میں فلسطینی جو ریاستی اقتدار پر مذاکرہ کر چکے ہیں اس بات پر رضامند ہوں گے کہ ان پر مکمل طور پر عمل ایک مخصوص مدت تک ملتوی کر دیں گے اور ان کو ایک بین الاقوامی شہری انتظامیہ کے سپرد کر دیں گے۔' اس کے لیے رپورٹ نے تین سے چار سال تک کا عرصہ تجویز کیا(48)۔

عراق پر یونائیٹڈ اسٹیٹس کے حملہ نے بالآخر اگلا اور طویل انتظار والے فلسطینی مسئلہ پر امریکی اقدام کے لیے اسٹیج تیار کر دیا۔ حملہ سے چھ ہفتے پہلے اسرائیلی دفاعی فوج کے سینئر افسران نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ 'جنگ فلسطینی قیادت میں اہم تبدیلیاں لائے گی' (49) اور یہی ہوا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور اسرائیل دونوں نے محمود عباس (ابو مازن) کے تقرر کو خوش آمدید کہا۔ 14 مارچ کو صدر بش نے زور دیا کہ 'محفوظ کمین گاہوں سے باہر آئیں اور امن کے حصول کے لیے ٹھوس قدم اٹھائیں'' اور یہ اضافہ کیا کہ ''ایک فلسطینی ریاست بلاشبہ اصلاح شدہ، پرامن اور جمہوری ریاست ہونی چاہیے جو دہشت گردی کے استعمال کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دے'۔ جب عباس کو رسمی طور سے تسلیم کرلیا گیا تو 30 اپریل کو طویل انتظار والا متوقع روڈ میپ سرکاری طور سے دونوں فریق کو پیش کر دیا گیا۔

(50) فلسطینی اتھارٹی نے اس کو فوراً قبول کرلیا لیکن اسرائیل کے ردعمل نے تھوڑا وقت لیا۔ تین ہفتہ کی تاخیر کے بعد وزیراعظم شیرون نے کہا'' ساڑھے تین ملین افراد کو قبضہ میں رکھنا ہمارے لیے برا ہے اور ان کے لیے بھی۔ میں یہ بات واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمیں ایک (امن) معاہدہ پر پہنچنا چاہیے''(51)۔ 25 مئی کو کابینہ کی دی گئی منظوری بہرحال مشروط تھی۔ سرکاری بیان کی زبان بہت محتاط تھی: ''اسرائیل کو روڈ میپ میں بیان کیے گئے اقدامات سے اتفاق ہے'' اس بیان میں اسرائیل نے 114 'تحفظات' کی فہرست بھی شامل کی تھی جو اسے مجموعی طور سے اس پلان سے تھے (52) مستند ذرائع کے مطابق اسرائیلی رویہ میں یہ تبدیلی براہ راست بش انتظامیہ کے دباؤ کی وجہ سے آئی (53)۔ امریکن جیوش کمیونٹی کے پندرہ قائدین نے کانگریس کے لیڈروں کے نام ایک خط میں اس منصوبہ کی حمایت کی تاکہ'' خونی صورت حال سے بچا جاسکے۔'' اس حمایت نے بھی اہم رول ادا کیا۔(54) کچھ دنوں کے بعد صدر بش نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا۔ پہلے تو انھوں نے شرم الشیخ میں مصر اور سعودی عرب کے قائدین سے ملاقات کی اور اس کے بعد عقبہ میں کافی ڈھول تاشے کے ساتھ دونوں وزرائے اعظم سے ملے۔ اس موقعہ پر ایک عوامی جلسہ میں عباس نے 'جہاں کہیں بھی اسرائیلی ہوں ان کے خلاف دہشت گردی کی مذمت کی اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے تمام وسائل اور ذرائع انتفاضہ کی عسکریت ختم کرنے میں لگادیں گے۔ دوسری جانب شیرون نے اپنی حکومت کے لیے روڈ میپ کے مرحلوں کے مطابق جیسا کہ اسرائیل حکومت نے اس کو قبول کیا ہے، براہ راست مذاکرات کی ذمہ داری قبول کی تاکہ دو ریاستوں کا ایک دوسرے سے امن وامان کے ساتھ مل جل کر رہنے کا تصور پورا ہوسکے۔ شیرون نے یہ وعدہ بھی کیا وہ غیر اجازت یافتہ چیکنگ پوائنٹس کو ہٹانے کا کام شروع کریں گے۔ بش سب سے آخر میں بولے، انھوں نے اسرائیل کی سلامتی کے بارے میں امریکی ذمہ داری کا اعادہ کیا اور کہا کہ 'ارض مقدس میں اسرائیلی ریاست اور فلسطینی ریاست کا حصہ ہونا چاہیے' اور زور دیا کہ 'امن کے حصول کے لیے یہودی بستیوں کا مسئلہ حل ہونا چاہیے'۔ انھوں نے فلسطینی وزیراعظم کے 'مسلح انتفاضہ' کو ختم کرنے اور فلسطینی

علاقوں کو دہشت گردی سے نجات دلانے کے وعدہ کو اہمیت دی اور وعدہ کیا کہ وہ امن کے قیام کو اولین ترجیح دیں گے۔(55)

روڈ میپ کے تصور کے مطابق ترقی متوازی مرحلوں میں ایک دوسرے کے جوابی اقدام کے ذریعہ ہوگی جس کی نگرانی کوارٹیٹ، جنھوں نے یہ منصوبہ تیار کیا تھا، کی ایک بین الاقوامی ٹیم کرے گی۔ اس کے علاوہ ایک امریکی ٹیم خاص طور سے دونوں فریقوں کے فرائض کے سلامتی پہلو کی نگرانی کرے گی۔ پہلا اور سب سے مفصل مرحلہ (جومئی 2003 میں ختم ہوگا) مقبوضہ علاقہ میں امن کے قیام کی جانب رہنمائی کرے گا جو فلسطینیوں کی جانب سے تشدد کے غیر مشروط خاتمہ کے ذریعہ حاصل ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی جامع سیاسی اصلاحات نافذ کرنی ہوں گی تا کہ پارلیمانی طرز جمہوریت جہاں موثر اختیارات وزیراعظم کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں نافذ ہوسکے۔ اس کے علاوہ اس مرحلہ میں فلسطینی آزادانہ اور کثیرالجماعتی انتخاب کرائیں گے۔ اسرائیل کی جانب سے ایک آزاد فلسطینی ریاست کے تصور کی منظوری کا اعلان کیا جائے گا اور وہ اپنی افواج کو 28 ستمبر 2000 کی حدوں پر (جس دن دوسرا انتفاضہ شروع ہوا تھا) واپس بلا لے گا، فلسطینی علاقے میں مارچ 2001 سے بنائی ہوئی بستیوں کو منہدم کرنے کے ساتھ ساتھ نئی بستیوں کی تعمیر پر مہر لگا دے گا۔ پہلے مرحلہ کی تکمیل کا سرٹیفکیٹ کوارٹیٹ کی مانیٹرنگ ٹیم جاری کرے گی۔ دوسرے مرحلہ میں (جون-دسمبر 2003) میں کوارٹیٹ، فلسطینی معاشی بحالی اور عارضی سرحدوں کے ساتھ ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کے طریقہ کار کے اجزا پر ایک بین الاقوامی کانفرنس طلب کرے گی۔ تیسرے مرحلہ (2004-2005) میں ایک اور بین الاقوامی کانفرنس ہوگی تا کہ دونوں فریقوں کے درمیان حتمی حیثیت کے لیے مذاکرات شروع ہوسکیں تا کہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کی روشنی میں سرحدوں کا تصفیہ، قبضہ کا خاتمہ، یروشلم کے مسئلہ کا حل طے ہوسکے اور پناہ گزینوں کے مسئلہ کا ایک حقیقت پسندانہ اور منصفانہ حل ڈھونڈا جاسکے تا کہ دونوں ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہ سکیں۔

اس منصوبہ پر ابتدای ردعمل بہت حوصلہ افزا نہیں تھے۔ اگر چہ حکومتوں نے اس

پلان کو خوش آمدید کہا لیکن عوام اور میڈیا کی نظر میں یہ محض ایک عوامی مقبولیت، کی کوشش سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ حماس جیسے فلسطینی گروپ چوٹی کانفرنس میں فلسطینیوں کو نیچا کرنے میں عباس پر نکتہ چینی کر رہے تھے۔ حماس نے وزیراعظم کے ساتھ ایک ممکنہ جنگ بندی پر گفتگو کو بھی ختم کر دیا۔

انٹرنیشنل کرائسس گروپ، برسلز نے موجودہ، عراق کے بعد، داخلی اور بین الاقوامی عناصر کے حوالے سے روڈ میپ کے متن کا ایک مفصل تجزیہ شائع کیا ہے۔ ''روڈ میپ دراصل اسرائیلی فلسطینی امن عمل میں ایک بتدریج اور ترتیب وار منطق سے وابستہ ہے جو ماضی میں اسرائیل اور فلسطین دونوں کو مایوس کرنے والے رویوں کی نفی کرتا ہے۔ اس کے اکثر عناصر کی تعریف نہیں کی گئی ہے اور ممکن ہے کہ اس کا ہر قدم دونوں فریقوں کے درمیان اکتا دینے والے تنازعات کو ابھارے۔ اس میں عمل درآمد کرنے والا کوئی میکنزم نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اشارہ موجود ہے کہ قابل ذکر تاخیر کی صورت میں کیا کیا جائے گا۔ ان سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس میں 'حتمی حیثیت' کے معاہدہ کی کوئی تعریف یا شناخت نہیں بیان کی گئی ہے۔ اور یوں یہ نہ تو امن کے لیے کوئی مفصل اور قابلِ عمل بلیو پرنٹ ہے بلکہ دشمنی کے خاتمہ کے لیے بھی نہیں'۔ لیکن ان کوتاہیوں کے باوجود کوارٹیٹ پلان کو ایک سیاسی دستاویز کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ مقصد یہ تھا کہ زیادہ اہم فیصلے لینے پر آسانیاں اور تیز رفتاری فراہم کرے۔ اس کے مسودے کی تحریر میں کثیرالاقوامی نوعیت، جو اس سے قبل یونائیٹڈ اسٹیٹس کی یکجہتی شرکت سے گریز ہے، حتمی حیثیت معاہدہ کی نگرانی اور دیکھ بھال میں ممکنہ بین الاقوامی مداخلت کی نظیر قائم کر سکے۔ آئی سی جی مخصوص سفارشات کا ایک مجموعہ بھی پیش کرتی ہے جس میں مستقل انتظامات کے لیے تیاریاں قابل شناخت اور ظاہر ہوں تاکہ کھیل کا انجام عوامی یادداشت میں محفوظ رہے۔(56)

دیگر تبصرے زیادہ جارح ہیں۔ روڈ میپ روڈ کی حالت یا اس کے استعمال کرنے والوں اور اس کے لکھنے والوں کے ارادے اور صلاحیتوں کے بارے میں خاموش ہے۔ اسرائیلی قبضہ کے تلخ حقائق اور اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں رہنے والے فلسطینیوں کی روزمرہ

کی زندگی میں اس کے اثرات کو تقریباً نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح سے زیرِتعمیر 'علاحدگی کی دیوار' کے نتائج کا بھی تذکرہ نہیں ہے۔ روڈ میپ جس ظاہری توازن کے لیے کوشاں ہے اس وراثتی غیر توازن کو نظرانداز کرتا ہے جو دونوں فریقوں کے درمیان موجود ہے۔ اس کے باوجود زیادہ تر اصلاحات کا بوجھ یہ فلسطینیوں کے سر ڈالتا ہے۔ ''یہ امن سے زیادہ تسلی دینے کا پلان ہے۔ اس کا مقصد فلسطین کا ایک مسئلہ کی حیثیت سے خاتمہ ہے۔''(57) اصل میں جو تجویز کیا جا رہا ہے وہ جغرافیائی اکائی میں ضلعی نسلی حکومتیں ہیں جس کا موازنہ پرانے جنوبی افریقہ سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں قوم پرستی اور زمین کے درمیان رابطہ کا تحفظ صرف بالادست یہودی شہریت کے لیے کیا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر مجوزہ فلسطینی ریاست ایک ایسے اقتدار اعلیٰ کی حامل ہوگی جو بکھرا ہوا ہوگا، کوئی ظاہری انفرااسٹرکچر نہ ہوگا، جس کا باہری دنیا سے کوئی رابطہ نہ ہوگا اور جو اپنی رہائشی عمارتوں کی چوٹی اور قبروں کی گہرائی تک محدود ہوگا۔ فضائی اور آبی وسائل اسرائیلی اقتدار کے تحت رہیں گے'(58) یہ بات کہ یہ سوچ قطعی طور پر سرکاری تھی، اسرائیل کے سابق وزیراعظم اور شیرون حکومت میں وزیرخزانہ بنجامن نتن یاہو کے بیان سے ظاہر ہے: ''نہ ہی فلسطینی آبادی پر اسرائیلی تسلط اور نہ ہی جوڈا، سماریہ اور غزہ پر فلسطینی کنٹرول قابل قبول ہے۔'' لیکن ایک تیسرا حل بھی ہے جو اسرائیل اور فلسطین کے لیے ایک حقیقت پسندانہ اور ذمہ دارانہ حل کی جانب امید دلاتا ہے۔ رہنما اصول یہ ہے کہ: ''فلسطینیوں کو وہ تمام اختیارات دینے چاہئیں جو حکومت کرنے کے لیے ضروری ہیں لیکن ان کے پاس کوئی ایسی طاقت نہ ہونی چاہیے جو اسرائیل کے لیے خطرہ ثابت ہو سکے۔ سیدھے سادے الفاظ میں یہ حل فلسطینیوں کی خود حکمرانی ہے لیکن اہم سلامتی اختیارات اسرائیل کے ہاتھ میں ہوں'(59)۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو روڈ میپ کی تخلیق اور اس کی قبولیت فلسطینی عوام کے سفر میں ایک اہم قدم تھا۔ ایسا سفر جو بغیر زمین کے افراد کی حیثیت سے شروع ہوا ایک ایسے مرحلہ پر آ گیا جہاں زمین کے ایک حصہ پر ان کا دعویٰ، اگرچہ وہ ان کی اپنی ہی زمین ہے جو غلط ہاتھوں میں چلی گئی ہے کو بحث کے موضوع کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس

سفر کے آثار اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے نظریات کے ارتقا میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ قرارداد 242 (1967) میں لفظ 'فلسطینی' نہیں استعمال کیا گیا ہے بلکہ ان کو عجیب وغریب طریقہ سے 'پناہ گزینی مسئلہ' سے یاد کیا گیا ہے جس کا منصفانہ حل ہونا چاہیے۔ پینتیس سال بعد قرارداد 1397 (2002) ''ایک ایسے علاقہ کا تصور جہاں دو ریاستیں، اسرائیل اور فلسطین، محفوظ اور تسلیم شدہ سرحدوں میں ساتھ ساتھ رہیں'' کی تصدیق کرتی ہے (60) قرارداد میں ستمبر 2000 کے ان واقعات کی جانب بھی توجہ دلائی جنھوں نے اس کو ممکن بنایا۔ عوام کے ذہنوں میں تیزابی نقش و نگار بنانے میں 1988 اور 2000 کی مقبول شورشوں نے جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابل انکار ہے اور اب اس سے کوئی انکار بھی نہیں کرتا۔ (61) یہی وجہ ہے کہ عقبہ میں وزیراعظم عباس نے انتفاضہ کی عسکریت کو ختم کرنے کا محدود وعدہ کیا تھا اور جس کو صدر بش نے بھی تقریباً انھی الفاظ میں تسلیم کیا (عسکری انتفاضہ کو ختم کرنا)۔ یعنی عباس کو حماس اور دیگر عسکری تنظیموں سے روڈ میپ کو آگے لے جانے والے حالات پیدا کرنے کے لیے گفتگو کرنی ہوگی لیکن وہ بہرحال ان پر دباؤ ڈال کر شدید عوامی ردِعمل کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ لیکن اسی سبب سے اسرائیلی رویہ ان کے وجود کو مٹانے کا ہوگا جو ضرورت پڑنے پر قتل کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ ان کی مستقل موجودگی طاقت کے اس کھیل میں جو مذاکرات میں کھیلا جائے گا ایک بڑی رکاوٹ ہوسکتی ہے۔ عقبہ میٹنگ کے فوراً بعد ظاہر ہونے والے تشدد سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے امریکہ کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ روڈ میپ کی اوّلین و ابتدائی مرحلہ کی بہت باریکی سے نگرانی کرے اور اس نے حماس کے ایک نمایاں رہنما کے قتل پر اسرائیل کی سرزنش بھی کی۔ (62) اس دباؤ کا اثر فلسطینی عسکری تنظیموں کی ایک عارضی جنگ بندی پر رضامندی اور کچھ مقبوضہ علاقوں سے اسرائیلی افواج کی واپسی میں ظاہر ہوا۔ اگر اس طریقہ کو استحکام حاصل ہوا تو ممکن ہے کہ روڈ میپ کے پہلے مرحلہ میں سلامتی سے متعلق دیگر مسئلوں کو امریکہ کو حل کرنے کا موقعہ ملے۔ جنگ بندی سے قبل تشدد نے اسرائیل کے غیر حفاظتی احساس کو بڑھا دیا اور مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی اور فلسطینی آبادی کو الگ الگ کرنے کے لیے کنکریٹ کی فصیل کی تعمیر شروع کی (63)۔

اس محدود کامیابی کے باوجود روڈ میپ کی قسمت ہوا میں معلق ہے اور اس کی افادیت اور کارکردگی پر اندیشے ظاہر کیے جا رہے ہیں۔ اسرائیل کا مقصد یہ ہے کہ روڈ میپ کے پہلے مرحلہ کو حماس کو غیر مسلح اور سیاسی طور سے ختم کرنے کے لیے استعمال کرے۔ اسی اثنا میں ٹرسٹی شپ (64) کے تصور کی کافی زور و شور سے تجدید کی گئی اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ فلسطین کے پاس 'ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جو دہشت گرد تنظیموں اور مسلح گروپوں، جو تشدد کے ذمہ دار ہیں، پر قدغن لگانے کا اہل ہو اور بغیر کسی ایسے ادارہ کے اسرائیلی دفاعی فوج یہ کبھی نہیں چاہے گی کہ وہ ان فلسطینی شہروں اور قصبوں کو خالی کر دے اور باہر کھڑی رہے جن پر انھوں نے دہشت گردوں کو روکنے کے لیے دوبارہ قبضہ کیا تھا''۔ لہٰذا وزیر اعظم شیرون اس بات کو ترجیح دیں گے کہ روڈ میپ کے نفاذ سے پہلے اس کی تفصیلات پر ایک مقرر گفتگو ہو جائے۔' لہٰذا یونائٹیڈ اسٹیٹس آف امریکہ کے لیے زیادہ مثبت طریقہ یہ ہوگا کہ فلسطین کے لیے کوسووو اور ایسٹ تیمور کے طرز پر ٹرسٹی شپ کے قیام میں بین الاقوامی کاوشوں کو مہمیز دے جس کے پاس ایک آزاد اور جمہوری فلسطین تعمیر کرنے کے قطعی اختیارات ہوں۔ یہ رسمی طور سے فلسطینی علاقوں سے یاسر عرفات اور فلسطینی اتھارٹی سے اختیارات لے لے گا اور ان کو فلسطینی عوام کے ٹرسٹ میں رکھے گا۔ ٹرسٹی شپ کے قیام کے متوازی یونائٹیڈ اسٹیٹس کی وضع کردہ حدود میں حتمی حیثیت کے مذاکرات کا اجرا کیا جائے گا اس شرط کے ساتھ کہ وہ تین سال میں مکمل ہو جائیں گے۔ ٹرسٹی شپ کا اسرائیل کے لیے قابل قبول ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ یونائٹیڈ اسٹیٹس کی وضع کردہ ہو اور ایسا سلامتی کونسل کی ایک قرارداد کے ذریعہ ہوگا جو کہ یونائٹیڈ اسٹیٹس کی قیادت میں بنی ہوئی اسٹیرنگ کمیٹی کو ٹرسٹی شپ چلانے کا اختیار دے اسی طرح سے یونائٹیڈ اسٹیٹس حفاظتی افواج میں قیادت کرے گی اور ان افواج کا زیادہ تر حصہ یونائٹیڈ کنگڈم، آسٹریلیا اور کناڈا سے لیا جائے گا۔ ایسی فوج موجودہ اسرائیلی دہشت گردی کے خلاف آپریشن سے زیادہ موثر ثابت ہوگی۔(65)

ٹرسٹی شپ کے تصور کے مخفی فوائد کچھ بھی رہے ہوں یہ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد فلسطینی اتھارٹی پر دباؤ ڈالنا تھا تاکہ وہ پہلے مرحلہ کے نفاذ میں مقصدیت کے ساتھ کام کرے

یا خود اختیاری کی حیثیت پر لوٹنے کا خطرہ مول لے اور امن عمل میں کوئی بھی کردار ادا کرنے سے الگ رہنے کا نقصان اٹھائے۔ خواہ روڈ میپ کے ذریعہ ہو یا ٹرسٹی شپ کے ذریعہ، امن عمل کے طریقہ کار کا ماقبل آخر مرحلہ حتمی حیثیت پر مذاکرات پر توجہ مرکوز کرے گا جس میں سرحدیں، سلامتی، یروشلم، بستیاں، پناہ گزیں اور پانی کے مسائل شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر جنوری 2001 میں طابہ کے مذاکرات میں بحث کیا گیا حصہ (جو موراٹینوز میمورنڈم میں جھلکتا ہے) آگے کے مذاکرات کی بنیاد بنے گا۔ 2004-2005 میں یہ کیا شکل اختیار کریں گے اس کا انحصار ان خیالات پر ہوگا جن کے وزن اور اہمیت کا اندازہ اس وقت نہیں ہے: یعنی مغربی ایشیا کے عام حالات اور عراق میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کی تسلی دینے والی مہم کی رفتار، فریقوں کا سفارتی تال میل خصوصاً فلسطینیوں کا یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ساتھ، صدارتی انتخابی مہم کے دباؤ سے قطع نظر روڈ میپ کے نفاذ میں امریکیوں کا مسلسل ملوث ہونا، اور اسرائیل کی طرف سے روڈ میپ کو درہم برہم کرنے کی غرض سے دانستہ چھیڑ چھاڑ کے باوجود فلسطینی عسکری گروپوں کو امن پر قائم رکھنے کی فلسطینی اتھارٹی کی صلاحیت۔

12 جون 2002 کے ایک نان پیپر میں حتمی تصفیہ کے بارے میں فلسطینی تصور کو پیش کیا گیا ہے (66) یہ بنیادی طور سے مذاکرات کا فریم ورک ہے لہٰذا اس میں ترتیب و تبدیلی کی گنجائش موجود ہے۔ اس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ 4 جون 1967 کی جنگ بندی لائن دونوں ریاستوں کے درمیان سرحد قرار پائے گی جس میں بغیر علاقائی سالمیت کو متاثر کیے باہمی چھوٹے چھوٹے ایڈجسٹ منٹ کیے جاسکتے ہیں۔

☆ فلسطینی ریاست کے مغربی کنارہ والے حصہ اور غزہ پٹی کے درمیان ایک مستقل زمینی کاریڈور قائم کیا جائے۔

☆ مشرقی یروشلم فلسطینی ریاست اور مغربی یروشلم اسرائیل کی راجدھانی ہوگا۔ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لیے کھلا رہے گا۔ پرانے شہر کا اقتدار

فلسطین کے پاس رہے گا لیکن بعد میں مشرقی یروشلم کے یہودی محلہ اور مغربی دیوار کے دیوار گریہ والا حصہ اسرائیل کے حوالہ کر دیا جائے گا۔

☆ دونوں فریق اقتدار اور سالمیت کو محفوظ رکھنے میں ایک دوسرے سے انتظامی تعاون کریں گے۔ ان انتظامات میں بین الاقوامی فوج اہم کردار ادا کرے گی۔ کوئی بھی فریق ایک دوسرے کے خلاف کوئی فوجی معاہدہ نہیں کرے گا۔ سلامتی کے انتظامات سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینٹ کے، بجھائے ہوئے نظریات پر مبنی ہوں گے۔

☆ اقوام متحدہ کی قرارداد 194 کے مطابق پناہ گزینوں کے مسئلہ کا متفقہ اور منصفانہ حل تلاش کیا جائے گا۔

☆ بین الاقوامی معاہدوں اور معمولات کے مطابق پانی کے مسئلہ کو منصفانہ اور مساویانہ طریقہ سے حل کیا جائے گا۔

☆ فلسطین اور اسرائیل مارکیٹ اکنامی کے اصول پر دو جمہوری ریاستیں ہوں گی۔

مندرجہ بالا نکات اور طابہ دستاویز کے خصوصی اصولوں کو آئی سی جی نے امن معاہدہ کے لیے ایک جامع فریم ورک میں تشکیل کیا (67)۔ مغربی کنارہ میں زمین کا مجوزہ لین دین 4 فیصد سے زیادہ نہ ہوگا اور یہ ادلا بدلی نہ صرف رقبہ بلکہ قدر و قیمت میں بھی مساوی ہوگی (حقیقی یا صلاحیتی اعتبار سے)۔ سرحدی لائنوں کی حدبندی اس طرح کی جائے گی کہ اسرائیل کے ساتھ ادلا بدلی والی زمین میں اگر سب نہیں تو زیادہ تر بستیاں شامل ہو جائیں۔ مغربی کنارہ اور غزہ پٹی کے درمیان کاریڈ والا علاقہ اسرائیل کے زیر اقتدار ہوگا لیکن خود کاریڈور پر فلسطین کا قبضہ ہوگا۔ اگرچہ فلسطینی ریاست ایک غیر فوجی ریاست ہو لیکن اس کے پاس ایک طاقتور داخلی حفاظتی فورس ہوگی جس کی تعداد، صلاحیت اور اسلحہ کی تشریح معاہدہ میں کی جائے گی۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی قیادت میں ایک کثیر الاقوامی فوج مغربی کنارہ اور غازہ پٹی میں موجود رہے گی۔ فلسطین کو اسرائیل کے زیر نگرانی تین فوری وارننگ اسٹیشن کو فلسطین میں قبول کرنا ہوگا۔ دس سال کے بعد ان کی حیثیت پر نظرثانی کی جائے گی۔ اسرائیل کو فلسطین

کے ایک رابطہ افسر کی موجودگی کو قبول کرنا ہوگا جو بہرحال ان کے کام میں نہ کوئی مداخلت کرے گا اور نہ ہی رکاوٹ پیدا کرے گا۔ فلسطین اسرائیل کو اس کی سلامتی مفاد کے لیے اپنی فضائی حدود استعمال کرنے کی اجازت دے گا۔ پہلے تین سال میں فلسطین کی سرحدیں اسرائیل کی زیرنگرانی رہیں گی۔ مغربی یروشلم، جیسا کہ 4 جون 1967 کی جنگ بندی لائن میں مذکور ہے، اور مشرقی یروشلم کا یہودی محلہ اسرائیل کے زیر اقتدار آجائیں گے۔ مشرقی یروشلم کے دیگر تمام علاقے جو کہ موجودہ میونسپل حدود میں ہیں فلسطینی کنٹرول میں رہیں گے۔ پرانے شہر کے لیے ایک خصوصی حکومت ہوگی اور بین الاقوامی پولیس فورس موجود رہے گی تا کہ بلا روک ٹوک آنے جانے کو یقینی بنایا جائے۔ پرانے شہر کے ایڈمنسٹریشن کے لیے ایک ''جیروسلم انٹرنیشنل کمیشن'' ذمہ دار ہوگا۔ پرانے شہر کے اوپر اقتدار کے مسئلہ پر ایک رائے یہ ہے کہ اس کو مذہبی تعمیرات کی روشنی میں تقسیم کردیا جائے۔ مسلمان اور عیسائی تعمیرات فلسطین کے حصہ میں اور یہودی تعمیرات اسرائیل کے حصہ میں۔ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ غیر معینہ مدت کے لیے ایک کثیرالاقوامی ''جیروسلم انٹرنیشنل اتھارٹی'' کے تحت ایک بین الاقوامی پروٹیکٹوریٹ ہونی چاہیے۔ جہاں تک پناہ گزینوں کے مسئلہ کا تعلق ہے دونوں فریق اس بات پر رضامند ہوں گے کہ اگر پناہ گزین فلسطینی ریاست کی سرزمین پر بسائے گئے (خاندانی ملاپ پروگرام کے تحت پناہ گزینوں کی ایک علامتی تعداد اسرائیل بھی جائے گی) تو ساتھ میں ان کے مالی نقصان اور شدید مشقت کا معاوضہ بھی ادا کرنا ہوگا جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی قرارداد 194 کی شرائط کو مطمئن کرتا ہو۔ معاوضہ کا اندازہ اور اس کی ادائیگی کا انتظام 'انٹرنیشنل کمیشن برائے فلسطینی پناہ گزین' کے ذریعہ ہوگا۔ پانی کے سوال پر فلسطین کو 4 جون 1967 کی فلسطینی سائڈ مگر جو اسرائیل سے زمین کی ادلا بدلی میں شامل ہے کے آبی ذخائر پر دسترس ہوگی'۔ ان وسیع تر مشقوں کی تکمیل کے بعد دونوں فریق سلامتی کونسل سے مطالبہ کریں گے کہ وہ یہ بیان کرتے ہوئے کہ یہ معاہدہ سلامتی کونسل کے قرارداد 242 اور 338 اور جنرل اسمبلی قرارداد 194 کے متعلقہ دفعات کی تکمیل کرتا ہو، اس کی توثیق کرے۔''

آئی سی جی فریم ورک کوارٹیٹ حلقہ کے موجودہ سوچ کی آئینہ دار ہے۔ زیادہ تر مسائل پر یہ اسرائیلی رائے کو اہمیت دیتی ہے۔ علاقائی عرب ریاستیں (خصوصاً، سعودی عرب اور اردن) روڈ میپ کی مکمل حمایت میں ہیں اور سمجھتی ہیں کہ بس اب شہر میں یہی کھیل باقی بچا ہے۔(68) ایسی صورت حال میں کیا فلسطینی نمائندے اس قابل ہوں گے کہ بہتر شرائط منوا سکیں؟ 1990 میں رابرٹ جیکسن نے بین الاقوامی تعلقات نظریہ پر ایک مفصل مشق میں زیادہ تر سابقہ نوآبادیوں کو نیم ریاستوں کے زمرہ میں رکھا ہے جو قانونی طور سے ریاست کا درجہ رکھتی تھیں لیکن حقیقی طور سے ایک بااقتدار ریاست کی ادارتی خصوصیات کی حامل نہیں تھیں۔(69) اس معیار پر فلسطینی ریاست، جب بھی وجود میں آئے گی، سیڑھی کے نچلے پائیدان پر ہوگی۔

اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ حالات کے پیش نظر سرحد، بستیوں، سلامتی، یروشلم اور پانی کے مسائل پر مجوزہ حل بہترین دستیاب حل ہیں تب بھی پناہ گزینوں اور ''واپسی کا حق'' کا مسئلہ ایک بڑی رکاوٹ بن سکتا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں اولین لہر میں نکالے جانے والے فلسطینی پناہ گزینوں کے گروپس میں اس کے لیے خاصی حمایت بنی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر جولائی 2000 میں کیمپ ڈیوڈ میں گفتگو ناکام ہوئی ہے۔ طابہ مذاکرات میں ''فلسطینی پناہ گزینوں کے المیہ پر ایک مشترکہ بیان'' جاری کرنے کے وعدہ سے اس شگاف کو بھرنے کی کوشش کی گئی۔ جہاں تک فلسطینیوں کا تعلق ہے پناہ گزینوں کی داستان 1948 میں ان کے منظم اخراج سے شروع ہوتی ہے(70)۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو اقوام متحدہ جنرل اسمبلی کی دسمبر 1948 کی قرارداد 194 (11) کے پیراگراف گیارہ میں یہ کہتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ ''ان پناہ گزینوں کو جو اپنے گھروں کو لوٹنا اور پڑوسیوں کے ساتھ امن و سکون سے رہنا چاہتے ہیں ان کو جلد ہی کسی قابل عمل تاریخ میں ایسا کرنے کی اجازت دی جائے۔ مزید یہ کہ جو لوٹنا نہیں چاہتے ہیں ان کی جائداد کا معاوضہ ادا کیا جائے اور اس جائداد کے نقصان کا معاوضہ جو بین الاقوامی قانون کے تحت حکومتوں یا ذمہ دار اتھارٹیز نے استعمال کیا ہے۔ اسی پیراگراف میں قرارداد نے کنسی لیشن سیشن کو یہ ہدایت بھی کی کہ ''پناہ

گزینوں کو معاوضہ کی ادائیگی، واپسی، بازآبادکاری، معاشی اور معاشرتی راحت کاری کو آسان بنایا جائے۔'' اس خیال کو بشمول یو ایس وفد کے وسیع بین الاقوامی حمایت حاصل ہوئی اور ہر سال اس کو جنرل اسمبلی میں دوہرایا جاتا ہے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس نے پہلی بار دسمبر 1993 میں قرارداد کے خلاف ووٹ دیا ہے یعنی 13 ستمبر 1993 کے ڈی او پی کے بعد (جس کی وجہ سے پناہ گزینوں کا مسئلہ حتمی حیثیت کے مذاکرات تک ٹال دیا گیا)۔

یہ سوال پیچیدہ ہے اور اس کی کئی جہتیں ہیں۔ طابہ دستاویز میں دونوں فریقوں کے موقف واضح ہیں کہ ''فلسطینی پناہ گزینوں کا مسئلہ اسرائیلی فلسطینی تعلقات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور امن کے لیے ایک جامع اور منصفانہ حل لازمی ہے''۔ سب بھی سیدھا سادا ہے۔ پناہ گزین 531 قصبوں اور گاؤں سے آئے ہیں اور ان کی تعداد پانچ ملین سے زیادہ ہے (ان میں سے 3.9 ملین یو این اور ڈبلیو اے کے ساتھ رجسٹرڈ ہیں اور 1.3 ملین غیر رجسٹرڈ ہیں) اور یہ 8 ملین فلسطینیوں کا دو تہائی حصہ ہیں۔'' آج 86 فیصد پناہ گزین تاریخی فلسطین میں 100 میل کے دائرہ میں رہتے ہیں۔ اپنے گھروں سے ان کی یہ قربت اس رشتہ کی غماز ہے جو انھیں اپنے اصل وطن سے ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اور کسی بھی مقام پر ان کی بازآبادکاری، سوائے ان کے اپنے وطن کے، کی تین درجن سے زیادہ اسکیمیں ناکام ہوچکی ہیں'(71) اس کے باوجود اکثر فلسطینیوں کو علم ہے کہ اسرائیل اس مطالبہ کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا اور کوارٹیٹ (اور اقوام متحدہ کے اراکین کی اکثریت) اس کے قانونی ہونے کے باوجود اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ اس صورت حال میں صرف یہی ممکن ہے گزشتہ غلطیوں کو تسلیم کیا جائے اور بین الاقوامی فنڈ کے ذریعہ جس میں اسرائیل کا حصہ علامتی سے زیادہ ہو، سے معاوضہ ادا کیا جائے (72)۔ فلسطینی پناہ گزینوں کے لیے وہی طرز اختیار کیا جاسکتا ہے جو جنگ عظیم کے بعد 'نازی مظالم کے شکار' لوگوں کے لیے جرمن معاوضہ میں کیا گیا تھا۔ معاوضہ کے مسئلہ کی بنیاد میں انفرادی حقوق ہیں۔ افراد یا خاندان نے سب سے زیادہ نقصان اٹھائے ہیں۔ اور اسی وجہ سے فلسطین اتھارٹی جو صرف اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی ذمہ دار ہے ان کے دعووں کو نظرانداز نہیں کرسکتی (73)۔

لہٰذا آخری تجزیہ میں فلسطینیوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ صورت حال کو قبول کرلیں۔ مزاحمت اور عسکریت نے دنیا اور اسرائیل پر واضح کردیا ہے کہ مستقل قبضہ اب ممکن نہیں ہے۔ اسی نے دو ریاستوں کے امکان کے حل کو ابھارا ہے۔ یہ ایسا حل ہے جو مساویانہ نہیں ہے اور جو فلسطین کو ریاست کے لازمی عناصر ترکیبی نہیں بخشتا ہے۔ فتح وشکست سے ابھرتے ہوئے اور دنیا میں طاقتوں کے توازن کے پیش نظر کسی اور حل کی امید بھی نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ ستم ظریفی بھی ملاحظہ ہو کہ کم وبیش اسی سے ملتا جلتا اور بغیر ان پابندیوں کے جواب عائد کی گئی ہیں، یو این پارٹیشن پلان 1947 کے تحت پیش کیا گیا تھا۔ فلسطینیوں کی قابل ذکر انسانی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے، وقت اور بتدریج قوم پرستی کی تعمیر ان کو مہلت دے گی کہ وہ کوتاہیوں پر قابو پالیں گے اور معمول کے مطابق علاقائی اور عالمی رول ادا کریں گے۔

فلسطینیوں کے کارناموں کی داستان اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک اس استثنائی حیثیت کا ذکر نہ کیا جائے جو دنیا نے اسرائیل کو بخشی ہے۔ یہ 'منتخب افراد' جو یوروپ میں ہولوکاسٹ کا شکار ہوتے رہے، بیسویں صدی کے آخری سالوں میں ہر مرحلہ پر امداد و ہمدردی وصول کرتے رہے۔ ممکن ہے کہ یہی قدرت کی مرضی ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عالمی طاقتوں کی دنیاوی اغراض کے سبب سے یہی مرضی تھی خواہ وہ بین الاقوامی قانونیت کے معمولات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اسرائیل کی ریاست کا ہر بڑا عمل (اور ریاست کے ابتدائی تعمیری سالوں میں یہودی گروپس کا ہر کام) خواہ وہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے دہشت گردی کا استعمال ہو، نسل کشی ہو، فتح ہو، قبضہ ہو، مقبوضہ علاقوں میں انسانی حقوق اور دیگر حقوق کی مکمل خلاف ورزی ہو، جوہری اسلحہ کا خفیہ فروغ یا اس کی ذخیرہ اندوزی ہو یہ سب اکثر ممالک نے طاقت کے بے شرم کھیل میں نظرانداز کردیے جس کی مثال موجودہ زمانے میں نہیں ملتی۔

ولادیمیر جابوٹنسکی نے 1923 میں کہا تھا کہ ''صیہونیت ایک نوآبادیاتی معرکہ آرائی ہے لہٰذا اس کا عروج اور زوال مسلح افواج سے وابستہ ہے۔'' اس نے پیشین گوئی کی

کہ (فلسطینی) عرب اس وقت تک اپنی زمین نہیں چھوڑے گا جب تک کہ وہ یہودی سنگینوں کی دیوار کے سامنے نہیں آ جاتا۔ اس کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور کسی حد تک اس کا تصور بھی:

ایک نئی نسل کا ظہور ہوگا
مغرور، سخی اور بے رحم

اکثر لوگ ان کے غرور کو تسلیم کریں گے۔ ایک صدی تک ساتھ رہنے کے بعد بھی ایک ایک فلسطینی ان کی بے رحمی کی گواہی دے گا۔ ریکارڈز کی گہری تحقیق سے معلوم ہوگا کہ ایک قوم جو خود نسل کشی کا شکار ہوئی اسے یہی مصیبت، ہاتھ روک کر ہی سہی، دوسروں پر ڈالنے میں کوئی عار نہیں محسوس ہوئی۔

حواشی

1۔ جان، رابرٹ اینڈ ہدوی سمیع ''دی پیلسٹائن ڈائری'' (آرنلڈ جے ٹوائن بی کے مقدمہ کے ساتھ)، (نیو ورلڈ پریس، نیویارک، 1970) جلد 1، صفحات XIII-XIV، 1947 کی آبادی کے اعداد و شمار فلسطینی حکومت کی رپورٹوں سے لیے گئے ہیں جو جلد 11، صفحہ 179 میں درج ہیں۔

2۔ جانسن، پال ''اے ہسٹری آف دی جیوز'' (ہارپر اینڈرو، لندن 1987)، صفحہ 521

3۔ حوالہ بالا، صفحات 25-524، مزید دیکھیے ایبان ابا ''ڈپلومیسی فار دی نیکسٹ سنچری'' (ییل یونیورسٹی پریس، نیو ہیون، کنکٹی کٹ، 1998)، صفحات 4-3، 14 فروری 1945 کو روز ویلٹ نے سعودی عرب کے شاہ عبدالعزیز بن سعود سے کہا تھا کہ وہ ''عربوں کے خلاف یہودیوں کی کوئی مدد نہیں کرے گا اور نہ ہی عربوں کے خلاف کوئی قدم اٹھائے گا'' اس کو 5 اپریل 1945 کے ایک خط میں بھی دوہرایا گیا تھا: ''اس حکومت کی انتظامیہ شاخ کے سربراہ کی حیثیت سے''۔ ٹرومین کا موقف یہ تھا: ''مجھے ان سینکڑوں ہزاروں یہودیوں کو جواب دینا ہے جو

صیہونیت کی کامیابی کے لیے بے چین ہیں۔ میرے حلقہ انتخاب میں سینکڑوں ہزاروں عرب نہیں ہیں''۔ دیکھیے لیسی، رابرٹ ''دی کنگڈم'' (ہارکورٹ بریس، جوونووچ، نیویارک، 1981) صفحات 75-272

4۔ جانسن، حوالہ سابق، صفحہ 528

5۔ حوالہ بالا، صفحہ 530، جانسن وضاحت کرتے ہیں کہ قدیم عہدنامہ میں ارض موعود کا تذکرہ کرتے وقت (پیدائش 15:6-1 اور 12:3-1) خدا نے ''اس کی کوئی قطعی شناخت نہیں بیان کی ہے۔''

6۔ ٹوئن بی، حوالہ دیا گیا فلبرائٹ، جے ولیم ''اولڈ میتھس اینڈ نیو ریلیٹیز۔ دی مڈل ایسٹ'' میں، جان نورٹن مور (ایڈٹ) ''دی عرب اسرائیلی کانفلکٹ'' (پرنسٹن یونیورسٹی پریس، پرنسٹن نیو جرسی، 1974) جلد 1، صفحہ 1048

7۔ سیلا اوراہم، ''دی ڈیکلائن آف دی عرب اسرائیلی کانفلکٹ: مڈل ایسٹ پالیٹکس اینڈ دی کوئیسٹ فار ریجنل آرڈر'' (ایس یو این وائی پریس، البانی، نیویارک 1998) سیلا اشارہ کرتی ہیں کہ 15 مئی 1967 تک ناصر نے ایک نیم پختہ جنگ میں شرکت کے خلاف تنبیہ کی تھی: ''ناصر کے اقدامات (جو جنگ کی طرف لے گئے) ان کے اس موقف کی ضد تھے جو انھوں نے ہر چوٹی کانفرنس میں دہرائی کہ اسرائیل کے ساتھ جنگ کو اس وقت تک ملتوی رکھا جائے جب تک کے عرب اسٹرٹیجک برتری حاصل نہ کرلیں''۔ مزید یہ کہ مصری قائد ''بغیر کسی قطعی سیاسی مقصد کے جنگ میں کود گئے سوائے اس کے کہ وہ اسرائیل کو شام پر حملے سے باز رکھ سکیں'' (صفحات 92-90)۔ اس بارے میں ایبان ابا ''این آٹو بائیوگرافی'' (رینڈم ہاؤس نیو یارک 1977)، صفحہ 318 کا ایک ریمارک بھی موزوں ہے: ''1967 کی جنگ کے بعد ناصر نے یہ کبھی نہیں چھپایا کہ سوویت مخبروں نے انھیں اس راستہ پر چلنے کے لیے اکسایا جس پر وہ چلے''۔ اور یہ کہ نیشنل اسمبلی کے صدر انور سادات کی قیادت میں ایک مصری وفد سے، 12 اور

13 مئی کو ماسکو میں کہا گیا کہ اسرائیلی قومی دن کے فوراً بعد شام پر اسرائیلی حملہ کی توقع رکھنا چاہیے۔

8۔ یونائیٹڈ نیشنز، ریلیف اینڈ ورکس ایجنسی فار پیلسٹینین رفیوجیز ان دی نیر ایسٹ'' (یو این آر ڈبلیو اے) 1949 میں اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارہ کی حیثیت سے تخلیق کیا گیا۔ 30 جون 2002 میں یہ 3973360 رجسٹرڈ پناہ گزینوں اور 59 پناہ گزیں کیمپ کی اردن، لبنان، شام، مغربی کنارہ اور غزہ میں دیکھ بھال کر رہا تھا۔ باقی زیادہ تر اردن (1708507)، شام (407742) اور لبنان (390498) میں ہیں۔

9۔ سیلا، حوالہ سابق، صفحہ 305، ابا ایبان نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ ''امن عمل میں ترقی کی ایک وجہ اسرائیل کا بالادستی اور توسیع میں ناکام تجربہ تھا، حوالہ سابق (1998) صفحہ 159

10۔ سیلا، حوالہ سابق صفحہ 306

11۔ رولیو ایرک ''جرنل آف پیلسٹائن اسٹڈیز (1993 گرمیاں 22:4)'' میں انٹرویو، صفحہ 45

12۔ کاربن جین۔ ''دی ناروے چینل: دی سیکرٹ ٹاک ریٹ لیڈ ٹو دی مڈل ایسٹ پیس پروسس'' (اٹلانٹک منتھلی پریس، نیویارک، 1994) صفحہ 40۔ اسرائیلی سائڈ سے مذاکرات کے براہ راست مشاہدہ کا بیان بیلن، یوسی نے ''ٹچنگ پیس: فردم دی اوسلو اکورڈ ٹو اے فائنل سٹیلمنٹ'' (ویڈن فیلڈ اینڈ نکلسن، لندن 1999) صفحات 49-138 اور ساور یوری ''دی پروسس: 1000 ڈیز ویٹ چینجڈ دی مڈل ایسٹ'' (رینڈم ہاؤس، نیورک 1998) میں کیا ہے۔ عربوں کی جانب سے بہترین بیان ہیکل محمد ''دی سیکرٹ چینلز: دی انسائیڈ اسٹوری آف عرب۔ اسرائیلی پیس نیگوسی ایشن'' (ہارپر کولنز، لندن 1996)

13۔ ہیکل، حوالہ بالا، صفحہ 469

14۔ بیلن، حوالہ سابق صفحات 84-180، جن تجاویز پر بحث کی گئی کتاب میں ان کا بیان ہے

15۔ لو چیری، نیل، ''دی ڈیفیکلٹ روڈ ٹو پیس: نتن یاہو، اسرائیل اینڈ دی مڈل ایسٹ پیس پروسس'' (اتھاسا پریس، ریڈنگ 1999) صفحات 57،58

16۔ حوالہ بالا، صفحات 70-267، دونوں دستاویز کا متن دیتے ہوئے۔ 23 اکتوبر 1998 کے وائی ریور میمورنڈم کے ایک سائڈ لیٹر میں اس کی توثیق کی گئی ہے جس پر نتن یاہو، عرفات اور کلنٹن کے دستخط تھے۔ اس میں تجویز کیا گیا تھا کہ حتمی حیثیت کے لیے مذاکرات 4 مئی 1999 تک مکمل ہو جانے چاہئیں۔

17۔ حوالہ بالا صفحات 76-271

18۔ حوالہ بالا صفحات 82-277، بیلن ایتان دستاویز کا متن، بعنوان ''نیشنل ایگریمنٹ ریگارڈنگ دی نگوسی ایشن آن پرمننٹ سیٹلمنٹ ود دی پیلٹینز 1996''۔

19۔ مالے، رابرٹ، اینڈ آغا حسین، نیویارک ریویو آف بکس، 9 اگست 2001 صفحات 89-81 میں دیکھیے کیمپ ڈیوڈ: دی ٹریجڈی آف ایررس۔ مزید دیکھیے کیمپ ڈیوڈ اینڈ آفٹر: این ایکسچینج۔ 1.'این انٹرویو ود ایہود بارک (بینی مورس)، 2 ''اے ریپلائی ٹو ایہود بارک'' (رابرٹ مالے اینڈ حسین آغا)، حوالہ بالا، 13 جون 2002 صفحات 49-41، مزید دیکھیے فلسطینی روزنامہ 'الایام' کو محمود عباس ابو مازن کا دیا ہوا انٹرویو (28 جولائی 2001) اور 'پی ایل او سینٹرل کونسل کو محمود عباس کی رپورٹ، ''جرنل آف پیلسٹینین اسٹڈیز'' (2001 موسم سرما 30:2)، صفحات 72-168، جولائی 2000 کی چوٹی کانفرنس کی 'الایام' کے ایڈیٹر ان چیف اکرم ہانیہ نے مکمل تفصیلات کے ساتھ 29 جولائی سے 10 اگست 2000 کے درمیان سات قسطوں میں شائع کیا۔ اسی کا مختصر ورژن ''جرنل آف پیلسٹینین اسٹڈیز'' حوالہ بالا، صفحات 79-75 میں شائع ہوا۔

20۔ ہیجز کرس، 'دی نیو پیلسٹینین ریوولٹ' ''فارن افیئرز'' (2001 رجنوری فروری

8:1) صفحات 38-124 تحریک کا بیان وضاحت سے ہے۔ وہ مغربی کنارہ اور غزہ کا موازنہ جنوبی افریقہ میں علاحدگی پسند حکومت کے زمانے کے شہروں سے کرتا ہے ''بجائے فلسطینیوں کو شکست دینے کے اسرائیل آہستہ آہستہ اپنی ہی ہزیمت کا سامان کررہا ہے۔ اسرائیل کے صیہونی بانیوں کے مخصوص اور آزادانہ خواب ایک قضیہ کی صورت میں تبدیل ہو چکے ہیں اور جہاں سے اسرائیل کو پیچھا چھڑانا مشکل معلوم ہورہا ہے۔ 1967 اور 1973 کے برعکس اس وقت اسرائیل کی جنگ فوجوں سے نہیں ہے بلکہ وہ محکوم رعایا سے لڑ رہا ہے''۔ ہیجز 1988 سے 1995 تک نیویارک ٹائمز میں مڈل ایسٹ بیورو چیف تھا۔

21۔ ''جرنل آف پیلسٹینین اسٹڈیز'' (2001، اسپرنگ، 30:3) صفحات 73-171 کا متن۔ ڈینس روس جو کلنٹن کا اسپیشل مڈل ایسٹ کوارڈی نیٹر تھا، نے 21 جولائی 2001 کو واشنگٹن میں ایک گفتگو میں کہا تھا کہ کلنٹن کے دسمبر والے نظریات نے فلسطینی اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کے بااختیار افسران کے درمیان، اگست ستمبر کی مدت کے دوران ہوئی 38 میٹنگوں میں آخری شکل اختیار کی۔ آخری میٹنگ 28-26 ستمبر کو ہوئی تھی جس کے بعد ''فلسطینی چلے گئے اور جیسا میرا خیال ہے وہ پرامید تھے۔ لیکن تشدد پھوٹ پڑا تھا''۔ ''جرنل آف پیلسٹینین اسٹڈیز'' (2001 خزاں 31:1) صفحات 52-150 کا متن۔ شیرون کے دورہ کا تشدد کے بڑھانے میں کیا کردار تھا تاریخ میں محفوظ ہے۔ کیا دونوں کا ایک طرف مائل ہونا اتفاقی تھا؟

22۔ ''جرنل آف پیلسٹینین اسٹڈیز'' (2002 اسپرنگ، 31:3) میں مشترکہ اعلانیہ کا متن صفحات 81-79، یوروپین یونین نان پیپر کے متن کے لیے تتمہ ملاحظہ کریں۔

23۔ کیمپ جیوفری اینڈ پریس مین، جیریمی: ''پوائنٹ آف نو ریٹرن۔ دی ڈیڈلی اسٹرگل فار مڈل ایسٹ پیس'' (کارنیگی انڈومنٹ، واشنگٹن، ڈی سی 1997) صفحہ 12

24۔ کیسنجر، ہنری، ''ایرس آف اَپ ہیول'' (لٹل براؤن اینڈ کمپنی، بوسٹن 1982) صفحات 46-845

25۔ لوچیری، حوالہ سابق، صفحات 51-47

26۔ کلن، مینانحم، ''جیروسلم: دی کنسلڈ سٹی'' (ہرسٹ اینڈ کمپنی، یروشلم، 2001)، صفحات 20-19، شہر کے رقبہ کو 38.1 سے بڑھا کر 108.5 اسکوائر کلومیٹر کردیا گیا۔ ''وہ مرکزی اصول جس کو 1967 کی توسیع کے ذمہ داروں نے اپنے سامنے رکھا یہ تھا کہ شہر میں زیادہ سے زیادہ علاقہ کو شامل کرلیا جائے بشمول علاقہ کے بلند مقامات کے جب کہ ساتھ میں اضافی عرب آبادی کو کم سے کم رکھیں، ان کا مفروضہ تھا کہ نسلی قومی ترکیب اس کا فیصلہ کرے گی کی توسیع باقی رہے گی یا یہ تاریخ کا ایک معمولی واقعہ ہوکر رہ جائے گی''۔ ٹیڈی کولک 1965 سے 1993 تک یروشلم کے میئر رہے اور انھوں نے براہ راست مشاہدہ کو بیان کیا ہے۔ رجحان یہ تھا کہ ''عربوں کے واسطے زندگی مشکل بنا دی جائے، انھیں تعمیر کی اجازت نہ دی جائے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے ارادہ ہی سے باہر چلے جائیں اس طرح یروشلم میں آبادی کا توازن قائم رہے گا'' (صفحہ 75)

27۔ حوالہ بالا، صفحات 93-92

28۔ حوالہ بالا، صفحات 47-145

29۔ فلسطینی انتہا پسندوں کی دوسری نسل کے ذہنی رجحان پر اسرائیلی اور امریکی باخبر مشاہد نے کچھ تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ دیکھیے لفٹ گال 'پیلسٹینین ایج، باعب: ٹیرر ونگ اسٹرٹیجی، ''فارن افیئرز'' (جولائی راگست 2002) صفحات 7-2 اور روبن ایلز بیتھ 'دی موسٹ وانٹیڈ پیلسٹینین' ''نیویارک ٹائمز (30 جون 2002)۔ روبنسٹین ڈینی، ''ہاریٹز'' 14 اکتوبر 2002 کا مشاہدہ تھا کہ مغربی کنارہ پر دوبارہ قبضہ کے بعد انتفاضہ ''پہلے سے زیادہ مقبول اور غیر متشدد ہوگیا ہے''۔ 29 نومبر 2002 کے 'ہاریٹز' میں ایک دوسرے لکھنے والے کا مشاہدہ ہے کہ بے پناہ مصیبتوں اور تکلیفوں کے باوجود ''اسرائیلی سپاہیوں اور شہریوں کے خلاف مسلح اقدام حمایت میں عام اتفاق ہے''۔

30۔ متن کے لیے دیکھیے www.caabu.htm۔ اس رپورٹ میں نئے انتفاضہ میں شیرون کے مبینہ رول پر تبصرہ کیا گیا ہے: 'شیرون کے دورہ نے الاقصیٰ انتفاضہ کو جنم نہیں دیا'۔ لیکن وقت کا انتخاب غلط تھا اور اس سے بھڑکنے والے جذبات کا اندازہ پہلے سے لگا لینا چاہیے تھا۔ دراصل جو یہ دورہ منسوخ کرنا چاہتے تھے وہ اس کا اندازہ پہلے ہی لگا چکے تھے۔'

31۔ متن کے لیے دیکھیے ''دی ایوالون پروجیکٹ' ییل لا اسکول ویب سائٹ

32۔ کیسر رابرٹ جی اینڈ اوٹا وے ڈیوڈ بی 'سعودی لیڈرز اینگر ریویلڈ شیکی ٹائیز'' ''واشنگٹن پوسٹ (10 فروری 2002)''

33۔ متن کے لیے دیکھیے تتمہ۔ 6/جولائی 2002 کے 'ہارٹیز' کے شمارہ میں اس کے ایک نامہ نگار الوف بین کی ایک رپورٹ 'انالیس۔ ایریل شیرون انگریز ٹو ہزاون ائیڈیاز' شائع ہوئی۔ اس نے لکھا 'بش کی تقریر کا زیادہ تر حصہ خود شیرون کے پیش کردہ خیالات پر مبنی تھا' جو کچھ ہفتہ قبل اس نے واشنگٹن کی ایک میٹنگ میں ظاہر کیے تھے۔ جس میں اس نے امن مذاکرات کی پیش قدمی کے لیے یاسر عرفات کے تبادل کی شرط رکھی تھی۔

34۔ دونوں دستاویز کا متن تتمہ میں موجود ہے۔ فلسطینی نان پیپر نے زور دیا ہے کہ ایک واضح سیاسی افق کی ضرورت ہے جو ایک مستقل امن جو مذاکراتی تصفیہ پر مبنی ہو کی امید کو روشن رکھے'۔ اس میں یہ اضافہ بھی کیا کہ اس تصور کے حصول کے لیے زمین پر مثبت ترقی بشمول شدت پسندی اور قبضہ کے خاتمے کی ضرورت ہے' نان پیپر کا آخری جملہ قابل توجہ ہے ''سلامتی کے میدان میں سی آئی اے ڈائریکٹر جارج ٹینیٹ کے بچھائے ہوئے اصول ہماری کوشش کی بنیاد ہوں گے''۔

35۔ ''دی نیشنل سیکوریٹی اسٹریٹجی آف دی یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا'' صفحات 8-7،
http://www.whilehouse.gov/nsc/print/nsdl.html
پر دستیاب ہے

36۔ ''نیویارک ٹائمز'' 24 ستمبر 2002

37۔ ''ہارہیٹز'' 20 فروری اور 16 مارچ 2003

38۔ جم ہاگ لینڈ، ''واشنگٹن پوسٹ'' (جولائی 2002) بحوالہ سیل میٹرک ''واشنگٹن اینڈ تل ابیب ڈریم آف اے نیو ریجنل آرڈر'' (5 جولائی 2002)۔

http:///www.mafhoum.com/press3/103p77/htm

39۔ متن کے لیے دیکھیے، واشنگٹن پوسٹ (14 مارچ 2003)

40۔ اس طرز فکر کا آئینہ دار وہ تبصرہ ہے جو امیر اورین نے 23 مارچ 2003 کے ہارمیٹز، کی ایک تحریر میں کیا ہے: ''واشنگٹن کا یہ فیصلہ کہ وہ عراق پر حملہ کرے، صدام حسین کی حکومت کو بدل دے، ان ہتھیاروں کو ختم کردے جو مبینہ طور سے تباہ کن استعمال کے لیے ہیں اور سب سے طاقتور عرب ریاست (مصر کے علاوہ) کو دشمنی کے حلقہ سے نکال دے اسرائیل کو کچھ مہلت دے سکتا ہے، اگر آپریشن کامیاب ہوجائے تو، وہ امن و سلامتی کے مذاکرات کے لیے کچھ مزید تیاری کرے جس کی بنیاد ایک مختلف فوج ہوگی جو موجودہ سے چھوٹی لیکن زیادہ ترقی یافتہ ہوگی۔''

41۔ بین آلوف، 'شیرونز ویٹنگ پیریڈ' ''ہارمیٹز'' (20 مارچ 2003) اور ارکات صائب 'روڈ میپ مسٹ شو دی وے ٹو ریئل پیس' ''فنانشل ٹائمز'' (16 مارچ 2003)، بین نے اضافہ کیا ہے کہ شیرون چاہتا تھا کہ اہم مسائل عراق میں جنگ کے بعد اٹھائے ''بش کو دوبارہ منتخب ہونے کے لیے یہودیوں اور دائیں بازو والے عیسائیوں کی ضرورت ہوگی۔ یورو پین کو سزا کے طور پر علاقہ سے نکال دیا جائے گا اور اقوام متحدہ پھر غیر موثر ہوجائے گی۔ ان حالات میں شکست خوردہ فلسطینی وہ عارضی ریاست قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں گے جس کی پیش کش شیرون کررہا ہے۔ لہذا شیرون کے کیریئر کی انتہا مغربی ساریا اور اردن وادی پر سیکورٹی زون پر کنٹرول اور بستیاں اپنی جگہ محفوظ و سلامت، پر ہوگا'' شیرون کے

کھیل کو جم ہاگ لینڈ کے اس تبصرہ کی روشنی میں دیکھنا چاہیے جو اس نے گزشتہ سال کیا تھا: 'اسرائیلی وزیراعظم نے تاریخ کی لگام پکڑ لی ہے اور اس کا ارادہ واقعات وحوادث کو اپنے رخ پر لے جانا ہے اور دوست یا دشمن کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا''۔''واشنگٹن پوسٹ'' (9 مئی 2002)

42۔ 'ہارٹیز' (1 اپریل 2003)

43۔ کیسنجر، حوالہ سابق صفحات 61-460 'ہماری معقولیت کی تعریف نے سنجیدگی کے ساتھ اس خیال کو نہیں لیا کہ عزت نفس کی خاطر ایک ناقابل فتح جنگ کو شروع کیا جائے۔ (صفحہ 465)

44۔ پیٹرز، جوئیل ''فنانشل ٹائمز'' (23 جنوری 2003)

45۔ ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون'' (30 جنوری 2003) مزید دیکھیے ایلڈر، اکیوا، ''ہم ایک ٹوٹتے ہوئے پل پر کھڑے ہیں'' ''ہاریٹز (24 فروری 2003)'' جہاں یکساں نظریات ایک اور سیاسی شخصیت، ڈان میر ڈور، سے منسوب کیے گئے ہیں۔ کچھ سال پہلے ابا ایبان (حوالہ سابق، صفحہ 157) نے مستقل قبضہ کی پیچیدگیوں کی جانب توجہ دلائی تھی: ''یہ بات جدید جمہوریت کی فطرت کے منافی ہے کہ بغیر منصفانہ مساوات کی پیش کش یا ان کی علاحدہ قانونی حدود کے قیام کے غیر قوم کے دو ملین سے اوپر افراد پر حکومت کی جائے۔''

46۔ ''پیس ان دی مڈل ایسٹ کین ناٹ ویٹ''۔''فنانشل ٹائمز'' (10 مارچ 2003)

47۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ، ''مڈل ایسٹ اینڈ گیم I: گٹنگ ٹو اے کمپری ہنسیو عرب اسرائیلی پیس سیٹل منٹ'' (برسلز، 16 جولائی 2002) صفحات 2 اور 10

48۔ حوالہ بالا II، ''ہاؤ اے کمپری ہینسو اسرائیلی پیلسٹینین پیس سیٹل منٹ ووڈ لک لائیک'' صفحات 8 اور 16

49۔ بینزی مان، اوزی 'کوریڈورز آف پاور۔ اینڈ ناؤ فار دی ہارڈ پارٹ' ''ہارٹیز'' (12 اپریل 2003)

50- پرفورمینس بیسڈ روڈ میپ ٹو اے پرمنٹ ٹو اسٹیٹ سولوشن ٹو دی اسرائیلی پیلسٹینین کانفلکٹ، کے لیے دیکھیے تتمہ۔ یہ فلسطینی وزیراعظم کو کوارٹیٹ کے ایک ممبر اور یو ایس قونصل جنرل نے پیش کیا تھا۔ اسرائیلی وزیراعظم کو یہ صرف یو ایس سفیر نے پیش کیا۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس موضوع پر اپنی تمام عوامی تقریروں میں شیرون نے کہیں بھی کوارٹیٹ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

51- لیوی، 'شیرون ڈیفنڈس اینڈورسمنٹ آف پیس پلان' واشنگٹن پوسٹ (27 مئی 2003)

52- 'واشنگٹن پوسٹ' حوالہ بالا اور 'ہارٹیز' (27 مئی) مؤخرالذکر تحفظات کی مفصل متن دیتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے تتمہ)

53- بین الوف، اینڈ گڈ مین، ناتھن 'یو ایس ڈیرانڈنگ اسرائیل فار لی اکسپٹ روڈ میپ،'' ہارٹیز'' (22 مئی 2003)

54- فاف ولیم 'امریکن جیوفورس شیرونز ہینڈ'۔ ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون'' (29 مئی 2003)

55- ''واشنگٹن پوسٹ'' (5 جون 2003) تقریروں کے متن کے لیے

56- 'اے مڈل ایسٹ روڈ میپ ٹو دہیر؟' ''آئی سی جی مڈل ایسٹ رپورٹ'' (نمبر 14، 2 مئی 2003) صفحات 30-25 مجموعی طور سے یہ رپورٹ روڈ میپ کے بارے میں شکوک ظاہر کرتی ہے کہ بغیر اہم تبدیلیوں کے اپنے مقاصد میں اس کی کامیابی مشکوک ہے۔

57- سعید، ایڈورڈ: 'آرکیالوجی آف دی روڈ میپ'۔ ''الاہرام ویکلی'' (نمبر 642، 12 سے 18 جون 2003)

58- بین ویستی میرون۔ 'روڈ میپ ٹو پرپیچویٹ دی اسٹیٹس کو' ''ہارٹیز'' (19 جون 2003)

59- نتن یاہو بنجامن۔ 'اے لمیٹڈ پلیسٹینین اسٹیٹ' ''واشنگٹن پوسٹ'' (21 جون 2003)

60- تین متعلقہ سلامتی کونسل قراردادوں 242، 338، 1397 کے لیے دیکھیے تتمہ

[illegible]

دی پرومزڈ لینڈ'' (سینٹ مارٹنز گریفنز، نیویارک، 2002)۔''یوم کپور کی جنگ نے اسرائیلیوں کو اپنی فوج اور حکومت کی اہلیت پر سوال کرنے پر مجبور کیا، لبنان جنگ نے اس کی اخلاقیات پر شک کرنے اور انتفاضہ نے ان کو یہ قبول کرنے پر مجبور کیا کہ فلسطینیوں کو ان کے ایک علاحدہ قوم کے وجود کی حیثیت سے انکار ایک عمل رائیگاں ہے'' (صفحہ 134)، مزید دیکھیے مندرجہ بالا n9 اور n30۔

62۔ بین الوف، 'دی یو ایس ان ناؤ مائیکرو۔مینیجنگ دی پروسس،'' ہارٹیز'' (نیو یارک) (مارچ/اپریل 2003) صفحات 19-106، ''تین سو میل لمبی فینس جو الکٹرونیکلی کنٹرول کی جاتی ہو اور جس میں چھ یا سات کراسنگ پوائنٹس ہوں کا خیال سب سے پہلے 1996 میں آیا تھا لیکن اس سے تنازعہ پیدا ہوا۔ اب تک پہلے گیارہ کلومیٹر تک کی فینس جو جنین کے علاقہ سے ملحق ہے مکمل ہو چکی ہے۔ بقیہ علاقہ میں فینس اگلے بارہ مہینوں میں مکمل ہو جانے کی امید ہے۔ اسٹین برگ، جیرالڈ، 'سپریشن از بیٹر دین کانفلکٹ' ''فنانشیل ٹائمز'' (23 جون 2003)۔ بش انتظامیہ نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ فینس یکطرفہ اعلانیہ میں سیاسی سرحد نہ قرار دے دی جائے۔ عملی طور سے یہ ملحق علاقوں میں رہنے والے فلسطینیوں کے لیے سخت مشکلات پیدا کرے گا۔

64۔ جولائی 2002 میں آئی سی جی نے یہ رائے پیش کی۔ دیکھیے مندرجہ بالا n49

65۔ انڈیک، مارٹن، 'اے ٹرسٹی شپ فار پیلسٹائن؟' ''فارن افیئرز'' (نیویارک) (مئی/جون 2003)، صفحات 66-51، انڈیک 1997 سے 2000 تک اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ تھا اور دو بار اسرائیل کا سفیر رہ چکا ہے۔ اس کی دلیل ہے کہ قانونی طور سے ٹرسٹی شپ کا تصور ممکن ہے کیونکہ ''مغربی کنارہ اور غزہ اقوام متحدہ کے ہاتھوں میں رہیں گے، جو اس کو لیگ آف نیشنز سے وراثت میں ملا ہے اور جس نے یہ وراثت برطانیہ سے پائی، برطانیہ نے پہلی جنگ عظیم کے

قائم رہا ان کو سلطنت عثمانیہ سے حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ کے بعد مغربی کنارہ پر اردن

کے اقتدار کے دعویٰ کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا اور اگرچہ 1967 کی چھ روزہ جنگ

کے بعد اسرائیل اس سرزمین کا انتظام کررہا ہے لیکن اس نے ان پر کبھی اپنے

اقتدار کا دعویٰ نہیں کیا''۔ صفحہ 56، n1

66- فلسطینی نان پیپر، 22 جون 2002 کے لیے تتمہ دیکھیے

67- آئی سی جی 'مڈل ایسٹ اینڈ گیم 11' صفحات 17-9، مزید دیکھیے مندرجہ بالا n49

68- عمان میں ورلڈ اکنامک فورم کی 22 جون 2003 کی میٹنگ میں اردن کے وزیرخارجہ مروان جمیل معاشر

69- جیکسن، رابرٹ ایچ ''کواسی اسٹیٹس: ساورنٹی، انٹرنیشنل ریلیشنز اینڈ دی تھرڈ ورلڈ'' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، کیمبرج، 1990) صفحہ 21

70- مصلح نور 'دی ہسٹوریکل روٹس آف دی پیلسٹینین ریفوجی کوئسچن، ناصر عروری (ایڈٹ) ''پیلسٹینین ریفوجیز: دی رائٹ آف ریٹرن'' (یونیورسٹی آف مشی گن پریس، لندن 2001) صفحات 37-36، اس مقالہ میں پالیسی کے رویہ اور اس موضوع پر رہنما ہدایات پر ڈیوڈ بن گورین کے 'میموراِئرز اینڈ وارڈ ائیریز' کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اسرائیلی مورخوں کی ایک نئی نسل نے گاؤں کے بعد گاؤں کے اخراج کے حق میں مضبوط دلائل دیے ہیں۔

71- ابوستہ، سلمان 'دی رائٹ آف ریٹرن: سیکریڈ، لیگل اینڈ پاسیبل' ناصر عروری، حوالہ بالا، صفحات 207-194

72- معاملہ کا یہ پہلو اب قابل ذکر توجہ حاصل کررہا ہے۔ جون 2003 میں انٹرنیشنل ریسرچ سینٹر آف کناڈا نے اس موضوع پر ایک ورکشاپ منعقد کی تھی۔

73- کبریٰ عاطف 'ویلیوئنگ پیلسٹینین لوسز اِن ٹوڈیز ڈالرز'۔ ناصر عروری: حوالہ بالا، صفحات 51-216 مصنف نے 'فلسطینیوں پر ڈھائی گئی ناانصافیوں کا مالی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ نہ کم نہ زیادہ'۔

74۔ بیت اللحمی، بنجامن ''اوریجنل سن: ریفلیکشنز آن دی ہسٹری آف زائیونزم اینڈ اسرائیل'' (اولیو برانچ پریس، نیویارک، 1993) صفحات 3-102، لیکن البرٹ آئن سٹائن اور کچھ دیگر دوسری طرح سے سوچتے تھے: ''میں یہودی ریاست کی تخلیق کے بجائے عربوں سے امن کی بنیاد پر ساتھ ساتھ رہنے کے ایک معقول معاہدہ کو ترجیح دوں گا۔ یہودیت کی بنیادی نوعیت کے بارے میں میرا علم سرحدوں، فوج اور دنیاوی اقتدار خواہ وہ کتنا ہی معتدل ہو، والی یہودی ریاست کی مزاحمت کرتا ہے۔ میں اس اندرونی نقصان سے خائف ہوں جو یہودیت کو پہنچے گا۔ خصوصاً ہمارے اندر ایک تنگ نظر قوم پرستی کے پھیلنے سے۔'' (جانسٹن، حوالہ سابق، 47-446)

سعودی عرب میں اصلاحات

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جن کو تمھارے درمیان اختیار دیا گیا ہے اور اگر کسی امر میں تمھارے درمیان اختلاف پیدا ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کے پاس لے جاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ (سورۃ النساء: 59)

یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نام نہاد سلطنت سعودی عرب کی حکمراں ایک کافر حکومت ہے جس کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔

('اسلامک موومنٹ فار چینج' کے عرب جزیرہ نما کے جہاد ونگ کا بیان نمبر 1، اپریل 1995)

اپنے ایک کھرب بیرل یقینی قابل وصول تیل اور ثابت شدہ 264.2 ارب بیرل تیل۔ جو دنیا کے کل تیل کا 26 فیصدی ہے۔ اور خام تیل کی 8 ملین بیرل سے زیادہ روزانہ کی پیداوار (10.5 بیرل روزانہ کی پیدائش کی صلاحیت کے ساتھ) (1) سعودی عرب نے گزشتہ پانچ دہائیوں میں دنیا کی صنعتی ترقی یافتہ اور صنعتی ترقی پذیر ملکوں کی معیشت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی غرض سے بیرونی دنیا میں تیل کی صنعت کی ہموار کارکردگی کی خاطر ملک

کے استحکام میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ سعودی سلطنت کی متعلقہ اہمیت اس کے رقبہ، خلیج فارس اور بحر احمر کے ساحل پر اس کی حساس مقامیت، ساز و سامان اور خدمات کے سلسلہ میں اس کی مارکیٹ کی وسعت، اپنی اسلامی ریاست ہونے کی خودساختہ شناخت اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے دو مقدس ترین مقامات کا اس کی حدود میں واقع ہونے سے، بہت بڑھ گئی ہے ان اسباب کی وجہ سے سعودی عرب میں ماضی قریب میں ہونے والے واقعات ایک گہری تحقیق کا تقاضہ کرتے ہیں۔

☆ آخر ایک اسلامی ریاست، اسلامی حلقوں کی تنقید کا شکار کیوں ہو رہی ہے؟

☆ آخر کیوں حکمراں کی اطاعت اور اللہ کی اطاعت کو ایک دوسرے کے مماثل سمجھا جارہا ہے؟

☆ کیا حکمرانی میں کوئی بحران ہے؟

☆ اس کی نوعیت کیا ہے؟

☆ ملک کے قومی ارتقا میں اس کا اثر کتنا ہے؟

ان سوالوں کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سیاست کا مقام اور حکمرانی کے مقصد کا جائزہ لیا جائے۔ ان کا تعلق 'انسانی زندگی میں اسلام کا ایک جامع نظام کی حیثیت سے شامل ہونا' اور اس نظام کے عالمی نفاذ اور اطاعت کے واسطے سیاست کو ایک لازمی آلہ کی حیثیت سے اختیار کرنے کے رابطہ میں موجود ہے۔(2) لہٰذا ایک مسلم معاشرہ میں مومنوں کو اجتماعی طور سے کچھ فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پابند ہونا ہوتا ہے۔ لہٰذا اقتدار کے وجود کی ضرورت خود بخود پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے قانونی جواز اور اقتدار کے حدود کی نشاندہی بھی لازمی ہوجاتی ہے۔ ایک قرآنی آیت (iv:59) میں اس مسئلہ کو متعین شرائط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جن کو تمھارے درمیان اختیار دیا گیا ہے اور اگر کسی امر میں تمھارے درمیان اختلاف پیدا ہو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کے پاس لے جاؤ اگر تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو''۔ اسی کو بنیاد

بناتے ہوئے فقہا نے خلافت کا ایک جامع نظریہ تیار کیا جس کی چاروں سنّی مسلک کے اسکولوں نے تائید کی۔ اس کی سب سے بہترین وضاحت گیارھویں صدی میں الماوردی نے کی اور اس منصب اور اختیار کا مقصد (دین کو قائم کرنا اور دنیاوی امور کا انتظام کرنا) بیان کیا اور خلیفہ یا امام کی ذمہ داریوں کو واضح کیا (3) کچھ صدیوں بعد سیاسی ابتری اور مزاج کے خطرے کو بھانپتے ہوئے فقہا نے نظم ونسق برقرار رکھنے کی صلاحیت کو اس منصب کی اولین شرط قرار دیا۔ اس کے باوجود، خلافت کے لیے مذہبی اجازت کا حیلہ قانونی اور رعایا کی حکمراں سے مشروط وفاداری عوام کے ذہنوں اور نظریہ ریاست میں باقی رہا۔ ایک متوازی طرز فکر نے حکمراں کی غیر اطاعتی کے خلاف لوگوں کو خبردار کیا لیکن اسی کے ساتھ اس نے اطاعت گزاری کی حدود مقرر کردیں۔ حنبلی فقہ کے عالم ابن تیمیہ کی تحریروں میں اس کی وضاحت پائی جاتی ہے (4)۔ سعودی علما اور جج ان تحریروں کو بنیادی متن تصور کرتے ہیں۔

سعودی عرب میں اصلاحات پر مباحثہ میں انھی تصورات کا نقش جھلکتا ہے۔

امام۔بادشاہ: سعودی عرب پہلی جنگ عظیم کے بعد عالم وجود میں آیا۔ فتوحات، اپنے بدوی حمایتوں کو زرعی کمیونیٹیوں میں بسانا، دشمنوں پر سیاسی دباؤ اور برطانوی سفارتکاری حمایت نے مجموعی طور پر سلطان نجد وقرب وجوار عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن السعود کو اس قابل کیا کہ وہ اپنی بالادستی قائم کرے اور 1932 میں سلطنت سعودی عرب کا اعلان کرے۔(5) چھ سال قبل یعنی 1926 میں حجاز پر قبضہ ہوجانے کے بعد اس نے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے عالم اسلام کی ایک کانفرنس بلائی تاکہ دنیا کی مختلف مسلم کمیونٹیوں میں باہمی افہام و تفہیم میں ترقی ہو اور سالانہ حج کے انتظامات میں سدھار پیدا کیا جاسکے (6) سلطنت کی تعمیر وتوسیع کے عمل میں بادشاہ کو ایڈجسٹ منٹ کے کئی مراحل سے گزرنا پڑا اور کئی سیاسی حریف، روایتوں اور رسوم کے لیے گنجائش نکالنی پڑی۔ حجاز میں پرامن داخلہ اس لیے ممکن ہوسکا کہ مکہ اور جدہ کے اشراف نے ساتھ ہوکر ایک نیشنلسٹ پارٹی بنائی اور ایک اسمبلی (المجلس الاعلی) کو منتخب کیا اور ابن سعود کو علاقہ کی حکمرانی کے لیے دعوت دی۔ 1926 میں جو انتظامی امور رائج کیے گئے ان میں اس صوبہ کے انتظام کے لیے ایک خاص ضابطہ (القانون

الاساسی) منظور کیا گیا تھا۔ اور اس کو اس بنیاد پر صحیح ٹھہرایا گیا تھا کہ اسلام نے شوریٰ کے اصول کو متعارف کرایا ہے۔(7) متن پر اس انحصار (جیسا کہ ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کے متبعین نے سمجھا) کو اپنے نجدی حامیوں کو تسلی دینے کے لیے بھی استعمال کیا گیا جن کو مفتوحہ علاقہ میں سلفی معمولات اور رسومات کے نفاذ سے مطمئن کیا گیا۔ اگر ان میں سے کچھ حمایتی کبھی حد سے آگے بڑھے اور جب کبھی ان پر قابو پایا گیا تو بادشاہ نے ان کے ساتھ بیدردانہ برتاؤ کیا۔(8) ابتدا زمانہ اور سلطنت میں انتظامی مرکزیت و اتحاد کے ظہور سے حجاز کے عوام کو دی گئی ابتدائی معمولی سیاسی آزادی بھی رفتہ رفتہ غائب ہوگئی۔ ایک متوازی فرع میں شرعی عدالتوں کے ججوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ بقیہ مسلکوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فیصلے صرف فقہ حنبلی کی روشنی میں صادر کریں۔(9)

اگلی دو دہائیوں اور 1953 میں اپنی موت تک ''بادشاہ ہی ریاست تھا کیونکہ اس کی ذات کے علاوہ وفاداری وعقیدت کا کوئی اور محور نہ تھا''(10) اس کی موت کے بعد ایک غیریقینی صورت حال جاری رہی جب کہ سعود اور فیصل کی خاندانی کشمکش خود کو سلجھاتی رہی۔ اس کا ایک دلچسپ پہلو طلال اور چھ دیگر ابناء عبدالعزیز (بشمول عبداللہ، موجودہ ولی عہد) کا ''ینگ نجد'' کے نام سے ایک تنظیم کا قیام تھا جس کا مقصد دستوری نفاذ کے قانون 'دستوری بادشاہت' 120 اراکین پر مشتمل ایک قومی کونسل جس میں 40 نامزد اور 80 منتخب ہوں اور جس کو بل پیش کرنے، وزیروں سے سوالات کرنے اور ووٹ کے ذریعہ حکومت کو باہر کرنے کا اختیار ہو، کے حصول کے لیے ایک اصلاحی تحریک چلائی جائے۔(11) طلال نے بنیادی قانون کا ایک مسودہ بھی تیار کیا۔ 200 مضامین پر مشتمل یہ مسودہ ماہرانہ ومساویانہ طریقہ سے اسلامی نص اور مذہبی اصولوں کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا۔ اس میں ایک باب سربراہ مملکت کی حیثیت سے بادشاہ پر بھی تھا۔ بادشاہ پر اپنے منصب کی حلف برداری کو لازمی قرار دیا گیا جس کی رو سے وہ اسلامی اصولوں کی حفاظت اور 'بنیادی قانون' کا احترام کرے گا اور یہ پابندی بھی رکھی کہ بادشاہ حکومت کا کام قومی اسمبلی کی شرکت میں کرے گا۔ سعودی حوالہ سے مسودہ کے دیگر ضابطے بھی قریب قریب اختراعی تھے: اسمبلی کو بغیر سبب بتلائے تحلیل نہیں کیا جاسکتا؛

ایک ہی وجہ سے اسمبلی کو ایک سے زیادہ بار تحلیل نہیں کیا جاسکتا اور چار مہینے کے اندر لازمی طور سے اس کی تشکیل نو ہو؛ ریاست کی کل آمدنی ایک جنرل بجٹ میں جانی چاہیے اور بغیر باضابطہ اجازت اور قانونی اختیار کے اس کا کچھ بھی حصہ خرچ نہ ہونا چاہیے(12)۔ اتنی آزادانہ تجاویز کو شاہی خاندان نے خوش آمدید نہیں کہا بلکہ فیصل کے قدم جب تخت پر مضبوطی سے جم گئے تو اس نے ان تجاویز کو بے اثر کرنے کے لیے 6 نومبر 1962 کو حکومت کے لیے ایک بنیادی قانون پیش کیا جو'' قرآن، سنتِ رسول اور خلفاء راشدین کے آثار سے اخذ نیا گیا تھا اور جو تفصیل کے ساتھ حکومت کے اصولوں اور حاکم ومحکوم کے باہمی تعلق کی وضاحت کرے گا۔ ریاست کی مختلف قوتوں اور ان قوتوں کے درمیان آپسی تال میل کو منظم کرے گا، شہریوں کو ان کے بنیادی حقوق بشمول اسلامی عقیدہ اور عوامی پالیسی کے حدود میں حقِ آزادیِ اظہار رائے عطا کرے گا''۔ اس کے علاوہ فیصل نے غلامی کو مٹانے، انتظامیہ میں جدت پسندی، مذہبی اور عدالتی اداروں کی تنظیم نو، مزدوروں اور معاشرتی قوانین کا سدھار، قدرتی ذخیروں کا تعمیری استعمال، فعال بنیادی ڈھانچہ کا بنانا اور مقامی مشاورتی کونسل کے قیام پر مبنی ایک دس نکاتی پروگرام بھی پیش کیا۔ ان میں سے کچھ پروگرام تو فوراً نافذ ہوگئے جب کہ پروگراموں کو مقابلتاً کم تن دہی سے انجام دیا گیا۔ شوریٰ کونسل کا قیام دوسرے زمرہ میں تھا(13)۔ 1963 کی ہدایات برائے تشکیل صوبائی کونسل کا بھی یہی حشر ہوا۔(14)

لہٰذا شاہی خاندان میں اختلاف کے باوجود، بیرونی حالات کے دباؤ (بشمول یمنی انقلاب اور مصر کا اس میں ملوث ہونا)، اصلاحی پیکیج کی پیش کش کے وعدہ کے باعث عوام میں امید افزا موڈ کی موجودگی کے نتیجہ میں فیصل کے تحت مطلق العنان بادشاہت کا ظہور ہوا۔ اس درجہ کو مزید قوت صدر کینیڈی کی اس یقین دہانی سے ملی جو انھوں نے 25 اکتوبر 1962 کو خصوصی طور سے دی تھی کہ'' سعودی عرب کی سالمیت کی برقراری کو یو ایس کی مکمل حمایت حاصل ہے''(15) اس کے بعد بادشاہ کی توجہ مالی اور انتظامی اصلاحات، معاشرتی پابندیوں میں معتدل رعایت خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلہ پر مرکوز ہوگئی۔ یونیورسٹیوں کی تعداد اور ان کی وسعت میں قابل ذکر اضافہ ہوا۔ جزئی طور سے اس کا مقصد ریاستی صنعت کاری اور

دفتری نظام میں خالی اسامیوں کو بھرنا تھا۔ یہ فیصل کے اس یقین سے ہم آہنگ تھا جو فیصل نے شاہی خاندان میں اپنے حامیوں کے درمیان پیدا کیا تھا(16)۔ فیصل نے خارجہ پالیسی میں بھی اسلامی جہت کا اعلان کیا۔ اس اعلان کی ضرورت شاید عالمی کیمونزم کے متوقع خطرہ اور ان کی اس سے ذاتی بیزاری کی وجہ سے ہوئی۔ ایک زیادہ واضح سبب عرب قومیت کے نظریہ اور عوامی رائے پر اس کے اثر کا خاتمہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ سب اسلامی یگانگت کے تصور کے تحت انجام پایا۔ یہ تصور رسمی طور سے فیصل شاہ ایران کے دسمبر 1965 کے مشترکہ اعلانیہ کی دین ہے۔ فیصل نے اپنے 1966 کے مسلم ممالک کے دوروں میں اس تصور کو روشناس کرایا۔ اس عمل کی انتہا 1969 میں آرگنائزیشن آف دی اسلامک کانفرنس کے قیام میں ظاہر ہوئی۔(17) فیصل کی پان اسلامک پالیسی ایک ماسٹر اسٹروک تھی جس سے دو مقاصد حاصل ہوتے تھے۔ داخلی طور سے یہ السعود کی سیاسی قانونی جواز کو تقویت بخشتی تھی دوسری جانب یہ اسلامی دنیا میں سلطنت کے وقار کو مضبوط کرتی تھی جس سے سلطنت کو ایک ناقابل تسخیر مرکزیت حاصل ہوئی۔ دس نکات کے پروگرام میں وعدہ کیے گئے دوسرے نکات نافذ نہیں کیے گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اضطراب و بے چینی پیدا کی۔ 1969 میں ایرفورس کے اندر ایک اوسط درجہ کی سازش کا انکشاف ہوا۔ تیل سے حاصل ہونے والی تیز رفتار دولت اور کرایہ خور ریاست کے ڈھانچہ کی مضبوطی نے اقتدار و اختیار پر نظر رکھنے کے ابتدائی نظام کو بہت کمزور کردیا(18)۔ اقتدار اور دولت کا شاہی خاندان میں مرکوز ہونے اور اس کے کچھ اراکین جو سرکاری عہدوں پر فائز تھے، کی قابل ذکر عیاشی نے عوام کے کچھ طبقوں میں ناراضگی پیدا کی۔

اصل دھماکہ مکہ میں 20 نومبر 1979 کو ہوا۔ قبائلی اصل کے 400 سعودیوں اور 18 دوسرے عربوں نے حرم مکہ پر قبضہ کرلیا اور دو ہفتہ تک حفاظتی افواج سے مقابلہ کرتے رہے۔ ان کا قائد جھیمہ ابن محمد ابن سیف العتیبی، نیشنل گارڈز کا رکن رہ چکا تھا، اسلامی یونیورسٹی مدینہ میں تعلیم حاصل کرچکا تھا اور مذہبی کتابوں پر دسترس رکھتا تھا۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار سب سے پہلے ایک مضمون (جو کویت میں شائع ہوا اور سعودی عرب

اسمگل کیا گیا) بعنوان ''اطاعت و وفاداری کے اصول: حکمرانوں کی بے راہ روی'' کے ذریعہ کیا۔ دلائل کلاسیکی خطوط پر تھے کہ وہ مسلم حکمراں جو قرآن اور سنت کے تابع نہیں ہیں اپنا قانونی جواز کھو چکے ہیں لہٰذا ان کی مخالفت کرنی چاہیے اور ساتھ ہی ان علما کی بھی جو ''ایک بدعنوان حکومت کے پیسے سے پروان چڑھائے گئے ہیں اور جن سے ترقی کے وعدے کیے گئے ہیں''۔ السعود اسی زمرہ میں آتے ہیں لہٰذا ان کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔ اپنے ایک اور مضمون 'اخوان کی پکار' میں اس نے اس قدیم عقیدہ کو تازہ کیا کہ مومنین کے دفاع اور معاشرہ کو مستند اسلامی خطوط پر تشکیل کرنے کے لیے مہدی کا ظہور ہوگا۔ حرم مکہ پر قبضہ کے دوران اس نے اپنے ساتھیوں (اور محصور حجاج) سے مہدی کے بیسویں صدی کے مظہر کا تعارف کرایا جو ریاض میں اسلامی یونیورسٹی کا ایک 27 سالہ طالب علم محمد بن عبداللہ القحطانی تھا۔(19)

حکومت نے اس کا جواب طاقت سے دیا اور تقدس کی پامالی کو سینئر علما کی کونسل کے ایک فتویٰ سے جائز قرار دیا کہ سعودی حکومت شریعت کے اصولوں کے مطابق کام کرتی ہے لہٰذا اس کے خلاف بغاوت غداری ہے۔(20) بعد میں علما نے اپنے خطبوں میں شاہی خاندان کی مذہبیت اور اسلام کے اعتدال پسندانہ رویہ پر زور دینا شروع کیا۔ لیکن اس واقعہ نے یہ ثابت کردیا کہ حکومت ایسے حملہ آوروں کے لیے آسان ہدف ہے جن کا منبع مذہبی عناصر ہیں اور عصری صورت حال سے روایتی مذہبی معمولات کو ہم آہنگ کرنے میں السعود کے تذبذب کو نمایاں کیا۔ قدامت پرست عناصر کو مطمئن کرنے کے لیے خواتین اور بیرونی باشندوں پر مزید معاشرتی پابندیاں عائد کی گئیں اور مذہبی اداروں کو ملک اور بیرون ملک اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے کثیر رقوم عطا کی گئیں(21)۔

حکومت کی پریشانیوں میں اضافے کے لیے پندرہ دن کے اندر مشرقی صوبہ کے شیعہ اکثریتی آبادی کے شہر قطیف میں عاشورہ کے ایک جلوس میں پولیس کی نااہل کارکردگی کی وجہ سے خطرناک احتجاج اور تشدد پھوٹ پڑا۔ اس واقعہ کو ایران کے حوالے سے دیکھا جارہا تھا جہاں چند ماہ قبل شاہ ایران کی بے دخلی اور اسلامی انقلابیوں کی کامیابی نے خلیج کی

بادشاہتوں کے ہوش اڑا دیے تھے۔ لہٰذا ایک بار پھر کچھ مہربانیاں کی گئیں اور 'بنیادی قانون' اور مشاورتی اسمبلی کی شکل میں وعدے کیے گئے۔ 15 جون 1983 کو شاہ فہد نے اسلامی علما کو دعوت دی کہ وہ اسلامی قوانین کو شدید اجتہاد کے ذریعہ جدید رنگ میں ڈھالنے کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائیں۔ 1986 میں بادشاہ نے اپنے نام سے 'ہز میجسٹی' کا باوقار لقب نکال دیا اور اس کی جگہ روایتی اور پاکیزہ 'خادم الحرمین' اختیار کیا(22) اس کے آگے بادشاہ نے، جو اصلاح پسندوں اور قدامت پسندوں کے دعووں کے درمیان گھرا ہوا تھا، کچھ نہیں کیا۔ 1980 کی کساد بازاری کو اس بے حسی کے لیے بہانہ بنایا گیا جو اس کے خاندانی بزنس جس کا وہ سربراہ تھا، کے مفادات کے حق میں تھا۔ لیکن ایک دوسری جانب 1987 تک سعودی معاشرہ میں اسلام اور جدیدیت کے بارے میں شدید بحث جاری تھی اور اسی طرح آڈیو کیسٹس کا استعمال ہو رہا تھا تاکہ پیغام ایک وسیع حلقہ تک پہنچ سکے۔(23) اس پورے عمل میں ایک پوشیدہ عنصر (جو حکومت کے علم میں تھا) یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ کچھ سعودیوں کا تھا جو افغانستان میں جہاد میں شامل تھے اور نتیجہ کے طور پر ایک انقلابی رجحان کے حامل تھے۔

جنگ: تبدیلی کے مؤثر عامل کی حیثیت سے: 2 اگست 1990 کے کویت پر عراقی حملہ نے حکومتوں، علاقے اور پوری دنیا کو شدید دھچکا پہنچایا۔ اس نے عرب سیاست کے ضابطے تبدیل کر دیے۔ عراق اپنے فوری مقاصد یعنی الصباح خاندان کی گرفتاری اور کویت کی سرحدوں کو بند کرنے میں ناکام رہے۔ سعودی فوجی لحاظ سے تیار نہیں تھے اور ''لمبی شمالی سرحد کے دفاع میں لڑنے کی حالت والے فوجیوں کی تعداد 8000 سے کم تھی'' (24) یونائیٹڈ اسٹیٹس سے مدد کی درخواست ایک قومی سلامتی پالیسی کے تحت تھی جس کو کئی دہائیاں پہلے تیار کیا گیا تھا اور جس کی تجدید وقفہ وقفہ سے ہوتی رہی تھی۔ یہ اس مفروضہ پر مبنی تھی کہ 'باہری حملہ آور جغرافیائی محل وقوع' سلامتی کی امریکی ضمانت اور سعودی سفارتکاری کے میلان روکیں گے، اس میں یہ تصور بھی شامل تھا کہ یو ایس اور دوسروں کی کمک آتے آتے سعودی افواج میں مورچہ سنبھالنے کی صلاحیت ہے۔(25) ریاض میں ایک عام خیال یہ تھا کہ کویت کی

عدم موجودگی، جلد یا بدیر، سعودی عرب کی شناخت اور سلامتی کے لیے بڑا خطرہ ثابت ہوگی اور یہ کہ عرب حل کی بات محض واہمہ ہے اور صرف یونائٹیڈ اسٹیٹس ہی معنی خیز طریقہ سے صورت حال پر توجہ دے سکتا ہے۔ لہٰذا فہد کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ امریکنوں کو بلائے خواہ اس میں ملکی عوام کے ایک حصہ اور مسلم دنیا سے منفی ردعمل کا خطرہ ہو۔(26) جیسا کہ حرم مکہ پر قبضہ کے وقت کیا گیا تھا اس بار بھی بادشاہ نے اپنی قوت کو فتویٰ کے ذریعہ مزید مضبوط کیا۔ فتویٰ نے امت اور اس کے وسائل کے دفاع کے لیے ہر ممکن ذریعہ کی ضرورت پر زور دیا اور عرب اور غیر عرب ممالک سے مدد کی درخواست کی تحریک کی حمایت کی۔ لیکن ان سب سے قطع نظر کثیر تعداد میں امریکی اور اتحادی افواج کی آمد اور ڈیڑھ ہزار سے زیادہ میڈیا کے نمائندوں کی موجودگی نے عوام کی ناراضگی کو ابھارا اور کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا اثر آج بھی محسوس کیا جارہا ہے۔

کویت کا بحران سماجی اضطراب کا محرک بن گیا۔ چبھتے ہوئے سوالات پوچھے گئے۔ کچھ لوگوں کو یہ تعجب تھا کہ 300 بلین ڈالر خرچ کرنے کے باوجود سعودی عرب کیوں ابھی تک اپنے دفاع کے قابل نہیں ہے۔ دیگر لوگ خصوصاً مذہبی حلقوں میں یو ایس کے مقاصد کے بارے میں شکوک میں مبتلا تھے۔ زیادہ تعلیم یافتہ طبقہ کا خیال تھا کہ یہ صورت حال انتظامی امور میں نااہلی کے باعث ہے لہٰذا وہ اصلاحات کے خواہاں تھے۔ ان خیالات کو دو دستاویز میں حتمی شکل دی گئی جو دو مختلف نظریوں کے حامل حلقوں سے آئے تھے۔ ان کو دسمبر 1990 اور مئی 1991 میں بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ دونوں ہی نے بادشاہ کو نصیحت دینے کا کلاسک اور مقبول اسلامی طریقہ کار اختیار کیا۔ ان میں پہلا ''تبدیلی کی درخواست'' 43 ایسے دانشوروں کی جانب سے آیا تھا جو خود کو 'ترقی پسند قدامت پرست کہتے تھے'(27) خود کو وفادار شہری کہتے تھے اور موجودہ نظام حکومت اور شاہی خاندان سے وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ اصلاحات کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے بجائے ردعمل کے واقعات کے رونما ہونے کا اندازہ کرنے پر زور دیا سعودی عرب کو ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کے لیے انھوں نے دس نکاتی پروگرام پیش کیا:

1- فتویٰ کے لیے ایک منظم فریم ورک ہو۔ اس میں شریعت کا خاص حصہ ہو جو غلطیوں سے پاک اور تبدیلیوں سے پرے ہے اور قرآن وسنت کے مطابق ہے۔ لیکن فقہی تفسیریں، قرآنی ترجمانوں کی رائے اور شریعت کے ماہروں کی آراء مختلف الخیال علمی نظریات شریعت کے نص کے تفہیم کے لیے محض انسانی کاوشیں ہیں۔ منزل من اللہ اور غیر مبہم نصوص کو قبول کرنا اور ان کی اطاعت کرنا ہوگی۔ لیکن علمی آراء کو غیر محدود طریقہ سے پرکھا اور سمجھا جائے گا۔

2- ملک کے حکمرانوں کے ذریعہ مختلف زبانوں میں دیے گئے بیانات اور اقرارناموں کی روشنی میں حکومت کے لیے ایک بنیادی قانون پر غور کرنا ہوگا۔

3- ایک مشاورتی کونسل کی تشکیل جو اہل اور باعلم آراء کے حامل اور اپنی ایمانداری، دوراندیشی، غیرجانبداری، اخلاقیات اور عوامی خدمت کے لیے معروف افراد پر مشتمل ہو اور جو سلطنت کے ہر علاقہ کی نمائندگی کرتے ہوں۔ کونسل کی ذمہ داریوں میں لازی طور پر تمام معاشی، سیاسی، تعلیمی اور دیگر معاملات سے متعلق قوانین اور ضابطوں کا مطالعہ، فروغ اور ان کی منظوری شامل ہو اور وہ تمام انتظامی اداروں کی مؤثر تفتیش کرے۔

4- میونسپل کونسلز کی تجدید، صوبائی قوانین کا نفاذ اور تمام تجارتوں کے لیے چیمبر آف کامرس کی عمومیت کا تجربہ۔

5- ججوں اور ان کے نائبوں کی تربیت و تیاری کے عمل کو بہتر بنانے، قوانین کو جدید انداز میں ڈھالنے کے لیے عدلیہ کے نظام کے ہر پہلو کی تحقیق۔ اس اہم میدان کی تربیت گاہوں کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہونے چاہئیں اور وہ کسی خاص فرقہ اور گروپ کے لیے مخصوص نہ ہوں جو کہ شریعت پر مبنی اصول 'مساوی مواقع' کے منافی ہے۔

6- یہ ذمہ داری کہ تمام شہریوں کو ان کی زندگی کے ہر پہلو میں بغیر نسلی، قبائلی طبقاتی یا معاشرتی اصل کے امتیاز کے مکمل مساوات حاصل ہوگی۔ دخل اندازی

سے شہریوں کی حفاظت، سوائے عدالتی احکامات کے، کے اصول کو سختی سے قائم کیا جائے۔

7- میڈیا پالیسی پر نظرثانی کی جائے اور اس کو ایک حتمی اور جامع قانون کے تحت جو دوسرے ممالک کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوانین کا آئینہ دار ہو۔ اس قانون کے ذریعہ کل سعودی میڈیا اس قابل ہو جائے کہ وہ آزادی کے ساتھ اچھائی کی برائی کے مقابلہ میں تبلیغ کر سکیں، نیکیوں کی طرف بلائیں اور بدی سے روکیں اور ساتھ ہی ایک آزادانہ مسلم سماج میں مذاکرات کو صحت مند بنائیں۔

8- ''انجمن برائے تبلیغ نیکی و امتناع بدی'' کی جامع اصلاح کی جائے۔ ایک ایسے حتمی قانون کی ضرورت ہے جو ان کی سرگرمیوں اور طریقہ عمل کو متعین کر سکے۔ نواحی علاقوں کے سرداروں اور افراد سے اجرت پر کام لینے کے لیے سخت قوانین بنائے جائیں تاکہ منصفانہ اور باتدبیر تبلیغ کی یقین دہانی ہو سکے۔

9- نئی نسل کی تربیت، مسلمان عورت کا اعلیٰ ترین فریضہ ہے۔ عوامی زندگی کے کئی پہلو ہیں جہاں عورت کو شریعت کی حدود میں رہ کر کام کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس طرح ان کے وقار میں اضافہ ہوگا اور معاشرہ کی تعمیر میں ان کے کردار کو تسلیم کیا جائے گا۔

10- قوموں کی ترقی اور نشاۃ ثانیہ کے لیے تعلیم اوّلین اور اہم ترین بنیاد ہے۔ نظام تعلیم کو بھی ایک مکمل اور بنیادی اصلاح کی ضرورت ہے۔ تاکہ وفادار نسلوں میں وہ تعلیم یافتہ پیدا ہو سکیں جو موثر اور مثبت طریقے سے ملک کے حال اور مستقبل کی تعمیر میں حصہ لے سکیں اور زمانہ کے چیلنج کا مقابلہ کر سکیں۔ اس طرح سے ہم قوموں کے اس کاروان کے برابر آسکیں گے جس نے ہر میدان میں ہم کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

دوسری دستاویز ''پیغامِ نصیحت'' (28) اکیاون مذہبی اور علمی شخصیات کے دستخط کے ساتھ جس میں مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز بھی شامل تھے، بادشاہ کو بھیجا گیا تھا۔ کچھ

حد تک یہ پہلی 'نصیحت' کے ردِعمل میں تھی۔ اس میں مذہبی اعتبار سے فرائض کے متعلق حکمراں کو ہدایت دینے میں مذہبی علما کے رول پر اصرار کیا گیا۔ اس میں زور دیا گیا کہ ''ایسے نازک وقت میں جب سب تبدیلی کی ضرورت سے متفق ہیں'' 12 نکاتی پروگرام کے مطابق اصلاحات نافذ کرنا چاہئیں:

1- ایک مشاورتی کونسل کا انعقاد جو داخلی اور خارجی معاملات میں شریعت کے مطابق فیصلہ دے۔ اس کے اراکین ایماندار، صاف گو اور مہارت کے ہر میدان کی نمائندگی کرتے ہوں۔ وہ مکمل طور پر خودمختار ہوں اور کسی ایسے دباؤ میں نہ ہوں جو کونسل کے اختیار کو متاثر کر سکے۔

2- سیاسی، معاشی، انتظامی یا دیگر نوعیت کے تمام قوانین اور ضابطے شریعت کے اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔ امور شریعت میں ماہر کمیٹیوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ایسے قوانین کو منسوخ کر دیں جو شریعت کے اصولوں پر پورا نہ اترتا ہو۔

3- سرکاری افسروں اور ان کے بیرونی نمائندوں کو اپنے کام میں مخصوص مہارت، خلوص اور دیانت داری کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا بھی سختی سے پابند ہونا چاہیے۔

4- انصاف نافذ ہو۔ حقوق کی ادائیگی اور ذمہ داریوں کی تقسیم تمام شہریوں کے درمیان مساوی ہو۔ امرا کے ساتھ کوئی رعایت اور غریبوں کے ساتھ کوئی امتیاز نہ ہو۔ اختیار کا غلط استعمال خواہ وہ کسی سے ہو اور چاہے وہ ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالنے کی صورت میں ہو یا عوام کے حقوق کی عدم ادائیگی کی شکل میں ہو معاشرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اس کی بربادی کا سبب ہوتا ہے۔

5- تمام سرکاری افسران خصوصاً وہ جو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں بغیر کسی استثنٰی کے جوابدہ ہوں اور سخت نگرانی کے تحت کام کریں۔ سرکاری دفاتر کو بغیر کوئی اور غور کیے ثابت شدہ بدعنوان اور غیر ذمہ دار عناصر سے پاک کرنا ہوگا۔

6- عوامی دولت ہر طبقہ اور فرقہ میں مساوی تقسیم ہو۔ ٹیکسوں کو ختم کریں اور جو فیس

عوام پر گراں بار ہے اس کو کم کیا جائے۔ سرکاری آمدنی کی استحصال اور غلط استعمال سے حفاظت کی جائے۔ اخراجات میں سب سے زیادہ فوری اور لازمی ضرورتوں کو ترجیح دی جائے۔ ہر قسم کی اجارہ داری اور غیر قانونی ملکیت کو ختم کیا جائے۔ اسلامی بینکوں پر عائد پابندیاں ہٹائی جائیں۔ پبلک اور پرائیویٹ بینکنگ اداروں کو سود سے پاک کیا جائے جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی اور دولت کے فروغ میں رکاوٹ ہے۔

7- ایک مضبوط اور مکمل طور سے متحد فوج تیار کی جائے جو ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو خواہ وہ کسی ذریعہ سے حاصل کیے ہوں۔ اسلحہ کی پیداوار اور فروغ پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ فوج کا مقصد ملک اور حرمین کا دفاع ہوگا۔

8- انفارمیشن میڈیا کو سلطنت کی اختیار کی ہوئی میڈیا پالیسی کے مطابق دوبارہ تشکیل کیا جائے۔ اس کا مقصد تعلیم، اسلام کی خدمت اور معاشرہ کی خوبیوں کو اجاگر کرنا ہو۔ جو کوئی بھی ان مقاصد کے غیر موافق ہو، میڈیا کو اس سے پاک کر دینا چاہیے۔ عوامی بیداری کو سچی رپورٹنگ اور تعمیری تنقید کے ذریعہ پھیلانے میں اس کی آزادی کی حفاظت کی جانی چاہیے جو کہ اسلامی حدود کے دائرہ میں ہو۔

9- غیر شرعی اتحاد پر انحصار نہ کرتے ہوئے خارجہ پالیسی قومی مفاد پر مبنی ہو۔ اس میں مسلم مفادات کو بھی شامل کیا جائے۔ سلطنت کے سفارتخانوں کی اس طرح اصلاح کی جائے کہ وہ ملک کے اسلامی مزاج کے آئینہ دار بنیں۔

10- مذہبی اور تبلیغی اداروں کو ترقی دی جائے اور ان کو مالی اور انسانی وسائل سے مضبوط بنایا جائے۔ اپنے مقاصد کے حصول میں جو دشواریاں ان کو پیش آئیں ان کا سدِ باب کیا جائے۔

11- قانونی اداروں کو متحد کیا جائے اور ان کو مکمل اور بااختیار آزادی دی جائے۔ قانون کی بالادستی سب پر نافذ ہوگی۔ یہ لازمی ہے کہ ایک ایسی خودمختار تنظیم قائم ہو جس کی ذمہ داری عدالتی احکامات کا نفاذ ہو۔

-12 انفرادی اور اجتماعی حقوق کی ضمانت دی جائے۔ عوام کے حقوق اور ان کے اداروں پر عائد کی گئی ہر پابندی ہٹائی جائے اور منظور شدہ مذہبی حدود میں انسانی عظمت اور خوشحالی کو بحال کیا جائے۔

ان چیلنجز پر حکومت کا ابتدائی ردعمل تذبذب کا تھا۔ علما کی ایک اور جماعت سامنے آئی جس نے ان نصیحت ناموں کے پیش کرنے کے کھلے ہوئے نامناسب طریقہ پر اعتراض کیا۔ ''حکمراں کو نصیحت مخلصانہ ہونی چاہیے اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار کے خوف سے اس کو پوشیدہ رکھنا چاہیے''۔ اپنی جانب سے ارباب حل و عقد نے حکمرانوں کی اطاعت پر زور دیا اور مستقبل میں کسی ایسے عمل سے احتیاط برتنے کی تاکید کی۔ طویل مدت سے واجب کچھ اصلاحات پر اوّلین قدم اٹھائے گئے۔ مارچ 1992 میں ''حکمرانی کے بنیادی قوانین'' کا اعلان کیا گیا تاکہ ''مروّجہ طریقوں کو مدون کیا جائے'' اور ''ملک کی انتظامیہ پر عام نظرثانی کی جائے''۔ دفعہ 12 میں اس نے ان تمام سرگرمیوں کو ممنوع قرار دیا جو ''تفریق، تقسیم اور بدنظمی کی جانب لے جاتی ہوں اور (دفعہ 26 میں) شریعت کے مطابق انسانی حقوق کی ضمانت دی اور دفعہ 55 میں بیان کیا کہ بادشاہ ''شریعت کے مطابق قوم پر حکمرانی کرے گا'' اور ''شریعت کے نفاذ کی نگرانی بھی کرے گا''۔ قانون اور ضابطے (دفعہ 67) شریعت کے مطابق بنائے جائیں گے۔ دفعہ 68 نے ''ایک موجودہ نظام کی ترقی اور جدیدیت'' کے لیے ایک مشاورتی کونسل (شوریٰ) کا اعلان کیا۔ ایک علاحدہ شاہی فرمان نے تفصیلات واضح کیں بشمول اس حقیقت کے کہ نئے قانون نے 65 سال پرانے بنائے ہوئے قانون کی جگہ لے لی ہے۔(29) لیکن ان سب سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ستمبر 1992 میں 400 سے زیادہ علما جج اور دانشوروں نے ایک 'ایکسپلینیٹری میمورنڈم آف ایڈوائس' پر دستخط کیے۔ اس نے ظاہری طور سے پہلے کے دیے ہوئے میمورنڈم آف ایڈوائس کو مزید واضح اور نمایاں کیا۔ اسی عمل میں میمورنڈم نے مطالبات کا ایک نیا مجموعہ بھی پیش کردیا: علما پر سے پابندیوں کو ہٹایا جائے؛ ان کی فضیلت کو تسلیم کیا جائے؛ انتظامیہ کی مکمل تطہیر؛ موجودہ 'سیکولر' قوانین پر نظرثانی؛ تعلیمی نظام اور میڈیا میں موجود اجنبی نظریات اور مواد

کی مکمل صفائی اور پانچ لاکھ افرادی قوت کی ایک فوج جو ''اس ارض مقدس کی حفاظت، یہودیوں سے جنگ اور مسلمانوں کی مدد کے لیے'' جہاد کی روح سے متحرک ہو۔

جن افراد نے مختلف نصیحت ناموں پر اپنے دستخط ثبت کیے وہ کس حد تک سعودی معاشرہ کی نمائندگی کرتے تھے؟ ایک تجزیہ سے پتہ چلا کہ علاقائی اعتبار سے دستخط کنندگان میں 72 فیصد کا تعلق نجد سے تھا جب کہ 4.7 فیصد حجازی تھے۔ پیشہ کے اعتبار سے 3.7 فیصد علما وفقہا تھے، 59.8 فیصد یونیورسٹی کے دانشوران اور 22.4 فیصد تاجر تھے۔ عہدوں کے لحاظ سے 48 فیصد مذہبی مراتب پر فائز تھے جب کہ 34.6 فیصد سیکولر میدانوں میں مشغول تھے۔ یہ 1979 والے گروپ سے واضح طور پر بہت مختلف تھے(30)۔

لہٰذا کویت کی جنگ کے بعد اور 1992 کے اواخر میں صورت حال کی برقراری کو ایک چیلنج کا یقینی سامنا تھا اور خود حکومت نے بھی یہی سمجھا تھا۔ اس کا جواب فہد نے ذاتی طور سے ایک تنبیہ کی صورت میں دیا۔ ایک وسیع موضوع کے پس منظر میں اور خود کو علما سے مخاطب کرتے ہوئے بادشاہ نے کہا کہ 'غیر معقول تنقید پمفلٹس اور کیسیٹز کے ذریعہ پھیلائی جارہی ہے'۔ انھوں نے کہا کہ 'اگر نصیحت سیکولر مقاصد کے حصول کے لیے یا کچھ بیرونی حلقوں سے متاثر ہوکر دی گئی ہے تو وہ قبول نہیں کی جائے گی۔''(31) جیسا کہ ماضی میں ایسے مواقع پر کیا جاتا تھا حکومت نے معاملات کو مؤخر کیا اور اپوزیشن میں تفریق کی کوشش کی۔ اس نے یہ بھی کوشش کی کہ کچھ اراکین کو شوریٰ میں نامزد کر کے ان کو نظام میں داخل کرلیا جائے۔ ایک قابل ذکر تاخیر کے بعد بالآخر شوریٰ کی ترتیب کا اعلان اگست 1993 میں ہوگیا۔

'بنیادی قانون' نے آزاد خیالوں کو کچھ راحت دی۔ شوریٰ کونسل میں بھی ان کی نمائندگی خاصی تھی(32)۔ لیکن مخالفت کے اسلامسٹ فریق نے ایک مختلف جہت اختیار کی اور عمومی مخالفت کے بجائے اسے قابل شناخت افراد اور گروپوں میں لے گئے جن کے پاس عالمی نظر اور حتمی مطالبات تھے۔ دو رجحانات بہت واضح اور روشن تھے۔ پہلا گروپ ان روایتی علما کا تھا جو کسی مخصوص زمرہ میں شامل نہیں تھے لیکن جو منبر سے حکومت کی داخلی اور

خارجی پالیسیوں پر تنقید کرتے تھے۔ دوسرا گروپ ان دانشوروں کا تھا جو عصری تعلیم سے آراستہ تھے۔ اگر چہ دونوں کی سرگرمیوں کا محرک ایک ہی تھا لیکن دوسرا گروپ زیادہ فعال اور انقلابی ذہن کا مالک تھا۔ انھوں نے تنظیمیں بنائیں۔ غیر قانونی قرار دیے گئے تو مجبور ہوکر ملک سے باہر پناہ لی اور وہاں سے سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے اوّل الذکر گروپ نے آڈیو کیسٹ کا کثیر استعمال کیا جب کہ دوسرے گروپ نے اسی مقصد کے لیے فیکس پیغامات کی بارش کردی۔(33)

اوّل الذکر گروپ کی نمایاں شخصیات شیخ سفرالحوالی اور شیخ سلمان العودہ تھے۔ کویتی جنگ کے زمانہ میں الحوالی کی تحریر اور خطبات یونائیٹڈ اسٹیٹس میں عیسائی مبلغین اور مسلم اور عرب دنیا میں مغرب کی موجودگی کے مضر اثرات سے متعلق تھے۔ انھوں نے سعودی عرب کے مذہبی اور سیاسی اقتدار کو چیلنج نہیں کیا لیکن سعودی شاہی خاندان کو مغرب کے ساتھ میل جول بڑھانے کے خطرات سے متنبہ کیا۔ لیکن انھوں نے بہرحال عراق کے ساتھ تعاون کی سابقہ پالیسی کو غلط ٹھہرایا، حکومت کی دفاعی پالیسی پر نکتہ چینی کی اور ایک ایسے اقدام امن کی تجویز پیش کی جو کویت کی سلامتی کو قائم رکھے اور ساتھ ہی ساتھ عراق کی لاج کو بھی بچائے (34)۔ دوسری جانب العودہ نے سعودی صورت حال کا گہرا تجزیہ کیا: ''یہ مملکت بنیادی طور سے ایک اسلامی مملکت ہے اور جب کبھی بھی یہ اسلام سے دور جائے گی تو یہ اپنی ہی بنیادوں کی نفی کرے گی۔ ہمارے لوگ مذہب کے گرد جمع ہوئے۔ میں مسلمان رہنماؤں کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سلامتی اقدامات مسئلہ کو مزید پیچیدہ کریں گے۔ عوام اور جری ہوجائیں گے''۔ مملکت کے تحفظ کا واحد طریقہ ''یہ ہے کہ بنیادوں کی طرف لوٹا جائے اور معاشرہ کی اصلاح کی جائے''۔ انھوں نے اپنے سیاسی فلسفہ کو ایک خطبہ بعنوان ''ریاستیں منتشر کیوں ہوتی ہیں'' میں بیان کیا ہے اور بارہ عناصر کی فہرست پیش کی: زمان و مکان کے ساتھ غیر ہم آہنگی، جبری حکومت اور شوریٰ کے نظام کا خاتمہ، ریاست کا انتظام چلانے کے لیے صلاحیتوں پر مبنی انتخاب کرنے میں حکمراں کی ناکامی، نظام عدل میں بدعنوانی، سرکاری افسران پر کسی نگراں کا نہ ہونا، معاشی نظام میں مخصوص علاقائی بدعنوانیاں، نظام تعلیم میں

بدعنوانیاں (سیکولر مواد کے ذریعہ)، اخلاقی انحطاط اور اسراف، حکمراں میں دوست اور دشمن میں تمیز کرنے کی صلاحیت کا فقدان (اور آزاد خیالوں کی جانب سے کیے گئے مطالبات کی منظوری)، خارجی سازشیں، اندرونی تفریق اور جب ریاست اپنے وجود کی غرض و غایت ہی فراموش کر بیٹھے۔ اپنے دوسرے خطبات میں انھوں نے سعودی مملکت کے ایک اسلامی منارۂ نور کی انفرادی حیثیت پر بحث کی جو اصلاحات کی منتظر ہے اور ساتھ ہی جدید، سیکولر اور مغربی عناصر پر گہرے شکوک کا اظہار کیا(35)۔ دونوں ہی علما کو 1994 کے موسم گرما میں قید کرلیا گیا اور وہ 1999 تک حالت اسیری میں رہے۔

مئی 1993 میں پانچ معزز اور معروف سعودی شہریوں نے ریاض میں 'کمیٹی فار دی ڈیفنس آف لیجی ٹی میٹ رائٹس' (سی ڈی ایل آر) یعنی جائز حقوق کے دفاع کے لیے کمیٹی بنانے کا اعلان کیا۔ یہ کہا گیا کہ اس کا مقصد انسانی حقوق کا دفاع ہے۔ اس کو قابل ذکر عوامی ہمدردی اور بیرونی میڈیا میں نمایاں کوریج ملا۔ اس تحریک کی پشت پر پانچ نوجوان سعودی پیشہ ور تھے جو ایک غیر لچکدار اسلامسٹ ماحول میں پروان چڑھے تھے۔ ان کے اعلانیوں میں وہی پیغام تھا جو اس سے قبل نصیحت ناموں اور دونوں علما، سفرالحوالی اور سلیمان العودہ کے بیانات میں تھا۔ لہٰذا دو ہفتوں کے اندر ہی اعلیٰ علما کی کونسل نے نئی تنظیم کی مذمت کرتے ہوئے اُسے ''غیر قانونی ٹھہرایا کیونکہ سعودی عرب وہ ملک ہے جو اسلامی خطوط پر چلایا جاتا ہے''۔ ریاض میں سی ڈی ایل آر کے دفتر کو پولیس نے سربمہر کردیا۔ اس کے اکابرین جیسے محمد المسیری، محسن العواجی، سعد الفقیہ اور دیگر نے لندن کا راستہ اختیار کیا۔ یہاں سے انھوں نے افراد اور سعودی عرب میں موجود سفارتخانوں پر فیکس پیغامات کی باڑ لگا دی۔ ارباب اقتدار نے اس کو ایک چیلنج کے بجائے محض ایک الجھن سے تعبیر کیا۔ (36) لیکن مارچ 1996 میں یہ تنظیم ٹوٹ گئی اور الفقیہ نے 'دی موومنٹ فار اسلامک ریفارم ان عریبیا'' (ایم آئی آر اے۔ میرا) کے نام سے ایک نیا گروپ بنالیا۔ چند مہینے پہلے ہی سعودی عرب برطانیہ سے یہ بات منوانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ مسیری کو سیاسی پناہ نہ دی جائے اور اس کو ڈومونیکا ملک بدر کردیا جائے۔ لیکن ایک جج نے اس حکم کو روک دیا۔ (37)

'میرا' ہر اعتبار سے ایک زیادہ تربیت یافتہ اور مہذب مخالف گروپ ثابت ہوا۔الفقیہ نے اس تنظیم کے لیے اپنی دو کتابوں میں ایک زیادہ واضح اور مربوط سیاسی پروگرام پیش کیا جو ''نصیحت ناموں'' کے خطوط پر تھا۔لیکن انھوں نے سعودی نظام کے تین پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی: شاہی خاندان اور اس کا طرز حکمرانی، علما اور عدلیہ۔ انھوں نے زور دیا کہ ''سچی سیاسی اصلاحات لازمی طور سے خود سعودی حکومت کی ازسرِنو تشکیل سے وابستہ ہے کیونکہ حکومت کے سارے مسائل کے ذمہ دار شاہی خاندان اور اقتدار پر ان کی اجارہ داری ہے۔ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جس کو ہر سعودی مخالف مٹانا چاہتا ہے۔ انھوں نے سرکاری علما پر الزام لگایا کہ وہ دنیاوی طاقتوں کے سامنے حرف حق کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ جہاں تک عدلیہ کا تعلق ہے تو وہ آزادنہیں ہے اور مکمل طور سے شریعت کا نفاذ نہیں کرتی (38)۔

اپریل 1994 میں لندن میں ایک نئی تنظیم کا انعقاد ہوا۔ اس کا نظریاتی منبع بھی وہی تھا لیکن اس کا زندگی کا تجربہ بہت مختلف تھا اور انقلابی تبدیلیاں اس میں مرکزی مقام رکھتی تھیں۔ یہ اسامہ بن لادن کی کمیٹی فار ایڈوانس اینڈ ریفارم (سی اے آر۔کار) تھی جو مقدور سے زیادہ کام کرنے کی دھن میں خود اپنا نقصان کرنے والی اسلامی تنظیم تھی۔ اس تنظیم نے بھی اسلامی تعلیمات کی راہ سے بھٹکنے، خراب طرز حکمرانی، جواب دہی کی عدم موجودگی اور اس سرزمین کی حفاظت جہاں اسلام کے دو مقدس ترین مقامات واقع ہیں، کے لیے اجنبی طاقت پر انحصار کے الزامات عائد کیے۔ اگر چہ 'کار' نے اصلاحات کونعرہ تک محدود رکھا لیکن درحقیقت اس کی بنیادی کوشش نظام میں تبدیلی کی وکالت تھی۔(39) تنظیم کے پان اسلامک مزاج اور مخلص اور تربیت یافتہ کارکنوں کی دستیابی نے اس کی اثراندازی میں اضافہ کیا۔ حکومت نے اپنی جانب سے اس کوسعودی ریاست کی دینی بنیادوں، اور اس کی داخلی اور خارجی پالیسیوں پر خطرناک حملہ تصور کیا اور اسامہ بن لادن کی سعودی شہریت کو خارج کرنے کے لیے انتہائی اقدامات کیے۔(40)

جس وقت سعودی ریاست اور سنی روشن خیال اسلامسٹ عناصر کے درمیان اختلافات بن رہے تھے، شیعہ اقلیت جو تعداد میں 500000 (آبادی کا 4 فیصد سے نیچے)

اور مشرقی صوبہ کے کچھ مقامات پر یکجا تھی سے متعلق ایک نیا رجحان ابھر رہا تھا۔ کئی دہائیوں کی نظر اندازی اور جبر و ستم کے بعد، 1979 کے حادثات نے حکومت کو مجبور کیا کہ ان کی شکایتوں پر بھی دھیان دے۔ نتیجہ کے طور پر 1985 کے بعد شیعی طرز گفتگو میں تبدیلی آئی اور وہ ایک عام مخالفت اور دشمنی سے ہٹ کر صرف حقوق انسانی کے دائرہ میں خاص خاص شکایتیں پیش کرنے لگے۔ کویت کی جنگ کے دوران مشرقی صوبہ میں شیعوں نے عراقی پروپیگنڈے پر کوئی کان نہیں دھرا۔ جون 1992 میں شیعی رہنما شیخ حسن الصفار نے حکومت سے بات کرنے میں رضامندی کا اشارہ دیا بشرطیکہ اس میں 'سیاسی اصلاحات اور مسلک، علاقہ اور قبیلہ کے امتیازات کو ختم کرنے کے اقدامات کیے جائیں' (41)۔ ستمبر 1994 میں چار معروف شیعی رہنما کئی سال باہر گزارنے کے بعد ملک واپس آئے اور بادشاہ، سینئر شہزادوں اور مفتی اعظم سے ملاقات کی۔ نتیجہ کے طور پر بادشاہ نے زیادہ تر شیعی مطالبات کو منظور کرلیا۔' (42)

تشدد: ایک وسیلہ کی حیثیت سے: 1995 تک سلطنت میں ایک عام تصور یہ تھا کہ سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ لندن اور دوسرے مقامات پر مخالفین کو ایک جھنجھلاہٹ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جارہی تھی۔ ملک کے اندر جو مخالفین تھے وہ قیدوبند اور عتاب کی زندگی گزار رہے تھے۔ شوریٰ کونسل نے اپنا کام ڈھلمل طریقہ سے شروع کیا۔ اس کے صدر نے یہ بات کئی بار دہرائی کہ یہ نہ پارلیمنٹ ہے اور نہ ہی پارلیمنٹ بننے کی کوئی خواہش ہے۔ نہ ہی وہ الیکشن کے ذریعہ ممبروں کے انتخاب، خواتین کی حصہ داری اور سیاسی پارٹیوں کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ اصلاحات کے لیے بیرونی دباؤ جو کویت تنازعہ کے دوران زیادہ ہوگیا تھا رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا اس دلیل کے ساتھ کہ کمزور حکومتوں کے مقابلے میں استحکام قابل ترجیح ہے۔ لیکن دراصل سعودی حکومت کی اصل پریشانی معاشی محاذ پر تھی۔ 1983 سے 1989 تک سعودی عرب کا بجٹ 16 ملین ڈالر کا سالانہ اوسط سے قابل ذکر خسارہ دکھاتا رہا۔ اس میں مزید اضافہ کویت کی جنگ میں اخراجات کی وجہ سے ہوا (43)۔ 1993 کی ایک آئی ایم ایف رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ کے بڑے خسارے (بیلنس

آف پیمنٹ میں) اگلے پانچ سال میں اور زیادہ ہوجائیں گے۔ ایک دوسرا مسئلہ عوامی قرضہ میں اضافہ کا تھا(44)۔ الجھن یہ تھی کہ اصلاحی اقدامات، سبسڈی کو ختم کرنے کے ذریعہ سے اخراجات پر تنگی لائیں گے جو موجودہ بے چینی کو اور زیادہ کردے گا کیونکہ اس سے پرکیپٹا آمدنی کی سطح (5700 ڈالر بمقابلہ 15000 ڈالر سے زیادہ 1980 میں) میں زبردست کمی واقع ہوگی اور ساتھ ہی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی میں نوجوانوں کی بے روزگاری کی سطح بھی اونچی ہوجائے گی۔ 1990 کی وسط دہائی میں تیل کی قیمت میں گراوٹ نے معاملات مزید ابتر کردیے اور ولی عہد عبداللہ نے دسمبر 1998 میں فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ ''اللے تللے کا زمانہ گزر گیا اور اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا'' لہٰذا عوام کو چاہیے کہ وہ ایک مختلف طرز زندگی کو اپنائیں اور حکومت پر کم انحصار کریں۔

داخلی امن کی مدت جلد ختم ہوگئی۔ مخالفین کا ایک حصہ تشدد پر اتر آیا۔ نومبر 1995 میں ریاض میں واقع سعودی نیشنل گارڈ کی ٹریننگ کے واسطے یو ایس مشن کے آفس میں بم کا دھماکہ ہوا جس میں پانچ امریکی شہری ہلاک اور 37 زخمی ہوگئے۔ اس حملہ نے اس فیکس پیغام کو سچ کر دکھایا جو 1995 کے موسم گرما میں 'اسلامک موومنٹ فار چینج' نے بھیجا تھا اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ امریکی فوجیں جون 1995 تک واپس چلی جائیں، سلطنت میں صورت حال کا اندازہ، تنظیم کے ہدف اور تبدیلی کے لیے اس کے طریقہ کار کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

> قرآن پاک کہتا ہے کہ 'ان سے جنگ کرو جو اللہ پر یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی یوم آخرت پر: اور یہ ان باتوں کو ناجائز نہیں ٹھہراتے جن کو اللہ اور اس کے رسول نے ممنوع قرار دیا ہے۔'
> اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ نام نہاد سلطنت سعودی عرب کی حکومت ایک کافر حکومت ہے۔ اور اس کے پاس (حکومت کا) کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔ یہ حکومت اسلام، مسلمان، مبلغین اور مصلحین کے خلاف ہے۔ یہ کافروں اور صلیبیوں

کے ایجنٹ ہیں اور ان کی مدد کر رہے ہیں۔ انھوں نے اس سرزمین کے جہاں حرمین شریفین واقع ہیں اور پورے جزیرہ نمائے عرب کے دروازے حملہ آور قابض صلیبیوں کے لیے کھول دیے ہیں۔ حکومت کی اسلام کے دشمنوں کی حمایتی پالیسیوں کے نتیجہ میں پوری قوم ذلت اور حقارت میں مبتلا ہے۔ لہٰذا اس حکومت کو ہٹانے، اس جزیرہ نما سے حملہ آوروں کو باہر نکالنے اور (عرب) قوم کا عزت و وقار واپس لانے کے لیے 'اسلامک مومنٹ فار چینج' (جزیرہ نمائے عرب کا جہادی بازو) اللہ کے راستے میں جہاد کا علم اٹھاتا ہے۔

اس مقصد کے لیے ہم اپنے تمام ذرائع اور وسائل استعمال کریں گے یا تو فتح حاصل ہوگی اور اللہ کے دین کا پرچم لہرایا جائے گا یا پھر اس کے راستے میں شہادت حاصل ہوگی۔ جہاد کے دوران مندرجہ ذیل مومنٹ کے اہداف ہوں گے:

سب سے پہلے تمام جزیرہ نمائے عرب میں موجود صلیبی (عیسائی) افواج، خواہ وہ امریکی ہوں یا برطانوی... کسی کو چھوڑا نہیں جائے گا خواہ وہ شہری ہو یا فوجی۔ اس طرح سے تنصیبات اور آلات ہدف ہوں گے۔ انھیں اس سرزمین کو چھوڑنا ہوگا۔ ہم ان کو نوٹس دے رہے ہیں کہ وہ محرم 1416ھ کے اختتام مطابق 28 جون 1995 تک چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس مدت کے بعد یہ افواج جائز ہدف ہوں گی۔

دوسرے السعود خاندان کے بااثر اور طاقتور افراد کیونکہ وہی اس کافر حکومت کے قائد ہیں اور جو کچھ ہوا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو رہا ہے یہی لوگ اس کے ذمہ دار ہیں۔

تیسرے اس حکومت کی فوج جوان کی حفاظت پر مامور ہے جیسے
کہ رائل گارڈز اور ملٹری پولیس وغیرہ۔ کیونکہ یہ اس خاندان کی
کارروائیوں کو آگے بڑھانے میں ان کی مدد کر رہے ہیں۔

ریاض دھماکہ کے بعد لندن میں جاری کیے ایک بیان میں سی ڈی ایل آر نے اس حادثہ کو جبر و استبداد کا فطری نتیجہ قرار دیا اور یونائیٹڈ اسٹیٹس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس حکومت کی حمایت بند کر دے۔ دھماکہ میں ملوث چار سعودی شہریوں کو گرفتار کر کے ان کی گردن مار دی گئی۔ ان میں سے تین افغانستان اور ایک بوسنیا کی جنگ میں حصہ لے چکے تھے اور سی ڈی ایل آر سے ان کا رشتہ بہت مبہم تھا اور وہ کسی بیرونی تحریک کے بجائے مسیری اور اسامہ بن لادن سے زیادہ متاثر تھے(46) جون 1996 میں ظہران کے اندر ایک یو ایس فوجی رہائش کمپلیکس پر حملہ ہوا جس کے نتیجہ میں 19 سروس اسٹاف مارے گئے اور تقریباً 500 کے قریب زخمی ہوئے۔ سعودی شیعاؤں پر شبہہ کیا گیا اور ایرانی رابطوں پر الزام لگایا گیا جو ثابت نہ ہو سکا(47)۔ اس کے جواب میں حکومت نے ملک کے اندر حفاظتی اقدامات بہت سخت کر دیے اور بیرونی ممالک میں سفارتی سرگرمیاں بھی تیز کر دیں۔ 1998 میں صورت حال یہ تھی کہ المسائری کو کامیابی کے ساتھ خاموش کر دیا گیا تھا، الفقیہ حاشیہ پر رکھ دیے گئے تھے اور اسامہ ایسا مسئلہ ہو گئے تھے جس نے افغانستان کی طالبان حکومت سے سعودی رشتوں کو سنجیدگی سے متاثر کیا تھا۔ حوالی اور العودہ کو 1999 کے موسم گرما میں جیل سے رہا کر دیا گیا جو مصالحت کی جانب اشارہ تھا۔ ان کو حکام کے ساتھ اپنی گفتگو دوبارہ شروع کرنے کی دعوت دی۔ العودہ نے یہ دعوت قبول کر لی۔

اس مرحلہ پر ایک خارجی واقعہ نے معاملات کو منفی طریقہ سے متاثر کیا۔ سعودی عرب میں فکر کی انقلابیت کسی بھی مرحلہ پر خصوصی طور سے ایک مقامی معاملہ نہیں رہا۔ افغان جہاد (کمیونسٹوں کے خلاف) کی ترنگ اس کی ایک مثال تھی۔ اس کے علاوہ 1990 میں اسلام کے گہوارہ کے دفاع کے لیے غیر مسلم افواج کو دعوت دینا۔ اسی حوالہ سے فلسطین کا مسئلہ بھی ایک مستقل الجھن کا باعث تھا۔ 1988 کے انتفاضہ سے اس کی شدت میں اضافہ

ہوگیا تھا اوسلو سمجھوتہ کے باعث اس میں کچھ راحت ملی لیکن ستمبر 2000 کے دوسرے انتفاضہ اور اس کے بعد کی انتقامی کارروائیوں نے اس کو پھر سے ابھار دیا۔ لہٰذا یہ تصور جاگزیں ہوتا چلا گیا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی ہمدردیاں اسرائیل کے ساتھ اور فلسطینیوں کے مخالف ہیں۔ اسی تصور کے زیر اثر ایک سعودی شہزادے نے کہا کہ ''بہت زیادہ متعصب موقف امریکا کے دوستوں کو پریشان کن صورت حال میں ڈال دیتا ہے'' اور یہ کہ ''عرب علاقوں میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کا اعتبار صفر کی حد تک گر چکا ہے''(48)۔ اس طرح سے جو سوچ بنی اس میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو فروری 1998 میں اسامہ بن لادن کی جانب سے دی گئی اس پکار کا مثبت جواب دینے کے خواہش مند تھے کہ دنیا میں ہر جگہ یو ایس شہریوں اور فوجیوں کے خلاف جہاد کیا جائے(49)۔ اس فکر کا سب سے تباہ کن مظاہرہ خود امریکہ میں گیارہ ستمبر کو ہوا۔ ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کہ 19 میں سے 15 ملزم سعودی شہری تھے۔ کچھ ہی مہینوں میں امریکہ کی رائے عامہ نے سعودی گناہوں کی فہرست میں قابل ذکر اضافہ کر دیا۔ ان میں بن لادن کا سعودی الاصل ہونا، وانکانا موبے میں سعودی قیدیوں کی تعداد، انتہا پسند وہابی مدرسوں کو سعودی تعاون اور اسرائیل میں خودکش حملہ آوروں کے خاندان کو سعودی نقدی امداد اس کی وجہ تھے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ سعودی عرب ''ہمارے خلاف'' ہے(50)۔ نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال سرکاری سطح پر بھی کچھ بہتر نہ تھی جہاں بش انتظامیہ کی مشرق وسطیٰ کی پالیسی پر پیدا ہوئے بحران کے بعد ستمبر کے پہلے ہفتہ میں تعلقات خوش گوار ہو گئے تھے اور ریاض کو یو ایس پالیسی کے مقاصد کی یقین دہانی کرائی گئی تھی(51)۔ لیکن گیارہ ستمبر نے یہ سب ضائع کر دیا اور اس کے بجائے متبادل نظریات سامنے لایا۔ قومی سلامتی کے سابق مشیر سیموئل برگر نے کہا کہ ''سعودی ایک ایسی حکومت رکھتے ہیں جو ان انتہا پسندوں کو دبا کر رکھتی ہے جو اس کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ہماری معلومات آگے بڑھتی ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ علاقہ کے انتہا پسند اسلامسٹس کی عام تحریک کو نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ اس کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔'' ایسے ہی طنزیہ رنگ میں سلطنت میں ایک سابق سفیر چارلس ڈبلیو فری مین جونیئر نے سوال کیا کہ ''کیا سعودی

عرب کی سلطنت میں کوئی شے سڑ گل گئی ہے؟ کیا یہ اب بھی اتنی مستحکم ہے کہ مستقبل میں یونائٹیڈ اسٹیٹس کا ایک قابل اعتماد دوست رہ سکے؟'' 10 جولائی 2002 کو ڈیفنس پالیسی بورڈ آف پینٹاگن کی ایک بریفنگ میں ''سعودیوں کو عرب سے باہر کرو'' خطرہ کی مدافعت کی۔(52) ان وضاحتوں کے باوجود تعلقات کی بنیاد مشترک اقدار نہیں بلکہ تیل اور سلامتی کے مشترکہ مفادات کو تیاگ دیا گیا اور نقصان کو محدود کرنے کے اقدام کیے گئے۔(53)

یہ سب اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اسی درمیان یونائٹیڈ اسٹیٹس نے تعلقات کے سلسلہ میں ایک نیا فریم ورک تیار کرلیا۔ اس میں زور دیا گیا تھا کہ ''امریکا ان ملکوں کو ذمہ دار ٹھہرائے گا جو دہشت گردی سے سمجھوتہ کریں گے بشمول ان ملکوں کے جو دہشت گردوں کو پناہ دیں گے۔ اور یہ عمل ان ممالک کو قائل کر کے یا مجبور کر کے کہ وہ اپنی اقتدار کی ذمہ داریاں قبول کریں، کے ذریعہ کیا جائے گا اور یہ کہ وہ دہشت گردوں کو تعاون، امداد اور پناہ سے انکار کریں۔ اور جدید اور معتدل حکومتوں، خصوصاً مسلم دنیا میں، کی حمایت کی جائے تاکہ وہ حالات اور نظریات جو دہشت گردی کو فروغ دیتے ہیں کسی بھی ملک میں زرخیز زمین نہ پائیں،(54) کچھ مہینے بعد 'یو ایس۔ مڈل ایسٹ پارٹنرشپ انیشیٹیو' کا اعلان ہوا (اور اس کی تفصیلات لندن کے ایک عربی روزنامہ میں) جس کے ذریعہ یونائٹیڈ اسٹیٹس نے خود کو مضبوطی سے ''تبدیلی کے ساتھ، اصلاحات کے ساتھ اور ایک جدید مشرق وسطی کے ساتھ جوڑ لیا ہے''۔ یہ یقین کیا گیا کہ یہ تبدیلی بحرین، قطر، کویت اور مراکش میں پہلے ہی شروع ہو چکی ہے۔ لہٰذا سعودی قیادت کو بھی اپنی روایات اور معمولات کا جائزہ تبدیلی کو ذہن میں رکھ کر کرنا چاہیے: ''علاقے کے عوام کو آگے آنا ہوگا اور ان مضبوط قائدین کو آگے بڑھانا ہوگا جو عقیدہ اور آزادانہ سیاسی نظام میں توازن کی تلاش کرنے کے خواہش مند ہوں۔ (55) معلوم ہوتا ہے کہ پاول کے بیان نے اس تقریر کو نظرانداز کر دیا جو نائب وزیراعظم دوم، شہزادہ سلطان نے شروع نومبر میں سعودی شوریٰ کے خصوصی اجلاس میں کی تھی۔ اس میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ کونسل کو منتظمہ کی ہدایات اور نگرانی کے لیے اور زیادہ اختیارات دیے جائیں گے۔'' سعودی میڈیا کے تبصروں نے اس وقت بہت احتیاط کے ساتھ اس

ایجنڈے کو وسیع کرنے کی کوشش کی اور بنیادی قانون میں ترمیم، ممبروں کے انتخاب میں الیکشن کا عنصر اور عورتوں کے رول کی تجاویز پیش کیں: ''خواتین بھی شہری ہیں اور مساوی حقوق رکھتی ہیں، اور قوم کی ترقی اور خوشحالی کے لیے انھیں بہت کچھ کرنا ہے۔''(56)

یہ اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان کم ظاہری رابطوں میں کیا گزری ہوگی۔ پاول کی تقریر کے چار ہفتہ بعد آنے والی عرب لیگ چوٹی کانفرنس کے حوالہ سے ایک اہم سعودی اعلان ہوا۔ اس میں ولی عہد عبداللہ نے یہ تجویز پیش کی کہ عرب قائدین ایک نیا عرب منشور اختیار کریں جو 28 مارچ 2002 کے امن پلان کو دہرانے اور ایک عرب کسٹمز یونین اور بالآخر ایک مشترکہ منڈی بنانے کے علاوہ یہ فیصلہ کرلیں کہ خود اصلاحی اور عرب ممالک میں سیاسی شراکت داری میں ترقی، عرب صلاحیتوں کی نشوونما میں بنیادی ذرائع کی نمائندگی کرتے ہیں۔ (57)

اگرچہ اوپری طور سے سہی لیکن تبدیلی کا اشارہ عرب لیگ برادری کے کاندھوں پر رکھ کر سرکاری ایجنڈے میں شامل کردیا گیا اور مروجہ معمولات جو 1992 کے بنیادی قانون کی اساس تھے، کی قانون سازی سے آگے چلا گیا۔ عبداللہ نے 103 دانشوروں اور اساتذہ کے ایک گروپ جس کی قیادت محمد الحیصن کررہے تھے سے مذاکرات شروع کیے الحیصن نے ولی عہد کو ایک پٹیشن پیش کیا جس کا عنوان 'قوم کے حال اور مستقبل کا تصور/ خاکہ' تھا۔ اس میں انھوں نے وسیع ترین انقلابی اصلاحات کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کے رجحان کا اندازہ ان تمہیدی کلمات سے ہوتا ہے:

> ''آپ کا یہ اعلان کہ آپ عوام کی آواز سننا چاہتے ہیں اور معاشرہ کے مختلف طبقوں اور دانشوروں کے ساتھ کھلا ہوا اجلاس کرنے اور ہمارے ملکی مسائل کو حل کرنے میں جو شفاف طریقہ عمل آپ نے اختیار کیا ہے اس سے عوام خوش ہیں۔ یہ ایک قابل تعریف قدم تھا جس سے عوام میں آپ کے اکثر بھائی اور بیٹوں میں حمایت پیدا ہوئی جو گیارہ ستمبر 2001 کے

بعد سے ملک کو لاحق خطرات سے فکرمند تھے۔ مثال کے طور
پر وہ علاقائی اور بین الاقوامی حالات جن کا مرکز ہمارا ملک ہے
فوجی کارروائی کے خطرہ سے دوچار ہیں، داخلی معاملات میں
مداخلت اور علاقہ کا ایک مکمل نیا نقشہ بنانے کی کوشش ہے۔
اس دستاویز کے دستخطی اگرچہ مختلف طبقہ فکر اور زاویہ خیال سے
آئے تھے لیکن وہ سب اپنے ملک 'سلطنت سعودی عربیہ' اور
اس کی قیادت پر یقین رکھتے تھے اور انھوں نے اعلان کیا کہ
وہ حال اور مستقبل میں ملک پر پڑنے والی مشکلات میں اپنے
قائدین کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے اور ان کا یہ بھی خیال
ہے کہ ان خطرات کا سامنا کرنے کے لیے اصلاحات کی
ضرورت ہے کیونکہ اسی سے قیادت اور عوام کے تعلقات
مضبوط ہوں گے۔''

پٹیشن میں ایک قومی مذاکرات کونشن کی تجویز رکھی گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ''دین خیرخواہی ہے... مسلم حکمرانوں اورعوام کے لیے، کی نبیاد پر چار مرحلوں پر مشتمل اصلاحات کا پیکیج بھی تیار کیا۔ گزشتہ پٹیشنز کی طرح اس کی زبان بھی دینی اصطلاحوں سے پُر ہے جو سلطنت کے رواج کا آئینہ دار ہے لیکن جس کا مقصد بنیادی وسائل کی طرف لوٹنے کے ساتھ دلیل کو مضبوط کرنا بھی ہے:

1 - دستوری ادارے بنانے کی ضرورت ہے: قرآن و سنت جو قومی دستور کی اساس ہیں، میں حکومت کا قانونِ جواز دو امور سے نکلتا ہے۔ اوّل تو عبادات اور عوام کے ساتھ معاملات میں جو احکام اسلام نے دیے ہیں ان کو پورا کرنا۔ دوسرے قائدین کی حکمرانی سے عوام کا اطمینان کیونکہ حقوق کی وصولیابی اور فرائض کی انجام دہی میں قائدین ہی کمیونٹی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کیونکہ انصاف حکومت کی بنیاد ہے لہٰذا خدا نے سماجی انصاف کا حکم دیا اور اسے عقیدہ اور ایمان کی بنیاد قرار دیا۔ اور کیونکہ انصاف بغیر شوریٰ کے حاصل نہیں ہوسکتا

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سیاسی معاملات میں شوریٰ کا استعمال فرض قرار دیا۔ اس نے اپنی کتاب میں کہا: ''اور معاملات میں مشورہ کرو''۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ شوریٰ اس وقت تک ظہور میں نہیں آسکتی جب تک کہ اوارتی اور دستوری نظام کے لیے سنجیدہ اقدامات نہ کیے گئے ہوں۔ اور یہ ایک بار پھر بنیادی قانون کے نظام کے فروغ کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے تاکہ دستوری نظریات جن کا انحصار قرآن و سنت پر ہے اور جو عدلیہ، منتظمہ اور مقننہ کی علاحدگی، اور انصاف، مساوات اور مساوی مواقع کے بنیادی شہری حقوق کی یقین دہانی پر بھروسہ کرتے ہیں، کو مزید تقویت حاصل ہو۔''

پٹیشن نے 'قائدین اور کمیونٹی کے درمیان معاشرتی معاہدہ' کے اصول کی درخواست کی اور چند تجاویز بھی پیش کیں: (ا) شہریوں کے درمیان میں سے راست انتخاب کے ذریعہ شوریٰ کونسل کی تشکیل جو حکومت کے دوسرے محکموں کے لیے بھی قانون سازی اور نگرانی کے فرائض انجام دے (ب) راست انتخاب کے ذریعہ علاقائی قانون ساز مجلسوں کی تشکیل جو علاقائی امور کو سنبھالے اور انتظامی افسران پر نگرانی رکھے (ج) عدلیہ کی خودمختاری کا تصور کا تقدس جو اگرچہ نظریاتی طور پر موجود ہے لیکن اس وقت تک موثر نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس تصور کی حفاظت کی تدابیر نہ کی جائیں (د) ایک شاہی اعلان کے ذریعہ تمام شہری حقوق کی ضمانت خصوصاً اظہار رائے، اجتماع میں۔ اور الیکشن کا حق اور ان تمام انسانی حقوق کی ضمانت جن کو سعودی عرب کی توثیق شدہ بین الاقوامی قراردادوں کا حصہ بننے سے پہلے اسلام بخش چکا ہے۔ (ہ) سول ادارے جیسے کہ کلب، کمیٹی، تعلیمی تجارتی، سماجی یونینوں کے قیام کی اجازت تاکہ فیصلہ سازی میں عوامی شرکت بھی ہو سکے۔ اس کے علاوہ سول سوسائٹیز اور حقوق انسانی کے کارکنوں کو بھی کام کرنے کی اجازت دی جائے کیونکہ یہ سرگرمیاں علاحدگی پسندی اور نظر اندازی اور پرتشدد جدوجہد جو ہمارے مستقبل کے لیے خطرہ ہے، کے بجائے ایک مذاکرات اور پرامن مباحثہ کا ماحول پیدا کریں گی۔

2- ملک کے معاشی مسائل کو ان طریقوں سے حل کیا جاسکتا ہے: (ا) معاشی منصوبہ بندی میں انصاف و مساوات کے تصور پر زور اور علاقوں کے درمیان دولت کی تقسیم،

(ب) عوامی خرچ کو قابو میں رکھنے کے لیے لازمی پابندیاں رکھی جائیں، اخراجات کی ترجیحات کو طے کیا جائے اور بدعنوانی، رشوت اور عوامی زمین کا نامناسب استعمال روکا جائے، (ج) ذمہ دار اور نگرانی کرنے والے اداروں کو زیادہ اختیار دے کر مزید قوت بخشی جائے اور ان کو شوریٰ کونسل کے سامنے جوابدہ بنایا جائے (د) قوم پر قرض کو قومی مسئلہ اور بڑی ذمہ داری سمجھنا چاہیے جن کو ایک محدود وقت میں نمٹانے کے لیے اثر پذیر حل کی ضرورت ہوگی۔ قومی آمدنی کا ایک حصہ اگلی نسلوں کے لیے مخصوص کرنا چاہیے جن کو تیل کے علاوہ توانائی کے متبادل وسائل سے خطرہ ہے۔ اور (ہ) آمدنی کے دیگر ذرائع کو فروغ دیتے ہوئے معیشت میں تنوع پیدا کیا جائے۔ قومی اور بین الاقوامی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہو۔ اور ایک قانونی فریم ورک بنایا جائے جو اس کی کارروائیوں کو قابو میں رکھے اور اس کے حقوق کی حفاظت کرے۔

3- انسانی حقوق اور صبر و برداشت انصاف اور رواداری کی دینی اقدار کے کلچر کے پھیلاؤ میں عوام اور حکومت کے رول کے لیے دونوں کے درمیان باہمی تال میل کی حوصلہ افزائی ہو۔ قومی یکجہتی کو فروغ دیا جائے اور نسلی، علاقائی اور معاشرتی بنیادوں پر امتیاز کو ہٹایا جائے۔ پبلک سروس میں اصلاحات کی جائے اور ساتھ ہی روزگار کے مزید مواقع مہیا کیے جائیں۔ کم سے کم اجرت، بے روزگاری الاؤنس اور عمر رسیدہ افراد کی پینشن کو متعارف کرایا جائے۔ ''خواتین سوسائٹی کا آدھا حصہ اور اس کی ساخت کا اہم عنصر ہیں۔ ان کو وہ تمام سہولتیں دستیاب ہونا چاہئیں جو ان کی فرائض کی انجام دہی میں اسلام نے منظور کی ہیں۔ عوامی زندگی میں اس کے رول کو اسلامی ضابطوں کے تحت متحرک کیا جائے۔

4- سیاسی قیدیوں کے لیے عام معافی اور اصلاح پسندوں، یونیورسٹی پروفیسروں اور ججوں کے شہری حقوق کی بحالی اور ان کے عہدوں پر دوبارہ تقرری سے اصلاحات کے عمل پر عوام کا اعتماد بڑھے گا اور یہ وطن پرستی کے جذبہ کو طاقت بخشے گا۔

5- تمام سماجی عناصر، خصوصاً علما اور دانشوروں کو مختلف صورتوں میں عوامی مسائل پر بحث کی قانونی آزادی حاصل ہو اور عوامی امور سے پابندیاں ختم کی جائیں جیسے کہ سفر کی

ممانعت، قید و بند کی دھمکی، روزگار سے برخواستگی، تحریر اور اظہار رائے کی پابندی کے لیے جبریہ بیانات ختم ہوں۔(58)

عبداللہ نے 20 جنوری کو ان میں سے 34 دستخطیوں کو دعوت دی اور ان کے ساتھ تین گھنٹے صرف کیے۔ لیکن ایک مہینے بعد حج کے موقعہ پر روایتی شاہی پیغام میں انتہا پسندی، غیر ضروری مداخلت اور ضرورت سے زیادہ آرام پسندی کو مسترد کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ تبدیلی کی ضرورت کو بظاہر منظور کرلیا گیا تھا لیکن اس کی رفتار کو مزید مباحثہ کے لیے چھوڑ دیا گیا۔(59)

اپریل میں ایک شیعہ پٹیشن کے ذریعہ دباؤ زیادہ ہوگیا۔ اس پٹیشن کا عنوان 'ایک قوم میں شرکت دار' تھا اور اس پر 450 مرد اور عورتوں نے دستخط کیے تھے۔ اس نے اسلامی اور قومی اتحاد کے ساتھ اصلاحات پر زور دیا۔ شاہی خاندان کی قطعی حمایت اور جنوری گروپ سے اتحاد عمل کا یقین دلایا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ''ہمارا ملک مسلکی انتہا پسند فرقوں کی موجودگی کے آزار میں مبتلا ہے جو دوسرے اسلامی فرقوں خصوصاً شیعوں کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں... اس سے قومی یکجہتی، سماجی امن اور سلامتی کے بارے میں فکرمند ہونا پڑتا ہے۔'' آئی ایس ای ایس سی او، جو آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس کا ایک ادارہ ہے، کی مختلف مسلم فرقوں کے درمیان مفاہمت کی کاوشوں سے اس پٹیشن کو تحریک ملی۔ اس نے ساخت کی تبدیلی، انصاف، سلامتی، مساوات اور استحکام، تعصب کے خاتمہ، غیر قانونی گرفتاریاں، انتہا پسند مسلکی رجحانات جو نفرت کو بڑھاتے ہیں، سرکاری ملازمتوں اور شوریٰ کونسل میں موزوں نمائندگی، تعلیمی اصلاحات، رواداری، تعلیمی اصلاحات اور علمی آزادی کے فروغ کے لیے ایک قومی پروگرام کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا کہ قائدین ایک اعلانِ عام کریں کہ سلطنت میں شیعوں کے حقوق کا احترام کیا جائے گا اور ان کو دوسرے شہریوں کے برابر سمجھا جائے گا۔ اس پٹیشن میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ عبادت اور دینی اداروں کی آزادی کو وسعت دی جائے۔ دینی کتابوں کی اشاعت کا حق دیا جائے اور ایک تنظیم کی تخلیق کی جائے جو ان کے مذہبی امور کی نگرانی کرے اور ''مناسب انتظامی قانونی اختیارات'' کے ساتھ مذہبی عدالتوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے۔(60)

قومی مذاکرات: 12 مئی کو ریاض میں ایک بم دھماکے کی شکل میں ایک ناخوشگوار محرک ظاہر ہوا جس میں بشمول سات سعودیوں کے 25 افراد ہلاک ہوئے۔ اس نے دروں بینی پر مجبور کیا اور بالآخر اس عمل میں سرعت کا احساس بھی داخل کیا۔ اب تک اور دھماکہ سے کچھ دن پہلے تک تشدد کے واقعات کو سرکاری طور سے خارجی عناصر سے منسوب کیا جاتا تھا اور مقامی دہشت گردوں کے وجود کا نہایت احتیاط سے انکار کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ انداز زیادہ دنوں تک نہیں اختیار کیا جاسکتا تھا اور اس حادثہ کے بعد ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں ولی عہد نے صاف صاف الفاظ میں کہا کہ اسلام کے نام پر تشدد کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ میڈیا میں بھی اس کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ''اگرچہ ظاہری طور سے بہت کم لوگ اس کا اقرار کریں گے لیکن سعودی بن لادن کے حامیوں کی ایک مختصر اقلیت کے دقیانوسی ایجنڈے کے یرغمال بن گئے ہیں جس نے ہماری سوسائٹی کو اغوا کرلیا ہے... ہم سعودیوں کو یہ حقیقت تسلیم کرلینی چاہیے کہ ہمارا اصل دشمن مذہبی انتہا پسندی ہے۔ ہمیں اب اصلاحات کی ضرورت پر گفتگو بند کردینی چاہیے اور اس کو حقیقت میں شروع کرنا چاہیے خصوصاً تعلیم کے میدان میں۔ کل میں نے ریاض کی گلیوں میں ہزاروں سعودیوں کو غصہ میں دیکھا۔ میں بھی غصہ میں ہوں۔ ہمارے انتہا پسندوں نے جو کچھ باہر بھیجا تھا وہ ہمارے گھر کو تباہ کن طریقہ سے زد لگانے کے لیے واپس آرہا ہے۔ سعودی غصہ اس بات کی نشانی ہوسکتا ہے کہ بہت جلد ہماری سوسائٹی خوداحتسابی کے قابل ہوجائے'' (61) بم دھماکہ کا ایک براہ راست نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اسلامی عسکریت پسندی کی مذہبی جڑوں پر مباحثہ کی ہیئت بدل دی (62) اس موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے اور شوریٰ کونسل کو بادشاہ کے 17 مئی کے خطاب کو بنیاد بناتے ہوئے میڈیا نے ''مکمل مشاہدۂ نفس اور پھر ہر سطح۔ سیاسی، انتظامی، معاشی اور معاشرتی۔ پر مؤثر اصلاحات شروع کی جائیں''، کی بات کرنے کی ابتدا کی (63)۔

اس طرح آٹھ دہائیوں میں تین بار مذہبی نظریہ سازوں اور سعودی ریاست کے درمیان کشمکش نے تشدد کی حدیں چھوئیں۔ ایک بار پھر اس نے سعودی حکومت کے سامنے عملی اور نظریاتی سوالات پیش کیے اور ایک بار پھر اس کا جواب، جیسا کہ 1929 اور 1979 میں

ہوا، غیر مبہم الفاظ میں ریاست کے حق میں دیا گیا۔ ریاض دھماکوں نے سعودی حکام کو مجبور کیا کہ وہ انتہا پسندوں کے ٹھکانوں کا پتہ لگانے اور انھیں ختم کرنے میں اپنی کوششوں کی رفتار دوگنی کردیں اور تحقیقات میں ایف بی آئی کی مدد لیں۔ داخلی سلامتی کے حوالہ سے سال 2003 سعودی تاریخ میں بدترین سال تھا۔

حکومت نے جنوری پٹیشن کی جانب توجہ کی اور قومی مذاکرہ کے مشورہ کو قبول کرلیا۔ جون میں ولی عہد نے ایک نیشنل فورم فار ڈائیلاگ کے لیے علمائے دین کو دعوت دی۔ مدعوئین میں اسلامی فقہ کے تمام مسلکوں بشمول اثناعشری اور اسماعیلی شیعہ کے نمائندے شامل تھے۔ مذاکرہ کی بنیاد اسلامی اتحاد کا اصول تھا اور اس کا مقصد اسلامی اتحاد کی فروغ کی راہیں تلاش کرنا تھا۔ مذاکرہ کے مرکزی موضوع قومی اتحاد کی تعریف اور اس کی ترقی کے راستے؛ اس اتحاد کو لاحق خطرات؛ نظریاتی تنوع کو فروغ، معاشرہ میں عورت کا رول؛ عصری فتووں کے حوالے سے آزادیٔ اظہار رائے اور سماجی حقیقت سے ان کی مناسبت، معاشرتی اتصال و اتفاق اور قومی یکجہتی پر تھا۔ سعودی عرب کی تاریخ میں ایسا اجتماع جس میں اتنے مختلف الخیال بلکہ بعض اوقات متضاد و متناقص نظریات کے حامل علما موجود ہوں، کبھی نہیں منعقد ہوا تھا۔ کچھ شرکا نے اس کو آگے کے لیے ایک ''بڑا قدم'' قرار دیا (64) لیکن یہ صرف پہلا قدم تھا۔

24 ستمبر 2003 کو ولی عہد کو ایک مزید پٹیشن پیش کیا گیا (65)۔ اس کے 306 دستخطیوں میں 57 خواتین تھیں۔ دستخطیوں (آزاد خیال اعتدال پسند اور جدیدیت پسند میدان سے) نے پٹیشن کو رنگ نوٹ میں ولی عہد عبداللہ کو سعودی عرب کے قومی دن پر مبارکباد پیش کی، اپنی وفاداری کا یقین دلایا، ہر قسم کے تشدد اور دہشت گردی کی مذمت کی اور ''ہمارے دستوری، سیاسی، معاشی اور معاشرتی اداروں کی انقلابی اور جامع اصلاحات کے عمل کے نفاذ کی ضرورت'' پر زور دیا تاکہ ''آج جو چیلنجز ہمارے سامنے ہیں اور مستقبل میں سامنے آسکتے ہیں، کے لیے ہمارے پاس عملی اور موزوں جواب ہوں۔'' پٹیشن میں جرأت مندانہ مطالبات کی ایک فہرست تھی:

☆ اصلاحات میں تاخیر اور فیصلہ سازی میں عوامی شرکت سے انکار ان خاص عناصر میں سے ہیں جو موجودہ 'خطرناک موڑ' کے ذمہ دار ہیں۔

☆ آزادیٔ اظہار رائے کے انکار کے نتیجہ میں ایک (دینی) رجحان کی بالادستی قائم ہوگئی ہے جو مذاکرات میں شامل ہونے سے انکار کرتا ہے۔ یہ رجحان اسلام کی رواداری اور تنوع کی نمائندگی نہیں کرتا۔

☆ دہشت گردی کو محض حفاظتی اقدام زیادہ کرنے سے نہیں ختم کیا جاسکتا۔ اس کے لیے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی جو اس کے ذمہ دار ہیں اور ایک اصلاحی ایجنڈے کو نافذ کرنا ہوگا۔ اس کو جنوری کے پٹیشن میں ضبط تحریر میں لے آیا گیا تھا اور یہ سعودی سماج کے مختلف طبقوں کے احساسات کی نمائندگی کرتا ہے اور سیاسی قیادت اور مختلف قومی حلقوں کا مشترک تصور ہے۔

☆ سعودی معاشرہ کے نمایاں معاشرتی معاشی مسائل بشمول انتظامیہ میں بدعنوانی اور دولت کا بے جا اصراف پر ان اصلاحات کے بغیر قابو پانا ممکن نہیں ہے۔

☆ سیاسی قیادت کو ایک خودمختار قومی تنظیم جس میں عوام کے سبھی طبقات کی نمائندگی ہو، کے لیے ایک جامع قومی اقدام کا اعلان کرنا چاہیے جو عرصہ سے واجب ہے تا کہ ایک متعین پروگرام کے تحت اصلاحات کے پیکیج کا نفاذ ہوسکے۔

اس دستاویز کے مطالبات بالکل واضح تھے اور لہجہ بھی سخت تھا۔ حکومت کی جانب سے کوئی فوری توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن واقعات تیز رفتاری سے جاری رہے اور غیر فعال عوامل نے منظر پر ظاہر ہوکر نئے محاذ کھول دیے۔ 13 اکتوبر کو یہ اعلان کیا گیا کہ الیکشن میونسپل کونسلز کی صرف آدھی نشستوں پر ہوں گے۔ اگلا دن ریاض میں سرکاری تعاون یافتہ حقوق انسان کی کانفرنس کے افتتاح کا موقعہ تھا۔ 'میرا' سے متاثر اسلامسٹ نے یہ دن سیاسی اصلاحات کی مانگ کرتے ہوئے عوامی مظاہرہ کے لیے استعمال کیا۔ پولیس نے ان میں سے 150 افراد کو گرفتار کرلیا۔ ایسا ہی ایک مظاہرہ جدّہ میں 24 اکتوبر کو ہوا۔ وہاں 70 لوگ گرفتار ہوئے۔ (66) اس کے بعد 5 نومبر کو پان عرب روزنامہ الحیات کو انٹرویو دیتے ہوئے

وزیر داخلہ نائف بن عبدالعزیز نے تسلیم کیا کہ سلطنت سیاسی اصلاحات کے خلاف نہیں ہے لیکن وہ مغربی طرز کی جمہوریت کو درآمد نہیں کرے گی: ''اصلاح کی تعریف، ہماری ضرورتوں اور بنیادوں کی روشنی میں طے ہونی چاہیے۔ کچھ لوگ اصلاح کے ذریعہ اس مقصد کا حصول چاہتے ہیں جو قومی مفادات کے خلاف ہوسکتا ہے۔ یہ معقول نہیں ہے۔ دوسروں کے نزدیک اصلاحات کا مقصد اسلامی اقدار اور اساس کا ترک کرنا ہے۔ یہ مردود ہے۔ اور کچھ کے لیے یہ بھی ناقابل قبول ہے کہ وہ یقین کریں کہ اصلاحات سے مراد ترقی میں مزاحمت اور دوسروں سے اختلاف ہے۔'' (67) تین دن بعد ریاض میں ایک اور دھماکہ ہوا جس میں 17 لوگ مارے گئے۔ دسمبر میں سو سے زیادہ دانشوروں اور اساتذہ نے ولی عہد کو ایک اور پٹیشن بذریعہ ڈاک روانہ کیا اور مطالبہ کیا کہ مطلق العنان بادشاہت کو دستوری بادشاہت میں تبدیل کردیا جائے (جیسے کہ اردن اور بحرین میں ہے)۔ انھوں نے ایک منتخب پارلیمنٹ، خودمختار عدلیہ اور عورتوں کے لیے مساوی حقوق کا مطالبہ کیا۔ اگرچہ انھوں نے اپنے نام کے اظہار سے احتراز کیا لیکن یہ کہا کہ ان کی حقوق میں ''اساتذہ، اسلامی جج، علما، سابق وزرا، حقوق انسانی کے کارکن اور سماج کی دیگر کلیدی شخصیات شامل ہیں۔'' (68)

دسمبر کے آخری ہفتہ میں مکہ میں دوسرا نیشنل انٹلکچوئیل ڈائیلاگ منعقد ہوا تاکہ خاص مسائل پر بحث کی جائے؛ اداروں کی قوم کی معاہداتی مشکل کے لیے دستوری بنیاد قائم کی جائے اور عوامی رائے کے رجحان کی حقیقتوں کو جانچا جائے تاکہ ان کو حکام کے سامنے پیش کیا جائے جو اصلاحات کے ذمہ دار ہیں۔ شرکا میں 60 مرد اور خواتین تھے۔ ڈائیلاگ کا موضوع ''زیادتی اور اعتدال'' تھا اور پانچ دنوں پر پھیلے ہوئے چودہ ورکنگ سیشنز میں اس کے دینی قانونی، طبیعاتی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ہوئی۔ شرکا نے اپنے مباحث کو سعودی قومی یکجہتی سے وفاداری پر ختم کیا جس کی اساس اسلام ہے جو مذہبیات اور قانون کا منبع ہوگا۔ انھوں نے دہشت گردی کو یکسر خارج کردیا اور کچھ دلچسپ سفارشات پیش کیں:

☆ سعودی سماج میں زیادتی کے عنصر کا جامع مطالعہ ہونا چاہیے تاکہ اس سے نمٹنے کے لیے حکمت عملی تیار کی جاسکے۔

ایک شاہی فرمان کے ذریعہ ظہور میں آنے والے طریقہ عمل سے نکلی ہوئی یہ سفارشات ان امور پر جواب تک ممنوع تھے ایک وسیع مباحثہ کے اقدام کی سنجیدگی کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ سعودی عرب کی نظریاتی تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی چھوٹی کامیابی نہیں تھی۔ اس کی رفتار اور نتیجہ کو قابو میں رکھنے کی خواہش بھی حتمی ہے۔ کچھ اصلاحی اقدام جیسے کہ مسجد کے اماموں کی ''دوبارہ تعلیم'' بشمول لاپرواہ افراد کے خلاف تادیبی کارروائی، بھی متعارف کیے گئے (70)۔ میونسپل، صوبائی اور شوریٰ کونسل میں منتخب ہونے کے لیے الیکشن کے اصول کو بھی جزوی طور سے تسلیم کرلیا گیا (71)۔ دوسری جانب دسمبر کے پٹیشن کے کچھ دستخطیوں کو اس الزام کے ساتھ کہ وہ سلطنت میں حقوق انسانی کی ایک آزاد تنظیم قائم کرنا چاہتے ہیں (اس کے علاوہ جو سرکار نے قائم کی ہے اور شاید اس میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے) 15 مارچ کو گرفتار کرلیا گیا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی وزارت خارجہ نے ان گرفتاریوں کو ''سیاسی تبدیلی کے عمل میں ایک قدم پیچھے'' کے مترادف بتایا۔ جواب میں سعودی وزارت خارجہ نے یوایس کے ردعمل پر اپنی مایوسی کا اظہار کیا۔(72)

مکہ ڈائیلاگ میں تذکرہ تو ہوا لیکن نوجوان افراد کے مسائل کی بات کو آگے نہیں بڑھایا گیا۔ یہ آبادی کا 62 فیصد حصہ ہیں اور اگلے دس سال تک ووٹوں کی سیاست کا نازک حصہ ہیں۔ بے روزگاری (کچھ اندازوں کے مطابق 30 فیصد کے آس پاس) کی شرح کو دیکھتے ہوئے معاشی غیر یقینی ان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ روایت و جدیدت کی متحارب قوتوں کے درمیان ان کی شناخت کا احساس کچھ تحقیقات کا موضوع رہا ہے۔ اکثریت کا خیال تھا کہ اسلامی اقدار سے الحاق بہتر تبدیلی لائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ حکومت سے متعلق ایک رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حکومت ایک 'فریق' بن گئی ہے جس پر بہت سے افراد بھروسہ نہیں کرتے۔'' پابندیوں سے آزاد ہونے کی شدید خواہش موجود ہے۔''عام طور سے نئی نسل کے افراد جو قومی شناخت کے مثبت احساس سے معمور ہیں چاہتے ہیں کہ اب سعودی سماج میں ایک مقام حاصل ہو جہاں وہ علما اور سیاست کی زبردستی کی موجودگی کے بغیر اپنے رجحانات اور خیالات کو فروغ دے سکیں۔''(73)

سعودی معاشرہ میں عورت کے رول پر جاری بحث نے کئی مفید نکتے واضح کیے۔ 1992 کے بنیادی قانون میں لفظ عورت موجود نہیں ہے۔ مکہ ڈائیلاگ کا یہ فیصلہ کہ اس کی اگلی میٹنگ میں عورت کے مسئلہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے گا ذہنی ارتقا کا ایک قدم ہے۔ ان معاملات کی جو ایجنڈے میں شامل ہونے چاہئیں کی ایک طویل فہرست ہے۔ (74) کچھ لوگوں کا بہرحال یہ خیال ہے کہ جن خواتین نے مکہ ڈائیلاگ میں شرکت کی تھی وہ پوری طرح عورتوں کی نمائندگی نہیں کرتیں، انھوں نے بحث کے الگ تھلگ انداز میں ہونے کا شکوہ کیا، اور مزید یہ کہ 'اسلام اور (مقامی) رسم و رواج کے درمیان ثقافتی ابہام کو دور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سعودی عورت بغیر لازمی مذہبی معیار کی خلاف ورزی کی حد تک جاتے ہوئے اپنے روایتی رول کی زنجیروں سے آزاد ہو سکے(75)۔ خاندانی سطح پر یہ کچھ تناؤ پیدا کررہا ہے۔ جدہ میں ورکنگ خواتین کے درمیان طلاق کی شرح 40 فیصد کی اونچائی کو چھورہی ہے۔(76) بیرون ممالک میں سعودی عورت کے متعلق شبیہ کو اس وقت مزید حسن ظن حاصل ہوا جب سالانہ جدہ اکنامک فورم کے موقعہ پر ایک سینئر سعودی کاروباری خاتون نے کلیدی خطبہ پڑھا اور اس میں ایک ایسے سعودی عرب کا خاکہ پیش کیا جہاں سب شہری خود کو ''محفوظ سمجھیں اور ایک ایسے ماحول میں زندگی گزار سکیں جہاں سب کے درمیان باہمی احترام اور رواداری ہو اور سماجی مرتبہ، مذہب اور صنف کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ ہو۔''(77) نئی بیداری کے مزید اشارات بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ملک میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں میں عورتوں کا حصہ دوتہائی ہے(78)۔ اس کے باوجود سلطنت کی نوجوان عورتوں کی اکثریت یہ یقین رکھتی ہے کہ ''ان کے سماجی درجہ میں تبدیلی صرف دینی حوالہ سے آسکتی ہے'' اور اس مقصد کے لیے ''عورتوں کے حقوق اور سلوک کا مسئلہ علما اور ریاست کے درمیان طاقت کی کشمکش کے مرکز پر رکھ دیا گیا ہے''(79) دوسری جانب خود سعودی خواتین کا ایک یکہ وتنہا مگر قابل شناخت گروپ ہے جس کے خیال میں اسلام ہی نسائی رجحانات کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ یہ طرز فکر حجاز کے علاقہ میں عام ہے۔(80)

نظریات کی ان تبدیلیوں سے علما کی طاقتور لابی غیر متاثر نہیں رہی ہے۔ مختلف

نظریات کے حامل علما قومی مذاکرہ میں شرکت کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ معاشرتی اصلاحات کے بارے میں قدامت پرست نقطہ نظر سے سمیٹے ہوئے جب کہ دوسروں نے نئے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے کچھ گنجائش نکالی ہے۔ مذاکرہ کا عمل ان کی صفوں میں انتشار پیدا کر رہا ہے اور اصلاح گروپ اور ان کے قدامت پرست حریفوں کے درمیان بحث جس نہج پر آگے بڑھتی ہے اس کو بغور دیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اوّل الذکر کی ایک غیر شدت پسند قدامت پرستی کی وضاحت میں کامیابی حکومت کے ہاتھ مضبوط کرے گی اور اصلاح کی کوششوں کو قانونی بنا دے گی۔ اس کی حدود کو بہر حال مدنظر رکھا جائے گا۔ لہٰذا مثال کے طور پر شیعہ پٹیشن کی مانگ کہ رواں مذاکرہ (آئی ایس ای ایس سی او اور اسلامک فقہ اکیڈمی میں) کو مسلکی تفریق کو پاٹنے یا کم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے اور شیعوں کو مکمل مساوات دی جائے مکہ اعلانیہ میں غیر مذکور رہی سوائے شاید ایک وسیع سیاق میں زیادتیوں کو ہٹانے اور اعتدال کی آرزومندی کے تذکرہ سے۔ دوسری جانب جس گروپ نے دسمبر 2003 کا پٹیشن پیش کرتے ہوئے دستوری بادشاہت کا مشورہ دیا تھا روشن خیال طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے: ''یہ حقیقت کہ سعودی اسلامسٹس نے ایسی تجویز سامنے رکھی ہے جو عکاسی کرتی ہے کہ سعودی عرب جو ایک بہت قدامت پرست ملک ہے محرکات و توانائی کے کن تجربات سے گزر رہا ہے۔ (81)

اصلاح کی سیاست: بہت دیر ہو چکی ہے یا ابھی امید باقی ہے؟ حال ہی میں ایک سعودی اخبار میں پوچھا گیا یہ سوال، اگرچہ سماجی پس منظر میں تھا، لیکن اس کا دائرہ وسیع تر ہے۔ امید کا تعلق ایک عمل، جو بنیادی طور سے ارتقائی ہے اور جس کے نتیجہ میں اچانک الٹ پھیر نہیں ہوتی، میں تبدیلیوں کی توقعات سے ہے۔ پھر اس سے دوسرے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا تبدیلی ہونا چاہیے اور کس میں تبدیلی ہونا چاہیے؟ اس کے حصول کے لیے کیا طریقۂ کار ہونا چاہیے؟ یہ ذمہ داری کس کی ہوگی؟ اس کی تکمیل کی کیا رفتار ہونی چاہیے؟ کیا طریقۂ کار اور نتیجہ پر اتفاق رائے ہے؟ وہ کیا عناصر ہیں جو تبدیلی کی مزاحمت کر رہے ہیں، ان کی نوعیت کیا ہے اور کتنی طاقت ہے؟

1990 سے جو مختلف پٹیشنز اور تنقیدی جائزے پیش کیے گئے ہیں ان کو سطحی طور سے تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (1) وہ انقلابی گروپ جن کی حتمی وفاداری حکمرانی کے اسلامی اصولوں کے ساتھ ہے اور اسی بنا پر وہ سعودی حکمت کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کا تختہ پلٹنے کی دعوت دیتے ہیں، (ب) وہ روایتی اسلامی علما جو محمد بن عبدالوہاب اور السعود گھرانے کے بانی کے درمیان اٹھارویں صدی میں کیے گئے میثاق کو مانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ موجودہ سعودی نسل اس کا لفظی اور معنوی اعتبار سے احترام کرے اور (ج) تیسرا گروپ ان جدید تعلیم یافتہ ممتاز افراد کا ہے جو مختلف درجہ کے اصلاح پسندانہ نظریات کے حامل ہیں اور چاہتے ہیں کہ مطلق العنان بادشاہت منتخب مجلس قانون ساز کو مانتے ہوئے ایک ذمہ دار جوابدہ حکمرانی کے اصول کو اپنائے۔ حقوق کا ایک بل جس میں اس موضوع پر بین الاقوامی معاہدوں کی شمولیت ہو، سماجی اور تعلیمی اصلاحات نافذ کرے تاکہ سعودی معاشرہ جدید دنیا سے زیادہ ہم آہنگ ہو سکے۔ ان نظریوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم سماجوں میں حکمرانی کے تصور کا تجزیہ کیا جائے خصوصی طور سے ایک جانب علما اور فقہا کا نظریہ اور دوسری جانب حکمرانوں کا تصور۔ یہ اس لیے بھی کہ گزرتے وقت کے ساتھ مسلم سیاسی خیالی تصویر نے جو خاکہ بنایا ہے وہ سیاسی انفرادیت اور حکمرانی کے بے عیب و صحیح سالم نمونہ کی ہمسری کی کوشش کرتا ہے۔ حکمرانی کے مسئلہ سے متعلق قرآنی آیات کی تعداد کم ہے اور وہ عام نوعیت کی ہیں لیکن وہ ایک اصول ضرور مرتب کرتی ہیں۔ دراصل ''مسلم تاریخ کے اوّلین اور سب سے باعزت دور نے قوم کے سیاسی لیڈر کے انتخاب کے لیے کوئی مقررہ طریقۂ کار نہیں متعارف کرایا۔ لیکن اس دور نے واضح طریقہ سے وہ تجاویز اور معمولات پیش کیے ہیں جو حکمرانوں (بشمول سلسلہ وار خاندانی حکمراں کے) کے رویہ اور سلوک اور رعایا کے حقوق اور خود دین سے منضبط فرائض بتاتے ہیں(82)۔ یہ ذمہ داری ایک خودساختہ 'اسلامی ریاست' جیسے کہ سعودی عرب میں لازمی ہو جاتی ہے اور یہ مکمل طرح سے پہلے کے اعلانیوں میں جھلکتا ہے اور 1992 کے ''بنیادی قانون'' میں بھی جیسے کہ دفعہ 1 (قرآن وسنت، سلطنت کے دستور کے طور پر)، دفعہ 7 (قرآن وسنت، اقتدار اور قانون

کے منبع کی حیثیت سے)، دفعہ 8 (انصاف، شوریٰ اور مساوات شریعت کے مطابق حکومت کی بنیاد) اور دفعہ 55 (بادشاہ کو شریعت کے مطابق حکومت کرنی ہوگی اور اس کو نافذ کرنا ہوگا)۔ نظام میں ایک غیر مذکور معاشرتی معاہدہ سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس سیاق میں مباحثہ کی ناگزیری میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس بات کے لیے کافی ثبوت ہیں کہ وہ انقلابی گروپ جو سعودی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس کا تختہ پلٹنا چاہتے ہیں سعودی رائے عامہ کا بہت ہی قلیل حصہ ہیں۔ یہ 1979 میں بھی ظاہر تھا اور گزشتہ مہینوں میں ہم وطن سعودیوں کے خلاف تشدد پر اُتر آنے سے اس میں اور کمی آگئی ہے۔ ان کے ہدف میں ایک اشکال متبادل کی صورت میں ایک ٹھوس پروگرام کی عدم موجودگی ہے سوائے اس عام وعدہ کے کہ اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ دوسری مشکل ہے خالص نظریاتی زاویہ سے، اگر چہ اکثر اس بات سے متفق ہو سکتے ہیں کہ اسلام میں وفاداری مشروط ہے اور اس کو واپس لیا جا سکتا ہے، یہ لوگ آسانی سے اپنے اس عمل کے سبب عوامی نظم ونسق پر پڑنے والے اثرات ونتائج سے متعلق موجودہ عدالتی فیصلوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتے۔ یہی تذبذب تھا جس نے کہ ''اضطرار'' کے عقیدہ یا نظریہ کو جنم دیا۔ اس کا قدیم اظہار الغزالی (1111-1058) کے الفاظ میں ملتا ہے: ''ہم نے جو مراعات دی ہیں وہ غیر ارادی نہیں ہیں بلکہ ضرورت ممنوع کو جائز بنا دیتی ہے۔ کس کو ترجیح دی جائے گی! مناسب طریقہ کار سے تعمیر شدہ اقتدار کی عدم موجودگی کی وجہ سے معاشرتی زندگی میں جمود اور مزاج، یا برسر حکومت طاقت کو تسلیم کرے خواہ وہ کوئی ہو؟ ان دو متبادل صورتوں میں فقیہ کو دوسرا متبادل اختیار کرنے کے کوئی اور چارہ نہیں ہے''(83)۔ اسی منطق کے زیر اثر چودھویں صدی کے دینی فلسفی احمد ابن تیمیہ، سعودی علما کے حلقوں میں غیر معمولی عزت و وقار کے حامل، نے کہا کہ ''ایک برائی کو صرف دو صورتوں میں برداشت کیا جا سکتا ہے: ''اگر وہ اپنے سے بڑی برائی کو دور کرنے کی راہ دکھاتا ہو اور جس کو ہٹانے کا کوئی اور راستہ نہ ہو، اور اگر وہ ایسا فائدہ پہنچاتی ہے جو نہ چھوڑا جا سکتا ہو اور نہ کسی دوسرے ذریعہ سے لایا جا سکتا ہو۔''(84) اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اصلاح کو بغاوت پر ترجیح دی جائے گی۔

قدامت پرست اصلاح پسند اور آزاد خیال اصلاح پسند بادشاہت کے ادارے اور السعود کی حکومت کو قبول کرتے ہیں۔ ان حلقوں نے ابھی تک کسی جمہوری جذبہ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ ریاست کے ظہور اور بکھرے ہوئے زمینی ٹکڑوں کو جو اتحاد اس نے دیا ہے میں پوشیدہ ہے۔ ملک کا نام ''سعودی'' عرب ہے اور سعودی جھنڈے میں جو تلوار ہے وہ اتحاد کے اصل عمل کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ سات دہائیوں کے بعد بھی اتفاق و یگانگت کے معاشی و جذباتی عوامل اب بھی مضبوط ہیں۔ لیکن ان کو اکثر دہراتے رہنے کی ضرورت ابھی باقی ہے جیسا کہ بنیادی قانون کی دفعہ 12 اور اصلاحات سے متعلق متعدد پٹیشنز اور دو نیشنل ڈائیلاگ سے باہر آئی ہوئی دستاویزات میں قومی یکجہتی اور السعود خاندان سے وفاداری کے افراد سے ظاہر ہوتا ہے۔ 2002 میں واشنگٹن کے کچھ حلقوں میں دیے گئے بیانات صرف ان تعلقات میں اضافہ ہی کر سکتے تھے۔ لہٰذا اصل مسئلہ بادشاہت کا نہیں بلکہ اس کی طرز حکمرانی کا ہے۔

1990-2003 کی مدت میں پیش کیے گئے مختلف پٹیشنز کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب اداراتی اور انتظامی اصلاح کن ذرائع سے متعلق کچھ خصوصیات مشترکہ ہیں اور کہیں کہیں نظریات میں فاصلے ہیں۔ ان کا تعلق (1) فیصلہ سازی میں عوامی شرکت۔ شوریٰ، صوبائی اور میونسپل کونسلز، اراکین کے انتخاب کا طریقۂ کار، ان تنظیموں کو تفویض کیے گئے اختیارات، ان کے کام کرنے کا طریقۂ کار اور یہ کہ انتظامیہ کے محکموں کا ان کے مخصوص میدان عمل میں یہ کس حد تک احتساب کرتے ہیں؛ (ب) عدلیہ کے نظام کے بارے میں، اس کو بیک وقت جدید طرز پر آراستہ کرنا اور انتظامیہ کے اثر سے آزاد ہونا، (ج) شہریوں کے حقوق اور اسلامی قانون اور عصری بین الاقوامی حقوق انسانی کے معمولات کے مطابق ان کی ضمانت۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ اور صنفی تعصب کو ختم کر کے تمام شہریوں میں مساوات کی یقین دہانی کی ضرورت، (د) اونچے طبقہ کا مالی اور انتظامی اختیارات کے نامناسب استعمال کا خاتمہ، (ہ) نظام تعلیم میں اصلاح، (و) روزگار کو فروغ دینے والی پالیسیاں تاکہ نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مسائل سے نمٹا جائے جن میں 62.3 نوجوان چوبیس یا

اس سے کچھ کم سال کے ہیں؛ (85) اور (ز)ان رسوم و رواج کو بدلنا جن کی جڑیں مقامی ہیں اور مذہب میں ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے، سے ہے۔ اس وسیع فریم میں خاصی تعداد میں جو باریک فرق اجاگر ہوئے ہیں وہ قدامت پرست یا اصلاح پسندوں کی ترجیحات اور پالیسی انتخاب کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں سے کچھ سمجھوتہ کے قابل ہیں اور کچھ نہیں ہیں بلکہ اس عمل میں آگے چل کر وہ معاملات کو الجھا سکتے ہیں۔

یہ پٹیشنز خاص طور سے وہ جو حال ہی میں پیش کیے گئے ہیں کچھ خاص عوامی شکایتوں پر بھی توجہ دیتے ہیں جن کو چار زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ انفرادی سطح پر ان کا تعلق حقوق کی پامالی سے ہے جو سعودی ریاست کے کام کرنے کے طریقہ پر آنکھیں کھولنے والا تبصرہ ہے۔ ادارتی سطح پر ادارے موروثی، پدرانہ ڈھانچہ سے جدیدیت کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ ان میں سب ہی عدلیہ کی کوتاہ عملی کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ وہ انتظامی بدعنوانیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اگر کھل کر نہیں تو پوشیدہ طور سے اس مربیانہ نظام کے طریقہ کار پر تنقید کرتے ہیں جس کا فائدہ اگر صرف نہیں تو سب سے زیادہ شاہی خاندان کو پہنچتا ہے۔ (86)

یہ کہا جاسکتا ہے کہ درست حکمرانی کا سطحی نشان، سعودی معیار کے مطابق، فیصل کا 6 نومبر 1962 کا اعلان ہے اور ان کا یہ بیان کہ ''کسی حکومت کی کامیابی کو اس کے کاموں اور حکمراں کی دیانت داری سے ناپنا چاہیے نہ کہ اس کے نام سے''۔ (87) 1993 کے شاہی فرمان نے شوریٰ کی تشکیل کرتے ہوئے پینسٹھ سال پہلے والے فرمان کو خارج کردیا۔ (جس کے زیادہ تر حصہ میں یا کونسل کا وجود ہی نہ تھا یا صرف نام ہی نام تھا) یہ بجائے خود اپنے ہی نافذ کردہ روایتی طرز عمل سے انحطاط کا اعتراف ہے۔ لیکن بات اس وقت تک بنی نہیں تھی جب تک اصلاحات کی ضرورت پر جنوری 2002 میں عبداللہ کا اعلان، وہ بھی ایک وسیع تر، پان عرب فریم ورک میں، نہیں آگیا۔ نیشنل ڈائیلاگ کی شروعات کو بھی سرکاری تائید سمجھنا چاہیے۔

اصلاحات کی سیاسیات ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ 'السعود' کی تعداد تقریباً چھ ہزار ہے اور بارہ ہزار کی تعداد کا تعلق ان سے شادی یا مقامی رشتوں کی وجہ سے ہے یہ کل تعداد

اٹھارہ سے بیس ہزار تک ہو جاتی ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جو ایک وسیع نظام میں فیاضانہ ماہانہ وظیفوں (عمر کے لحاظ سے)، بڑی زمینی جائداد اور نفع بخش تجارت سے خصوصی طور سے مستفید ہوتے ہیں۔(88) بشمول سرکاری ٹھیکوں کے ایک بڑے حصے اور کچھ کے لیے کم سے کم سرکاری ڈھانچہ میں اعلیٰ عہدوں پر تقرر۔ اہم مسائل پر فیصلے وزرا کی کونسل نہیں لیتی بلکہ شاہی خاندان کے سینئر ممبران، علما کی مدد سے اتفاق رائے سے کرتے ہیں (89) ایک بہت پکا عقیدہ یہ ہے کہ ملک اور اس کی دولت سب سے پہلے خاندانی ملکیت ہے۔ ایسی صورت حال میں خاندانی مفاد کی حفاظت، اپنے جامع ترین تصور میں، اعلیٰ ترین ترجیح ہوگی۔ اور پٹیشنز میں مذکور اکثر سنجیدہ مالی اور انتظامی بدعنوانیوں کا تعلق شاہی خاندان کے کرتوتوں سے ہے۔ لہٰذا شفاف اور جوابدہ حکمرانی (عرب ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ 2002 اور ورلڈ بینک رپورٹ آن گڈ گورنینس 2003 میں دیے گئے مشوروں کی طرز پر یا اس کے نزدیک ترین متبادل) کے انداز و کردار میں شدید اور تکلیف دہ ایڈجسٹمنٹ کی ضرورت ہوگی۔ میکاولی کے قول کہ ''لوگ اپنے باپ کا غم آسانی سے بھلا دیتے ہیں بمقابلہ باپ کی جائیداد کے غم کے'' سے مطابقت رکھتے ہوئے کسی بھی رعایت کے نقصان کی سختی سے مزاحمت کی جائے گی۔ خاندان کے کچھ افراد جیسے کہ 1959/60 میں طلال بن عبدالعزیز، تبدیلی کی ضرورت کو فوراً مان لیں گے لیکن کچھ شدت سے مخالفت کریں گے۔ ''السعود'' میں ان کے درمیان طاقت کا کیا توازن ہے اس پر رائے دینی مشکل ہے کیونکہ ان مسائل پر ان کے اندرونی بحث و مباحثے کے متعلق مناسب معلومات نہیں ہیں۔ یہاں یہ کہاوت سچ لگتی ہے کہ ''جو جانتے ہیں وہ بولتے نہیں اور جو بولتے ہیں وہ جانتے نہیں۔''(90)

اس کے علاوہ اصلاح کی سیاست سراسر داخلی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ اصلاحات کے لیے یو ایس کے دباؤ جو صاف صاف الفاظ میں بڑھتا جاتا ہے، ایک حقیقت ہے جس پر مخالفت میں پرزور احتجاج کے باوجود سعودی ریاست کو توجہ دینی ہوگی۔ اسی طرح سے سعودیوں کی یہ خواہش کہ مسئلہ کو عرب رنگ دے کر علاقائی بنا لیں جنوری 2003 میں ایک اچھی تدبیر ہو سکتی ہے لیکن وہ دیگر قسم کے دباؤ کو دعوت دے سکتی ہے۔ اور یہ بات فروری

2004 میں یو ایس حکومت کے تجویز کردہ ''گریٹر مڈل ایسٹ انیشیٹو'' سے ظاہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ السعود وقتی ٹال مٹول سے کام لیں گے، یو ایس صدارتی الیکشن کے نتیجہ کا انتظار کریں گے اور عالمی اور علاقائی ماحول میں خوشگوار تبدیلی کا انتظار کریں گے۔ خود ملک کے اندر مختلف حلقوں کی مختلف ترجیحات ہیں۔ سریع اصلاحات کی کوشش جو جدید ذہن کی جانب سے آرہی ہے اس کی بہت حد تک نفی علما اور عمومی طور سے قدامت پرست تاجر کمیونٹی کی جانب سے اس کے اصل متن سے متعلق ہے۔ لہٰذا حکومت اصلاح ایجنڈے میں شگاف اور قدامت پرست اور جدید اصلاح پسندوں کے مختلف ٹکڑیوں میں فاصلے تلاش کرے گی۔ ان دونوں عناصر کو مہارت کے ساتھ حاصل تفریق میں شامل کر دیا جائے گا۔

ایک اور عنصر جو اصلاح کے عمل سے متعلق ہے وہ ملک کی معیشت اور اندرونی استحکام پر اس کا اثر ہے۔ تیل کی اونچی قیمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سعودی عرب نے 2003 میں 80.9 بلین ڈالر کمائے جو بیس سال میں اس کی سب سے زیادہ آمدنی تھی۔ سعودی۔امریکن بینک (سامبا) 2004 کی سعودی معیشت کے لیے پیشین گوئی کرتا ہے کہ 2004 میں قیمتوں کو مستحکم رکھنے کے لیے پیداوار میں کچھ کمی کے باوجود پچھلے دو سالوں کی بہترین کارگزاری جاری رہے گی۔ اس نے پیشین گوئی بھی کی ہے کہ پچھلے اندازوں کے برخلاف پرائیویٹ سیکٹر میں زیادہ روزگار مہیا ہوگا۔ آخرالذکر کچھ سماجی دباؤ کم کرے گا۔ گزشتہ کئی مواقع پر بہترین معاشی صورت حال نے تبدیلیوں کے تئیں غیر دلچسپی پیدا کردی۔ یہ دیکھنا باقی ہے کہ کیا نئی صورت حال کے لوازمات رجحان کو واپس لا دیں گے۔

تبدیلی کی رفتار: نتیجہ کے طور پر جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ایک غیر مساوی تبدیلی کی ہے جو اپنے مواد اور رفتار میں نامتوازن ہے۔ اس کی شدت اور اثر بحث کا موضوع ہوسکتا ہے۔ اصلاح کے حامی کچھ سعودی محسوس کرتے ہیں کہ پہلے ہی سے دو سعودی عرب، حقیقی اور عملی موجود ہیں۔ اور یہ کہ ملک ایک حقیقی اور سانس روک دینے والی اصلاحی مہم کا مشاہدہ کر رہا ہے جو کامیاب ہونی ہی چاہیے کیونکہ ملکی نظام کے اندر اور باہر قدامت پرست طاقتوں کی مخالفت کے باوجود سعودیوں کی اکثریت اس کی حامی ہے۔(91)

تبدیلی کے حقیقی مظاہر کو سماجی زندگی کے ترجیحی حصوں میں تلاش کرنا ہوگا۔ ان میں سے ایک کا تعلق تعلیمی نصاب کی اصلاح سے ہے۔ اس موضوع پر کئی سال سے زبردست کشمکش جاری ہے۔ زیادہ تر سعودی تعلیمی ایجنڈے میں اصلاح کی حمایت کرتے ہیں ''جب تک کہ نیک اور شفاف ارادے شامل ہیں اور جو محض عارضی صورت حال کا نتیجہ نہیں ہے''(92) وہ حصہ داری کی طرز حکمرانی کے بارے میں بھی فکرمند ہیں۔ سعودی طرز سے موافقت رکھتے ہوئے سرکاری ذرائع آہستہ آہستہ الیکشن کے ٹائم ٹیبل کی وضاحت کررہے ہیں۔ چودہ میونسپل کونسلز کے ممبروں کی آدھی تعداد کا الیکشن ایک سال کا ہوگا؛ صوبائی کونسلز کے ممبروں کی آدھی تعداد کا الیکشن دو سال کے اندر ہوگا اور تین سال کے اندر شوریٰ کونسل کی ایک سو بیس نشستوں میں سے ایک تہائی کو پُر کیا جائے گا(93)۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی صاف کردیا گیا ہے مغربی طرز انتخاب کو صرف ترمیم شدہ صورت میں اختیار کیا جائے گا۔ ''ہم جمہوری الیکشن کرسکتے ہیں لیکن افراد کا انتخاب اسلامی ضابطوں کے تحت ہونا لازمی ہے تاکہ شوریٰ کے اراکین کی خوبی اور دیانت داری کی یقین دہانی ہوسکے(94)۔'' اسی طرح سے میڈیا میں جس تیزی سے عورتوں کے مسائل پر بحث ہورہی ہے اس سے اس حساس میدان میں دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس عمل کو باہر کے لوگ کس انداز سے دیکھتے ہیں؟ کچھ مبالغہ آمیز جوش سے کام لیتے ہیں۔ حال ہی میں ایک صاحب علم امریکی سیاح نے لکھا ہے کہ ''سعودی عرب میں ایک خاموش انقلاب جاری ہے۔ کسی کو اس کی وسعت اور گہرائی اور یقینی اثر کا اندازہ نہیں ہے لیکن اصلاح کی کوشش قطعی ہے اور شاید نہ رکنے والی ہے... اصلاح کی کامیابی اور ناکامیابی کا دارومدار شاہی خاندان کی اسلام کی تشریح اور اس کے انتہا پسندانہ عناصر کو غیر قانونی قرار دینے کی متحدہ کوششوں میں ہے... انقلابی ردعمل کا خوف اصلاح کے عمل کو سست کرے گا لیکن سلطنت میں اصلاح کے نام پر جو کام شروع ہو چکا ہے اس کو واپس لوٹانا بہت مشکل ہے سوائے اس کے کہ السعود خاندان کا تختہ پُرتشدد طریقہ سے پلٹ دیا جائے اور فی الحال یہ غیر ممکن نظر آتا ہے''(95) ایک اور امریکی مبصر نے کہا ہے کہ ''حکمراں

خاندان کے مربیانہ برتاؤ کا بتدریج ارتقا ہے' جو وسیع عوامی بیداری سے مربوط ہو رہا ہے(96)۔ دیگر انداز سے مایوسی اور امید کا ملا جلا اظہار ہیں۔ جو اس عمل کو (شاہی خاندانی سیاست کے مطابق) ''مثالی اور خطرناک دونوں'' بتاتے ہیں اور یہ اعتدال پسند اسلامسٹ اور سیکولر اصلاح پسند جو''اپنے لیے زیادہ نمائندگی اور شاہی حکمرانوں سے زیادہ جوابدہی'' کے لیے کام کر رہے ہیں، کے درمیان ایک سمجھوتہ (موجودہ طاقت کے حصار سے باہر) کے امکان کی تلاش میں ہیں۔''(97)

اس میں کوئی شک نہیں کہ سال 2003 سعودی عرب میں سیاسی نظریات کے ارتقا میں اہم موڑ تھا۔ مختلف پٹیشنز کے متن اور ان میں استعمال کی گئی زبان اور لہجہ، اس عمل کو آگے بڑھانے میں ایک نئی جرأت اور سرعت کے احساس کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اور اگرچہ کہ اصطلاحات اور اظہار بیان جزئی طور سے بیرونی دنیا کے لیے بھی تھا، یہ بنیادی طور سے سعودی اور اسلامی ہے لہٰذا اس کا مزاج انقلابی کے بجائے سعودی ہے۔ اس اظہارِ بیان سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ اصل کوشش عوامی نظریات کو متاثر کرنا ہے نہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور، علما اور تکنیکی بالادست کی جانب جو فی الحال ان مسائل پر بحث میں مشغول ہیں۔ ان معاملات پر غیر اوسط درجہ کے طبقہ کے کیا تاثرات ہیں، اس سوال کا جواب ابھی باقی ہے۔

لہٰذا سعودی عرب میں اصلاحات کے فوری تناظر میں دو عناصر ترکیبی کو درکنار نہیں کیا جا سکتا۔ اوّل تو اسلام پر نیا اتفاق رائے (جیسا کہ سعودی معاشرہ میں سمجھا اور عمل کیا جاتا ہے) اور دوم السعود کے اپنے کچھ مطلق العنان اختیارات سے دستبرداری کرتے ہوئے تبدیلی کو قبول کرنے کی صلاحیت۔ اب تک تو شاہی خاندان نے توازن کو اپنی شرائط پر برقرار رکھا ہے۔ آبادی کے سب ہی طبقوں اور علاقوں میں اپنی بیشتر طاقت کی بنیاد پر اس عوامی آگاہی پر بھروسہ کرتے ہوئے کہ ملک کی قومی یکجہتی اور اتحاد بہت حد تک سعودی حکمرانی سے مربوط ہے اور جس کا کوئی مقبول متبادل ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے، وہ اس کو پھر کر سکیں گے۔

ایک ممتاز عرب مؤرخ نے لکھا ہے کہ ایک مربوط حکمراں گروپ، ایک بالادست حکمراں طبقہ اور طاقتور تصورات حکومت کے استحکام میں فائدہ پہنچا سکتے ہیں لیکن کچھ حالات میں یہ کمزوری کا سبب بھی ہو سکتے ہیں۔ حالیہ عرب تاریخ میں اسلام اور سماجی انصاف کے نظریہ کے استعمال کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے لکھا:

> ''جن حکومتوں نے ان گہری جڑوں والے اور طاقتور تصورات سے دلچسپی دکھائی انھوں نے پریشانی مول لی۔ وہ طاقت کے سمجھوتوں اور ابہام میں پھنس گئیں۔ اور اگر انھوں نے اتنی طاقتور اپیل کی زبان استعمال کی تو ان کے مخالفین بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں تاکہ وہ دکھا سکیں کہ حکومت کے قول اور عمل میں کتنا تضاد ہے۔ وہ جبر و استبداد اور منافقت جیسے الفاظ، جو اسلامی تاریخ میں شروع سے آخر تک دکھائی دیتے ہیں، کو ان کی پوری اثر آفرینی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں... ایسی حالت میں مستحکم ترین اور طویل ترین حکومتیں بھی کمزور ثابت ہوں گی۔''(98)

اس تجزیہ کی تائید اسلامزم کا عنصر اور مذہب کی حقیقی معاشرتی و سیاسی اقدار میں اس کی اپیل سے ہوتی ہے۔ اسی طرح سے سعودی عرب کا 'اسلامو-لبرل' رجحانات سے حالیہ تجربہ ہے جو جدید اسلامی فکر۔ نتیجہ خیز اور بغیر تشدد کی وکالت کے۔ دوسرے عرب ممالک میں قدم بقدم ہے۔(99)

ایک تاریخی تناظر میں السعود اصلاح کا راستہ 1960-1959۔ 1962 میں اختیار کر سکتے تھے بلکہ دیر سے سہی لیکن 92-1991 میں بھی ہوسکتا تھا۔ یہ آزادانہ اقدام یا اس سے قریب ہوتے۔ ان مواقع کو دو رخی ترنگ کے باعث نظرانداز کر دیا گیا۔ پہلی تو طاقت کا نشہ تھی اور دوسرے سعودی ادارہ کی نئی مربیانہ ناگزیریاں۔ نتیجہ کے طور پر اور پچھلی دہائی میں، تاخیر کی قیمت ظاہر ہوچکی ہے۔ اس نے نظام سے بیزاری پیدا کی، رائے عامہ کو

انتہا پسند بتایا، تبدیلی کے مطالبوں میں سرعت کا اضافہ کیا، اندرون خانہ تشدد کو ایک سماجی عنصر کی حیثیت سے فروغ دیا، داخلی اور بیرونی رائے کو سعودی طرز حکمرانی کی کوتاہیوں پر مرکوز کردیا۔ بیرونی دباؤ جس میں سے کچھ ملک کی جغرافیائی سالمیت سے متعلق ہے کو زیادہ کیا اور بین الاقوامی طور پر ملک کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس عمل کے دوران سیکولر لبرلزم اور اسلامزم دونوں ہی نے اپنی جڑیں مضبوط کیں اور وہ حالات پیدا کیے جو جدید عربیانہ ڈھانچے کو جو اب تک اسلام کے ذریعہ اپنا جواز ثابت کرتا تھا، کمزور کیا جائے۔ کچھ سال پہلے، سعودی منظرنامہ کے کچھ محتاط مبصروں نے چند تجاویز پیش کی تھیں جن کو قبول کیا جاسکتا تھا(100)۔ قیمتی وقت کو رائیگاں جانے دیا جاتا رہا جس کے دوران چنندہ تکنیکی جدیدیت اور سماجی و سیاسی صورت حال کو برقرار رکھنے کے درمیان دولختی ہونے کو شدید تر کردیا۔ ستمبر 2003 کے پٹیشن نے کچھ افراد کے تشدد پر اتر آنے کو غیر مبہم الفاظ میں اصلاحات کے نفاذ کی تاخیر سے منسوب کیا اور ترغیب دی کہ عمل کو ایجنڈا بنانے پر ترجیح دی جائے۔ دوسری جانب مکہ اعلانیہ بظاہر ایک وسیع تر اتفاق رائے کو فروغ دینے کے لیے خود کو رائے عامہ کے رجحانات اور حقائق تک محدود رکھتا ہے، دونوں کے درمیان تناقض ظاہر ہے۔

السعود کے سامنے فی الوقت چیلنج یہ ہے کہ اپنی قانونیت کی تجدید کے لیے تبدیلی کے دباؤ سے آگے جانا ہے۔ اصلاح پسندوں، اسلامسٹ اور لبرل کے سامنے چیلنج یہ ہے کہ وہ بغیر اسے روکے تبدیلی کے عمل پر جم کر تنقید کریں۔ اس تناؤ کو توازن میں بدلنے کے لیے وقت لامحدود نہیں ہوگا۔

حواشی

1- یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف انرجی، بریف فار سعودی عربیہ، 17 دسمبر 2003 اپ ڈیٹ۔سعودی وزیر برائے پٹرولیم نے ایک سی ایس آئی ایس۔ سعودی/ ایس بزنس کونسل کی واشنگٹن کی ایک کانفرنس میں 29 اپریل 2004 کو کہا کہ ''سعودی عرب بغیر کسی پریشانی کے پیداوار کو 10.5 ملین بیرل روزانہ سے بارہ سے پندرہ ملین بیرل روزانہ تک بڑھا سکتا ہے اور پیداوار کی اس سطح کو پچاس یا اس سے زیادہ سال تک برقرار رکھ سکتا ہے...'' تقریر کا متن

http://www.saudiembassy.net/2004news/statements/speechdetails.asp?cIndex=402

2- عنایت حمید ''ماڈرن اسلامک پولیٹیکل تھاٹ'' (میکمیلن، لندن، 1982)، صفحہ 1

3- الماوردی ''دی آرڈینس آف گورنمنٹ'' (گارنٹ پبلشنگ ریڈنگ، یوکے 1982) صفحات 22-23

4- انصاری، محمد عبدالحق (ایڈٹ) ''ابن تیمیہ اکسپاؤنڈز آن اسلام: سلیکٹیڈ رائیٹنگس آف شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ آن اسلامک فیتھ، لائف اینڈ سوسائٹی''

(امام محمد ابن سعود یونیورسٹی، ریاض، 2000) صفحات 23-510

5- الفارسی، فواد ''موڈرنٹی اینڈ ٹریڈیشن: دی سعودی اکویشن'' (نائٹ کمیونی کیشنز، گیورنسی، چینل آئی لینڈز، 1995) صفحات 26-25

6- کرامز مارٹن ''اسلام اسمبلڈ: دی ایڈونٹ آف مسلم کانگریسز'' (کولمبیا یونیورسٹی پریس، نیویارک 1986) تتمہ 6 صفحات 91-186 کانگریس کے دستور کا متن فراہم کرتا ہے۔ باوزن ووٹنگ کا نظام اختیار کیا گیا تھا۔ ہندوستانی وفد کو ووٹوں کی سب سے بڑی تعداد دی گئی تھی کیونکہ وہ 'سب سے زیادہ مسلم آبادی والی سرزمین ہے۔' لیکن کانگریس میں کئی تنازعات پیدا ہوئے خصوصاً ہندوستانی وفد کے رویہ سے بادشاہ کافی چیں بجبیں ہوئے کیونکہ انھوں نے اس کی حجاز کی بادشاہت پر سوال اٹھائے تھے اور حکومت حجاز کی نگرانی کے لیے ایک بین الاقوامی تنظیم کی تخلیق کی تجویز پیش کی تھی۔ (حوالہ بالا، صفحات 22-106)

7- کوسٹنیر جوزف، ''دی میکنگ آف سعودی عربیہ: فروم چیفٹنسی ٹومونارکیکل اسٹیٹ'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک 1993) صفحہ 101

8- حوالہ بالا، صفحہ 190: ''ابن سعود نے مذہب کو قانونیت کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ دینی خدمات شروع کیں، تعلیمی اور عدلیہ نظام کو مرتب کیا۔ لیکن سیاسی معاملات کے فیصلوں میں اس نے ان پر انحصار نہیں کیا۔'' اخوان کے خروج کو دبانے کا تفصیلی تذکرہ ماس ہوس، کرسٹین نے ''دی کوہیون آف سعودی عربیہ: ایوولوشن آف پولیٹکل آئیڈنٹیٹی'' (جان ہوپکنس یونیورسٹی پریس، بالٹیمور، میری لینڈ، 1981) صفحات 75-250، وہ طرز حکمرانی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ستم ظریفی یہ ہے کہ عبدالعزیز کو اسی قوت کو کچلنا پڑا جس نے اس کو زمین کی اس وسعت تک پہنچایا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اخوان نے اپنی بنیادیں وہابی عقیدہ پر قائم کیں جس کے ذریعہ السعود نے اپنے سیاسی اقتدار کو قانونیت بخشی تھی، بلکہ ان کو برطانیہ کی مدد سے شکست دی جو کہ ایک غیر مسلم

حکومت تھی اور عبدالعزیز کا ذاتی طور سے مغربی طرز پر متعین سرحدوں کو قبول کرنا۔'' (صفحہ 251)

9- اَلیا سینی ایمن ''ریلجن اینڈ اسٹیٹ ان دی کنگڈم آف سعودی عربیہ'' (ویسٹ ویو پریس بولڈر، کولوراڈو 1985) صفحہ 76

10- ہولڈن، ڈیوڈ اینڈ جانز رچرڈ، ''دی ہاؤس آف سعوز' (پان بکس، لندن 1981) صفحہ 99

11- ''کیننگز کلکٹر یری آرکائیوز' 8-1 ستمبر 1962 صفحہ 18962 اور ''دی اسٹیٹسمین'' (نئی دہلی) 17 اگست 1962

12- عبدالعزیز، طلال بن۔ ''رسالہ اِلی المواطن'' یہ دستاویز 1960-1959 میں مرتب کی گئی اور حکام کے پاس بھیج دی گئی تھی۔ 1961 کے ایک سرکاری بیان میں اس کا اوپری طور سے حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ 157 صفحات کی ضخامت کی یہ کتاب 'بنیادی قانون' اور صوبائی و میونسپلٹیز قانون کا مسودہ ہے۔ متن پر وضاحتی نوٹ اور اسلامی طرز حکومت پر ایک تعارف کتاب میں ان سے پہلے شامل ہے۔ مقدمہ میں قاری کی توجہ اطاعت کے عقیدہ کی طرف لے جائی گئی ہے کہ حاکم کی اطاعت مشروط ہے مطلق نہیں۔

13- الظہر ان، عبدالرحمٰن بن علی ''سیرۃ الشوریٰ فی المملکۃ'' صفحات 349-319 میں فیصل کے عہد (1384-1395AH) میں شوریٰ کونسل کے اجلاسوں کی تفصیل فراہم کرتی ہے۔ کل 754 میٹنگ بلائی گئی تھیں (صفحہ 348)۔ زیادہ تر پروفارما نوعیت کی تھیں۔ اس زمانے میں اراکین کی تعداد 18 سے گھٹ کر 12 ہوگئی اور ساتھ ہی اجلاس تعداد بھی۔ ان کے جانشینوں کے دور میں کونسل عملی طور سے غائب ہوگئی۔

14- ولسن، پیٹر ڈبلیو اینڈ گراہم ڈگلس ایف ''سعودی عربیہ: دی کمنگ اسٹورم'' (ایم ای شارپ، نیویارک، 1994) صفحات 53-50، دیکھیے ہولڈن اینڈ جانز، حوالہ

سابق صفحات 31-230، اور یزرائیلی سارہ، ''دی ری میکنگ آف سعودی عربیہ'' (تل ابیب یونیورسٹی پریس، تل ابیب 1997) صفحات 55، 96-87، 18-112۔

15- ہولڈن اینڈ جانز، حوالہ سابق صفحات 32-231، یزرائیلی حوالہ سابق 95-94، کا خیال ہے کہ ''اگر چہ (کینیڈی اور فیصل کی میٹنگ) کے بیان کا کچھ حصہ بتاتا ہے کہ کینیڈی نے فیصل پر اصلاحات کے لیے زور دیا یا ''سعود'' کے مقابلہ میں ان کی مدد کے لیے راضی ہوں کے اور اس کے بدلے میں فیصل نے اصلاحات کا وعدہ کیا، لیکن اس کی تائید ریکارڈز سے نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ فرض کرنا چاہیے کہ اپنے امریکا کے دورہ پر جاتے وقت انھوں نے معتدل اصلاحات کی تجویز کینیڈی کے سامنے رکھنے کی، سینئر شہزادوں سے اجازت حاصل کرلی تھی۔''

16- حوالہ بالا، صفحہ 113 اور 96 ان سمجھوتوں کی کئی مثالیں تھیں۔ لڑکیوں کے اسکول وزارت تعلیم کے تحت نہیں تھے بلکہ اس کے لیے ایک مخصوص ڈائریکٹوریٹ تھی جو مفتی اعظم کو جوابدہ تھی۔

17- ولسن اینڈ گراہم، حوالہ سابق صفحہ 98۔ صفران، نادو ''سعودی عربیہ: دی سیزلیس کوئیسٹ فار سیکوریٹی (ہارورڈ یونیورسٹی پریس، کیمبرج، میساچوسٹس 1985) صفحات 22-119، لیسی رابرٹ ''دی کنگڈم'' (ہارکورٹ پریس جوانووچ، نیویارک 1981) صفحات 75-374 اور بادیب سعید ایم ''سعودی ایرانین ریلیشنز 1982-1932'' (سینٹر فار عرب اینڈ ایرانین اسٹڈیز اینڈ ایکون، لندن 1993) صفحات 89-87۔

18- خلیج کی 'ریٹائر اسٹیٹ' کے تجزیہ کے لیے دیکھیے ایوبی نزیہہ ''اوور اسٹیٹنگ دی عرب اسٹیٹ: پولیٹکس اینڈ دی سوسائٹی ان دی مڈل ایسٹ'' (آئی بی ٹارس، لندن 1995) صفحات 55-224، ساتھ ہی دیکھیے گاز ایف گریگوری III ''آئل منارکیز'' (کونسل فار فارن ریلیشنز، نیویارک 1994) صفحات 44-43

-19 حوالہ بالا صفحات 26-511، دیکھیے کیچی چیان، جوزف ایچ، 'اسلامک ریوائیولزم اینڈ چینج ان سعودی عریبیہ: جہیمن العتیبز 'لیٹرز ٹو سعودی پیپل،'' دی مسلم ورلڈ' (LXXX:I جنوری 1990) صفحات 116-1، خصوصاً صفحہ 12 جہاں پیغام' اگرچہ سیاسی ہے لیکن مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا ہے، کا خلاصہ پانچ نکتوں میں بیان کیا ہے؛ السعود کا تختہ پلٹنا، حکمراں خاندان اور سرکاری علما کو غیر متصف قرار دینا، یونائٹیڈ اسٹیٹس کو پٹرولیم کی برآمد کا خاتمہ، بیرونی ماہرین کا جزیرہ نمائے عرب سے اخراج اور اسلامی اقدار پر مبنی ایک سماجی ثقافتی نظام کا نفاذ۔

-20 بلغ الیگزینڈر، 'دی سعودی ریلجس ایلیٹ ایز پارٹی سپنٹس ان دی پولیٹکل سسٹم، ''انٹرنیشنل جرنل آف مڈل ایسٹ اسٹڈیز'' (17:1985) صفحات 50-37 بلغ کا خیال ہے (صفحہ 48) کہ ''علما بحران کے دوران تذبذب و غیر فیصلہ کن رہے'' اور ''حکومت کی کارروائی پر منظوری یا نامنظوری کی کوئی آواز نہیں اٹھائی''۔ مزید دیکھیے کیچی چیان جوزف، اے ''دی رول آف علما ان دی پولیٹکس آف این اسلامک اسٹیٹ: دی کیس آف سعودی عریبیہ،'' حوالہ بالا (18:1986) صفحات 71-53۔ فتویٰ مسجد کے اندر طاقت کے استعمال کے سوال تک محدود رہا اور ان ٹھوس الزامات کے جواب دینے کی کوئی کوشش نہیں کی جو جہیمن نے اپنی تحریروں میں السعود پر لگائے تھے۔

-21 الیاسینی، حوالہ سابق صفحات 27-124 اور 51-150 (61-40)

-22 ابتدا میں شاہ عبدالعزیز امام کہے جاتے تھے اور جب انھوں نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا تو علما نے اس کی مخالفت کی۔ یہ نوخیز سعودی ریاست کی اصل حیثیت اور محمد بن عبدالوہاب کے ساتھ اس کے میثاق کا آئینہ دار ہے جس کے تحت حاکم سچے عقیدہ کی تبلیغ کرے گا اور بدلے میں علما اس سے تعاون کریں گے۔ یہ سلسلہ فیصل تک جاری رہا، جن کا لقب امیرالمسلمین تھا۔ عثمانی سلاطین (اور کچھ مصری حکمراں) نے خادم الحرمین کا لقب بھی اختیار کیا تاکہ حجاز کے علاقہ پر ان کے

اقتدار کی نشاندہی ہو سکے۔

23- کہا جاتا ہے کہ ولی عہد عبداللہ نے 1988 میں برطانیہ سے کہا تھا کہ "ملک کی سب سے بڑی مصیبت سعودی نوجوانوں میں اسلامی بنیاد پرستی کا فروغ ہے۔" ولسن اینڈ گراہم، حوالہ سابق، صفحات 47، 34، 29- بحوالہ ایک برطانوی افسر۔

24- خالد بن سلطان "ڈیزرٹ واریر - اے پرسنل دیو آف دی گلف وار بائی دی جوائنٹ فورس کمانڈر" (لانسر، نئی دہلی، 1997) صفحات 5 اور 14 "کویت کے بحران سے پہلے ہماری انٹیلیجنس اور جنرل اسٹاف نے عراق کی جانب بہت کم توجہ دی کیونکہ 1970 اور 1980 کی دہائیوں کی سیاست میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خطرہ اس جانب سے آئے گا۔" (صفحات 9-8)

25- سفران، حوالہ سابق، صفحات 197 اور 207۔ حملہ کا منظرنامہ جو اوّلاً 70 کی دہائی کے بیچ میں کھینچا گیا تھا، میں عراق کا حملہ کا تصور پیش کیا گیا تھا۔

26- خالد بن سلطان، حوالہ سابق، صفحہ 23

27- "پٹیشن آف چینج" کے متن کے لیے تتمہ دیکھیے۔

28- "میمورنڈم آف ایڈوائس" کے متن کے لیے تتمہ دیکھیے۔ بعد میں یہ دستاویز تمام سعودی اسلامسٹ بشمول بن لادن کی بنیادی کتاب بن گیا۔

29- متن کا انگریزی ترجمہ کنگ سعود یونیورسٹی ریاض نے فروری 1994 میں شائع کیا تھا۔ اس میں شاہ فہد کی تقریر کا متن شامل ہے جو محتاط اور قدامت پرست رجحانات کا حامل ہے اور یہ متن 1960 میں شہزادہ طلال کی پیش کردہ دستاویز سے متضاد ہے۔

30- ہریر ڈیکمیجان آر۔ 'دی رائز آف پولیٹکل اسلام ان سعودی عریبیہ' "مڈل ایسٹ جرنل" (1994 خزاں: 48:4) صفحات 43-627

31- مدینہ سے سعودی پریس ایجنسی کی رپورٹ روزنامہ ریاض میں، 22 دسمبر 1992

32- ہریر ڈیکمیجان، حوالہ سابق صفحہ 640، 60 ممبروں میں سے 29.5 فیصد بیورو

کریٹ .....ٹیکنوکریٹ تھے، 27.8 فیصد اساتذہ اور 13.1 فیصد تاجر تھے۔

33- الرشید، مداوی۔ 'سعودی عربیاز اسلامک اپوزیشن' ''کرنٹ ہسٹری (جنوری 1996) صفحات 22-16

34- فندی مامون ''سعودی عریبیہ اینڈ دی پولیٹکس آف ڈیولپمنٹ'' (سینٹ مارٹنز پریس، نیویارک 1999) صفحات 87-61۔ مصنف کا خیال ہے کہ ''حوالی کے افکار کی مرکزیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا'' (صفحہ 63) اور یہ کہ ''زیادہ تر سعودیوں کو اس کے نظریات معقول لگتے تھے'' (صفحہ 84)

35- حوالہ بالا، صفحات 113-89، العودہ کے خطبات کے کیٹس، 1990 سے 1994 تک کی مدت میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئے۔

36- حوالہ بالا، صفحات 21-115

37- جیری چو اینڈرز۔ ''دی سعودی فائل۔ پیوپل، پاور اینڈ پولیٹکس'' (سینٹ مارٹنز پریس، نیویارک 1998) صفحات 18-301

38- فندی مامون، حوالہ سابق، صفحات 75-167

39- روبن بیری اینڈ روبن، جوڈیتھ کولپ (ایڈٹ) ''اینٹی امریکن ٹیررزم اینڈ دی مڈل ایسٹ: اے ڈوکومینٹری ریڈر'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک 2002)، اگست 1996 کے ''اعلانِ جنگ'' کا متن صفحات 42-137 پر دیا ہے۔ اس کا مرکز سعودی نظام کی ناانصافیوں پر ہے جس کی کارروائیوں نے اپنے قانونی جواز کو چاک کر دیا ہے۔

40- فندی حوالہ سابق صفحات 90-180، مداوی الرشید حوالہ سابق، صفحہ 20 کا خیال ہے کہ سی ڈی ایل آر کی معتدل خصوصیت سی اے آر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

41- فندی حوالہ سابق صفحہ 200

42- حوالہ بالا صفحہ 226 ایک سعودی شیعہ لیڈر کے 1996 کے ایک انٹرویو سے اقتباس۔ فندی شیخ حسن الصفر کے افکار اور آزادی، تکثیریت، رواداری اور

حقوق انسانی پر ان کی آراء پر روشنی ڈالتے ہیں۔

43- ولسن اینڈ گراہم، حوالہ سابق، صفحہ 189، 64 بلین ڈالر جنگی اخراجات اور 20 بلین ڈالر نقد یا امداد کی صورت میں۔

44- کانووسکی الیسیا ہو، ''دی اکنامی آف سعودی عریبیہ: ٹربلڈ پریزنٹ، گرم فیوچر'' (دی واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار نیئر ایسٹ پالیسی، پالیسی پیپر نمبر 38، 1993)، صفحات 73-76

45- متن تتمہ 111 میں: اہداف کے بارے میں بیان بالکل واضح تھا: غیر ملکی فوجیں، السعود، اور سعودی سیکوریٹی فورسیز۔

46- کورڈزمین، اینتھونی ایچ، ''سعودی عریبیہ: گارڈنگ دی ڈیزرٹ کنگڈم'' (ویسٹ ویو پریس، بولڈر، کولاراڈو 1997) صفحہ 42، 4 جون 1996 کے ایک بیان میں سی ڈی ایل آر نے پھانسیوں کو انصاف کا قتل، کہا اور یونائیٹڈ اسٹیٹس پر سعودی ظلم میں ساتھ دینے کا الزام لگایا (جیری چو، حوالہ سابق، صفحات 55-254)

47- روبن، حوالہ سابق، صفحات 26-123 میں 21 جون 2001 میں یو ایس جسٹس ڈپارٹمنٹ کی جانب سے عائد کی گئی فرد جرم کی تفصیل ہے۔ ان میں سے تیرہ پر ''پرو۔ ایران سعودی حزب اللہ'' کا الزام عائد کیا گیا تھا اور کہا گیا کہ وہ امریکنوں کو سعودی سلطنت سے نکالنے کے مقصد سے متحرک تھے اور امریکنوں کے قتل کی کم سے کم 1988 سے کوششیں کر رہے تھے۔

48- پولوک، جوش، (اینٹی امریکنزم ان کنٹمپریری سعودی عریبیہ،'' مڈل ایسٹ ریویو آف انٹرنیشنل افیئرز'' (دسمبر 2003، 7:4)۔ یہ تبصرہ 4 دسمبر 2000 کے نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ پر مبنی ہے۔

49- برگن پیٹر ایل، ''ہولی وار انک: انسائڈ دی سیکریٹ ورلڈ آف اسامہ لادن'' (ویڈن فیلڈ اینڈ نکلسن، لندن 2001) صفحات 105-104۔ 23 فروری 1998 کے بیان کا متن روبن، حوالہ سابق، صفحات 51-149 میں دیا گیا ہے۔

بعدازاں بن لادن یا اس سے منسوب تمام اعلانات میں توجہ اسی وسیع ایجنڈے پر مرکوز ہے لیکن بغیر گھریلو سعودی رابطہ کو فراموش کیے ہوئے، مثال کے طور پر 'دی آبزرو' (لندن) کے 12 نومبر 2002 کے شمارہ میں شائع شدہ، لیٹر ٹو امریکا' جہاں اس نے دو سوال اٹھائے اور ان کے جواب دیے: (1) ہم آپ کے مخالف کیوں ہیں اور آپ سے کیوں لڑ رہے ہیں؟ (2) ہم آپ کو کس طرف بلا رہے ہیں اور ہم آپ سے کیا چاہتے ہیں؟

50- ٹیکساس کے ایک قاری کا 15 اگست 2002 کے عرب نیوز (جدہ) کے شمارہ میں مراسلہ۔ جنوری 2001 کی زوربی رائے شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ 56 فیصد امریکن سعودی عرب کے موافق ہیں جب کہ 28 فیصد کا رویہ غیر پاسدارانہ ہے۔ لیکن دسمبر 2001 میں شماریات بدل گئیں اور 24 فیصد موافق اور 56 فیصد امریکن غیر موافق تھے۔ نائن الیون کے فوراً بعد سعودی ردعمل کی رپورٹس متنازعہ ہیں۔ ترکی الفیصل نے 21 جنوری 2002 میں پبلک براڈ کاسٹنگ سروس کی الیزبیتھ فرانس ورتھ کو انٹرویو دیتے ہوئے ذہنی کوفت، صدمہ اور ماضی کے جذبات کا ذکر کیا۔ دوسری جانب میرا کے سعد الفقیہ نے یو ایس حکومت کے ذریعہ اکتوبر 2001 میں کیے گئے ایک خفیہ سروے کی جانب (دی گارجین، 29 جنوری 2002) توجہ دلائی جس کے مطابق 25 سے 41 سال کے عمر کے تعلیم یافتہ سعودی میں سے 95 فیصد بن لادن کے موقف کی حمایت کرتے ہیں۔ دوسرے مبصرین نے بھی اس کی تائید کی ہے بشمول ایرک رولیو کے جس نے یہ واضح کیا کہ 'باہری دنیا نے اس ناراضگی کو کمتر سمجھا ہے جو فلسطینیوں کے مصائب اور تکلیفوں کے سلسلہ میں سعودی عوام کے اندر ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تکلیفوں کا ذمہ دار اسرائیل کو کم اور اس کے محافظ امریکا کو زیادہ مانا جاتا ہے۔ کیونکہ واشنگٹن اور ریاض کے درمیان خصوصی تعلقات ہیں یہ ناراضگی خود سعود کے گھرانہ کی جانب مرتکز ہوجاتی ہے۔' ٹروبل ان دی کنگڈم' ''فارن افیئرز''

(جولائی/اگست 2002، 81:4) صفحات 89-75۔ طویل عرصہ سے سعودی حالات پر نظر رکھنے والے مبصر ڈیوڈ ای لانگ کا خیال ہے کہ 'بن لادن نے غیر مطمئن مسلم نوجوانوں کی بیداری کو مقامی سیاسی شکایات سے اٹھا کر عالمی سطح پر رکھ دیا'' - دور سعودی عربیہ۔ ''فارورڈ'' 5 ستمبر 2003

http://www.forward.com/uranes/2003/03.09.05/artsllong.html

ان تمام خیالات میں صداقت کے عناصر ہیں۔

51- کیسر اینڈ اُٹاوے، واشنگٹن پوسٹ، 10 فروری 2002

52- برکس تھامس، ای 'بریفنگ ڈیپکٹس سعودیز ایز اینیمیز، ''واشنگٹن پوسٹ'' 6 اگست 2002۔ ہڈسن انسٹی ٹیوٹ، واشنگٹن میں اپریل 2002 میں انھی خطوط پر ایک اور مباحثہ کے لیے دیکھیے فہیم اشرف ''لبریٹنگ سعودیز شیعا ئیٹس (اینڈ دیر آئل) ''ایشیا ٹائمز آن لائن'' 18 مارچ 2004

53- حوالہ بالا 12 فروری 2002

54- بش جارج ڈبلیو ''دی نیشنل سیکورٹی اسٹریٹجی آف دی یونائیٹڈ اسٹیٹس'' (واشنگٹن، 17 ستمبر 2002) انٹروڈکشن اور صفحہ 6

55- ہیریٹیج فاؤنڈیشن واشنگٹن میں 12 دسمبر 2002 کو سکریٹری آف اسٹیٹ کولن پاول کی تقریر۔ القدس العربی کو دیے ہوئے کولن پاول کے انٹرویو کا انگریزی متن 17 دسمبر 2002 کے دی گارجین، میں شائع ہوا ہے۔

56- ''عرب نیوز'' 12 نومبر 2002، اداریہ ''شوریٰ کونسل''۔

57- حوالہ بالا، 14 جنوری 2003، سعودی اقدام کا متن۔ پیش کش کو سامنے لانے کو ملتوی کر دیا گیا۔

58- حوالہ بالا، 26 فروری 2003، اداریہ: 'ریفارمس اینڈ چارٹر۔ دستاویز کا متن مندرجہ ذیل پر دستیاب ہے:

http://www.ccc.np3.navy.mil/verpResources/si/oct03/

SaudiPetitionJan03.pdf

59- اس منشور کے پس منظر سے متعلق کچھ بہت مفید معلومات اسٹیفن لیکرائیکس نے فراہم کی ہیں۔ 'بٹوین اسلامسٹس اینڈ لبرلز: سعودی عریبیاز نیو'اسلامولبرل ریفارمز' ''مڈل ایسٹ جرنل (2004 گرما، 58:3) صفحات 65-345۔ 'شریعت کی روشن تفہیم اور تکفیر اور علاحدگی پسندی کی مذمت کے لیے مقدس صحیفہ کے از سرنو مطالعہ کا مشورہ اسی طبقہ کے دینی علما میں اہم جدید طرزِ فکر کا حامل ہے۔

60- متن تتمہ V میں۔ مزید دیکھیے جونز ٹوبی''سیکنگ اے سوشل کنٹریکٹ فار سعودی عریبیہ''، ''مڈل ایسٹ جرنل (2003 خزاں، 228)، اور کیم ہرفی، لاس انجلس ٹائمز، 8 مئی 2003، بتاتے ہیں کہ عبداللہ نے درجن بھر شیعہ رہنماؤں سے پٹیشن وصول کیا۔ شیعہ سعودی آبادی کا تقریباً تین فیصد ہیں۔

61- الحطان، سلیمان 'ہوم گرون فینٹکس' نیویارک ٹائمز، 17 مئی 2003

62- عیک فرقوہر، نیل، 'سعودیز ری ایگزامن این اسلامک ڈوکٹرائن، سائیڈیڈ بائی ملیٹنٹس'۔ ''نیویارک ٹائمز'' 25 مئی 2003۔ 8 مئی کے ''عرب نیوز'' میں ریاض قسطی کی ایک رپورٹ کے مطابق وزارت داخلہ کو 19 عرب دہشت گردوں (بشمول 17 سعودی) کی تلاش، اسلحہ کے ایک ذخیرہ کی دریافت کے بعد ہے۔ رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تعلق القاعدہ اور افغانستان سے ہے۔

63- خشوگی جمال 'دی کنگز ریفارمز۔ ''الوطن'' 19 مئی 2003۔ اصلاحات کی جو فہرست یہاں دی گئی ہے وہ کم وبیش وہی ہے جو ولی عہد کو جنوری کے مراسلہ میں پیش کی گئی تھی۔ تبدیلیوں کی حمایت کرتے ہوئے خشوگی نے سعودی علما کو اس وقت زد پہنچائی جب 22 مئی کو انھوں نے خالد الغنمی کے ایک مضمون بعنوان 'دی انڈیویژول اینڈ دی ہوم لینڈ آرمور امپورٹنٹ دین ابن تیمیہ کو شائع کردیا۔ اس مضمون میں موجودہ خامیوں کو امام کی تعلیمات سے منسوب کیا گیا تھا۔ خشوگی کو

'الوطن' کی ادارت سے برخواست کردیا گیا۔ ''ڈیلی اسٹار'' (بیروت) نے اپنے 2 جون کے شمارہ کے اداریہ میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''جمال خشوگی اور الوطن نے تعمیری ایماندارانہ عوامی بحث کے نظریہ کو یکجا کیا ہے اور ہمیں عرب دنیا یہی چیز زیادہ، یقیناً کم نہیں، چاہیے۔''

-64 جونز نوبی سر سابق۔ سفارشات کی مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ 21 جون 2003 کے عرب نیوز میں ریاض القسطی کی رپورٹ۔

-65 متن تتمہ VI میں

-66 بی بی سی، 14 اکتوبر 2003: ''سعودی پولیس کویش پروٹیسٹ ریلی'۔ مزید دیکھیے 'ہیومن رائٹس واچ' (نیویارک) پریس ریلیز، 29 اکتوبر 2003

-67 http://english.aljazeera.net 5 نومبر 2003 ''سعودی ڈیفنڈز سلو ریفارم پیس''۔

-68 حوالہ بالا 23 دسمبر 2003 ''سعودی انٹلکچولز اپیل فار ریفارمز''۔

-69 ''دوسرے قومی مذاکرات'' متن کے لیے دیکھیے تتمہ۔

-70 23 اکتوبر 2003 کے ڈی گارجین میں رچرڈ نورٹن ٹیلر کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ چھ مہینوں میں 3600 مبلغین کو ازسرنو تعلیم دی گئی۔ 17 مارچ 2004 کو عرب نیوز، میں رپورٹ تھی کہ 900 اماموں اور خطیبوں کو 'لاپرواہی کے سبب معطل کردیا گیا ہے

-71 الداخل، خالد'' 2003: سعودی عربیاز ایئر آف ریفارم: ''عرب ریفارم بلیٹن' (کارنیگی اینڈومنٹ فار انٹرنیشنل پیس) جلد 2، شمارہ 3، مارچ 2004

-72 ''واشنگٹن پوسٹ'' اور ''عرب نیوز'' 18 اور 19 مارچ بالترتیب۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کولن پاول نے اپنے ریاض کے دورہ میں اسی دن یہ سوال اٹھایا اور دونوں جانب سے اپنے اپنے عوامی موقف کو دہرایا گیا۔

-73 یمنی، مائی۔ ''چینجڈ آئی ڈنٹیٹیز: دی چیلنج آف دی نیو جنریشن ان سعودی عربیہ''

(دی رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئر ز،لندن 2000) صفحات XX، 42 اور 147-49

74- حمد سہیلہ،'کجسٹنگ ٹوپکس فار دی سعودی نیشنل کانفرنس آن ویمن' ''الحیات''27 فروری 2004

75- ثریا الشہری، 6 فروری 2004 کے'عرب نیوز' میں۔اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان میں سے اکثر پابندیاں بدوی خواتین پر عائد نہیں ہوتی تھیں اور زیادہ تر رسوم و رواج شہری بننے کے سبب وجود میں آئیں۔

76- عرب نیوز، 20 اپریل 2004

77- عرب نیوز، 18 جنوری 2004،لبنی القیلان سے اقتباس

78- ٹیٹلبام جوشوا۔''ڈوئیلنگ فار دعوی: اسٹیٹ ورسس سوسائٹی آن دی سعودی انٹرنیٹ'''' مڈل ایسٹ جرنل (2002 بہار 56:2) صفحہ 234

79- یمنی،حوالہ سابق،صفحات 91 اور 95

80- یمنی مائی،''سم آبزرویشنز آن ویمن ان سعودی عریبیہ''۔ مائی یمنی (ایڈٹ) ''فیمنزم اینڈ اسلام: لیگل اینڈ لٹریری پرسپکٹیوز (ریڈنگ، 1996) صفحات 263-81 یہ بظاہر متناقض معلوم ہوتا ہے کیونکہ روایتی طور پر معاشرتی مسائل پر حجاز ملک کے بقیہ حصے سے آگے رہتا ہے۔

81- خشوگی جمال''نیو-اسلامسٹس: اے نیو ڈائریکشن ان سعودی عریبیاز اسلامک اپوزیشن''''عرب ریفارم بلیٹن'' حوالہ سابق۔

82- انصاری، محمد حامد''اسلام اینڈ گورننس'' ''خدابخش لائبریری جرنل (131، جنوری/مارچ 2003) صفحہ 5

83- لامبٹن، اے کے ایس''اسٹیٹ اینڈ گورنمنٹ ان میڈیول اسلام'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نیویارک، 1981) صفحہ 62

84- القرضاوی یوسف''پریورٹیز آف دی اسلامک مومنٹ ان دی کمنگ فیز''

(دارالنشر فارا یجوکیشین یونیورسٹیز، قاہرہ 1992) صفحہ 277

85- فلر گراہم ای، ''دی یوتھ فیکٹر: دی نیو ڈیموگرافکس آف دی مڈل ایسٹ اینڈ دی امپلیکیشنز فار دی یو ایس پالیسی'' (بروکنگز انسٹی ٹیوشن، واشنگٹن ڈی سی 2003)

86- اس سلوک کے لیے ایسا معاشرتی ماحول جہاں 'ذاتی مفاد کو عوامی مفاد پر ترجیح دی جاتی ہو' اور جہاں 'سرکاری عہدہ کو عوامی خدمت کے بجائے انعام تصور کیا جاتا ہو، غیر ہم آہنگ نہیں ہے۔ دیکھیے شربی ہشام ''نیسٹو پیٹری آرکی: اے تھیوری آف ڈسٹورٹڈ چینج ان عرب سوسائٹی'' (نیویارک 1988) صفحات 32-131

87- لیسی نے حوالہ دیا ہے، حوالہ سابق صفحہ 374

88- شاہ عبدالعزیز کی اپنے بیٹوں کو نصیحت کے باوجود: ''دو چیزیں ایسی ہیں جو ساتھ ساتھ نہیں چلتیں۔ حکومت اور دولت کا حصول۔ تاجروں سے مقابلہ مت کرو تو وہ بھی تم سے مقابلہ نہیں کریں گے'' (لیسی، حوالہ بالا، صفحہ 305)

89- یمنی، حوالہ سابق صفحہ 30۔ یہ کور گروپ اہل الحل و العقد کے نام سے جانا جاتا ہے (وہ جو باندھتے ہیں اور کھولتے ہیں)۔ تقریباً سو افراد کی اس حاکمانہ اور طاقتور تنظیم کے بارے میں عوامی معلومات محدود ہیں لیکن یہ بات مانی جاتی ہے کہ اس کو سرکاری منظوری حاصل نہیں ہے۔

90- کچھ دانشوروں جیسے کہ ''فارن افیئرز'' (جنوری/فروری 2004) اور ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون'' 23 دسمبر 2003 میں مائیکل ڈوران کی کوشش کہ بحث کو عبداللہ نائف معاملہ کی سطح تک گھٹا دیا جائے جو توحید اور تقرب سے متعلق دینی دلائل پر مبنی ہے، معاملہ کو ضرورت سے زیادہ آسان کردیتا ہے۔ جو بات حتمی ہے وہ یہ ہے کہ (دیگر متعلقہ مباحثوں کے ساتھ ساتھ) سرکاری اور ذاتی طور سے خاندان کے ہر رکن کے لیے ایک اہم موضوع پر بحث جاری ہے اور ہر ایک کی ترجیح کم سے کم قربانی کے ساتھ ظاہر ہوگی۔ ریاست چلانے کی حکمت اور تدبیر کو دینی ترجیحات پر فوقیت حاصل ہوگی۔ جو کہ ماضی میں فیصلہ کن عنصر نہیں تھا۔

91- خشوگی جمال۔ 'ریفارم نیڈز سرجر آف ٹو سعودی عربیاز' ''دی ڈیلی اسٹار'' (بیروت)، 22 اکتوبر 2003

92- قاسم، عبدالعزیز'' دی بیٹل آف ایجوکیشنل کریکولا'' ''الحیات'' 24 جنوری 2004۔ ینبوع پر یکم مئی کے دہشت گردانہ حملہ کے بعد ایک کالم نویس نے ان واقعات کی جڑوں سے متعلق سوال اٹھائے تھے'' کیا ہم نے خود ان عفریتوں کو جنم دینے میں مدد نہیں کی ہے؟ ہمارا نظام تعلیم ہمیں دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کی تلقین نہیں کرتا تو دوسرے اسلامی مسلک اور مکتب فکر کی برداشت کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو اوپر سے نیچے تک پرکھنا چاہیے''۔ اس نے مزید کہا کہ ''ملک کے دینی ماحول کو یقیناً بدلنا چاہیے'' (ریاض قسطی، عرب نیوز، 5 مئی 2004)

93- عرب نیوز، 14 مارچ 2004

94- حوالہ بالا، 28 مارچ 2004۔ شوریٰ کونسل کے سابق وائس چیئر مین ڈاکٹر عبداللہ عمر نسیف سے اقتباس۔ ایک مہینے پہلے یونائیٹڈ اسٹیٹس کی ''گریٹر مڈل ایسٹ انیشیٹیو'' کی پیش کش کے جواب میں 25 فروری کے سعودی مصری مشترکہ اعلانیہ میں زور دیا گیا تھا کہ جدیدیت اور اصلاحات کا عمل عوام کی خصوصی ضرورتوں اور ان کی 'عرب شناخت' سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ وزیر داخلہ نائف بن عبدالعزیز نے 5 نومبر 2003 کو الحیات سے اپنے انٹرویو میں اسی نکتہ پر زور دیا تھا۔ کیا یہ اس ایرانی نظام کی جانب ایک قدم تھا جہاں گارجین کونسل نے دستور کی دفعہ 99 کی ترجمانی خود کو یہ اختیار دینے میں کی ہے کہ وہ امیدواروں کو مسترد کر سکتے ہیں؟ دیکھیے شیرازی اصغر ''دی کانسٹی ٹیوشن آف ایران: پولیٹکس اینڈ اسٹیٹ ان دی اسلامک ری پبلک'' (آئی بی ٹاریس، لندن 1998) صفحات 91-86

95- واکر جونیئر، ایڈورڈ ایس۔ 'دی کوائٹ ریوولوشن۔ سعودی عربیہ'، ''دی ڈیلی اسٹار'' (بیروت)، 17 جنوری 2004۔ واکر مڈل ایسٹ انسٹی ٹیوشن واشنگٹن کے سربراہ

ہیں۔ وہ 1999 سے 2001 تک اسسٹنٹ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے نیئر ایسٹرن افیئرز رہے اور یو اے ای، مصر اور اسرائیل میں سفیر کی خدمات انجام دیں۔

96- کیچی چیان جوزف اے 'سلو بٹ گریجول چینج سویپنگ سعودی عربیہ' گلف نیوز، 24 فروری 2004

97- دی اکنامسٹ 4 مارچ 2004

98- ہورانی البرٹ ''اے ہسٹری آف دی عرب پیپلز'' (ہارورڈ یونیورسٹی پریس، کیمبرج، میساچوسٹس، 1991) صفحات 453 اور 455

99- مصری مفکرین جیسے کہ محمد الغزالی، کمال ابوالمجید اور یوسف القرضاوی کی آراء موزوں ہوسکتی ہیں۔ ان کا ایک ہمدردانہ جائزہ بیکر، ریمنڈ ولیم نے ''اسلام ودآؤٹ فیئر: ایجپٹ اینڈ دی نیو اسلامسٹس'' (ہارورڈ یونیورسٹی پریس، کیمبرج، میساچوسٹس 2003) میں لیا ہے۔ لیکروائیکس، حوالہ سابق n59 میں اصلاحات کے سعودی طریقۂ عمل میں اندر سے پیدا ہونے والی جہتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

100- کورڈزین، حوالہ سابق صفحات 87-181، اس کی تجاویز کا دائرہ وسیع تر اتفاق رائے اور حمیت کا آئینہ دار تھا۔ اگر سعودی عرب کو داخلی استحکام برقرار رکھنا ہے تو اسے بتدریج سماجی مراعات کو ختم کرنا ہوگا، اپنے معاشرتی معاہدہ کی دوبارہ تعریف کرنا ہوگی، شوریٰ کونسل کے اختیارات کو بڑھانا ہوگا، نوجوان نسل اور علاحدگی پسندی پر توجہ دینی ہوگی اور اپنے روایتی مذہبی کردار کو برقرار رکھنے کے لیے بغیر داخلی اسلامسٹ کو برداشت کیے یا بیرونی انتہا پسند تحریکوں کی مالی تعاون کیے، اسلام کے لیے اپنی حمایت کو ازسرنو واضح کرنا ہوگا۔ 1997 کی ایک نجی مجلس میں ایک برطانوی سفارتکار کا یہ غیر واضح مشاہدہ بھی موزوں ہے: ''یا تو پانچ سال میں بدل جائیے ورنہ دس کے اندر مصیبت کا سامنا کیجیے۔''

عراق کی دلدل-I

دوستانہ اور بااعتماد عرب حلقوں کی جانب سے اس تنبیہ کے باوجود کہ یہ عمل ''جہنم کے دروازے کھول دے گا'' اور ''تشدد اور دہشت گردی کی زبردست آگ لگا دے گا؛ عراق پر جنگ مسلط کردی گئی۔ چند ہفتوں بعد جب صدر جارج ڈبلیو بش ایک یو ایس ایئر کرافٹ کیریئر پر 'مشن مکمل' ہونے کا اعلان کررہے تھے تو بدنظمی کے اوّلین آثار شروع ہوچکے تھے عراق میں ان کا نمائندہ پال بریمر 111، پرووِژنل کولیشن اتھارٹی کا ایڈمنسٹریٹر، ملک کو سرنگوں رکھنے میں امریکی صلاحیت کے بارے میں بہت واضح تھا: ''ہم ان سے لڑتے رہیں گے اور اپنی مرضی ان پر لادتے رہیں گے اور یا تو ان کو گرفتار کریں گے یا ان کو مار ڈالیں گے جب تک کہ ہم اس ملک میں نظم ونسق قائم نہیں کرلیتے۔ وقت ہمارے ساتھ ہے اور ہم اس ملک پر اپنی مرضی چلائیں گے۔''

امبیسڈر بریمر کے لہجہ میں بھرپور اعتماد کے باوجود، فاتح اور مفتوح دونوں ہی مختلف تجربوں سے گزرے۔ آنے والے مہینوں میں جو مطالعہ کیا گیا وہ بدلتے ہوئے منظر کا آئینہ دار تھا۔

اپریل 2003

''بغداد کی فضا میں موت کی بلند آواز گونج رہی ہے

وقت نے جو افتاد وہاں ڈالی ہے اس پر آنسو بہاؤ''

ابن بطوطہ ابو تمام کا شعر پیش کرتے ہوئے

بغداد- ناگ کی طرح بل کھاتی ہوئی دجلہ کے اس موڑ پر یہ انسانی بستی اسلام سے قبل کی ہے۔ نام بجائے خود فارسی ہے اور اس کا مطلب 'خدا کا عطیہ' ہے۔ عباسی خلیفہ منصور جو اپنی غیر عرب فوجوں کے قیام کے لیے راجدھانی کوفہ سے دور ایک مقام کی تلاش میں تھا' نے 762 عیسوی میں اس شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کو مدینۃ السلام یعنی امن کا شہر کا نام دیا۔ اگلی پانچ صدیوں تک بغداد ایک عظیم تہذیب کا گہوارہ رہا جہاں مشرق و مغرب کی حکمت و دانشوری کا سنگم ہوتا تھا اور جس نے اس کی نشوونما میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا۔ اس کا دور انحطاط تین صدیوں بعد شروع ہوا۔ 1184 میں مغرب سے آنے والے سیاح ابن جبیر نے اس کی شان وشوکت کا ماتم کیا لیکن اس کے رہنے والوں کی انکساری اور فخر و ناز (اور اس کی عورتوں کے حسن و جمال) کی تعریف کی۔ 1256 میں ہلاکو کی منگول فوج نے شہر اور خلافت پر قبضہ کرلیا۔ اعلیٰ سطح پر کی گئی فریب اور دھوکے بازی نے اپنا رول ادا کیا۔ آخری عباسی خلیفہ کو پاؤں تلے کچل دیا گیا اور شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ ''چونتیس دنوں تک تلواریں نیام میں نہیں گئیں۔ بہت کم لوگ بچ کر نکلے۔ تقریباً اٹھارہ لاکھ افراد تہہ تیغ ہوئے۔'' پھر زوال مکمل ہوگیا۔ بغداد صوبائی راجدھانی بن کر رہ گیا۔ اگرچہ بعض دفعہ عثمان حکومت بدلی لیکن پھر یہ اپنی عظمت رفتہ حاصل نہ کرسکا۔

عصر جدید میں بغداد ایک بار پھر عراق کی نئی ریاست کی راجدھانی کے روپ میں ابھرا۔ جس کا سربراہ باہر سے آیا ہوا بادشاہ تھا جو برطانوی شاہی تقسیم کا نتیجہ تھا۔ 1932 میں مکمل آزادی سے قبل بارہ برس برطانوی عملداری میں گزرے تھے۔ ہائی کمشنر سر پرسی کاکس کے الفاظ میں دوسری اصطلاح (عراقیوں کے لیے) پہلی کے مقابلہ میں قابل لعنت تھی کیونکہ اس میں اختیارات کا دوہرا عمل شامل تھا یعنی ایک قومی اور دوسرا خارجی۔ اور ایسی بے قاعدہ

حکومت کو پیش کرتی تھی جو عملاً نہیں صرف نام کی صاحب اقتدار ہو۔ 1930 کے ایک نئے اینگلو عراقی معاہدہ کے تحت برطانیہ کو مراعات حاصل ہوئیں جس میں عراقی سرزمین پر ہوائی اڈے بھی شامل تھے۔ اس معاہدہ کو 1955 کے بغداد پیکٹ سے بدل دیا گیا لیکن 1958 کے انقلاب کے نتیجہ میں بادشاہت کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی کالعدم ہوگیا۔ اگلے چند برسوں تک عراقی مملکت نے ایک جمہوریہ کی شکل اور پان عرب نیشنلزم کے نظریہ کو اپنایا جس کی جڑیں مثل افلاق جو شام کے ایک یونانی قدامت پسند خاندان سے تعلق رکھتا تھا کے خیالات سے ملی ہوئی تھیں۔ مثل افلاق کے خیال میں عرب قوم پرستی مذہب اور فرقوں کے دائرہ سے باہر ہے۔ اس نے نیشنلزم اور سوشلزم کے ایک مجموعہ کی وکالت کی اور عرب اتحاد کا مطالبہ کیا۔ لیکن بین عرب ازم کے دیگر حامیوں کی طرح اس نے بھی کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے میں امتیاز نہ کرنے کی تباہ کن غلطی کی۔ یعنی عرب ایک قوم ہیں یا وہ ایک قوم بننا چاہتے ہیں۔ اس کے افکار میں جرمنی کے نیشنل سوشلزم کے نقوش بھی ظاہر تھے۔ اس نہ ہضم ہونے والے نظریاتی پیکیج نے واضح طور سے ایک ایسی استبدادی ریاست کے لیے ترجیح فراہم کی جہاں پارٹی کا غلبہ پوری ریاست پر عام ہوجائے اور پھر دونوں مل کر فرد اور اس کی آزادی کو ثانوی حیثیت پر لے آئیں۔ اس کے بعد حاکیت اور عمل کو دلکش بنانے کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ شخصیت سازی نے معصومیت کے عقیدہ کے ساتھ بقیہ کام انجام دیا۔ 1974 کے سال میں عراق استحکام کا نمونہ بن گیا جس کی ستائش بھی کی گئی۔ لیکن اس تقریباً مکمل ترتیب میں ایک رکاوٹ تھی۔ ملک کے اندر مکمل استحکام نے بیرون ملک مہم جوئی کے لیے راہ ہموار کی اس امید پر کہ ایک کامیاب مہم عراق کے اندر اور عرب دنیا میں مہم جو کی طاقت میں اضافہ کرے گی۔ صدام حسین نے عرب پلیٹ فارم کو اپنایا۔ ان کی کامیابی کا راز دیگر عربوں کے خوابوں اور آرزوؤں کی وضاحت میں مضمر تھا۔

عراق کی موجودہ پریشانیاں بہت حد تک خودساختہ ہیں۔ 1980 میں ایران اور 1990 میں کویت پر حملہ سیدھے سادے الفاظ میں جارحیت تھی۔ ان کو علاقائی اور عالمی تناظر میں کیسے پرکھا جاسکتا ہے۔ پہلے میں تعریف کی گئی اور دوسرے میں مذمت۔ دونوں ہی

کو زمینی مراعات کے ذریعہ سیاسی مفاد کے حصول کے لیے بہترین فوجی اور سیاسی موقعہ پر استعمال کیا گیا۔ دونوں ہی فیصلے غلط ثابت ہوئے۔ دونوں ہی نے عراق اور عراقیوں سے بھاری قیمت وصول کی۔ دوسرے نے تو عراق کو عرب برادری اور بین الاقوامی سطح پر بالکل تنہا کردیا۔ 1991 کی جنگ میں یو ایس نظریہ کی یہ آخری سطور ہی آبرو بچانے کا واحد سہارا تھیں 'ہماری پالیسی صدام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ہے اس کی حکومت سے نہیں۔'' جون 1991 میں سی آئی اے کو ایک صدارتی ہدایت نامہ موصول ہوا کہ 'وہ حالات پیدا کیے جائیں جو صدام حسین کو اقتدار سے باہر کردیں۔' مارچ 2003 میں عراق پر 'ہم خیال اتحادیوں' کا حملہ اسی پالیسی کی ناکامی کا مظہر تھا۔

اور جیسا کہ ماضی میں کئی بار ہو چکا ہے بغداد پہلے تو مزاحمت کرتا ہے اور پھر فاتح کی جھولی میں گر جاتا ہے۔ ایک بار پھر دجلہ کا پانی معصوموں کے خون سے رنگین ہوگیا۔ کچھ وہ لوگ جو انجیل کی اس پیشین گوئی پر یقین واثق رکھتے ہیں کہ 'شمال کی سرزمین کی بڑی طاقتوں کی جانب سے بابل کے خلاف تباہ کن آندھیاں چلیں گی جو اس کے جوانوں میں سے کسی کو نہیں بخشیں گی''، شاید وہ اس عمل کو حق بجانب ٹھہرائیں۔ دیگر عقائد کے ماننے والے اکثر لوگ اس کو انتقامی کارروائی قرار دیں۔ لیکن تنازعہ کے بعد والا منظر ابھی مبہم ہے۔ مس رائس نے زور دیا ہے کہ اقوام متحدہ کے بجائے یو ایس عراق کی تعمیر نو کو کنٹرول کرے گا۔ لیکن یونائٹیڈ اسٹیٹس اپنی غیر وضاحت شدہ اتحاد سے باہر نکل کر اپنے حملہ کے لیے سیاسی جواز تلاش کرے گا۔ صورت حال کچھ بھی ہو عراقیوں کے ایک گروپ کی شمولیت ضروری ہے۔ ان کا اعتبار اور سیاسی قانونیت کیا ہوگی؟ کیا وہ بھی اسی دو عملی حکومت کے نظام کا حصہ نہ ہوں گے جو برطانوی اقتدار کے ایام میں ان کے ملقون تھی؟ کیا وہ کرد جنھوں نے اینگلو امریکن چھتری کے تلے حقیقی آزادی کا مزہ چکھ لیا ہے بغیر اپنی خودمختاری کی شرطیں منوائے دوبارہ بغداد کی حکومت کے سامنے سر جھکا دیں گے؟ کیا ایک عبوری منتظمہ یہ شرائط منوا سکتی ہے اور پھر ان کو منتخب حکومت پر عائد کر سکتی ہے؟ ایک پارٹی کے چالیس سالہ استبدادی زمانہ اقتدار کے بعد جمہوریت کی جانب انتقال کتنا مشقت

طلب ہوگا جب کہ اس سلسلہ میں معاشرہ کے مختلف طبقات میں باہمی صلح وصفائی کی کوئی کوشش بھی نہیں کی گئی؟

عراق کے عوام خود کو ایک وسیع تر عرب خاندان کا حصہ مانتے ہیں۔ گزشتہ ہفتوں نے عوامی برہمی کی شدت کو اجاگر کیا باوجودیکہ علاقائی حکومتوں نے سیاسی درستگی کی لائن پر چلنے کی کوشش کی۔ پان عربزم کا جذبہ، جو اپنی سیاسی تحریک سے کافی الگ ہے، زندہ ہے۔ عراق اور اس کے عوام سے متعلق کوئی نیا غم وغصہ آگ کو اور بھڑکا دے گا۔ یہ ایک علاحدہ معاملہ ہے کہ احتجاج کو تنقیدی سوچ کے لیے راہ ہموار کرنی پڑے گی کیونکہ جیسا کہ شامی مؤرخ کانسٹینٹن زور ایک نے لکھا ہے ''مصیبتوں کو سمجھنے میں ناکامی افراد کے لیے خود مصیبتوں سے زیادہ تباہ کن ہے۔''

سقوط بغداد آسانی سے نہیں بھلایا جاسکے گا۔ کئی سال پہلے عراقی شاعر جمیل صحاوی نے اسی احساس کو اک شعر میں پیش کیا تھا۔

''جب اس سرزمین پر جہاں تم پروان چڑھے، تباہیاں
مسلط ہوجائیں اور تمھیں غم نہ ہو، تو تم ایک پتھر ہو''

جولائی 2003

بغداد کے پولیس اسٹیشن میں تعینات ایک یوایس آرمی سرجنٹ ایک صحافی سے کہتا ہے کہ ہمارے یہاں رہنے کا کوئی مطلب نہیں ہے، یہاں زندگی قابل رحم ہے۔ گرم گرم کھانے، ایرکنڈیشنگ اور صاف ستھرے غسل خانے دستیاب نہیں ہیں اور حوصلہ کو بلند رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ ''ہمیں بس یہاں سے نکلنا چاہیے''۔ عراقی پولیس میں اس کے ہم منصب کا خیال ہے کہ امریکی بددماغ اور متکبر ہوتے ہیں اور عوام میں ان کے غیر معتبر ہونے کا سبب یہی خودسری ہے۔

یہ ایک صورت حال کی دو مختلف تصویریں ہیں جو ایک پیچیدہ سرزمین میں جسے مقبوضہ عراق کہا جاتا ہے سے تعلق رکھتی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ پر عوام کی بنیادی ضرورتوں کے تئیں عدم منصوبہ بندی اور نااہلی کا الزام لگایا جارہا ہے۔ ایک ایک گھر کی تلاشی میں

دست درازیاں، بے حسی اور کتوں کے استعمال نے عوام کی قدامت پسند آبادی کے جذبات کو بھڑکا دیا ہے۔

وہ افراد جنھیں امریکہ نے مستقبل میں عراق کی حکمرانی کے لیے پالا پوسا تھا پہلے ہی رد کر دیے گئے ہیں۔ احمد شلبی ایک شکست خوردہ فرد ہے اور اس کی ''فری عراق'' فوج جس کی تربیت امریکنوں نے کی تھی بکھر چکی ہے۔ پہلے یو ایس ایڈمنسٹریٹر جنرل جے گارنر کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اس کے جانشین ایمبیسڈر پال بریمر نے عراق میں دو سال ٹھہرنے کے ارادے کا اعلان کیا ہے۔ اس کا ارادہ چند عراقی کونسلرز کو چننے کا ہے جو انتظام میں مدد کریں اور نئے دستور کا مسودہ تیار کریں جس کے تحت الیکشن ہو سکیں۔ تاثر یہ ہے کہ وہ الیکشن میں تاخیر اس لیے چاہتا ہے تاکہ مذہبی جماعتوں کو حاشیہ پر رکھ سکے۔ اس اقدام کی مخالفت اب تک سیاست سے بے نیاز، نجف میں شیعاؤں کے صف اوّل کے رہنما آیت اللہ سیستانی نے کی ہے۔ پچھلے ہفتہ کے جاری کردہ ایک فتویٰ میں انھوں نے کونسلرز کے تقرر کو غیر اسلامی قرار دیا ہے۔ اس کے بدلے انھوں نے مشورہ دیا کہ الیکشن کا انعقاد ہونا چاہیے تاکہ منتخب اراکین دستور کا مسودہ تیار کر سکیں۔ جس کو عوام کے سامنے ریفرنڈم کے لیے رکھا جائے۔ دوسرے الفاظ میں کشمکش دراصل امریکہ کے مقرر کردہ عبوری حکمرانوں اور منتخب حاکموں کے درمیان ہے۔ اس سے قابض طاقتوں کی مشکلیں آسان نہ ہوں گی۔

کرد علاقہ میں بھی حالات پیچیدہ ہیں۔ کردوں کی دو بڑی پارٹیوں نے صدام کے خلاف امریکا کی مدد کی تھی۔ اب وہ کسی بھی مرکزی حکومت سے اپنی شرائط پر تعاون کے لیے تیار ہیں اور اسلحہ حوالہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ترکی بھی حالات کا معائنہ بغور کر رہا ہے۔ لہٰذا کسی بھی نئی حکومت کو خواہ وہ مقرر کردہ ہوں یا منتخب، مرکزی کنٹرول کے تحت اور علاقائی خودمختار کرد علاقوں کے درمیان تلوار کی دھار پر چلنا ہوگا۔ بہت زیادہ پابندیوں سے کردوں کی برہمی پھر عود کر آئے گی اور بہت زیادہ خودمختاری سے ترکی خوش نہ ہوگا۔ اصل مسئلہ وسطی اور جنوبی عراق میں ہے جہاں اتحادی افواج پر مسلح حملے ہوتے رہتے ہیں اور جس کی وجہ سے مجبور ہو کر بریمر نے 50,000 اضافی فوج کا مطالبہ کیا ہے (میزان 20,000 تک پہنچتا ہے) اور صدام حسین

اور اس کے دونوں بیٹوں کی مخبری پر بھاری رقومات کا اعلان کیا ہے۔ امریکی اور برطانوی فوجیوں اور اقتصادی اہداف پر حملے سے فوجی چوکسی کی سطح زیادہ اور تعمیراتی کارروائیوں کی سطح کو کم کردے گی۔ ایسی صورت حال میں عراقیوں کے دل و دماغ کو جیتنے کی جنگ آسان نہ ہوگی۔لگتا ہے 1920 واپس آگیا ہے لیکن اس بار برطانیہ کی جگہ امریکہ نے لے لی ہے۔

اگرچہ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش اپنی گفتگو میں جارحانہ انداز قائم کیے ہوئے ہیں لیکن واشنگٹن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہوگئی ہیں۔ جن لوگوں کے کاندھے پر یہ ذمہ داری ہے کہ جناب بش اگلے سال بھی صدر منتخب ہوجائیں ان کے درمیان سرگوشیوں میں یہ سوال پوچھا جارہا ہے کہ صدر کو کس نے گمراہ کیا کہ جیت کے لیے عراق پر ایک ڈرامائی اور فیصلہ کن فتح لازمی ہے؟

غلطی کہاں ہوئی؟ یہ جنگ گمراہ کن بیانات اور غلط اعداد و شمار کی اکتا دینے والی داستان ہے۔ ان میں سے کچھ کا تعلق جنگ کے اصل اسباب سے دنیا کو غلط اطلاعات پہنچانے؛ یو این سلامتی کونسل کے ردعمل سے متعلق غلط تخمینہ؛ ترکی کے ردعمل کو غلط سمجھنے، عراقی قیادت کو معذور کرنے یا اس کے اہم ارکین کی گرفتاری میں ناکامی؛ جلاوطن عراقی باغی گروپوں کی استطاعت اور افرادی قوت کو سمجھنے میں ناکامی؛ جنگ کے بعد کے زمانے کے لیے منصوبہ بندی میں ناکامی؛ یہ سمجھنے میں ناکای کہ قوت کا خلا اسلامسٹ گروپس سے پر ہوسکتا ہے؛ سلامتی کونسل کی پیس کیپنگ کارروائیوں کو نظرانداز کرنے کے نتائج کو سمجھنے میں ناکامی جس کا براہِ راست نتیجہ بہت سے ممالک کی اس پروگرام میں غیر دلچسپی ہے؛ جنگ کے فوراً بعد ایک عبوری عراقی انتظامیہ کا قیام اور پھر جلد ہی جمہوری طرز پر منتخب حکومت کے قیام میں غیر دلچسپی؛ شیعہ مذہبی رہنماؤں سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے میں ناکامی اور ان سب سے بڑھ کر عوام کا مزاج سمجھنے اور عراقی قوم سے رابطہ رکھنے میں ناکامی سے ہے۔

ایک امریکی دانشور جس کو علاقہ کی بخوبی آگاہی ہے نے لکھا ہے کہ عراق میں حالات ناگفتہ بہ ہیں اور آبادی کے ہر حصہ سے پریشانیاں اٹھ رہی ہیں۔ لہٰذا فوجی سارجنٹ کا مشاہدہ قابل فہم ہے اور ساتھ ہی اس کا عراقی ہم منصب بھی غلط نہیں ہے۔

اکتوبر 2003

عراق پھر سرخیوں میں واپس آ گیا ہے۔ سلامتی کونسل کی ایک نئی قرارداد قابض طاقتوں کو قانونی جواز فراہم کرتی ہے۔ میڈرڈ کانفرنس کو کامیابی بتایا جارہا ہے۔ ڈونلڈ رمسفیلڈ کی 16 اکتوبر کی داخلی یادداشت جو اس نے اپنے چار قریب ترین اسٹاف کو بھیجی تھی شائع ہوچکی ہے۔اس ہاہمی میں اس کا کلیدی فقرہ بھلا دیا گیا: ''یونائیٹڈ اسٹیٹس ایک طویل مدتی منصوبہ پر نسبتاً کم توجہ دے رہی ہے۔لیکن ہم دہشت گردوں کو روکنے میں بہت کام کررہے ہیں۔لیکن منافع کی شرح ہمارے خلاف ہے۔ اس ہفتہ سی بی ایس ٹیلی ویژن براڈ کاسٹ کا ''سکسٹی منٹس'' پروگرام ان انٹرویوز پر محمول تھا جو عراق میں یو ایس کے رول کے بارے میں شیعوں کے بدلتے ہوئے رجحان پر دیے گئے تھے۔ اے ایف پی نے ''عراقی سینٹر فار ریسرچ اینڈ اسٹریٹجک اسٹڈیز'' کے ذریعہ کرائی کی گئی ایک رائے شماری کے نتائج بھی ظاہر کیے ہیں آخرالذکر دو، خاص طور سے اہم ہیں۔

سی بی ایس نے دو شیعی عالموں کو انٹرویو کیا۔ جو اگرچہ درجہ میں کمتر ہیں لیکن خبروں میں رہتے ہیں۔حسین خمینی پچھلے کئی ہفتوں سے واشنگٹن میں ہیں اور ایسے بیانات دے رہے ہیں جو 1656 میں باروش اسپنوزا کے اعلانیہ کے مطابق، خود ان کے دادا انھیں باضابطہ طور سے دین سے خارج کردیتے۔نوجوان خمینی نے دینی ریاست کی ہر صورت میں مذمت کی ہے۔ اگر جدید سننے والوں کے لیے یہ خیالات ساز و آواز تھے تو دوسرے عالم کے خیالات یقیناً ایسے نہ تھے۔مقتدی الصدر،عراق کے عظیم آیت اللہ جنھیں بعث اراکین نے مار ڈالا تھا، کے بیٹے ہیں اور ان کے ماننے والے بڑی تعداد میں ہیں۔ مقتدی نے صدام کو ایک چھوٹے سانپ اور امریکہ کو بڑے سانپ سے تشبیہ دی ہے: ''چھوٹا سانپ چلا گیا اور اس کی جگہ بڑا سانپ آ گیا ہے'' عراق پر قبضہ پر ان کی مخالفت کا اظہار،شیعی علاقوں میں یو ایس فوجیوں پر حملے کی بڑھتی ہوئی تعداد سے ہوتا ہے۔ قابض طاقتوں کے خلاف نئی شیعی سرگرمیاں دراصل ایک پیچیدہ گھریلو عراقی جمع تفریق کا ایک جز ہیں۔ اگر قبضہ کی مزاحمت صرف سنیوں پر چھوڑ دی جائے تو تنازعہ کے خاتمہ پر اختیارات کی تقسیم کے وقت یہ ایک منفی اثر چھوڑے گا۔

رائے شماری کی ابتدا اکتوبر میں شیعہ، سنّی اور کرد علاقوں کے اہم شہروں میں کرائی گئی تھی اور اپنی مختصر حدود کے باوجود اس نے کچھ دلچسپ انکشافات کیے۔ سرسٹھ فیصد عراقی امریکنوں کو قابض سمجھتے ہیں صرف پندرہ فیصد ان کو نجات دہندہ مانتے ہیں۔ جنگ کے بعد اپریل میں یہی شماریات بالترتیب 46 اور 43 فیصد تھیں۔ چھیالیس فیصد کا خیال تھا کہ سلامتی صورت حال ابتر ہوئی ہے اور صرف 23 فیصد کو اتحادی افواج پر حالات سدھارنے پر اعتماد تھا۔ مستقبل میں عراق میں طرز حکومت کے سوال پر 33 فیصد نے اسلامی طرز حکومت کی حمایت کی جب کہ 30 فیصد نے مغربی طرز کی جمہوریت کو پسند کیا۔ رہنماؤں کی پسند کے سوال پر شیعی عالم دین الحاکم، بحرالعلوم اور ابراہیم الجعفری نے پہلے تین پائیدانوں پر قبضہ جمایا (انھوں نے بالترتیب 58 فیصد، 57 فیصد اور 54 فیصد مقبولیت حاصل) واضح طور سے ترجیح ایک شیعی عالم کے حق میں ہے بجائے ایسے رہنما کے جو مغربی دنیا میں جانا جاتا ہو۔ جدیدیت کے نظریہ کے حامیوں کو اب ایسے دلائل پر ازسرنو غور کرنا ہوگا۔

حال ہی میں ملیشیا میں اختتام پذیر پر آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (او آئی سی) کی چوٹی کانفرنس میں عراق بھی شامل تھا اور وہاں جو ہوا وہ قابل غور تھا۔ ایک ساتھی ممبر ریاست پر بیرونی قبضہ نے کچھ ممبروں کو تحریک دلائی کہ وہ یو ایس کے عراقی قبضہ کے خاتمہ اور اقوام متحدہ کو مرکزی رول دینے کے لیے ایک قرارداد منظور کریں۔ لیکن کھلے ہوئے امریکی دباؤ کے سامنے یہ قرارداد محض ایک بیان سے بدل دی گئی جس میں یونائٹیڈ اسٹیٹس سے واپس جانے اور اقوام متحدہ کے رول کا تذکرہ کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عراقی گورننگ کونسل کے ایک رکن، جنھوں نے کانفرنس میں اپنے ملک کے وفد کی سربراہی کی تھی، نے قرارداد کے مسودہ کو عراق کے داخلی معاملات میں دخل اندازی سے تعبیر کیا (جو او آئی سی کے منشور کے خلاف تھا)۔ او آئی سی کے حق میں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے انھی رجحان کی پیروی کی جو سلامتی کونسل کی 16 اکتوبر کی قرارداد نے وضع کیے تھے۔ یعنی یو ایس کی رہنمائی میں کثیرالملکی فوج کو سلامتی برقرار رکھنے کے لیے تمام لازمی اقدام لینا۔ قرارداد عراق کی تعمیرنو میں ایک اہم رول (مرکزی رول نہیں) دیتی ہے۔ بلاشبہ یہ دستاویز

معنویت پر لفاظی کی فتح ہے۔ اس بظاہر کامیابی کے باوجود میڈرڈ میں جس جھجکتے ہوئے انداز سے مالی تعاون کے وعدے کیے گئے تھے اس تشکیک کو واضح کردیتا ہے جس کی نظر سے عراق کے مسئلہ کو دیکھا جارہا ہے۔

ہنری کیسنجر نے اپنی ایک کتاب میں واقعہ کے بیس سال بعد اس صدمہ کا تذکرہ کیا جو'ویت نام پر امریکہ کی قومی اتفاق رائے کا اچانک زوال پذیر ہونا تھا' کیا اس ہفتہ واشنگٹن میں ہونے والے مظاہرے اور پچھلے ہفتوں میں امریکہ میں بیلٹ دے اور دیگر مقامات پر ہونے والے مخالفت کے اظہار، کسی ایسے ہی طریقۂ عمل کا پیش خیمہ تو نہیں؟ مماثلتیں پراسرار ہیں: امریکہ کے خلاف ایک متصور بین الاقوامی سازش پر اشتعال اور دنیا کے دوسرے حصہ میں آزاد ادارے قائم کرنے کا عزم، ساتھ ہی امریکن طاقت کی حدود کا انکشاف اور ایک غیرملکی جنگ میں امریکی جانوں کے زیاں کی ایک مسلسل قطار پر بڑھتی۔ 21 اکتوبر کے ہیومن رائٹس واچ کی ایک رپورٹ جس میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں عراقی شہریوں پر زیادتیوں کا تذکرہ ہے اس بحث میں ایک اور گوشہ کا اضافہ کرتی ہے۔ ہیومن رائٹس واچ کی رپورٹ قبضہ کی تدبیروں کے صرف ایک پہلو کا احاطہ کرتی ہے اور وہ ان مستند رپورٹوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتی جو اجتماعی سزاؤں اور کسان کمیونٹی کی فصلوں اور باغوں کو برباد کرنے سے متعلق ہیں۔ ایسے مظالم آسانی سے نہیں بھلائے جاتے۔

لہٰذا وہ ولولہ انگیز منصوبہ جو'عرب دنیا میں جمہوریت کے اغراض و مقاصد کو ایک دوسرے میں سمونے اور اسرائیل کی بقا' کے لیے تیار کیا گیا تھا حقیقت کی گرد میں جھلستا ہوا لگ رہا ہے۔ کیا ایک کم کٹر نظریاتی اور اعتدال پسند رویہ بہتر نتائج نہیں فراہم کرے گا؟ ایرئیل شیرون کی زیادتیوں کی پالیسی کی مکمل تائید نے کسی کا بھلا نہیں کیا ہے۔ نہ ہی اس نے اسرائیل کی حفاظت کو قوت بخشی اور نہ ہی اس روڈ میپ کو آگے بڑھایا جس کی ذمہ داری جناب بش نے بہت دھوم دھام سے کچھ مہینے پہلے اٹھائی تھی۔ اس کے بجائے عرب دنیا میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کی پالیسی کے خلاف شاہراہوں پر مظاہروں کی سطح کافی اونچائی تک پہنچ گئی ہے۔ کیا یہ آئندہ کی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے؟ یقیناً - کیا یہ لازمی طور سے جمہوری

اصلاحات کے مقاصد اور معاشی سرگرمیوں کے استحکام کو مزید مضبوط بنائے گا؟ نہیں۔ ایک غیر مستحکم مغربی ایشیا کا اندیشہ کچھ مزید نظریات کی تخلیق کا باعث ہوسکتا ہے۔ عام طور سے دنیا کے لیے یہ ایک خوفناک بات ہوگی۔ ہم ہندوستان میں رہنے والوں کو اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہیے اور نہ ہی ہم کو پہلے سے تحریر شدہ جعلی جدیدیت کے مواقع سے خوش فہمی میں رہنا چاہیے۔

مارچ 2004

''بابل کا بادشاہ مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کرنے کے دوراہے پر کھڑا ہے۔''

مقدس کتابیں زمانوں کی دانشمندی کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ وہ سیکولر شرائط کی تکمیل بھی کرتی ہیں کیونکہ انسانی تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے۔ پیش نظر معاملہ عراق کا ہے۔ ایک غیر منصفانہ جنگ اور اس کے بعد ایک غیر مقبول قبضہ نے کوئیلیشن اکوپیشن اتھارٹی، کو مجبور کیا کہ وہ ایک باعزت واپسی کا اعلان کرے جس میں روزمرہ کے معاملات ایک چنندہ عراقی حکومت کے ہاتھ میں ہوں اور ایک غیر معینہ مدت کے لیے فوج کی مؤثر موجودگی کو قائم رکھا جائے۔ ایک بہت مربوط ٹائم ٹیبل کے مطابق، 28 فروری کو ایک عبوری دستور مکمل ہو؛ 31 مارچ تک ایک اسٹیٹس آف فورسیز معاہدہ طے پایا جائے؛ 31 مئی تک ایک عبوری اسمبلی کا انتخاب (صوبائی سیاسی دھڑوں کے ذریعہ) عمل میں آجانا چاہیے اور 30 جون تک ایک عبوری قومی حکومت قائم ہوجانا چاہیے۔ اس کے بعد 15 مارچ 2005 تک ایک دستوری کنونشن منتخب ہوجائے۔ اس میں یہ منطق پوشیدہ تھی کہ یہ منصوبہ اکثریتی شیعہ اور اقلیتی کردوں کو منظور ہوگا اور اس طرح فسادی سنّی حاشیہ پر آجائیں گے لیکن عظیم آیت اللہ سیستانی کا خیال دوسرا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ دستور کی ساخت سے پہلے براہِ راست الیکشن کرائیں جائیں۔ اس طرح یہ منصوبہ اپنی راہ سے ہٹ گیا۔ مسئلہ کا حل نکالنے کے لیے سرگرداں اتحادیوں نے اس مرحلہ پر اقوام متحدہ سے مدد چاہی۔ کوفی عنان مان گئے اور دونوں ہی جماعتوں نے ایک بار پھر ٹراٹسکی کے ان الفاظ کو صحیح ثابت کردیا کہ سیاست میں اصولوں اور وعدوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے!

لخضر براہیمی کی 23 فروری کی رپورٹ قاری کو دلچسپ مواد فراہم کرتی ہے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ 30 جون تک راست الیکشن کے انعقاد کے امکانات کا اندازہ لگائیں؛ 'اقوام متحدہ کے اصولوں اور معمولات کے موافق معتبر الیکشن کے انعقاد کا صحیح وقت طے کریں اور یہ پتہ لگائیں کہ کیا عراقی عوام کی رائے جاننے کے کچھ اور شفاف اور مخصوص طریقے ہیں جو تمام جماعتوں کو منظور ہوں۔' براہیمی کا نظریہ کہ یہ ایک متفقہ رائے تھی کہ اقوام متحدہ ایک مددگار کا رول ادا کرے اور بریمر کا 15 نومبر کا پلان غیر متوازن ہے اتنا واضح اور صریح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی رپورٹ کے مطابق الیکشن کی حمایت میں اتفاق رائے ہے اور اس پر اتفاق رائے ہے کہ 30 جون 2004 ایک عارضی حکومت کو انتقال اقتدار کی آخری تاریخ ہو اور اس پر بھی اتفاق ہو رہا ہے کہ اس تاریخ کو قائم ہونے والی حکومت الیکشن کے علاوہ کسی اور طریقہ سے عمل میں آئے۔ دوسرے ممکنہ طریقوں کی افادیت کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی گئی ہے لیکن عمائدین کی قومی کانفرنس کی جانب ایک اشارہ کیا گیا ہے جو افغانستان کے لویا جرگہ کے طرز پر ہے جس کو دسمبر کے مہینہ میں براہیمی نے کابل میں منظم کیا تھا۔

الیکشن کے عملی پہلو پر براہیمی خصوصی سفارشات پیش کرتے ہیں: الیکشن کے فریم ورک کو قانونی سند ملنے کے بعد آٹھ مہینے کا تیاری کا وقفہ ملنا چاہیے؛ حفاظت اور سلامتی کے حالات بہتر ہونا اوّلین شرط ہے؛ ایک معتبر انتخابی فہرست؛ مقامی سیاسی دھڑوں کا خارج کرنا اور سال کے آخر تک الیکشن کا انعقاد جو کہ ایک اکیلی تنظیم یعنی قانون ساز اسمبلی کے لیے ہو جو دستور ساز بھی ہو۔ رپورٹ کے فارورڈنگ نوٹ میں سکریٹری جنرل نے زور دیا ہے کہ عراق میں اقوام متحدہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے جب کہ سلامتی کونسل کی واضح، غیر مبہم اور متحدہ حمایت اور محفوظ ماحول کا قیام حاصل ہو۔ لہٰذا اب یہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اتفاق رائے بنانے میں پیش قدمی کرے۔ جہاں تک مسٹر رمسفیلڈ کا تعلق ہے وہ عراق میں ناٹو کے ملوث ہونے کے ذریعہ سے حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔ دوسری طرف سیستانی نے سال کے آخر

تک معتبر ضمانتوں غالبًا سلامتی کونسل کی قرارداد کی شکل میں، کے ساتھ الیکشن کرانے کا مطالبہ کیا ہے۔

زمینی حالات بھی عراقی عوام یا قابضوں کے لیے خوش کن نہیں ہیں۔ بغداد اور کربلا کے تازہ ترین قتل عام سے پہلے بھی حفاظتی انتظامات کمزور تھے۔ نہ ہی روزگار کے مواقع بہتر ہوئے ہیں۔ وزارت منصوبہ بندی کی ایک رپورٹ کے مطابق جو اسی ماہ شائع ہوئی ہے بے روزگاری کی سطح 48.7% ہے۔ سی او اے کے لیے دوسری پیچیدگیوں نے بھی سر اٹھایا ہے۔ ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ موجودہ چنندہ حکومت اسٹیٹس آف فورسیز معاہدہ کے لیے زیادہ سنجیدہ نہیں ہے وہ اور وہ اس مسئلہ کو منتخب حکومت پر چھوڑنا چاہتی ہے۔ اس سے جون میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگی۔ تازی نامزدگی کے ذریعہ صوبائی کونسلز میں توسیع کی کوشش کی عظیم آیت اللہ تقی المدرسی نے مذمت کی ہے۔ ان کے خیال میں یہ آمریت کی طرف لوٹنا ہے۔

عبوری دستور کا مسودہ آخری تاریخ کو یاد کرتے کرتے رہ گیا۔ اسلام کے رول اور وفاقی ساخت کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے۔ کافی بحث ومباحثہ کے بعد اسلام کو سرکاری مذہب اور قانون کے ماخذوں میں ایک بنیادی ماخذ قرار دیا گیا۔ یہ بھی طے پایا گیا کہ ایسی قانون سازی ممنوع ہوگی جو اسلامی شریعت کے منافی ہو۔ نجف کے شہ زوروں کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ترجیح کا اظہار پہلے ہی 1960 کے فیملی اسٹیٹس لا (عرب دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ) کو ختم کراکے کردیا ہے۔ بے چینی کا ایک اور نقطہ کرد علاقوں کی حیثیت کا ہے۔ متن میں یہ تحریر ہے کہ ''کردستان کی سرزمین عبوری دور میں اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھے گی۔'' یہ کرد مسلح گروہوں کو قائم رکھنے کی اجازت ہے اور ساتھ ہی کرد سیاسی پارٹیوں کے لیے وفاق میں سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی مہلت بھی۔

اقوام متحدہ کا ایک سابق افسر جو عراق کے حالات سے مانوس ہے اتحادی پالیسیوں کو سانس روکنے والی غلطیوں کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ ان میں سب سے چھوٹی غلطی عراق کے ہمسایوں سے صلاح ومشورہ کرنے میں ناکامی ہے۔ ان میں سے سب صورت

لخضر براہیمی کی 23 فروری کی رپورٹ قاری کو دلچسپ مواد فراہم کرتی ہے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ 30 جون تک راست الیکشن کے انعقاد کے امکانات کا اندازہ لگائیں؛ 'اقوام متحدہ کے اصولوں اور معمولات کے موافق معتبر الیکشن کے انعقاد کا صحیح وقت طے کریں اور یہ پتہ لگائیں کہ کیا عراقی عوام کی رائے جاننے کے کچھ اور شفاف اور مخصوص طریقے ہیں جو تمام جماعتوں کو منظور ہوں۔' براہیمی کا نظریہ کہ یہ ایک متفقہ رائے تھی کہ اقوام متحدہ ایک مددگار کا رول ادا کرے اور بریمر کا 15 نومبر کا پلان غیر متوازن ہے اتنا واضح اور صریح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی رپورٹ کے مطابق الیکشن کی حمایت میں اتفاق رائے ہے اور اس پر اتفاق رائے ہے کہ 30 جون 2004 ایک عارضی حکومت کو انتقال اقتدار کی آخری تاریخ ہو اور اس پر بھی اتفاق ہو رہا ہے کہ اس تاریخ کو قائم ہونے والی حکومت الیکشن کے علاوہ کسی اور طریقہ سے عمل میں آئے۔ دوسرے ممکنہ طریقوں کی افادیت کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی گئی ہے لیکن عمائدین کی قومی کانفرنس کی جانب ایک اشارہ کیا گیا ہے جو افغانستان کے لویا جرگہ کے طرز پر ہے جس کو دسمبر کے مہینہ میں براہیمی نے کابل میں منظم کیا تھا۔

الیکشن کے عملی پہلو پر براہیمی خصوصی سفارشات پیش کرتے ہیں: الیکشن کے فریم ورک کو قانونی سند ملنے کے بعد آٹھ مہینے کا تیاری کا وقفہ ملنا چاہیے؛ حفاظت اور سلامتی کے حالات بہتر ہونا اوّلین شرط ہے؛ ایک معتبر انتخابی فہرست؛ مقامی سیاسی دھڑوں کا خارج کرنا اور سال کے آخر تک الیکشن کا انعقاد جو کہ ایک اکیلی تنظیم یعنی قانون ساز اسمبلی کے لیے ہو جو دستور ساز بھی ہو۔ رپورٹ کے فارورڈنگ نوٹ میں سکریٹری جنرل نے زور دیا ہے کہ عراق میں اقوام متحدہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے جب کہ سلامتی کونسل کی واضح، غیر مبہم اور متحدہ حمایت اور محفوظ ماحول کا قیام حاصل ہو۔ لہٰذا اب یہ یونائٹیڈ اسٹیٹس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اتفاق رائے بنانے میں پیش قدمی کرے۔ جہاں تک مسٹر رمسفیلڈ کا تعلق ہے وہ عراق میں ناٹو کے ملوث ہونے کے ذریعہ سے حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔ دوسری طرف سیستانی نے سال کے آخر

تک معتبر ضمانتوں غالبًا سلامتی کونسل کی قرارداد کی شکل میں، کے ساتھ الیکشن کرانے کا مطالبہ کیا ہے۔

زمینی حالات بھی عراقی عوام یا قابضوں کے لیے خوش کن نہیں ہیں۔ بغداد اور کربلا کے تازہ ترین قتل عام سے پہلے بھی حفاظتی انتظامات کمزور تھے۔ نہ ہی روزگار کے مواقع بہتر ہوئے ہیں۔ وزارت منصوبہ بندی کی ایک رپورٹ کے مطابق جو اسی ماہ شائع ہوئی ہے بے روزگاری کی سطح 48.7% ہے۔ سی اے اے کے لیے دوسری پیچیدگیوں نے بھی سر اٹھایا ہے۔ ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ موجودہ چیندہ حکومت اسٹیٹس آف فورسیز معاہدہ کے لیے زیادہ سنجیدہ نہیں ہے وہ اور وہ اس مسئلہ کو منتخب حکومت پر چھوڑنا چاہتی ہے۔ اس سے جون میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگی۔ تازہ نامزدگی کے ذریعہ صوبائی کونسلز میں توسیع کی کوشش کی عظیم آیت اللہ تقی المدرسی نے مذمت کی ہے۔ ان کے خیال میں یہ آمریت کی طرف لوٹنا ہے۔

عبوری دستور کا مسودہ آخری تاریخ کو یاد کرتے کرتے رہ گیا۔ اسلام کے رول اور وفاقی ساخت کے بارے میں اختلافات پیدا ہوئے۔ کافی بحث و مباحثہ کے بعد اسلام کو سرکاری مذہب اور قانون کے ماخذوں میں ایک بنیادی ماخذ قرار دیا گیا۔ یہ بھی طے پایا گیا کہ ایسی قانون سازی ممنوع ہوگی جو اسلامی شریعت کے منافی ہو۔ نجف کے شہ زوروں کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی ترجیح کا اظہار پہلے ہی 1960 کے فیملی اسٹیٹس لا (عرب دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ) کو ختم کرا کے کردیا ہے۔ بے چینی کا ایک اور نقطہ کرد علاقوں کی حیثیت کا ہے۔ متن میں یہ تحریر ہے کہ ''کردستان کی سرزمین عبوری دور میں اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھے گی۔'' یہ کرد مسلح گروہوں کو قائم رکھنے کی اجازت ہے اور ساتھ ہی کرد سیاسی پارٹیوں کے لیے وفاق میں سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی مہلت بھی۔

اقوام متحدہ کا ایک سابق افسر جو عراق کے حالات سے مانوس ہے اتحادی پالیسیوں کو سانس روکنے والی غلطیوں کا مجموعہ قرار دیتا ہے۔ ان میں سب سے چھوٹی غلطی عراق کے ہمسایوں سے صلاح و مشورہ کرنے میں ناکامی ہے۔ ان میں سے سب صورت

حال سے متاثر ہیں اور ان میں سے ہر ایک وہ خارجی ماحول پیدا کر سکتا ہے جو داخلی امن و سکون کے لیے بہترین ہو۔

اقوام کی لغزشیں اپنے نقش و نگار چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ عراق کا بھوت برطانیہ کے سر پر سوار رہتا ہے اور اس کی تازہ ترین مثال کلسیئر شارٹ اور کیتھرین گن ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں بھی، رائے عامہ کے بھولے پن سے قطع نظر، خارجہ پالیسی الیکشن کا مسئلہ بنتی جارہی ہیں۔ ایک تازہ ترین پیو سروے کے مطابق 21 فیصد ووٹرز صدر بش کو جھوٹا سمجھتے ہیں اور وہ جنھوں نے عراق پر حملہ کی حمایت کی تھی ایک ماہ کے اندر ان کی تعداد 65 سے گر کر 56 فیصد ہوگئی ہے۔

مئی 2004

خدا نے سلیمان سے کہا 'جو چاہتے ہو مانگو' سلیمان نے جواب میں ذی فہم قلب مانگا۔ خدا سلیمان کے جواب سے بہت خوش ہوا اور اس کو ایک ذی عقل قلب سلیم عطا کیا۔ لیکن تازہ ترین واردات ان دونوں خوبیوں میں تنزل کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی عراقی مہم یہاں غور و فکر کا مرکز ہے اور واشنگٹن میں موجودہ بحث و مباحثہ قدیم ایتھنز کے اس منظر کی یاد دلاتا ہے جب صقلیہ کی مہم کی ناکامی کی خبر وہاں پہنچی تھی۔ مورخ تھوسی ٹائیڈس نے اس کو ہمیشہ کے لیے تاریخ کے صفحات میں محفوظ کرلیا ہے: ''جب فیصلہ ان پر تھوپا گیا تھا تو وہ ان خطیبوں سے ناراض تھے جنھوں نے اس مہم کو بڑھاوا دیا تھا جیسے کہ انھوں نے خود اس کی حمایت نہ کی ہو۔ وہ یکساں طور سے کاہنوں، رمالوں اور اپنے زمانے کے شگون بتانے والے تمام پیش گوؤں سے خفا تھے کیونکہ انھی لوگوں نے اس امید کی ہمت افزائی کی تھی کہ انھیں صقلیہ پر فتح حاصل کرنا چاہیے۔'' عراق کے عوام نے جبر و استبداد سے نجات تو حاصل کرلی لیکن '' آزادی'' کے بارہ مہینے بعد بھی ان کا سامنا قبضہ، تسخر اور ذلت سے ہے اور وہ اندر ہی اندر غصہ سے کھول رہے ہیں۔

انخلا کا ظاہری عمل 30 جون کی جادوئی تاریخ سے منسلک ہے۔ کیا یہ قبضہ کا خاتمہ ہوگا؟ نہیں۔ کیا عراقی حکومت کو آزادانہ فیصلے کرنے کا اختیار حاصل ہوگا؟ نہیں۔ کیا اقوام متحدہ

میں اختیار ہوگا؟ نہیں۔ دراصل جو ظاہر ہونے والا ہے وہ ایک دوغلا انتظام ہوگا (جس میں طاقت کی اصل کلوں اور پرزوں پر یونائیٹڈ اسٹیٹس کا ہاتھ ہوگا) جس کو سیکورٹی کونسل کو ایک واقف کار سکریٹری جنرل کے ذریعہ قبول اور نافذ کرنا ہوگا۔ اس مشق کا مقصد اس بڑے مفروضہ سے لاج بچانا ہے کہ عراق میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کی رسوائی دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ اور عالمی نظام کے حق میں نہ ہوگی۔ آخر میں صورت حال یہ ہوگی کہ این ایس ایس 2002 میں بیان کیا ہوا بش نظریہ جس میں ابتدا میں امریکی برتری اور آخر میں تن تنہا فیصلہ کرنے کا اعلان کیا گیا تھا، لاگو ہو جائے گا - یہ صورت حال کہاں تک جائز ہے۔

بحران کے ایام مواقع کو سامنے لاتے ہیں۔ عراق نے ایک رجحان اور اس کے پیچھے ایک فلسفہ کو ناکام ثابت کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری دنیا میں بہت ساری کمزوریاں اور کوتاہیاں ہیں۔ ایک بڑے حصہ کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔ مکمل مطلق العنانی ناقابل تسلیم ہے۔ بین الاقوامی منظور شدہ روایات کا احترام کرنا چاہیے۔ اینفورسمنٹ کے معمولات اور طریقوں کو قانونی اختیار کے ساتھ ساتھ اخلاقی ذمہ داری سے بھی منسلک ہونا چاہیے۔ سرد جنگ کے خاتمہ نے ایک موقع فراہم کیا تھا لیکن اس کو بغیر کام میں لائے چھوڑ دیا گیا اور ان ساختی تبدیلیوں سے جو اقوام متحدہ کو قانونی طور سے زیادہ مضبوط بنا سکتی تھیں پہلو تہی کی گئی۔ نتیجہ کے طور پر اس عالمی تنظیم میں نہ تو جمہوری اصول اور نہ ہی موزوں نمائندگی کو نافذ کیا گیا۔ اس کے بجائے یہ 1945 کے گوشواروں کی بنیاد پر ہی کام کرتی رہی۔ اقوام متحدہ سے باہر ساختیات اور کارروائیوں کا ارتقا ایک منطقی نتیجہ تھا اور اسی طرح سے باب VII کے تحت اینفورسمنٹ ایکشن کو باب VIII کے ریجنل ارینجمنٹ میں منتقل کرنے کی تدبیر بھی۔ آخری ضرب اس وقت لگائی گئی جب فروری 2003 میں سلامتی کونسل کے وضع کردہ ایک مخصوص اختیار کے ذریعہ عراق، اقوام متحدہ کی ممبر ریاست، کے خلاف طاقت کے استعمال کا فیصلہ کیا گیا۔ کیا اب اگر اقوام متحدہ کی جانب دیکھیں تو یہ پس منظر فراموش کیا جاسکتا ہے؟ عراق کو پہلے ہی سے مفلوج کر دینے کا جو طریقہ استعمال کیا گیا وہ منشور کی صریح خلاف ورزی تھی۔ کیا اس کی تائید کرنا چاہیے؟

یہ بدلی ہوئی صورت حال کا ایک پیمانہ ہے کہ اب یونائیٹڈ اسٹیٹس میں انخلا کی حکمت عملی پر گفتگو ہونے لگی ہے۔ یہ سیاسی طور سے ناپسندیدہ ہے لہٰذا اس کا تذکرہ صرف علمی حلقوں اور میڈیا میں ہوتا ہے۔ پانچ راستے کھلے ہوئے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی فوجوں کا چھ ماہ کے اندر اندر واپسی کا یکطرفہ اعلان کر دیا جائے اس کی طرف دھیان دیے بغیر کہ بین الاقوامی کمیونٹی عراق کے بارے میں کیا کرتی ہے اور صدام حسین کے ہٹائے جانے پر فتح کا دعویٰ کرے۔ شورش کے مرکزی علاقوں سے واپس ہو اور اپنی موجودگی کو شمالی کرد اور بصرہ کے قریب کے جنوبی علاقوں تک محدود رکھے؛ سوم یہ کہ فیصلہ لینے کے اختیار سے دستبردار ہوتے ہوئے عراق کو اقوام متحدہ کے حوالے کردے اور ایک طے شدہ ٹائم ٹیبل کے مطابق امریکی افواج کی واپسی ہو اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کہ عراق سے فوجی اڈے ختم کر دیے جائیں گے؛ چہارم یہ کہ کسی مقامی طاقتور شخص کو حکومت سونپی جائے اور پنجم یہ کہ لبنان کے طرز پر ایک مضبوط ہمسایہ کی تلاش کی جائے جس کا داخلی امن اور استحکام کی برقراری میں مفاد ہو لہٰذا وہ صورت حال کو قابو میں رکھنے میں مدد کرے گا۔ ایسا ہمسایہ صرف ایران ہے جو تازہ ترین باہمی پیش قدمیوں کے باوجود ناقابل قبول ہے۔

اگلے چند ہفتے اور فلوجہ، نجف، کربلا، کوفہ، بصرہ میں ہونے والے واقعات امریکی پالیسی کی جہت کو طے کریں گے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یو ایس کی شرائط پر اقوام متحدہ کو ملوث کرنے کے دباؤ کو برداشت اور براہیمی منصوبہ کو نافذ کیا جائے گا۔ لیکن یہ منصوبہ صرف پرامن ماحول ہی میں کام کرسکتا ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک خود قبضہ کے جلد خاتمہ کرنے کا وعدہ نہ کیا جائے۔

کچھ ایسے اشارے مل رہے ہیں کہ ہندوستانی افواج کی شمولیت کی درخواست کی تجدید کی جائے گی۔ یہ بہت چوکنا رہنے کا وقت ہے۔ پارلیمانی قرارداد کی معقولیت پسندی جو عوامی احساس کی آئینہ دار بھی ہے کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ ہندوستانی سپاہی کسی قابض فوج کا حصہ نہیں بن سکتے۔

فروری 2005

غلو آمیز بشاشت سے بھرپور عراق پھر سرخیوں میں واپس آ گیا ہے۔ انتخابی مہم ختم ہوئی لیکن ابھی نتائج آنے باقی ہیں۔ 30 جنوری کے سی این این کے رواں تبصرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قریب قریب خامیوں سے پاک کارروائی تھی۔ لیکن اس میں عراق پر حملہ، قبضہ، عراقی مہلوکین، عراق کا پتھر کے زمانے کی جانب واپس لوٹنا، جنگ کے بہانوں کا چھوٹا پن اور عظیم تباہ کاری کے ہتھیاروں کی دستیابی میں ناکامی کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔

امریکہ کے ساحلوں سے پرے اکثر نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔ 'مذہبی بنیاد پرست طاقتوں' سے مقابلہ کے پیش نظر زبردست سفارتکاری اور یو ایس کے ساتھ ایک قلیل مدتی اتحاد کا تذکرہ رواں دواں ہے۔ ہنری کیسنجر کی یہ تحقیق کہ عراق میں یو ایس کی ناکامی ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہونے کے باعث اس کے لیے مشکلات پیدا کرے گی، کی وکالت کی جارہی ہے۔ جیسا کہ ہندوستانی افواج کو ''خواہش مندوں کے گٹھ بندھن، کو جوائن کرنے کی بحث کے وقت ہوا تھا ایک بار پھر قومی مفاد کو اہم ترین محرک کی طرح پیش کیا جارہا ہے۔ اس عمل میں جابرانہ جمہوریت سازی کی تائید کی جارہی ہے۔ تاریخ کے سبق سے چشم پوشی کی گئی اور اس حقیقت کو بھی بھلایا گیا کہ روسو کا نظریہ کہ عام رضامندی، کو سب کی رضامندی پر ترجیح حاصل ہے یوروپ میں آمریت کی تمام اقسام کی بنیاد بن گئی۔

حقائق دلائل سے مربوط ہیں۔ یونائٹیڈ اسٹیٹس نے انخلا کے ٹائم ٹیبل کو ایک جانب رکھ دیا تھا۔ عراق میں بارہ نئے اڈوں کی تعمیر کے لیے ٹھیکے دے دیے گئے۔ عراق کے وزیر داخلہ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ فوجوں کی واپسی اٹھارہ مہینوں کے بعد ہی ممکن ہوگی۔ نئی عراقی حفاظتی فوج کی ٹریننگ پروگرام سے کافی پیچھے ہے۔ ویسے بھی اس کا مقصد داخلی سلامتی کو دیکھنا ہے نہ کہ ملک کی سرحدوں کی حفاظت۔ ایسا کوئی منصوبہ نہیں ہے کہ عراق کو جدید فوج کے لیے اسلحہ، ہوائی فوج یا دوسرے لوازمات فراہم کیے جائیں گے۔ کیا ایک جدید عراق اسی طرح غیر مسلح ہوگا جیسے کہ مجوزہ فلسطینی ریاست؟

اس تناظر میں نئی منتخب شدہ قومی اسمبلی کا اس ریاست کی دستور سازی جس کے اقتدار اعلیٰ کو قائم کیا جا رہا ہے، میں کیا اختیار ہوگا؟ یہ بات پہلے ہی ظاہر ہو چکی ہے کہ اسمبلی کی نمائندگی غیر متوازن ہوگی۔ یو ایس کونسل آن فارن ریلیشنز کے ایک سابق صدر لیزلی ایچ گیلب کا خیال ہے کہ اقلیتوں کی حفاظت اور عوامی وفاداری ابھارنے والا دستور تحریر کرنا غیر ممکن ہے لہٰذا اس کو اپنا اختیار ایک ایسی دستور ساز کمیٹی کو منتقل کر دینا چاہیے جس کی نمائندگی وسیع تر ہو۔

ایک دوسرے محاذ پر خود الیکشن کے دن کرد علاقوں میں کیے گئے ایک غیر رسمی ریفرنڈم کے مطابق ایک کے مقابلہ میں گیارہ افراد نے آزاد کرد ریاست کے حق میں رائے دی جو کہ عملی طور سے پہلے ہی وجود میں ہے۔ نتیجہ کے طور پر دستور سازی کی مشق میں اکثریتی شیعی اتحاد کے نقطۂ نظر سے تکلیف دہی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا۔ ان کے خیال میں آبادیاتی حقیقتوں پر مبنی انتخابی کامیابی کے ثمرات ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کے حق میں ان کے ہاتھ سے پھسل جائیں گے اور یوں کرد علاقوں کو عملی طور سے آزادی اور معاشی خودمختاری حاصل ہو جائے گی اور سرحدوں اور سلامتی امور میں بھی ان کا حصہ برقرار رہے گا۔ اس کے علاوہ تیل کی آمدنی کی تقسیم اور ملی جلی آبادی کے شہروں پر کنٹرول کے مسئلہ کو حل کرنا بھی کچھ آسان نہ ہوگا۔

قومی اسمبلی کو دوسرے مسائل کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔ اس کو تین اراکین پر مشتمل ایک پریزیڈنسی کونسل کا انتخاب کرنا ہوگا جو وزیراعظم کو چنے گی۔ آخرالذکر کام مشکل ہوگا کیونکہ احمد شلبی آیت اللہ سیستانی کی حمایت یافتہ اتحادیوں کے امیدواروں میں سرفہرست ہیں۔ یہ سب عیاض علاوی کو کہاں لے جائے گا؟

عراق میں الیکشن کے بعد والے زمانے میں داخلی محاذ پر مصروفیات ہوں گی اور خصوصی توجہ اندرونی سلامتی، بنیادی سہولتوں کی فراہمی، دستور سازی اور اختیارات کی تقسیم پر مرکوز رہے گی۔ امریکہ کے علاوہ بیرونی طاقتیں اس سلسلہ میں شاید ہی کچھ کر سکیں۔ عراق میں امن قائم ہو سکے گا بشرطیکہ آپسی منافرت کی سطح کم ہو جائے اور حکومتِ وقت عوام کی شکایتوں

کو سمجھ سکے۔ واقعات کے اس تسلسل میں ہندوستان کو سنجیدگی سے دلچسپی لینی چاہیے اور وہ لے سکتا ہے۔ عراق میں ایک وفاقی نظام سے ہمارے مفادات پر کوئی زد نہیں پڑتی لیکن عراق کا ٹوٹنا۔ خواہ وہ عملی طور سے ہو یا قانونی طور سے ہم پر اثر انداز ہوگا۔ جدید عراق کے اپنے پڑوسیوں سے تعلقات اس خطہ میں سلامتی ماحول کو متعین کرے گا اور ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔ اسی طرح سے ایران کے ساتھ 1975 کے معاہدہ اور سلامتی کونسل پر عراقی رائے کویت کی سرحدوں کو متعین کرے گی۔ اگر عراق کے نزدیکی پڑوسی، علاقہ کی باہری طاقتوں کے ساتھ یا ان کے بغیر، ایک میٹنگ بلائیں اور اس کی زمینی سلامتی کی ضمانت دیں تو ہم اس کی پوری حمایت کریں گے۔ ہم کو اس بات کا اعادہ کرنا چاہیے، اور ہم پہلے ہی کر چکے ہیں، کہ عراق کی تعمیرِ نو میں ہم ہر طرح سے اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔

تیز رفتار سفارتکاری کی ضرورت ہے لیکن یہ صلاحیت و وسعت پر مبنی ہونا چاہیے۔ یونائٹیڈ اسٹیٹس سے تعاون پسندیدہ عمل ہوگا لیکن کیا ضروری ہے کہ اس کو اس کی نظریاتی ترجیحات تک بڑھاوا دیا جائے؟ ہندوستانی ضرورتوں یا ہندوستانی فکر کو پیش بندیوں، حکومتوں کی تبدیلی، جابرانہ جمہوریت سازی، ملکوں کی نقشہ سازی اور اسلامی خوف، سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہندوستان کو ان سے الگ رہنا ہے۔ مغربی ایشیا میں بلاشبہ مسائل ہیں لیکن صحیح تشخیص کو علاج پر ترجیح ہونی چاہیے۔

جولائی 2005

'ہم عراق کے عوام' اپنے تمام فرقوں اور گروہوں میں یکجا ہوکر یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم آزادانہ اور بالارادہ طور پر اپنی یکجہتی کو قائم کریں گے۔ کل کے لیے کل سے سبق سیکھیں گے؛ اور یہ مستقل دستور تحریر کریں گے...

مقدمہ میں یہ عہد بالکل مناسب ہے۔ لیکن ماضی اور مستقبل کے درمیان بنا ہوا ناخوشگوار حال بھی ہے جس سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ دستاویز کا مسودہ اس کو کیسے حل کرے گا؟ اس کی منظوری خواہ وہ صوتی ہو یا ووٹنگ کے ذریعہ، پر کشمکش اور پھر اس کے بعد اکتوبر میں اس کے اوپر ایک قومی ریفرنڈم کی بات سمجھ میں آتی ہے اور یہ اس لیے بھی کہ اس کے پہلے

باب میں کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی اور دستور کے دیگر حصّوں میں ترمیم کے لیے دوتہائی اکثریت کی ضرورت ہوگی جس کے بعد کسی بھی صورت میں ریفرنڈم ہوگا۔

جدید عراق جمہوری، وفاقی اور پارلیمانی ہوگا۔ اسلام اس کا سرکاری مذہب اور قانون سازی کا بنیادی ماخذ ہوگا۔ یہ ایک تکثیری قومیت، تکثیری فرقوں اور تکثیری مذہب والا ملک ہوگا جس کی سرکاری زبان عربی اور کرد ہوگی۔ یہ اسلامی دنیا کا حصہ ہوگا اور اس کے عوام عرب قوم کا حصہ ہوں گے۔

دوسرا باب شہریوں کے حقوق اورآزادی کی ضمانت دیتا ہے۔یہ قومی ڈی۔ بعثیفکیشن کمیٹی دفعہ 145 اور 148 (2) کے مستقل کام کو محدود کرتا ہے۔ دفعہ 25 عراق کی معیشت کی جدید معاشی رجحانات کے مطابق اصلاح کی ضمانت دیتا ہے۔ دفعہ 39 عراقی عوام کو اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے مذہب، فرقہ، اعتقاد اور انتخاب کے مطابق اپنی شخصی حیثیت قائم رکھیں اور اس طرح 1958 کے انقلاب کے بعد جو ترقی پسند شخصی حیثیت کا قانون بنایا گیا تھا اس کے اثر کو کم کیا جاسکے۔ وہ قبائلی رسوم جو انسانی حقوق کے منافی ہیں ممنوع ہوں گی۔

اصل نازک مسئلہ وفاقی ڈھانچہ کی شکل کا ہے۔ اگرچہ یہ دو ایوانی ہوگا لیکن دوسرا ایوان۔کونسل آف یونین۔کافی عرصہ کے بعد کام شروع کرے گا۔ وفاقی اختیارات خارجی امور، دفاع، مالیات، کسٹمز، ناپ تول، شہریت، شہریت کا حصول، ڈاک، ابلاغ و ترسیل اور مردم شماری تک محدود رہیں گے جب کہ بقیہ تمام اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے (دفعہ 108)

تیل کے ذرائع اور اس کی آمدنی کی تقسیم کو دفعہ 109 اور 110 میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ''تیل اور گیس عراق کے تمام صوبوں اور علاقوں کے عوام کی ملکیت ہے۔'' وفاقی حکومت موجودہ کنبوں سے تیل اور گیس کی پیداوار کا انتظام کرے گی اس شرط کے ساتھ کہ آمدنی کو منصفانہ طور سے تقسیم کیا جائے گا جو ملک میں آبادی کے تناسب سے ہم آہنگ ہو۔ اس کے علاوہ وہ علاقے جو گزشتہ حکومت میں اس سے محروم رہے تھے خصوصی کوٹا کے مستحق ہوں گے۔

صوبوں کے اپنے الگ الگ صدر اور قانون ساز اسمبلیاں ہوں گی جن کا انتخاب براہِ راست ہوگا۔ ان کو اختیار ہوگا کہ اگر کوئی وفاقی قانون ان کے صوبہ کے علاقائی قانون سے متصادم ہوتا ہے تو وہ اس کا نفاذ روک دیں۔

فیڈرل سپریم کورٹ میں اسلامی قانون کے ماہر جج شامل کیے جائیں گے اس کی ذمہ داریوں میں دستور کی ترجمانی اور وفاقی اور علاقائی حکام کے درمیان تنازعات پر اس کا فیصلہ صادر کرنا ہوگا۔ دیگر دستوری تنظیموں میں کمیشن برائے حقوق انسانی، الیکشن کمیشن، عراقی سینٹرل بینک، میڈیا اینڈ کمیونی کیشنز ایجنسی ڈجلینس کمیشن اور مذہبی عطیات و بخشش کے لیے ایک آفس شامل ہوں گے۔

خارجہ پالیسی کے طریقۂ کار کے اصولوں کو پہلے باب میں محتاط انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ''عراق خوش ہمسائیگی کے اصول کا احترام کرے گا اور دوسرے ممالک کے داخلی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔'' یہ مسائل کے پرامن حل کی تلاش اور بین الاقوامی ذمہ داریوں کا احترام کرے گا اور غیر توسیع پسندی، غیر نمو، غیر افزائش، جوہری، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیاروں کے غیر استعمال کے بین الاقوامی وعدوں پر قائم رہے گا۔ ایسے ہتھیاروں سے وابستہ آلات، مواد، ٹکنالوجی اور رابطہ نظام کو اور ان کے فروغ، پیداوار اور صنعت کاری کو ممنوع قرار دیا جائے گا۔ اس دفعہ یعنی دفعہ 9 (e) کے مسودہ کو تیار کرنے کے لیے خصوصی ماہرین کو تلاش کرنا ہوگا جو شاید عراقی اسمبلی میں نہ مل سکیں۔

اعلیٰ عہدوں کے لیے کچھ دلچسپ ہم آہنگی اور موافقت پیدا کی گئی ہے۔ وزیراعظم اور وزرا کو یونیورسٹی ڈگری یا اس کے مساوی کا حامل ہونا چاہیے۔ لیکن صدر کے عہدہ کے لیے یہ شرط نہیں ہے۔

مسودہ سازی کی کامیابیوں سے قطع نظر، مفادات اور نظریات کی سخت مشکلیں برقرار ہیں۔ کرکوک کے شہر سے متعلقہ مسائل، آمدنی کی تقسیم اور جدید تناظر میں سنی عربوں کی حیثیت معاملات کو مزید پیچیدہ بناسکتی ہیں۔ کرد جو عملی طور سے خودمختار ہیں کرکوک شہر اور اس علاقہ کی تیل کی آمدنی کا 65% حصہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شیعہ تیل کی آمدنی پر تو

سمجھوتہ کر سکتے ہیں کیونکہ جنوبی عراق میں بھی کافی تیل ہے لیکن کرکوک دینے پر رضامند نہ ہوں گے۔ سنی عرب، جنہیں مقدمہ کے دوسرے پیراگراف میں پہلے ہی وحشت زدہ قرار دے دیا گیا ہے، کو ڈھیلے ڈھالے وفاقی نظام میں اپنی عراقی شناخت اور جسمانی اور معاشی سلامتی غائب ہوتی نظر آئے گی۔ عراق کی عرب شناخت کا فقدان عرب دنیا پر ظاہر ہوگا۔

جہاں تک امریکنوں کا تعلق ہے ان کو ایک فوری انخلا کے بارے میں انکار اور اقرار کے متضاد بیانات کی عادت ہوگئی ہے۔ سابق سینٹر گیری ہارٹ نے اس بحث میں اصل مسئلہ کا خلاصہ اس طرح کیا ہے: ''تاریخ جارج ڈبلیو بش اور غیر قدامت پسندوں کو جنھوں نے ایک عظیم قوم کو گمراہ کیا اور اسے ایک ایسی غیر منصفانہ جنگ میں جھونک دیا جو کہ دنیا کی بہترین فوج کو نقصانات سے دو چار کر رہی ہے اور امریکہ کی قومی سلامتی کو کمزور کر رہی ہے۔''

اکتوبر 2005

ایک عربی ضرب المثل کے مطابق یمن عربوں کا گہوارہ ہے اور عراق ان کی قبر ہے۔ مارچ 2003 سے عراق بلاشبہ عربوں کی ایک کثیر تعداد کی قبر رہا ہے۔ مرد، عورتیں اور بچے ایک ایسے تنازعہ کی کراس فائرنگ میں گھرے ہوئے ہیں جو ایک ناجائز نظریہ کو زندہ رکھنے کے لیے اوباشانہ طریقہ سے ان پر تھوپ دیا گیا ہے۔ اب یہ قابو سے باہر ہو چکا ہے اور اس قدرتی حالت کو پہنچ گیا ہے جس کو تھامس ہابس نے ''جنگ کی وہ حالت جہاں ہر شخص دوسرے شخص کا مخالف ہے'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ خلا میں ایک تاریک گڑھے کی طرح ہے جو اپنی حدود میں آئی ہر شے کو نگل لیتا ہے۔

اس تنازعہ میں اب ایک نئی جہت شامل ہوگئی ہے۔ سعودی عرب کے وزیر خارجہ سعود الفیصل نے عراق میں امریکی پالیسی کے بارے میں اندیشوں کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے دستور کے مسودہ کو غیر متوازن قرار دیا اور کہا کہ بیرونی (دراصل ایرانی) مداخلت برسرِ عمل ہے اور یہ کہ مرکز سے دور لے جانے والی طاقتیں کامیابی کی جانب رواں ہیں۔

اس کا ایک جواب خالص عرب سرد جنگ کی زبان میں عراق کے وزیر داخلہ کا بیان جبور معلوغ کی جانب سے آیا۔ انھوں نے کہا کہ حمورابی کے قانون کے وارثوں کو شتر

سوار بدووں سے سبق لینے کی ضرورت نہیں ہے۔سعودی پریس نے وزیر موصوف (جو خود بھی شیعہ ہیں) کو یہ یاد دلانے میں دیر نہیں لگائی کہ شتر سوار بدووں نے تاریخ کو بدلا ہے اور خود پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور امام علی اور ان کے صاحبزادے حسن اور حسین شتر سوار بدو ہی تھے۔ کچھ دن بعد عراق کے وزیر خارجہ ہوشیار زیباری نے اپنے سعودی ہم منصب سے معافی چاہی۔لیکن اس تبصرہ کی یاد عوام کے ذہن میں چبھتی رہے گی۔

یہ واقعہ اس تناؤ کی عکاسی کرتا ہے جو سعودی۔عراقی اور سعودی۔ایرانی تعلقات میں در آرہے ہیں۔ پچھلے ہفتہ ایرانی وزیر خارجہ منوچہر متقی نے 'گلف کوآپریشن کونسل، ریاستوں کا دورہ کیا۔کویت، بحرین، عمان اور یو اے ای گئے۔ان کے اس دورہ میں ریاض اور دوحہ کا شامل نہ ہونا اہمیت کا حامل ہے۔ ایک ایرانی شہر رساں ایجنسی کی 6 اکتوبر کی رپورٹ کے مطابق 'یو اے ای کے دورہ کے بعد سعودی عرب کا دورہ پروٹوکول کے کچھ امور کے باعث کسی اور موقعہ کے لیے موخر کر دیا گیا''۔ کچھ ہی گھنٹوں بعد اسی ایجنسی نے خبر دی کہ سعودی وزیر خارجہ نے متقی سے ٹیلیفون پر گفتگو کی ہے اور ان کو سعودی عرب آنے کی دعوت دی ہے اور رپورٹ کے مطابق یہ دورہ مستقبل قریب میں ہوگا۔اس میں کسی بھی فرد کے سمجھنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن نقصان کی تلافی ہوگئی۔

عراق میں بڑے خطرناک کھیل کھیلے جارہے ہیں۔جس رشتہ نے ملک اور اس کی سول سوسائٹی کو ایک بندھن میں باندھ رکھا تھا، قبضہ اور قبضہ کے بعد والی پالیسیوں کے باعث ٹوٹ چکا ہے۔وہ افراد اور فرقے جو ساتھ ساتھ رہ چکے تھے اب باہم دست وگریباں ہیں۔عراق کے پڑوسی اپنی لاتعلقی اور غیر رخنہ اندازی کا ذکر کرتے ہیں لیکن دخل اندازی کے نئے سے نئے اور زیادہ چالاک طریقے اختیار کرتے ہیں۔

اس پیچیدہ تناظر میں اردن اور سعودی خود کو بہت بے بس پاتے ہیں کیونکہ ان کا بنیادی مسئلہ خود اپنے شہریوں کو جو اسلامی رجحانات کے حامل ہیں اور جن سے قبائلی رشتہ داریاں بھی ہیں کو سنی مزاحمت میں شامل ہونے سے روکنا ہے۔شام کے اوپر اور بھی دباؤ ہیں لہٰذا وہ اپنی سرحدوں پر دراندازی کو نہیں روک سکتا۔ بہت ہچکچاہٹ کے بعد اگرچہ ترکی

شمالی عراق میں عملی کرد ریاست سے کچھ شرائط پر متفق ہوگیا ہے لیکن اس کا بھی اصل مسئلہ اپنے کرد علاقوں کو ان نظریات سے محفوظ رکھنا ہے جو رینگتے ہوئے اندر چلے آرہے ہیں۔

اب رہا ایران تو وہ اپنے حریفوں کی نیستی سے خوش اور بہتر موقعہ کی تلاش میں ہے۔ اگرچہ عراق کو مزید حصوں میں تقسیم کرنا یا اس کی مغربی سرحدوں پر ایک شیعہ اکثریتی ریاست قائم کرنا ایران کا آئیڈیا ہے۔ لیکن دونوں ہی صورتوں میں ایران کو فائدہ ہوتا ہے۔ ایران کو کھلم کھلا دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایران کے لیے ایک غیر محسوس ہمدردی جس کو قبضہ نے مزید ہوا دی ہے جنوبی عراق کے شگافوں میں در آئی ہے۔

کچھ سعودی مبصرین کا خیال ہے کہ اگر امریکی افواج عراق سے واپس چلی جائیں گی تو اس کا نتیجہ عراق پر ایران کی بالادستی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ وہ ایران سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اٹھارہ گورنریوں (صوبوں) پر مبنی ایک ''معقول وفاقیت'' کی حمایت کرے نہ کہ تین علاقوں پر مبنی ایک کی۔

دبئی میں اپنی ملاقات کے بعد وزیر خارجہ متقی نے کہا کہ علاقائی سلامتی کے تحفظ میں ایران کو کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے سیکورٹی کونسل ریزولوشن نمبر 598 مورخہ جولائی 1987 کے پیراگراف 8 جو ایران وعراق کی جنگ بندی سے متعلق ہے، کا حوالہ پیش کیا۔ اس میں سکریٹری جنرل سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ 'ایران، عراق اور اس علاقہ کی دیگر ریاستوں کے صلاح ومشورہ سے اس خطہ کی سلامتی اور استحکام کے فروغ کے لیے اقدامات کا جائزہ لیں'۔

مخالف عراق کے راستہ سے ہٹ جانے کے بعد ایران خلیج فارس کی سلامتی کے بارے میں نئی تجاویز کو کھوجنے میں خود کو زیادہ آزاد محسوس کرتا ہے اگرچہ وقتی طور پر یونائیٹڈ اسٹیٹس اس کی راہ میں حائل ہے۔ جنوبی عراق کے واقعات دباؤ بڑھانے والے اور دباؤ ہٹانے والے طریقۂ کار کا حصہ بن گئے۔ ایران کا مقصد یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ساتھ ایک سمجھوتہ کرنے کا ہے جب کہ امریکہ کی کوشش ہے کہ وہ اپنی یکطرفہ تجاویز کو ماننے کے لیے ایران کو مجبور کرے۔ لہٰذا ویانا اور بصرہ اس طویل ڈرامے کا حصہ ہوں گے۔

اگر یونائیٹڈ اسٹیٹس تھک ہار کے پیچھے ہٹتا ہے تو اکثر امریکی شہری سابق سلامتی کار
بروس لیجن کے اس مراسلہ سے متفق ہوں گے جو اس نے نیویارک ٹائمز میں 2 اکتوبر کو لکھا تھا اور جس میں ایران کے ساتھ براہِ راست تعلق پر زور دیا تھا: 'جغرافیہ سے قطع نظر، امریکہ کے سرد اور سخت مفادات بھی اس کو واضح کرتے ہیں۔ ایران کی اہمیت ہے، ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے۔' عراق کے میدان جنگ اسی طرف لے جائیں گے۔

ستمبر 2005

روزنامہ 'القدس العربی' ایک معتبر اخبار ہے اور اس کے مدیر عبدالباری اتوان کی رائے وزن دار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ لازمی ہے کہ 7 ستمبر کے شمارہ میں ان کی ادارتی رائے بعنوان 'عراق کی عربیت اور طلبانی' کی جانب توجہ دی جائے۔ بات عرب دنیا میں عراق کے الگ تھلگ ہوجانے سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں جناب اتوان نے صدر جلال طلبانی کی اس شکایت کا جواب دیا ہے کہ عرب ریاستیں اپنے سفیر بغداد نہیں بھیجتیں اور اس سلسلہ میں ان شکایات کی ایک جامع فہرست پیش کی ہے جو 2003 کے حملہ اور قبضہ کے بعد کے حالات سے عربوں کو ہے۔ آخری جملہ غم و غصہ کا مظہر ہے۔ ''جب جدید عراق امریکی شامیانہ کو چھوڑ کر عربوں کے خیمہ میں آجائے گا تو، جناب والا، عرب سفیر انفرادی اور اجتماعی طور سے بغیر کسی پس و پیش کے واپس آئیں گے۔ اس سے پہلے۔ نہیں! ہزار بار نہیں''۔

نئے مجوزہ قانون کی تفصیل آنے سے جو سننا رہا تھا، ابل پڑا ہے: عراق ایک دو لسانی، کنفیڈریشن کا وفاق ہوگا جہاں زیادہ زور قومی کے بجائے نسلی اور فرقہ وارانہ شناخت پر ہوگا۔ موخرالذکر کا اظہار عراق کے سفارتخانوں میں بھی ہوگا۔ عرب عراقی عرب قوم کا حصہ ہوں گے جب کہ دوسرے ''اسلامی دنیا کا حصہ ہوں گے۔'' عراق کے عرب کردار کی اس تحریری منسوخی نے خطہ کو غصہ سے بھر دیا ہے۔ اگرچہ عرب لیگ کے سکریٹری جنرل نے ردِعمل کا اظہار کیا ہے لیکن عرب حکومتیں خاموشی سے جائزہ لے رہی ہیں۔

محترم اتوان کے اضطراب میں عالم عرب کی اکثریت شریک ہے۔ الاہرام نے خیال ظاہر کیا کہ 'ملک اپنی قومی یگانگت کو نسلی حریفانہ کشمکش کے مقابلہ میں کھو رہا ہے۔ اور فرقہ

واریت نے 'عرب مسلمان اور غیر عرب مسلمان کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا ہے۔'
''الحیات'' کے اداریہ کی رائے ہے کہ''عراق میں ایرانی طرز پر ایک اسلامی جمہوریہ کا ظہور مشرقی بحیرہ روم کے ہر عرب ملک کے لیے خطرہ ہے''؛ یہ ایک ایسے ڈومینو اثر کو متحرک کرے گا جس کے ذریعہ مذہبی جماعتیں موجودہ حکومتوں کی جگہ لے لیں گی۔ عراق نے عرب مشرق کو ختم کر دیا ہے اور اگر ہم نے عراق کو ایک دینی ریاست بنانے کے منصوبہ کو شکست نہیں دی تو ہم جانتے ہیں وہ اس کو بھی ختم کرے گا۔''

عربوں کی یادداشت میں پچھلی دو تباہیوں کی یاد تازہ ہے اوّل تو فلسطین (1948) اور دوسرے چھ روزہ جنگ (1967)۔ دونوں نے کاری زخم لگائے لیکن دونوں ہی صورتوں میں ردّعمل ناکافی تھا۔ مراکشی مورخ عبداللہ لادوئی نے اس کو ایک انفراہسٹوریکل ذھن جہاں ذات علاحدگی پسندگی جو زبان، ثقافت اور ماضی پر فخر میں گم ہوگئی ہو، سے وابستہ کیا ہے۔

تاریخی ارتقا پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ عربیت کا تصور زبان کے اشتراک پر مبنی ہے۔ اس نے عرب قومیت اور اتحاد کو محور میں رکھ کر خود کو عربزم میں ڈھال لیا۔ موخرالذکر کی ثقافتی اور لسانی بنیاد بہرحال سماجی اور سیاسی بنیاد کے ہم پلہ نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی قانونیت کے لیے حمایتی ڈھانچہ نہیں بنا سکی۔ اس کے بجائے عرب ریاستوں نے قومی مملکتوں جیسی شناخت بنا لی۔ انھوں نے عرب لیگ میں ایک مشترک مقصد کو پانا چاہا لیکن اس کو ایک حقیقی علاقائی تنظیم بنانے میں ناکام ہوگئیں۔ قول وفعل کی یہ دوعملی عرب قومیت کا مرکزی تضاد ہے۔

اس پوری نظریاتی بحث کے سلسلہ میں مرکزی سوال یہ ہے کہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ کیا عرب ایک قوم ہے یا وہ ایکتا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس ایکتا کی تعریف کیسے کی جائے گی؟ اور اس میں اور شناخت میں کیا فرق ہے؟ اور ہم تنوع کو کیسے جگہ دیں گے؟ علاقائی، نسلی، لسانی یا فرقہ وارانہ مغائرت کو ہم آہنگ کرنے اور عراق میں کرد، سوڈان کے جنوبی باشندے اور شمالی افریقہ کی ریاستوں کے بربر کی یگانگت کے لیے کون سے پیمانے کیسے استعمال کیے جائیں گے؟

عرب دنیا میں گفتگو اور بحث کا مرکز عموماً یکسانیت اور یگانگت رہتا ہے۔ اختلاف اور تنوع زندگی کی حقیقت ہے۔ اس خطہ میں مظلوم اکثریتیں اور اقلیتیں اور بالادست اکثریتیں اور اقلیتیں ہیں۔ اس کے حکمراں طبقہ کی نوعیت بھی الگ الگ ہے کہیں موروثی، کہیں علاقائی اور کہیں فرقہ وارانہ ہے۔ خطہ میں بہرحال نمائندہ طرز حکمرانی کا فقدان ہے۔

معاشرتی ڈھانچہ کی ہر سطح پر اور سماجی و سیاسی فکر ونظر میں تکثیریت ایک لازمی عنصر ہے۔ خرطوم میں ہوئے تازہ ترین سمجھوتہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظریاتی ایڈجسٹ منٹ نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس کو نافذ بھی کیا جاسکتا ہے۔ کیا دوسروں کے لیے اس میں کوئی سبق ہے؟

جہاں تک عراق کا تعلق ہے اس کی وفاقیت کے اصول میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اصل کمزوری اس کو بروئے کار لانے کے طریقہ میں ہے۔ کچھ لوگ جغرافیائی۔ سیاسی مفادات کے لیے کارٹوگرافک انجینئرنگ میں راحت محسوس کرسکتے ہیں۔ ان کے ارادوں میں نیک نیتی نہیں ہے۔ لہٰذا عملی متبادل کی پیشکش کے ذریعہ ان کی مزاحمت کرنی ہوگی۔ جدید عراق دولسانی ہوسکتا ہے لیکن عربی اور کردی کے درمیان ترقی کا فرق عربی کی فوقیت کو یقینی بنائے گا۔

جہاں تک اسلامی سیاسی پارٹیوں کا تعلق ہے وہ یا تو محوری ہوں گی یا بائیں بازو والی۔ یہ جمہوری عمل کا ایسا لازمی جز ہے جس سے دامن نہیں چھڑایا جاسکتا۔ تجربہ نے یہ دکھایا ہے کہ اسلامی پارٹیوں کے پاس سوائے موجودہ حکومت کی کمزوریاں گنانے کے کوئی اور متبادل پیش کرنے کے لیے نہیں ہے۔ عوام اس کو جلد ہی سمجھ لیں گے۔

بلاشبہ عرب دنیا ایک بحران سے گزر رہی ہے لیکن بحران ہی سے مواقع نکلتے ہیں۔ غالبًا اس کا جواب عربیت کی ایک جدید تعریف جو زیادہ وسیع ہو، میں پوشیدہ ہے۔

اپنی تاریخ کے سنہرے دور میں بغداد اس مرحلہ سے کامیابی کے ساتھ گزر چکا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اکیسویں صدی کی دنیا میں ایسا نہ کرسکے۔

واریت نے 'عرب مسلمان اور غیر عرب مسلمان کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا ہے۔'
''الحیات'' کے اداریہ کی رائے ہے کہ ''عراق میں ایرانی طرز پر ایک اسلامی جمہوریہ کا ظہور مشرقی بحیرہ روم کے ہر عرب ملک کے لیے خطرہ ہے''؛ یہ ایک ایسے ڈومینو اثر کو متحرک کرے گا جس کے ذریعہ مذہبی جماعتیں موجودہ حکومتوں کی جگہ لے لیں گی۔ عراق نے عرب مشرق کو ختم کر دیا ہے اور اگر ہم نے عراق کو ایک دینی ریاست بنانے کے منصوبہ کو شکست نہیں دی تو ہم جانتے ہیں وہ اس کو بھی ختم کرے گا۔''

عربوں کی یادداشت میں پچھلی دو تباہیوں کی یاد تازہ ہے اوّل تو فلسطین (1948) اور دوسرے چھ روزہ جنگ (1967)۔ دونوں نے کاری زخم لگائے لیکن دونوں ہی صورتوں میں ردّعمل ناکافی تھا۔ مراکشی مورخ عبداللہ لادوئی نے اس کو ایک انفراہسٹوریکل ذھن جہاں ذات علاحدگی پسندگی جو زبان، ثقافت اور ماضی پر فخر میں گم ہوگئی ہو، سے وابستہ کیا ہے۔

تاریخی ارتقا پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ عربیت کا تصور زبان کے اشتراک پر مبنی ہے۔ اس نے عرب قومیت اور اتحاد کو محور میں رکھ کر خود کو عربزم میں ڈھال لیا۔ موخرالذکر کی ثقافتی اور لسانی بنیاد بہرحال سماجی اور سیاسی بنیاد کے ہم پلہ نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی قانونیت کے لیے حمایتی ڈھانچہ نہیں بنا سکی۔ اس کے بجائے عرب ریاستوں نے قومی مملکتوں جیسی شناخت بنا لی۔ انھوں نے عرب لیگ میں ایک مشترک مقصد کو پانا چاہا لیکن اس کو ایک حقیقی علاقائی تنظیم بنانے میں ناکام ہوگئیں۔ قول وفعل کی یہ دوعملی عرب قومیت کا مرکزی تضاد ہے۔

اس پوری نظریاتی بحث کے سلسلہ میں مرکزی سوال یہ ہے کہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔ کیا عرب ایک قوم ہے یا وہ ایکتا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اور اس ایکتا کی تعریف کیسے کی جائے گی؟ اور اس میں اور شناخت میں کیا فرق ہے؟ اور ہم تنوع کو کیسے جگہ دیں گے؟ علاقائی، نسلی، لسانی یا فرقہ وارانہ مغائرت کو ہم آہنگ کرنے اور عراق میں کرد، سوڈان کے جنوبی باشندے اور شمالی افریقہ کی ریاستوں کے بربر کی یگانگت کے لیے کون سے پیمانے کیسے استعمال کیے جائیں گے؟

عرب دنیا میں گفتگو اور بحث کا مرکز عموماً یکسانیت اور یگانگت رہتا ہے۔ اختلاف اور تنوع زندگی کی حقیقت ہے۔ اس خطہ میں مظلوم اکثریتیں اور اقلیتیں اور بالادست اکثریتیں اور اقلیتیں ہیں۔ اس کے حکمراں طبقہ کی نوعیت بھی الگ الگ ہے کہیں موروثی، کہیں علاقائی اور کہیں فرقہ وارانہ ہے۔ خطہ میں بہرحال نمائندہ طرز حکمرانی کا فقدان ہے۔

معاشرتی ڈھانچہ کی ہر سطح پر اور سماجی و سیاسی فکر ونظر میں تکثیریت ایک لازمی عنصر ہے۔ خرطوم میں ہوئے تازہ ترین سمجھوتہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظریاتی ایڈجسٹ منٹ نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس کو نافذ بھی کیا جاسکتا ہے۔ کیا دوسروں کے لیے اس میں کوئی سبق ہے؟

جہاں تک عراق کا تعلق ہے اس کی وفاقیت کے اصول میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اصل کمزوری اس کو بروئے کار لانے کے طریقہ میں ہے۔ کچھ لوگ جغرافیائی۔ سیاسی مفادات کے لیے کارٹوگرافک انجینئرنگ میں راحت محسوس کرسکتے ہیں۔ ان کے ارادوں میں نیک نیتی نہیں ہے۔ لہٰذا عملی متبادل کی پیشکش کے ذریعہ ان کی مزاحمت کرنی ہوگی۔ جدید عراق دولسانی ہوسکتا ہے لیکن عربی اور کردی کے درمیان ترقی کا فرق عربی کی فوقیت کو یقینی بنائے گا۔

جہاں تک اسلامی سیاسی پارٹیوں کا تعلق ہے وہ یا تو محوری ہوں گی یا بائیں بازو والی۔ یہ جمہوری عمل کا ایسا لازمی جز ہے جس سے دامن نہیں چھڑایا جاسکتا۔ تجربہ نے یہ دکھایا ہے کہ اسلامی پارٹیوں کے پاس سوائے موجودہ حکومت کی کمزوریاں گنانے کے کوئی اور متبادل پیش کرنے کے لیے نہیں ہے۔ عوام اس کو جلد ہی سمجھ لیں گے۔

بلاشبہ عرب دنیا ایک بحران سے گزر رہی ہے لیکن بحران ہی سے مواقع نکلتے ہیں۔ غالباً اس کا جواب عربیت کی ایک جدید تعریف جو زیادہ وسیع ہو، میں پوشیدہ ہے۔

اپنی تاریخ کے سنہرے دور میں بغداد اس مرحلہ سے کامیابی کے ساتھ گزر چکا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اکیسویں صدی کی دنیا میں ایسا نہ کرسکے۔

اپریل 2006

ایک اور زمانے میں یونائٹیڈ اسٹیٹس کے سکریٹری آف اسٹیٹ نے کہا ہے کہ 'جو چیز نظریاتی طور سے غلط ہے وہ عملی طور سے صحیح نہیں ہوسکتی۔' اس منصب اعلیٰ کے موجودہ حامل، تاریخ کے فیصلے سے پراعتماد، یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ہزاروں تکنیکی لغزشوں اور غلطیوں کے باوجود عراق پر حملہ کرنے کا فیصلہ اپنی جگہ درست تھا۔ قوس قزح کے دوسری جانب یو ایس ڈیفنس سکریٹری ڈونلڈ رمز فیلڈ ہے جس کے خیال کے مطابق مبینہ غلطیاں دراصل ایڈجسٹ منٹ تھیں اور جس نے کونڈولیزا رائس کا مضحکہ بھی اڑایا تھا کہ وہ جنگی حکمت عملی سے ناواقف ہیں۔

دونوں ہی بیان مختلف فیہ ہیں۔ غلطیوں کے تسلسل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گہری بیماری ہے۔ سون زو کے خیال کے مطابق جنگی تیاری کے بنیادی عناصر میں ''اخلاقی اثر'' پہلے نمبر پر آتا ہے۔ کیا اس کو بالکل ہی نظرانداز نہیں کردیا گیا تھا؟

عراق کی کہانی شواہد و ثبوت سے آراستہ ہے اور ایک باریک بین تحقیق کی طالب ہے۔ رائے شماری میں صدر جارج ڈبلیو بش کی مقبولیت میں عمودی گراوٹ اپنی زبان سے بول رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے منشور اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی میں یہ جنگ گزشتہ تین سال میں ہر مرحلہ پر گمراہ کن بیانات، غلط اعداد و شمار اور غلط فیصلوں کا پلندہ ہے۔ یہ عراق میں انتشار اور نکبت و غربت لائی ہے۔ ایک پوری قوم کے خلاف جرائم کی مثالیں تاریخ کی عدالت میں ثابت ہوچکی ہیں بلکہ کبھی کبھی اس سے بھی پہلے۔ کیا ایک استثنا ہوگا؟

انسانی جان کے زیاں کے علاوہ کیا گلوبلائزیشن کے نشہ میں چور یہ دنیا معاشی زاویہ سے نقصان کا حساب کرسکتی ہے؟ پچھلے مہینے لندن میں توانائی کے موضوع پر ہونے والے سمینار میں ایک امریکی ماہر نے کہا کہ عراق پر حملہ نے امریکہ کی توانائی سلامتی کو کمزور کردیا ہے اور تیل کی قیمتوں میں اضافہ کا سبب ہوا ہے۔ بجائے اس کے عراق دنیا کو پانچ ملین بیرل روزانہ تیل سپلائی کرے، آج پیداوار صرف 1.7 ملین بیرل کے قریب

ہے جو کہ بعث پارٹی کے عراق کے آخری ایام کی 2.5 ملین بیرل کی سپلائی سے قابل غور حد تک کم ہے۔

تعمیر نو اور غیر متوازن اخراجات بجائے خود ایک موضوع ہے۔ خبر آئی ہے کہ واشنگٹن میں پالیسی ساز یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگئے کہ مستقبل کی جنگوں میں تعمیر نو کو ترجیح نہیں دی جائے گی!

جمہوری پتے بھی اپنی ساکھ کھو چکے ہیں کیونکہ حملہ آور حکومتوں کے وزراءِ خارجہ قانونی طور سے منتخب وزیراعظم پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ مستعفی ہو جائیں 'اختلاف پیدا کرو اور حکمرانی کرو' کی قدیم استعماری چال میں کچھ بھیانک غلطی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ اس فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عراق سے متعلق گفتگو ایران سے کی جائے اور یہ گفتگو بغداد میں منعقد ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی مورخ اس طرف اشارہ کرے کہ یہ گفتگو اصفہان سے چند میل پرے ہی واقع ہو رہی ہے جو ایرانی بادشاہوں کا موسم سرمائی راجدھانی تھا جو اس خطہ پر حکومت کرتے تھے۔

سفیر زالے خلیل زاد کے ذریعہ گفتگو کی تجویز یو ایس نے اکتوبر میں پیش کی تھی۔ عراقی شیعہ رہنما عبدالعزیز الحکیم کی تائیدی درخواست کے بعد ایران کی رضامندی ایرانی داخلی بحث میں ایک موڑ کا اشارہ دیتی ہے۔ ٹیم کے قائد بغداد میں ایران کے سفیر حسن کاظمی قمی ہوں گے جو کچھ سال پہلے افغانستان میں ایسے ہی مذاکرات میں حصہ لے چکے ہیں۔ انھوں نے 4 اپریل کو ایرانی پریس سے کہا کہ (i) گفت وشنید کا اصل موضوع عراق ہوگا؛ (ii) گفتگو کھلی فضا میں ہوگی اور عراقی نمائندہ موجود ہوگا؛ (iii) گفتگو سے قبل کی شرائط اور ایجنڈے پر کام ہو رہا ہے، (iv) ایران ہر اس چیز کا استقبال کرے گا جو عراق میں استحکام، سیاسی عمل میں ترقی اور سلامتی کی صورت حال میں فروغ کا باعث ہو؛ اور (v) دونوں فریق اس بات پر رضامند ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ایک نئی قومی حکومت تشکیل کی جائے۔

ایران کا خیال ہے کہ یہ تازہ ترین الیکشن کے نتائج کی بنیاد پر ہونا چاہیے کیونکہ 'جمہوری اصول بہت اہم ہے'۔ امریکہ اتفاق رائے کی حمایت میں ہے ''ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ کامیاب امیدواروں کی فہرست کو اختیارات میں زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔'' بہرحال امریکی

اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ضرورت اس بات کی ہے تینوں خاص فریق یعنی شیعہ، کرد اور سنی کے درمیان معاہدہ ہو۔

کیا یہ سب بہت تاخیر سے ہوا ہے۔ پیٹرک کاک برن جو عراقی امور کے ایک تجربہ کار مشاہد ہیں پورے منظر کی بڑی افسردہ تصویرکشی کرتے ہیں۔ ''وہ لمحہ جب عراق کو صحیح معنوں میں ایک متحد ریاست بنایا جاسکتا تھا غالباً گزر چکا ہے۔ لیکن ملک کے اندر اور باہر اکثر لوگوں کو ایک کمزور عراق مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ دنیا کے نقشہ پر موجود رہے گا۔ آہستہ آہستہ امریکی غلبہ کم ہوتا جارہا ہے اور برطانوی افواج بھی زیادہ تر بصرہ کے گردو پیش میں اپنے کیمپوں میں محدود ہیں۔ ایک قوی متحد حکومت قائم کی جاسکتی ہے لیکن یہ قومی نہیں ہوگی اور یقینی طور سے بکھر جائے گی اور بہت کم حکومت کر پائے گی۔ ایک وزیر نے کہا کہ حکومت گرین زون کی چند عمارتوں تک محدود رہے گی۔

تو پھر مذاکرات سے کیا حاصل ہوگا؟ اور وہ کب شروع ہوں گے؟ عراق کی زمینی حقیقت اور بین الاقوامی جوہری توانائی ایجنسی سے متعلقہ امور میں کیا ربط ہوگا؟ کون سے دیگر روابط قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ شطرنج اور تاش کا کھیل شروع ہونے والا ہے۔ عرب ریاستیں اپنے باہر رکھنے کی وجہ سے بے حد غصہ ہیں اور سمجھتی ہیں کہ ان کے ساتھ چال چلی گئی ہے۔

ایران کے امریکی نگاہ میں رہنے کی کئی وجوہات ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس سلامتی کونسل میں یہ تجویز پاس کرانے میں کامیاب ہوگیا کہ ایران کو مکمل درآمدی کے لیے 30 دن دیے جائیں اور اس درمیان میں وہ جوہری عدم توسیعی معاہدہ کے دستخطی کی حیثیت اپنے تمام حقوق سے یکے بعد دیگرے دستبردار ہوجائے۔ ابتدائی غم و غصہ کے بعد ایران کا ردّعمل 'نیویارک ٹائمز' کی 6 اپریل کی ادارتی رائے میں بیان کیا گیا ہے اور اس فاصلہ کی جانب اشارہ کرتا ہے جو ایران اپنے جوہری پروگرام کی دنیا کے سامنے وضاحت کے لیے طے کرنا چاہتا ہے۔ یہ پیش کش سنجیدہ، نپی تلی اور قابل غور ہے۔ فرانس اور جرمنی نے مزید مذاکرات کی خواہش کا اظہار کیا ہے لیکن واشنگٹن اور لندن کی خاموشی حیران کن ہے۔

امریکی اہلکاروں نے اس بات کا اکثر اقرار کیا ہے کہ کوئی بھی چنی ہوئی بات مذاکرات سے باہر نہیں ہے۔ سادے الفاظ میں یہ دراصل اس چنی ہوئی بات (آپشن) کا اعادہ ہے کہ طاقت کا استعمال بغیر کسی اشتعال کے، یکطرفہ یا اسرائیل جیسے حلیفوں کے ساتھ مل کر کیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ سالوں میں ای ایس وارکالج، کارلائل، (پن سلوینیا) میں 'یونیفائیڈ کویسٹ'' کے کوڈ نام سے جو مشقیں کرائی گئی ہیں ان میں ایسے حملہ کا تصور کیا گیا ہے جس میں چھ ڈویژن اور دو فضائی مہم جوفوجوں کی ٹاسک فورس چھ جانب سے ایران میں داخل ہورہی ہے اور جس کو پانچ ایرکرافٹ کیریئر پیچھے سے سنبھالے ہوئے ہیں اور جس کا واضح مقصد تہران میں حکومت کو بے دخل کرنا ہے۔

اس ہفتہ سیمور ہرش نے خبر دی ہے کہ واشنگٹن میں زمیں دوز افزودگی کی سہولت کو جوہری ہتھیاروں کی مدد سے تباہ کرنے کے بارے میں سوچ میں تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ سینئر افسران کے الفاظ میں اس کو مزید واضح کرتا ہے: 'یہ ایک جوہری مسئلہ سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ جمع ہونے کا ایک نقطہ ہے اور اس کو حل کرنے کے لیے ابھی وقت ہے۔ لیکن انتظامیہ کا خیال ہے کہ یہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ ایران کے دل اور دماغ کو نہ جیت لیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگلے دس سال میں مشرق وسطی اور اس کے تیل پر کس کا قبضہ رہتا ہے۔ اس کے لیے ایران میں حکومت میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تو بہت ممکن ہے کہ ایران کے صدر احمدی نژاد اپنے اس یقین میں درست ہوں کہ اگر جوہری مسئلہ حل بھی ہوجاتا ہے تو دوسرے سوالات جیسے انسانی حقوق یا جانوروں کے حقوق سامنے رکھ دیے جائیں گے۔

ماہرین نے دوسرے فوجی آپشنز کی ایک فہرست تیار کی ہے جس پر یونائیٹڈ اسٹیٹس غور کرسکتی ہے۔ یہ (i) ہائی نیوکلیر فیسیلٹی پر کروز میزائل کے حملہ کا مظاہرہ ہوسکتا ہے، (ii) 16-20 کروز میزائیل اور تقریباً سو حملہ آور طیاروں کے ساتھ کئی اہداف پر محدود حملہ، (iii) 200 سے 600 کروز میزائیل اور حملہ آور طیاروں اور اتنے ہی عدد امدادی طیاروں کے ساتھ دس دن تک ایک بڑا حملہ جس کا ہدف بڑی نیوکلیر، میزائل اور راڈر کی سہولتیں ہوں اور مقصد ان کی کم سے کم %70 تباہی ہو؛ یا (iv) 1000 سے 2500 کروز میزائل اور حملہ آور

طیاروں کے ساتھ تمام مشکوک ایرانی سہولتوں پر بہت بڑا حملہ۔ تعداد میں کم کچھ افراد نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ ایرانی وسعت کے طوفان کو آرام کے ساتھ گزر جانے دیں اس دلیل کے ساتھ کہ اگر چہ صبر ہمیشہ ہی بھلائی نہیں ہوتا لیکن اس کو کبھی بھی گناہ یا کمزوری تصور نہیں کیا گیا۔

تنازعہ کی مدت، خطہ پر اس کا اثر اور ایرانی انتظام کی نوعیت اور شدت کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے۔ معاشی پہلو سے جنگ بہت مہنگی پڑے گی۔ تیل کی صنعت کے اعداد و شمار اشارہ کرتے ہیں کہ پیداوار میں دو ملین بیرل روزانہ کی کمی تیل کی قیمتوں کو دوگنا کر دے گی اور دیگر اثرات کے ساتھ ساتھ امریکی جی این پی میں پانچ فیصد کی کمی آجائے گی۔ دوسروں پر اس کا اثر اور زیادہ ہوگا۔

ہمارے زمانے میں جنگ ایک بہت سنگین مسئلہ ہے جسے سیاستدانوں کی پسند و ناپسند کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ کیا امریکہ اور دنیا کے عوام ایک بار پھر ہزاروں غلطیوں اور ہمالیائی حماقت کے خاموش تماشائی بنے رہیں گے؟

عراق کی دلدل-II

ستمبر 2004

عراق ''روزمرہ کے معمولات کے لیے کھلا ہوا ہے''۔ 27 مئی 2003 کو اپنی اشاعت میں نیویارک ٹائمز نے ایمبیسیڈر پال بریمر III کے یہ الفاظ تحریر کیے۔ کچھ ہفتہ قبل باہمی رضامندی کے گٹھ بندھن جس کا قائد یو ایس تھا، نے جو جنگ عراق پر مسلط کی تھی اس سے اس کے وسیع تر مقاصد کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ فوجی کارروائیاں تیز اور کامیاب رہیں۔ جنگی وردی میں ملبوس یو ایس ایئر کرافٹ کیریئر پر کھڑے ہوکر 'مشن مکمل' کا اعلان کرتے ہوئے صدر بش نے ان کو لافانیت بخش دی۔ ان کے قومی سلامتی مشیر نے وعدہ کیا کہ اقوام متحدہ کے بجائے امریکہ عراق کی تعمیرنو کی ذمہ داری لے گا۔ ہر محاذ اعتماد سے پُر تھا۔ لیکن ایک مہینہ بعد ایک مختلف منظرنامہ سامنے آنے لگا۔

تو پھر گڑبڑ کہاں ہوئی؟ جون کا واقعہ ہے جب ایک یو ایس آرمی سرجنٹ اور ایک عراقی پولیس افسر جو دونوں بغداد کے ایک پولیس اسٹیشن میں ڈیوٹی پر تھے، معموں کی اس سرزمین جسے مقبوضہ عراق کہا جاتا ہے، کے متعلق دو نظریات کا اظہار کیا۔ امریکی نے کہا: ''یہ ایک بہت بہت بہت بہت برا پڑوس ہے۔ ہمارے یہاں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہیں

ہے''۔ دوسری جانب عراقی نے اعتماد کے فقدان کو امریکیوں کے تکبر اور اکڑفوں سے تعبیر کیا۔
(1) جوں جوں حقائق کو ایک دوسرے سے جوڑا گیا تو دنیا کو معلوم ہونے لگا کہ ''آپریشن فریڈم'' غلط اندازوں، گمراہ کن بیانات؛ جنگ چھیڑنے کے لیے دنیا کو غلط اسباب بتانا، یو این سلامتی کونسل کے ردِّعمل کا غلط اندازہ لگانا، ترکی کے ردِّعمل کو صحیح طور سے نہ سمجھنا، عراقی قیادت کو یکسر ختم کردینے یا فتح کی پہلی لہر میں اس کے اہم ممبران کی گرفتاری میں ناکامی، جلاوطن عراقی باغی گروپوں کی صلاحیت اور افرادی قوت کے متعلق غلط اندازہ لگانا، جنگ کے بعد والے زمانے کے لیے منصوبہ بندی میں ناکامی، یہ پیش بینی کہ قوت کا خلا اسلامسٹ پُر کرلیں گے، میں ناکامی، امن کی برقراری اور نفاذ کے لیے سلامتی کونسل کے فریم ورک کو درکنار کرنے کے عواقب کو پہچاننے میں ناکامی، جنگ کے فوراً بعد ایک عبوری عراقی انتظامیہ مقرر کرنے میں ہچکچاہٹ، جلد سے جلد ایک ایک جمہوری حکومت کے قیام میں ناکامی، شیعہ مذہبی رہنماؤں سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکامی، سنّی شکایات کو سمجھنے میں ناکامی اور سب سے زیادہ، عوام سے رابطہ قائم کرنے اور عوام کا مزاج سمجھنے میں ناکامی کا ایک سلسلہ ہے۔

یہ غلط تصورات کیسے ابھرے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کی سب سے طاقتور قوم جس کے پاس جاسوسی اور اطلاعات کے تمام ممکنہ وسائل موجود ہوں، اتنے بڑے کام سے متعلق غلط نظریے قائم کرسکتی ہے، غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتی ہے اور اس کو غلط طریقہ سے عمل میں لاسکتی ہے؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ وسائل کی دستیابی کی تنگ دامانی کے اندر مضبوط حکمت عملی اور مناسب انتخاب کرنے میں خوف کا امتیاز لازمی ہے۔ کیا عراق کے معاملہ میں ایسا کیا گیا تھا؟

اب ناقابل تردید ثبوت دستیاب ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عراق پر حملہ کا فیصلہ، القاعدہ کی 9/11 کارروائی کے فوراً بعد ہی لے لیا گیا تھا اس یقین کے ساتھ کہ 9/11 عراق کی حکومت کو جبراً ہٹانے کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے کا بہترین موقعہ ہے خواہ 9/11 کے مواقعہ میں عراق کی ساز باز ثابت نہ ہو۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ عراق پر حملہ کی اصلیت کو 28 فروری 1991 کو کویت میں جنگ بندی کے بعد والے زمانے میں عراق سے متعلق امریکی پالیسی میں، عراق کے اوپر عائد کی گئی بندشوں پر اور عراقی قیادت کو

بدلنے کی خواہش میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس پالیسی کی ناکامی اور اس سے پیدا ہونے والی مایوسی اور دل شکستگی تھی جو ستمبر 2001 میں پھٹ پڑی۔ اس عمل کے دوران عراق کو 'دہشت گردوں کا جغرافیائی مرکز جو بہت دنوں سے ہم پر حملہ کرر ہے لیکن خصوصی طور سے 9/11 پر' قرار دے دیا گیا۔ اور اس طرح اسامہ بن لادن اور صدام حسین کے درمیان ایک ربط (جو اب تک ثابت نہیں ہوا) قائم کیا گیا۔ ایک جانب ایک دربدر، تصوراتی، قانون کا بھگوڑا اور دوسری جانب سرکاری طور سے تسلیم کی ہوئی شرارتی ریاست۔

عراق کا مسئلہ خلا میں پروان نہیں چڑھا۔ یہ طویل تر مدت کے اندر خطہ میں ہونے والے واقعات سے الجھاؤ کی حد تک جڑا ہوا ہے۔ عراق ایک قدیم سرزمین ہے۔ اس کی موجودہ شکل پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر معاہدہ ورسیلز اور لیگ آف نیشنز کے تخلیق کردہ سسٹم آف مینڈیٹس' کے ذریعہ ظہور میں آئی ہے۔ طاقت برطانیہ عظمیٰ کو سونپی گئی اور اسے جلد ہی 1920 میں ایک عام بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہی ایڈمنسٹریٹر، سر پرسی کاکس نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ لفظ 'مینڈیٹ' کو عراقی لوگ لعنت سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں دو رخی حکومت عمل میں آئی اور حکومت کو ایسی مثال پیش ہوئی جس میں اقتدار حقیقت میں صرف نام کے لیے ہوتا ہے۔ 1932 میں اینگلو۔عراقی معاہدہ نے مینڈیٹ کی جگہ لے لی۔ اس نے عراق میں برطانوی مراعات بشمول آر اے ایف کے اڈوں، کی ضمانت دی (2) اس انتظام کو 1955 کے بغداد پیکٹ میں عام کیا گیا لیکن 14 جولائی 1958 کے انقلاب کے ساتھ یہ بھی ختم ہوگیا۔ فروری 1963 میں عرب بعث پارٹی نے ایک بغاوت کے ذریعہ اقتدار پر قبضہ کرلیا شبہہ یہ تھا کہ اس میں سی آئی اے کا ہاتھ ہے جو بعد میں تسلیم کیا گیا (3)۔ صدام حسین 1969 میں منظرِ عام پر آئے اور حکومت پر گرفت مضبوط کی۔ برطانوی سفیر کے ایک مراسلہ میں صدام کو 'بعث پارٹی کے سلسلہ اقتدار کا ایک سخت گیر، مقصد سے جڑا ہوا اور ضدی رکن ہے لیکن اگر اس کو اور زیادہ جانا جائے تو صرف یہی ہے جس سے کہ معاملات کیے جاسکتے ہیں' (4) انھوں نے 1979 میں ملک کی صدارت سنبھالی اور جیسا کہ ایک مبصر نے کہا ہے 'ناصر اور بسمارک' کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ (5)

ساتھ ہی ایک اور متوازی صورت حال میں، 1971 میں خلیج فارس سے برطانوی افواج کے انخلا کے بعد یونائیٹڈ اسٹیٹس نے استعماری ایران اور سلطنت سعودی عرب کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ خلیج کی سلامتی کے لیے جڑواں ستونوں کی طرح عمل کریں۔ 1973 میں تیل پر پابندی، عرب اسرائیل جنگ اور اس خطہ میں امریکی مخالف جذبات کے پھیلنے نے یوایس کو مجبور کیا کہ وہ بحرہند کے علاقہ میں اڈوں کے لیے محفوظ جگہیں تلاش کرے۔ اس کے نتیجہ میں 24 اگست 1977 کا پریزیڈینشیل ڈائریکٹر 18 ظہور میں آیا جس نے ایک ''ریپڈ ڈپلائمنٹ فورس'' قائم کرنے کا اختیار دیا۔ پی ڈی 18 کے جواب میں 7 ستمبر 1978 کو جوائنٹ چیفز آف اسٹاف نے ''خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ سے متعلق یوایس حکمت عملی پر نظرثانی کی منظوری دے دی۔'' اس میں تین امریکی مفادات واضح کیے گئے (i) پٹرولیم کے ذرائع تک مستقل رسائی کی یقین دہانی (ii) حریف طاقت یا طاقتوں کی ایک جماعت کو بالادستی قائم کرنے سے روکنا اور (iii) یہ یقین دہانی کہ اسرائیل اپنے ہمسایہ عرب ممالک کے ساتھ مستحکم تعلقات کے ساتھ باقی رہے گا (6) 1979 میں پال وولفووٹز کی قیادت میں پینٹیگن کے تجزیہ نگاروں کی ایک ٹیم بشمول اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ڈینس روس نے ایک خفیہ رپورٹ لکھی جس میں کویت پر عراق کے امکانی حملہ اور سعودی عرب پر اس کے اثرات وخطرات پر بحث کی گئی تھی (7) فروری 1979 میں ایک اور واقعہ ہوا جس نے خطہ کے اسٹرٹیجک توازن میں خلل ڈالا (8)۔

کئی حلقوں میں انقلابی ایران ایک خطرہ تصور کیا گیا۔ لہٰذا یوایس کے پالیسی ساز حلقوں میں ستمبر 1980 میں عراق کا ایران پر حملہ بعث حکومت کی جارحانہ اور توسیع پسندی کی نوعیت کی حمایت میں نہیں، بلکہ ایک ایسے اقدام کی صورت میں دیکھا گیا جو انقلابی ایران کی طاقت پر روک لگا سکے (9) اس کے عقب میں کچھ مغربی طاقتوں نے بھی ایران پر حملہ کے لیے عراق کو اکسایا۔ خلیج کی عرب ریاستوں نے قابل ذکر مالی امداد پہنچائی (10) 1967 کی چھ روزہ جنگ میں یوایس سے جو سفارتی تعلقات ٹوٹ گئے تھے ان کو 1984 میں بحال کیا گیا جس کے نتیجہ میں فوجی نوعیت کی تصاویر کی سیٹیلائٹ کے ذریعہ ترسیل کی گئی۔ عراق

نے امریکی ٹیکنالوجی اور زرعی تخلیقات کی خرید کے لیے یو ایس سے قرض بھی حاصل کیا۔(11) جنگ کے اخیر مرحلوں میں یونائیٹڈ اسٹیٹس نے خود کو کویتی ٹینکروں کی نئی رجسٹریشن میں بھی ملوث کیا۔ اس کی توجیہہ کو صدر ریگن نے 31 مئی 1987 کو ان الفاظ میں بیان کیا: ''خلیج فارس کے اہم راستوں کا استعمال ایرانیوں کی ہدایات و احکام پر نہیں ہوگا۔ یہ راستے سوویت یونین کے زیر اثر بھی نہیں آنے دیے جائیں گے۔ خلیج فارس جہاز رانی کے لیے دنیا کی تمام قوموں کے لیے کھلی رہے گی۔''(12)

اس طرح سے عراق کی اہلیتوں اور حدود سے متعلق معروضی غور وفکر پر علاقائی گرفت و توازن کی ناگزیر حکمت عملی کو ترجیح دی گئی۔ ''بعد میں جاسوسی کے تنقید نگاروں نے تسلیم کیا کہ بغداد سے معاملات میں یو ایس کی بنیادی غلطی زوال پذیر عراقی معیشت اور اس کی کثیر تعداد کی فوج کے درمیان دھماکہ دار تعلق کو سمجھنے میں ناکامی تھی''۔ (13) یہ کویت پر حملہ کرنے کی تیاری سے ثابت ہوگیا۔ اور عراق کے اس مطالبہ سے بھی کہ کویت اور سعودی عرب وہ قرض معاف کر دیں جو جنگ کے دوران عراق کو دیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ خلیج کی تیل پیدا کرنے والی ریاستیں کوٹا سسٹم اپنائیں تاکہ تیل کی قیمتیں اونچی جاسکیں۔ جنگ میں جھونکنا دراصل ایک فرد واحد کا مایوسی سے بھرپور آخری داؤ تھا جس نے اپنی انا کی خاطر سیاست کی تعریف ان الفاظ میں کی: ''سیاست یہ ہے کہ آپ کہیں کہ آپ ایک چیز کرنے جارہے ہیں جب کہ ارادہ دوسری چیز کرنے کا ہوتا ہے۔ پھر آپ نہ وہ کرتے ہیں جو آپ نے کہا تھا اور نہ ہی وہ جس کا ارادہ کیا تھا۔''

کویت حملہ پر بین الاقوامی ردعمل نے عراق کو حیرت میں ڈال دیا۔ سلامتی کونسل کی قرارداد 661 کی حمایت میں جس اتفاق رائے کا اظہار ہوا وہ بھی متاثر کن تھا۔ اس کا سبب برطانوی سکریٹری آف اسٹیٹ برائے دفاع نے 7 ستمبر 1990 کو ہاؤس آف کامنز میں بیان کیا۔ ''ہمیں وہاں کویت یا عراق پر حملہ کرنا نہیں ہے۔ ہم وہاں پر سعودی عرب کے دفاع کے لیے گئے ہیں۔ اور یہ یقینی بنانے کے لیے کہ اقوام متحدہ کی عائد کردہ بندشوں کا نفاذ ہورہا ہے۔'' (14) 'ام المعارک' کے لیے تیاریاں واضح تھیں؛ صدام حسین بہرحال اپنی

دھونس مستقل جمائے رہے اور ہر اس موقعہ کو ضائع کردیا جو کویت سے واپسی کا باعزت فارمولا فراہم کرسکتا تھا۔

15 جنوری 1991 یعنی فضائی جنگ کی شروعات کے ایک ماہ بعد جارج بش نے 'عراقی فوج اورعوام سے مطالبہ کیا کہ وہ معاملات اپنے ہاتھ میں لیں اور آمر صدام حسین کو درکنار کردیں۔' جنگ کے بعد جو نتائج سامنے آئے اس کے بارے میں فاتح ومفتوح دونوں نے سوچا بھی نہ تھا۔ اتحادیوں نے اپنی پیش قدمی روک دی اور جنگ بندی کا اعلان کردیا۔ جنوبی عراق میں شیعاؤں کی بلا قائد والی اضطراری بغاوت اور شمال میں محتاط منصوبہ بندی کے ساتھ کردوں کی بغاوت کوسختی کے ساتھ کچل دیا گیا۔ شیعی علاقوں میں ایران کے ملوث ہونے کی خبروں یا ایسے ہی اندیشوں نے امریکنوں کو باز رکھا ہو اور عراقی حکومت کی مدد کی ہو۔(15) جنگ کے بعد یونائیٹڈ اسٹیٹس کی اصل توجہ سعودی عرب سے فوجوں کی واپسی پر تھی۔ ''روزانہ تقریباً پانچ ہزار امریکی افواج کا انخلا ہوا یعنی نوے دن میں تین لاکھ فوجی، جو میرے خیال میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کا کسی بھی تنازعہ سے نکلنے کی سب سے تیز رفتار ہے''(16) پردے کے پیچھے ایک فیصلہ اور کیا گیا کہ سی آئی اے سے وہ حالات پیدا کرنے کے لیے کہا جو صدام حسین کو اقتدار سے ہٹا دیں۔ 1992 کے وسط میں انتظامیہ نے کانگریس سے چالیس ملین ڈالر کا مطالبہ کیا تا کہ عراقی قائد کا تختہ الٹا جاسکے(17)۔

سرد جنگ کے خاتمہ نے اس حسنِ کارکردگی کا اظہار کیا جو سلامتی کونسل اتفاق رائے اور یکجہتی کے ذریعہ خود کو عطا کرسکتی تھی۔ قرارداد 661 اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ کام اپریل 1991 میں قرارداد 687 کے ذریعہ کیا گیا۔ یہ بے کم وکاست تعزیری تھا لیکن امید یہ تھی کہ اس کی عمر کم ثابت ہوگی خواہ وہ ایک فوری اور مکمل عمل درآمدی کی وجہ سے ہو یا اس کی عائد کردہ معاشی سختیوں کے باعث حکومت کے گرنے سے ہو۔ لیکن حقیقت دونوں میں سے کوئی بھی صورت وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ اس کے بجائے عراق نے سب مذاکرات کا ایک طویل اور جزوی عمل درآمدی کا راستہ اختیار کیا۔ اسی اثنا میں شمالی علاقہ سے ترکی میں تقریباً چار لاکھ اور ایران میں سات لاکھ ساٹھ ہزار افراد کے پناہ گزین ہونے کو قرارداد 688 کو پاس کرنے

کے لیے استعمال کیا گیا جس میں اصرار کیا گیا تھا کہ ''عراق فوری طور سے حقوقِ انسانی کی بین الاقوامی تنظیموں کو ان افراد تک رسائی کی اجازت دے جو پورے عراق میں مدد کے ضرورت مند ہیں۔ اس موقعہ پر ترکی کے صدر اوزال نے عراق کے ہی اندر 'محفوظ جنت' (سیف ہیون) کا تصور پیش کیا اور برطانیہ نے بھی یہ وضاحت پیش کی کہ محفوظ زون، کا تصور خالص انسانیت پر مبنی ہے اور اس کا سیاست و عدالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بالآخر ایک 'غیر پروازی زون کی تخلیق ہوئی جس کا علاقہ قابل غور حد تک محفوظ حیثیت سے بڑا تھا۔(18) جنوب میں بھی ایسا ہی ایک زون، بغیر محفوظ جنت کے، تشکیل دیا گیا۔ اگلے چند سالوں میں عراق تباہ کن ہتھیار تلاش کرنے والے اقوام متحدہ کے انسپکٹرز سے گفت وشنید کرتا رہا، بندشوں کو برداشت کرتا رہا جس کی بھاری قیمت اس کے عوام کے سب سے کمزور طبقہ کو اٹھانی پڑی اور اپنے لیے مذاکرات کی گنجائش کو ڈھونڈتا رہا۔ اس اقدام کے اوّلین نتائج 1995 میں سامنے آئے۔ اپریل 1995 کی قرارداد 986 نے عراق کو ہر چھ ماہ میں دو بلین ڈالر کا پٹرول فروخت کرنے کی اجازت دی جس کی تجدید ہر ایک سو اسّی دن بعد ہونی تھی۔ دوسری جانب صدام کو ہٹانے کا کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ 1996 میں سعودی عرب، یو ایس اور برطانیہ کی انٹیلیجنس کی تحریک اور تعاون سے بغاوت کے ذریعہ تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ ٹائیں ٹائیں فش ہوکر رہ گئی اور یہ 'سی آئی اے کی تاریخ کی عظیم ترین ناکامی تھی۔'(19) اس کے باوجود سکریٹری آف اسٹیٹ میڈ بلین آل برائٹ نے 1997 میں کھلے عام دہرایا کہ ''یقیناً، عراق میں حکومت کی تبدیلی یو ایس پالیسی میں تبدیلی لائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو ہم اپنے حلیفوں اور دوستوں کے ساتھ مل کر آنے والی حکومت سے مذاکرات کے لیے فوراً تیار ہوں گے۔''(20) جنوری 1999 میں وزارتِ خارجہ نے عراقی حزب اختلاف کے ساتھ کام کرنے کے لیے ایک خصوصی نمائندہ مقرر کیا(21)۔

شمالی عراق کے کرد صوبوں میں ایک قابل ذکر عمل ہوا۔ یہاں غیر پروازی زون اور آپریشن پرووائڈ کمفرٹ نے کرد علاقوں اور عراقی حکومت کے زیر اثر علاقوں کے درمیان ایک حقیقی لائن کھینچ دی۔ اس نے عراق اور پڑوسی ممالک کے تعلقات میں بل ڈال دیے۔(22)

بندشوں کی ایک طویل مدتی پالیسی نے عراقی عوام کو ناگفتہ بہ دشواریوں اور مشقتوں سے دوچار کیا۔ اس نے اقوام متحدہ کے کردار پر بھی سوالات اٹھائے۔ ایک جانب تو اس نے بندشوں کو سلامتی کونسل کے ذریعہ نافذ کیا (جو کہ اکثر پانچوں مستقل اراکین کے خفیہ مذاکرات میں طے ہوتی تھیں اور منتخب اراکین کو علاحدہ رکھا جاتا تھا) اور دوسری جانب اپنی انسانی حقوق کے اداروں کے ذریعہ ان کے اثرات کو سدھارنے کی کوشش بھی کی۔ نتیجہ کے طور پر جو صورت حال سامنے آئی ہے اس کا خلاصہ ایک امدادی رضاکار نے یوں کیا ہے: ''ہم ان کے پاؤں توڑنے کے بعد ان کو بیساکھیاں مہیا کرتے ہیں۔'' اگست 2002 میں کئی غیر سرکاری تنظیموں نے برطانیہ کی ''سیو دی چلڈرن'' تنظیم کے اشتراک سے ایک رپورٹ پیش کی جس میں بندشوں کے بارے میں صریح الفاظ میں بیان کیا ہے: ''یہ بات اب صاف ہو چکی ہے کہ عراق پر مکمل معاشی پابندیوں نے بے گناہ عراقی شہریوں کی ایک کثیر تعداد کو متاثر کیا ہے۔ اس نے نہ صرف غذا اور دواؤں کو غیر دستیاب کیا ہے بلکہ پوری معیشت کو برباد کر دیا ہے۔ عراقی شہریوں کو مفلس کر دیا ہے اور ان کو بنیادی آمدنی سے محروم کر دیا ہے۔ آبی وسائل، بجلی کا نظام، صحت و زندگی کے لیے دیگر بنیادی لوازمات کو گھٹا دیا ہے۔ عراق میں لوگ کثیر تعداد میں مر چکے ہیں۔ اموات کی تعداد اور تکلیف و مشقت کی مقدار خود جنگ کے دنوں سے زیادہ ہو سکتی ہے خصوصاً شہریوں کے لیے... عراق پر یہ مکمل پابندیاں نہ ہی مفید ہیں، نہ ہی غیر تشدد اور نہ ہی اخلاقی ضابطہ کے موافق ہیں''(23) کچھ مہینوں بعد جب جنگ کے بادل چھا رہے تھے، اقوام متحدہ کے اداروں نے 10 دسمبر 2002 میں ایک اندرونی دستاویز تیار کی جس میں تفصیلی طور سے ان ''انسانی ضرورتوں کا اندازہ لگایا گیا تھا جو جنگ کے بعد کی صورت حال میں عراقی عوام کو پیش آ سکتی ہیں۔''

جنگ کی تیاری انٹلیجنس کی مفروضہ رپورٹوں پر مبنی تھی جس کے متعلق یونائیٹڈ اسٹیٹس اور برطانیہ میں سرکاری تفتیش کے ذریعہ ثابت ہو چکا ہے کہ اگر وہ مکمل طور پر جھوٹی نہیں تھیں تو بہت حد تک مبالغہ آمیز تھیں۔ 'کارنیگی اینڈ ومنٹ فار انٹرنیشنل پیس' نے ثبوتوں کا جائزہ لیتے ہوئے بیان کیا کہ ''انتظامیہ کے افسران نے منظم طور پر عراق کے تباہ کن اور

بالسٹک میزائیل کے پروگرام سے متعلق خطرہ کو غلط طریقہ سے پیش کیا۔'' برٹش امریکن سیکورٹی انفارمیشن کونسل، (بی اے ایس آئی سی) نے بھی یہی فیصلہ دیا: ''وہاں پانے کے لیے کچھ نہیں ہے... خلاصہ کلام یہ ہے کہ ممنوعہ ہتھیار کا پتہ لگانے میں ناکامی اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ اقوام متحدہ کے ہتھیار انسپکٹرز نے اپنی ذمہ داری پوری کی اور یہ کہ عراقی حکومت نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔'' یہ اور ایسی ہی دوسری رپورٹوں کے پیش نظر، 8 نومبر 2002 کی قرارداد 1441 میں حسن ظن کامل کا مظاہرہ کیا گیا، وہ خود سلامتی کونسل کی کمزور تصویر پیش کرتا ہے۔ اس نے خود کی تصحیح تو کی لیکن جزوی طور پر فروری 2003 میں ایک دوسری قرارداد کی تائید سے انکار کرتے ہوئے اور عراق کے خلاف واضح طور سے طاقت کے استعمال کی اجازت دی۔ اس انکار سے یو ایس اور برطانیہ پر کوئی اثر نہیں پڑا جو کہ 1441 کو حملہ کی 'اجازت' کی طرح استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لہٰذا کوفی عنان کا اقوام متحدہ کے منشور کی روشنی میں (24) اس عمل کی غیر قانونیت کے بارے میں بیان بعد از وقت اور اب بے معنی ہے۔ یہ صرف ایک وسیع تر رائے کی بازگشت ہے۔

جنگ ایک ایسے مقام کی راست بمباری سے شروع ہوئی جس کے متعلق شبہ تھا کہ وہاں صدام موجود ہے۔ 'ہاریٹز' کے ایک صحافی نے اس پر ایک برمحل سوال کیا: ''اگر انٹیلیجنس کے ترقی یافتہ طریقے صدام کی موجودگی کا پتہ لگا سکتے تھے اور اگر اسمارٹ بم کے ذریعہ اس کی نشاندہی کر سکتے تھے تو کیا واقعی اتنی بڑی جنگ ضروری تھی؟''(25) فوجی وقائع نگار اس بات کی تحقیق کریں گے کہ آخر کیوں عراقی فوجی مشینری کسی بھی طریقہ سے حملہ کا معنی خیز جواب دینے سے ناکام رہی۔ اتحادی فوجوں کی کامیابی سریع اور مکمل تھی۔ زیادہ تر تیل کی سہولتیں تباہ نہیں ہوئیں۔ دیگر بنیادی ڈھانچوں کے ساتھ ساتھ پُل، سڑکوں اور ریلوے لائنوں کو بھی محفوظ رکھا گیا۔ بغداد پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کرلیا گیا۔ ہتھیار ڈالنے کی کسی دستاویز پر دستخط نہیں ہوئے کیونکہ مملکت عراق کا، صدام کے مجسمہ کی ایک محتاط رقص کی صورت میں گرنے کے بعد، وجود ختم ہوگیا اور اس کی قیادت تاش کے پتوں کا ڈھیر ہوگئی اور اس کی تصویریں مطلوبہ فہرست میں شامل ہوگئیں۔ شہر اور اس کے باشندوں نے

لاقانونیت اور نراج کی بدترین صورتیں دیکھیں۔ فنکاری کے بہترین نمونے والے میوزیم کو لوٹا گیا اور لائبریریوں کو آگ لگا دی گئی اور قابض افواج تماشہ دیکھتی رہیں۔

اتحادی افواج کو توقع تھی کہ ان کا استقبال نجات دہندہ اور جمہوریت کے پیش رو کی حیثیت سے کیا جائے گا۔ عراق میں امید یہ تھی کہ تعمیر نو اور راحت کاری کا کام فوراً ہی شروع کر دیا جائے گا اور آمریت کی جگہ جمہوریت کو لانے کے اقدام کیے جائیں گے۔ عام توقع یہی تھی کہ عراق کے مستقبل سے متعلق اتحادی اپنی توجہ سیاسی وعدہ پر مرکوز رکھیں گے یعنی امن کے حصول میں عراقیوں کی حفاظت کو کلیدی مقام دیں گے۔ یو ایس وزارت خارجہ نے 'عراق کا مستقبل' کے نام سے ایک پروجیکٹ بھی تیار کر رکھا تھا جس کی ضخامت تیرہ جلدوں پر مشتمل تھی لیکن ڈیفنس سکریٹری اس جامع منصوبہ کو استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے بجائے یہ کام 'خصوصی منصوبوں کے دفتر' کو سونپ دیا جس کے اہلکاروں میں وہ افراد شامل تھے جن کی نظریاتی ہم آہنگی مسلم تھی۔(26) ریٹائرڈ جنرل جے گارنر اور ان کے ماہروں کی ٹیم کو بغداد میں کام کرنے کا وقت بہت کم ملا اور ایک ماہ کے بعد ہی ان کی جگہ ایمبیڈر پال بریمر III نے لے لی۔ 8 مئی 2003 کو یو ایس اور برطانیہ نے سلامتی کونسل کے صدر کو اپنی نئی حیثیت ''عراق پر قابض طاقتوں'' سے آگاہ کیا۔ 16 مئی کو بریمر نے 'کویلیشن پروویژنل اتھارٹی' کا انعقاد کیا جس کا پہلا حکم بعث پارٹی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا تھا۔ اس نے ممبران کو جانچنے اور چھانٹنے کا ایک طریقہ مقرر کیا اور یہ حکم دیا کہ پارٹی کے اوسط اور سینئر سطح کے ممبران کو مستقبل میں کسی عوامی یا سرکاری دفتر میں ملازمت کی اجازت نہ ہوگی۔ ایک اور حکم نے عراقی افواج کو مزید کمزور کیا۔ تیسرے حکم کے ذریعہ ایک ایسا طریقہ عمل میں آیا جس کے ذریعہ عراق کی کئی سرکاری ملکیت کے کاروباروں کی شدت کے ساتھ نجی کاری ہونے لگی۔ ان تمام طریقوں نے مل کر عراقی سماج کے ہر طبقہ پر بے روزگاری کا گہرا اثر چھوڑا۔ اس کے علاوہ لازمی شہری سہولتیں جیسے بجلی، نکاس، پانی، طبی خدمات وغیرہ کو دوبارہ بنانے اور مرمت کرنے کے کام میں کافی تاخیر ہوئی اور بظاہر جلد بازی سے یو ایس کمپنیوں کو بڑے بڑے کنٹریکٹ دیے گئے۔ 22 مئی کو سلامتی کونسل

نے قرارداد 1483 کے ذریعہ بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں صورت حال کو نوٹ کیا۔
13 مئی کو گورننگ کونسل آف عراق، کا انعقاد ہوا جو اِدھر اُدھر سے چنے ہوئے افراد پر مشتمل تھی اور جس کی حیثیت ''قبضہ'' کا عوامی محاذ تھی۔

یہ تاثر کہ واقعات اس تواتر سے پیش نہیں آرہے جیسا کہ امید کی گئی تھی بہت پہلے نہ صرف میڈیا (جمے ہوئے صحافیوں کے باوجود) بلکہ سفارتی، فوجی اور سیاسی حلقوں میں گردش کرنے لگا تھا۔ مستند کونسل فار فارن ریلیشنز، نیویارک کی جون کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ ''انتظامیہ کی تیاریاں امن جیتنے کے مقابلہ میں جنگ جیتنے کے لیے زیادہ بہتر تھیں۔'' اس نے وسطی راستہ میں کچھ تبدیلیاں بھی تجویز کیں تاکہ عبوری عمل کے لیے ایک طریقہ کار اور سیاسی تصور کی تعمیر، مقامی، علاقائی اور قومی سطح پر عراقیوں سے معاملات میں وسعت، تیل کی صنعت کے کام میں بہتری اور بین الاقوامی حلیفوں کے ساتھ مل کر بوجھ اٹھانے کے چیلنج میں یوایس کی توجہ میں اضافہ کیا جاسکے۔(27) جون ہی کے مہینے میں سکریٹری آف اسٹیٹ رمسفیلڈ کی درخواست پر سی ایس آئی ایس کے صدر نے عراق میں ماہرین کی ایک ٹیم کی قیادت کی۔ اس ٹیم نے 'تخریب کاری کی مہم اور مزاحمت کے عمل کو نوٹس کیا اور فوری توجہ کے لیے سات جگہوں کی نشاندہی کی: ملک کے ہر حصے میں عوامی حفاظت کا قیام؛ مقامی صوبائی اور قومی سطح پر تعمیر نو کے عمل میں عراقیوں کی ملکیت میں توسیع، بے کار بیٹھے ہوئے افراد کو کام پر لگانا چاہیے؛ غیر مرکزیت؛ عوام کا اعتماد جیتنا اور ان سے رابطہ میں بہتری؛ فوری طور پر ایک ایسے اتحاد کی تشکیل کی جائے جو جنگ کے زمانے کے اتحاد سے زیادہ وسیع ہو اور؛ مالیات کی آمدورفت لچکدار اور آزادانہ ہو۔'' اگلے بارہ مہینے فیصلہ کن ہوں گے۔ اگلے تین مہینے سلامتی کی صورت حال میں تبدیلی کے لیے اہم ہوں گے جو کہ ملک کے کچھ حصوں میں خطرناک ہوتی جارہی ہے۔(28) جولائی میں سینیٹ فارن ریلیشنز کمیٹی کے اراکین سینٹر لوگر اور بائیڈن نے بغداد کا دورہ کیا۔ کمیٹی کے لیے تیار کردہ رپورٹ نے صورت حال کی بڑی خوفناک تصویر پیش کی۔ ''ہم نے یہاں کی صورت حال کو تشویش ناک پایا ہے اور اگر اس کا تدارک فوراً نہیں کیا گیا تو وہ امریکی فوجیوں کے لیے خطرہ ثابت ہوگی اور ساتھ ہی مشرق

وسطی اور اس کے باہر امریکی قومی سلامتی مفادات کے لیے بھی... جمہوریت کا کیا ذکر خود استحکام کی جانب سفر بھی مشکل ہوگا اور کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔'' اس رپورٹ نے توجہ کی ضرورت کے لیے مندرجہ ذیل مقامات کو ترجیح دی: عراقی مزاحمت کو دبانے کے لیے مناسب تعداد میں افواج کی تعیناتی، امن اور قانون قائم کرنے کے لیے عراقی پولیس کی دوبارہ ٹریننگ کی غرض سے بین الاقوامی امداد کی فوری مانگ، جتنی جلد ممکن ہو سکے شہری خدمات کی بحالی، کام کرنے کی عمر کی آبادی کے 60% بے روزگار افراد کے لیے روزگار فراہم کرنا، سی پی اے کے اہلکاروں تک رسائی میں آسانی ہو اور اقوام متحدہ ناٹو اور عرب حلیفوں کے ساتھ مل کر بوجھ اٹھانا۔(29) ان سب کے باوجود سرکاری پالیسی جس کا اظہار بریمر نے کیا ہٹ دھرمی کی تھی۔ ''ہم ان سے لڑیں گے اور اپنی مرضی کو اُن پر ٹھونسیں گے ان کو پکڑیں گے یا قتل کریں گے جب تک کہ اس ملک میں امن و امان قائم نہیں ہوجاتا۔'(30) یو ایس سینٹ کام کے کمانڈر، جنرل جان ابی زید نے پہلی بار 16 جولائی کو یہ تسلیم کیا کہ جنگ کے بعد جولڑائی عراق میں چل رہی ہے وہ گوریلا جنگ ہے۔'

جولائی 2003 کے بعد والے زمانے میں آپریشن فریڈم کے اعلان کردہ مقاصد کے حصول کے طریقہ کار پر سی پی اے کی کارکردگی پر یہ تجزیہ روشنی ڈالتا ہے:

امن و امان کی بحالی

ابتدائی جون میں 'انٹرنیشنل کرائسس گروپ' برسلز کی ایک رپورٹ نے ''بنیادی خدمات اور امن و قانون کے قیام سے متعلق سی پی اے کی ناکامی پر بغدادیوں کو کافی مایوس اور شکستہ دل پایا۔ اکثر لوگوں نے مبہم الفاظ میں ان سرگرمیوں میں مسلح مزاحمت کی دھمکی بھی دی ہے،(31) اگلے آنے والے مہینوں میں مستقل تنزل کو 11 فروری اور 16 مئی 2004 کے نیویارک ٹائمز کے سیکوریٹی انڈیکیٹر چارٹ اور ماہنامہ 'عراق انڈکس' مطبوعہ بروکنگس انسٹی ٹیوشن نے تفصیل کے ساتھ شائع کیا ہے۔ واقعات اور فوجی اور شہری اموات کی فہرست واضح الفاظ میں اپنی کہانی بیان کرتی ہے (لیکن عراقی شہری اموات کو جزوی طور سے بیان کرتی ہے)۔ حملہ اور قبضہ کے چھ مہینے بعد ایک عرب مبصر نے صورت حال کی تلخیص اس طرح کی

ہے ''یو ایس نے عراق میں ایک معجزہ کر دکھایا۔ اس نے عوام کو صدام حسین کے زوال پر پچھتاوے کا موقعہ دیا۔'' (32) نومبر میں مستند مبصرین کی رائے یہ تھی کہ سرکاری دعویٰ کے برعکس عراق میں پکڑے گئے کسی بھی گوریلا کا تعلق القاعدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکا، اور یہ کہ شامی سرحد سے مداخلت کاری کا ثبوت محدود ہے، مزید یہ کہ (اس وقت) روزانہ تیس یا اس کے آس پاس کی تعداد میں کیے گئے حملے مقامی لوگوں نے کیے تھے۔ جنگ کے ایک سال بعد یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ 'عراق میں نازک لہر کٹھور طریقہ سے ہماری مخالفت میں جارہی تھی۔' اور یہ جوائنٹ چیفز آف اسٹاف کے چیئرمین کی بے باک رائے پر مبنی تھا ''عراق میں فوجی اعتبار سے شکست کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن پھر عراق میں فوجی اعتبار سے فتح کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے (33)۔ 28 جون کو اقتدار کی رسمی منتقلی کے بعد صورت حال تیزی سے بگڑ گئی۔

شہری سہولتوں کی بحالی اور روزگار میں اضافہ

جون 2004 میں خام تیل اور قومی پیمانے پر بجلی پیداوار جنگ سے پہلے کی سطح پر نہیں پہنچی تھی اور بغداد میں توانائی کی دستیابی مارچ 2003 سے پہلے کی نصف کے قریب تھی۔ واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ بھی جنگ سے پہلے کی حالت پر نہیں لائے جاسکے جس کی وجہ سے یرقان اور جگر کی دیگر بیماریوں کے پھیلنے کے اندیشے مضبوط ہو گئے۔ صرف 90% اسپتالوں کے کام کرنے کی صلاحیت جنگ سے پہلے کے زمانے کے برابر قائم ہو سکی۔ ایک اندازہ کے مطابق بے روزگاری تیس سے چالیس فیصد تک تھی جب کہ دوسرا اندازہ پچاس سے ساٹھ فیصد تک بتاتا ہے۔ معاشی سرگرمی اور روزگار کی پیداوار کا ایک اشارہ اُس رفتار سے ملتا ہے جو تعمیرنو کے لیے مختص یو ایس فنڈز کی وصولی میں تھی۔ اپریل 2004 تک بلاشبہ اس کی سطح بہت کم تھی (34)۔ مختصر یہ کہ عراق کی ایک بڑی اکثریت کے لیے ایک بہتر زندگی کا وعدہ بارآور نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ 28 جون 2004 کے انتقال اقتدار سے قبل لیے ہوئے کئی فیصلوں میں عراقی وزارتوں کی فیصلہ لینے کے اختیارات کو کمیشنوں کی تخلیق اور اعلیٰ سطح کے امریکی صلاح کاروں کے تقرر نے محدود کر دیا۔ قریب قریب عراقی حکومت کی ہر وزارت میں یہ موجود تھے (35)۔

وسطی اور اس کے باہر امریکی قومی سلامتی مفادات کے لیے بھی... جمہوریت کا کیا ذکر خود استحکام کی جانب سفر بھی مشکل ہوگا اور کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔'' اس رپورٹ نے توجہ کی ضرورت کے لیے مندرجہ ذیل مقامات کو ترجیح دی: عراقی مزاحمت کو دبانے کے لیے مناسب تعداد میں افواج کی تعیناتی، امن اور قانون قائم کرنے کے لیے عراقی پولیس کی دوبارہ ٹریننگ کی غرض سے بین الاقوامی امداد کی فوری مانگ، جتنی جلد ممکن ہو سکے شہری خدمات کی بحالی، کام کرنے کی عمر کی آبادی کے 60% بے روزگار افراد کے لیے روزگار فراہم کرنا، سی پی اے کے اہلکاروں تک رسائی میں آسانی ہو اور اقوام متحدہ ناٹو اور عرب حلیفوں کے ساتھ مل کر بوجھ اٹھانا۔(29) ان سب کے باوجود سرکاری پالیسی جس کا اظہار بریمر نے کیا ہٹ دھرمی کی تھی۔ ''ہم ان سے لڑیں گے اور اپنی مرضی کو اُن پر ٹھونسیں گے ان کو پکڑیں گے یا قتل کریں گے جب تک کہ اس ملک میں امن و امان قائم نہیں ہوجاتا۔''(30) یو ایس سینٹ کام کے کمانڈر، جنرل جان ابی زید نے پہلی بار 16 جولائی کو یہ تسلیم کیا کہ جنگ کے بعد جو لڑائی عراق میں چل رہی ہے وہ گوریلا جنگ ہے۔'

جولائی 2003 کے بعد والے زمانے میں آپریشن فریڈم کے اعلان کردہ مقاصد کے حصول کے طریقہ کار پر سی پی اے کی کارکردگی پر یہ تجزیہ روشنی ڈالتا ہے:

امن و امان کی بحالی

ابتدائی جون میں 'انٹرنیشنل کرائسس گروپ' برسلز کی ایک رپورٹ نے ''بنیادی خدمات اور امن و قانون کے قیام سے متعلق سی پی اے کی ناکامی پر بغدادیوں کو کافی مایوس اور شکستہ دل پایا۔ اکثر لوگوں نے مبہم الفاظ میں ان سرگرمیوں میں مسلح مزاحمت کی دھمکی بھی دی ہے'، (31) اگلے آنے والے مہینوں میں مستقل تنزل کو 11 فروری اور 16 مئی 2004 کے نیویارک ٹائمز کے سیکوریٹی انڈیکیٹر چارٹ اور ماہنامہ 'عراق انڈکس' مطبوعہ بروکنگس انسٹی ٹیوشن نے تفصیل کے ساتھ شائع کیا ہے۔ واقعات اور فوجی اور شہری اموات کی فہرست واضح الفاظ میں اپنی کہانی بیان کرتی ہے (لیکن عراقی شہری اموات کو جزوی طور سے بیان کرتی ہے)۔ حملہ اور قبضہ کے چھ مہینے بعد ایک عرب مبصر نے صورت حال کی تلخیص اس طرح کی

ہے ''یو ایس نے عراق میں ایک معجزہ کر دکھایا۔ اس نے عوام کو صدام حسین کے زوال پر پچھتاوے کا موقعہ دیا۔'' (32) نومبر میں مستند مبصرین کی رائے یہ تھی کہ سرکاری دعویٰ کے برعکس عراق میں پکڑے گئے کسی بھی گوریلا کا تعلق القاعدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکا، اور یہ کہ شامی سرحد سے مداخلت کاری کا ثبوت محدود ہے، مزید یہ کہ (اس وقت) روزانہ تیس یا اس کے آس پاس کی تعداد میں کیے گئے حملے مقامی لوگوں نے کیے تھے۔ جنگ کے ایک سال بعد یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ 'عراق میں نازک لہر کٹھور طریقہ سے ہماری مخالفت میں جارہی تھی۔' اور یہ جوائنٹ چیفز آف اسٹاف کے چیرمین کی بے باک رائے پر مبنی تھا ''عراق میں فوجی اعتبار سے شکست کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن پھر عراق میں فوجی اعتبار سے فتح کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے (33)۔ 28 جون کو اقتدار کی رسمی منتقلی کے بعد صورت حال تیزی سے بگڑ گئی۔

شہری سہولتوں کی بحالی اور روزگار میں اضافہ

جون 2004 میں خام تیل اور قومی پیمانے پر بجلی پیداوار جنگ سے پہلے کی سطح پر نہیں پہنچی تھی اور بغداد میں توانائی کی دستیابی مارچ 2003 سے پہلے کی نصف کے قریب تھی۔ واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ بھی جنگ سے پہلے کی حالت پر نہیں لائے جاسکے جس کی وجہ سے یرقان اور جگر کی دیگر بیماریوں کے پھیلنے کے اندیشے مضبوط ہوگئے۔ صرف 90% اسپتالوں کے کام کرنے کی صلاحیت جنگ سے پہلے کے زمانے کے برابر قائم ہوسکی۔ ایک اندازہ کے مطابق بے روزگاری تیس سے چالیس فیصد تک تھی جب کہ دوسرا اندازہ پچاس سے ساٹھ فیصد تک بتاتا ہے۔ معاشی سرگرمی اور روزگار کی پیداوار کا ایک اشارہ اُس رفتار سے ملتا ہے جو تعمیرنو کے لیے مختص یو ایس فنڈز کی وصولی میں تھی۔ اپریل 2004 تک بلاشبہ اس کی سطح بہت کم تھی (34)۔ مختصر یہ کہ عراق کی ایک بڑی اکثریت کے لیے ایک بہتر زندگی کا وعدہ بارآور نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ 28 جون 2004 کے انتقال اقتدار سے قبل لیے ہوئے کئی فیصلوں میں عراقی وزارتوں کی فیصلہ لینے کے اختیارات کو کمیشنوں کی تخلیق اور اعلیٰ سطح کے امریکی صلاح کاروں کے تقرر نے محدود کردیا۔ قریب قریب عراقی حکومت کی ہر وزارت میں یہ موجود تھے (35)۔

وسطی اور اس کے باہر امریکی قومی سلامتی مفادات کے لیے بھی... جمہوریت کا کیا ذکر خود استحکام کی جانب سفر بھی مشکل ہوگا اور کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔'' اس رپورٹ نے توجہ کی ضرورت کے لیے مندرجہ ذیل مقامات کو ترجیح دی: عراقی مزاحمت کو دبانے کے لیے مناسب تعداد میں افواج کی تعیناتی، امن اور قانون قائم کرنے کے لیے عراقی پولیس کی دوبارہ ٹریننگ کی غرض سے بین الاقوامی امداد کی فوری مانگ، جتنی جلد ممکن ہو سکے شہری خدمات کی بحالی، کام کرنے کی عمر کی آبادی کے 60% بے روزگار افراد کے لیے روزگار فراہم کرنا، سی پی اے کے اہلکاروں تک رسائی میں آسانی ہو اور اقوام متحدہ ناٹو اور عرب حلیفوں کے ساتھ مل کر بوجھ اٹھانا۔(29) ان سب کے باوجود سرکاری پالیسی جس کا اظہار بریمر نے کیا ہٹ دھری کی تھی۔ ''ہم ان سے لڑیں گے اور اپنی مرضی کو اُن پر ٹھونسیں گے ان کو پکڑیں گے یا قتل کریں گے جب تک کہ اس ملک میں امن و امان قائم نہیں ہوجاتا۔''(30) یو ایس سینٹ کام کے کمانڈر، جنرل جان ابی زید نے پہلی بار 16 جولائی کو یہ تسلیم کیا کہ جنگ کے بعد جو لڑائی عراق میں چل رہی ہے وہ گوریلا جنگ ہے۔'

جولائی 2003 کے بعد والے زمانے میں آپریشن فریڈم کے اعلان کردہ مقاصد کے حصول کے طریقہ کار پر سی پی اے کی کارکردگی پر یہ تجزیہ روشنی ڈالتا ہے:

امن و امان کی بحالی

ابتدائی جون میں 'انٹرنیشنل کرائسس گروپ' برسلز کی ایک رپورٹ نے ''بنیادی خدمات اور امن و قانون کے قیام سے متعلق سی پی اے کی ناکامی پر بغدادیوں کو کافی مایوس اور شکستہ دل پایا۔ اکثر لوگوں نے مبہم الفاظ میں ان سرگرمیوں میں مسلح مزاحمت کی دھمکی بھی دی ہے،'(31) اگلے آنے والے مہینوں میں مستقل تنزل کو 11 فروری اور 16 مئی 2004 کے نیویارک ٹائمز کے سیکوریٹی انڈیکیٹر چارٹ اور ماہنامہ 'عراق انڈکس' مطبوعہ بروکنگس انسٹی ٹیوشن نے تفصیل کے ساتھ شائع کیا ہے۔ واقعات اور فوجی اور شہری اموات کی فہرست واضح الفاظ میں اپنی کہانی بیان کرتی ہے (لیکن عراقی شہری اموات کو جزوی طور سے بیان کرتی ہے)۔ حملہ اور قبضہ کے چھ مہینے بعد ایک عرب مبصر نے صورت حال کی تلخیص اس طرح کی

ہے ''یو ایس نے عراق میں ایک معجزہ کر دکھایا۔ اس نے عوام کو صدام حسین کے زوال پر پچھتاوے کا موقعہ دیا۔'' (32) نومبر میں مستند مبصرین کی رائے یہ تھی کہ سرکاری دعویٰ کے برعکس عراق میں پکڑے گئے کسی بھی گوریلا کا تعلق القاعدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکا، اور یہ کہ شامی سرحد سے مداخلت کاری کا ثبوت محدود ہے، مزید یہ کہ (اس وقت) روزانہ تیس یا اس کے آس پاس کی تعداد میں کیے گئے حملے مقامی لوگوں نے کیے تھے۔ جنگ کے ایک سال بعد یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ 'عراق میں نازک لہر کٹھور طریقہ سے ہماری مخالفت میں جارہی تھی۔' اور یہ جوائنٹ چیفز آف اسٹاف کے چیئرمین کی بے باک رائے پر مبنی تھا ''عراق میں فوجی اعتبار سے شکست کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن پھر عراق میں فوجی اعتبار سے فتح کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے (33)۔ 28 جون کو اقتدار کی رسمی منتقلی کے بعد صورت حال تیزی سے بگڑ گئی۔

شہری سہولتوں کی بحالی اور روزگار میں اضافہ

جون 2004 میں خام تیل اور قومی پیمانے پر بجلی پیداوار جنگ سے پہلے کی سطح پر نہیں پہنچی تھی اور بغداد میں توانائی کی دستیابی مارچ 2003 سے پہلے کی نصف کے قریب تھی۔ واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ بھی جنگ سے پہلے کی حالت پر نہیں لائے جاسکے جس کی وجہ سے یرقان اور جگر کی دیگر بیماریوں کے پھیلنے کے اندیشے مضبوط ہوگئے۔ صرف %90 اسپتالوں کے کام کرنے کی صلاحیت جنگ سے پہلے کے زمانے کے برابر قائم ہوسکی۔ ایک اندازہ کے مطابق بے روزگاری تیس سے چالیس فیصد تک تھی جب کہ دوسرا اندازہ پچاس سے ساٹھ فیصد تک بتاتا ہے۔ معاشی سرگرمی اور روزگار کی پیداوار کا ایک اشارہ اُس رفتار سے ملتا ہے جو تعمیرنو کے لیے مختص یو ایس فنڈز کی وصولی میں تھی۔ اپریل 2004 تک بلاشبہ اس کی سطح بہت کم تھی (34)۔ مختصر یہ کہ عراق کی ایک بڑی اکثریت کے لیے ایک بہتر زندگی کا وعدہ بارآور نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ 28 جون 2004 کے انتقال اقتدار سے قبل لیے ہوئے کئی فیصلوں میں عراقی وزارتوں کی فیصلہ لینے کے اختیارات کو کمیشنوں کی تخلیق اور اعلیٰ سطح کے امریکی صلاح کاروں کے تقرر نے محدود کردیا۔ قریب قریب عراقی حکومت کی ہر وزارت میں یہ موجود تھے (35)۔

وسطی اور اس کے باہر امریکی قومی سلامتی مفادات کے لیے بھی... جمہوریت کا کیا ذکر خود استحکام کی جانب سفر بھی مشکل ہوگا اور کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔'' اس رپورٹ نے توجہ کی ضرورت کے لیے مندرجہ ذیل مقامات کو ترجیح دی: عراقی مزاحمت کو دبانے کے لیے مناسب تعداد میں افواج کی تعیناتی، امن اور قانون قائم کرنے کے لیے عراقی پولیس کی دوبارہ ٹریننگ کی غرض سے بین الاقوامی امداد کی فوری مانگ، جتنی جلد ممکن ہو سکے شہری خدمات کی بحالی، کام کرنے کی عمر کی آبادی کے 60% بے روزگار افراد کے لیے روزگار فراہم کرنا، سی پی اے کے اہلکاروں تک رسائی میں آسانی ہو اور اقوام متحدہ نائو اور عرب حلیفوں کے ساتھ مل کر بوجھ اٹھانا۔(29) ان سب کے باوجود سرکاری پالیسی جس کا اظہار بریمر نے کیا ہٹ دھرمی ئی تھی۔ ''ہم ان سے لڑیں گے اور اپنی مرضی کو اُن پر ٹھونسیں گے ان کو پکڑیں گے یا قتل کریں گے جب تک کہ اس ملک میں امن و امان قائم نہیں ہوجاتا۔'' (30) یو ایس سینٹ کام کے کمانڈر، جنرل جان ابی زید نے پہلی بار 16 جولائی کو یہ تسلیم کیا کہ جنگ کے بعد جولڑائی عراق میں چل رہی ہے وہ گوریلا جنگ ہے۔'

جولائی 2003 کے بعد والے زمانے میں آپریشن فریڈم کے اعلان کردہ مقاصد کے حصول کے طریقہ کار پر سی پی اے کی کارکردگی پر یہ تجزیہ روشنی ڈالتا ہے:

امن و امان کی بحالی

ابتدائی جون میں 'انٹرنیشنل کرائسس گروپ' برسلز کی ایک رپورٹ نے ''بنیادی خدمات اور امن و قانون کے قیام سے متعلق سی پی اے کی ناکامی پر بغدادیوں کو کافی مایوس اور شکستہ دل پایا۔ اکثر لوگوں نے مبہم الفاظ میں ان سرگرمیوں میں مسلح مزاحمت کی دھمکی بھی دی ہے، (31) اگلے آنے والے مہینوں میں مستقل تنزل کو 11 فروری اور 16 مئی 2004 کے نیویارک ٹائمز کے سیکوریٹی انڈیکیٹر چارٹ اور ماہنامہ 'عراق انڈکس' مطبوعہ بروکنگس انسٹی ٹیوشن نے تفصیل کے ساتھ شائع کیا ہے۔ واقعات اور فوجی اور شہری اموات کی فہرست واضح الفاظ میں اپنی کہانی بیان کرتی ہے (لیکن عراقی شہری اموات کو جزوی طور سے بیان کرتی ہے)۔ حملہ اور قبضہ کے چھ مہینے بعد ایک عرب مبصر نے صورت حال کی تلخیص اس طرح کی

ہے''یو ایس نے عراق میں ایک معجزہ کر دکھایا۔ اس نے عوام کو صدام حسین کے زوال پر پچھتاوے کا موقعہ دیا۔''(32) نومبر میں مستند مبصرین کی رائے یہ تھی کہ سرکاری دعویٰ کے برعکس عراق میں پکڑے گئے کسی بھی گوریلا کا تعلق القاعدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکا، اور یہ کہ شامی سرحد سے مداخلت کاری کا ثبوت محدود ہے، مزید یہ کہ (اس وقت) روزانہ تیس یا اس کے آس پاس کی تعداد میں کیے گئے حملے مقامی لوگوں نے کیے تھے۔ جنگ کے ایک سال بعد یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ 'عراق میں نازک لہر کٹھور طریقہ سے ہماری مخالفت میں جاری تھی۔' اور یہ جوائنٹ چیفز آف اسٹاف کے چیرمین کی بے باک رائے پر مبنی تھا ''عراق میں فوجی اعتبار سے شکست کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن پھر عراق میں فوجی اعتبار سے فتح کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے(33)۔ 28 جون کو اقتدار کی رسمی منتقلی کے بعد صورت حال تیزی سے بگڑ گئی۔

شہری سہولتوں کی بحالی اور روزگار میں اضافہ

جون 2004 میں خام تیل اور قومی پیمانے پر بجلی پیداوار جنگ سے پہلے کی سطح پر نہیں پہنچی تھی اور بغداد میں توانائی کی دستیابی مارچ 2003 سے پہلے کی نصف کے قریب تھی۔ واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ بھی جنگ سے پہلے کی حالت پر نہیں لائے جاسکے جس کی وجہ سے یرقان اور جگر کی دیگر بیماریوں کے پھیلنے کے اندیشے مضبوط ہو گئے۔ صرف 90% اسپتالوں کے کام کرنے کی صلاحیت جنگ سے پہلے کے زمانے کے برابر قائم ہو سکی۔ ایک اندازہ کے مطابق بے روزگاری تیس سے چالیس فیصد تک تھی جب کہ دوسرا اندازہ پچاس سے ساٹھ فیصد تک بتاتا ہے۔ معاشی سرگرمی اور روزگار کی پیداوار کا ایک اشارہ اُس رفتار سے ملتا ہے جو تعمیرنو کے لیے مختص یو ایس فنڈز کی وصولی میں تھی۔ اپریل 2004 تک بلاشبہ اس کی سطح بہت کم تھی(34)۔ مختصر یہ کہ عراق کی ایک بڑی اکثریت کے لیے ایک بہتر زندگی کا وعدہ بارآور نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ 28 جون 2004 کے انتقال اقتدار سے قبل لیے ہوئے کئی فیصلوں میں عراقی وزارتوں کی فیصلہ لینے کے اختیارات کو کمیشنوں کی تخلیق اور اعلیٰ سطح کے امریکی صلاح کاروں کے تقرر نے محدود کر دیا۔ قریب قریب عراقی حکومت کی ہر وزارت میں یہ موجود تھے(35)۔

سیاست میں حصہ داری

قبضہ کے بعد 15 اپریل 2003 کو 80 عراقی اراکین پر مشتمل اسمبلی کی پہلی نشست ناصریہ میں خصوصی ایلچی زلمے خلیل زاد کی موجودگی میں منعقد ہوئی۔ اس نے 13 نکات پر مبنی اعلانیہ جاری کیا جس میں ایک جمہوری اور وفاقی عراق کی ضرورت پر زور دیا۔ اس نے بعث پارٹی کی تحلیل پر زور دیا اور دس دن کے اندر ایک وسیع تر دوسری مجلس کی تجویز کی جو عبوری عراقی سرکار کے طریقہ کار پر بحث کرے۔ دوسری میٹنگ 28 اپریل کو بغداد میں ہوئی جس میں بشمول ایس سی آئی آر آئی مختلف گروپوں کے تین سو مندوبین نے شرکت کی۔ اس عمل کے نتیجہ میں 16 جولائی کو سی پی اے ریگولیشن نمبر 6 کے ذریعہ عراقی گورننگ کونسل کی تشکیل ہوئی۔ یہ تشکیل طبقاتی اور نسلی نمائندگی پر مبنی تھی۔ اس میں کئی عراقی جلاوطن بھی شامل تھے۔ لیکن اسی دوران کچھ اور واقعات نے اس کام کو حاشیہ میں ڈال دیا۔ 7 اگست کو اردن کے سفارتخانہ اور 19 اگست کو اقوام متحدہ کے دفتر پر بغداد میں بم دھماکے ہوئے۔ 24 اگست کو ایس سی آئی آر آئی کے آیت اللہ باقر الحاکمی کو قتل کردیا گیا۔ کولیشن اتھارٹی کے لیے یہ ایک تذبذب کا وقت تھا۔ ایک جانب ایک مشکل الحصول دشمن کی شناخت اور اس کو تہس نہس کرنا تھا اور دوسری جانب عوام کے مختلف طبقوں میں عوامی بہبود اور وسیع تر حصہ داری کے معنی خیز اقدامات کے ذریعہ حمایت و پشت پناہی کی بنیاد بنانا تھا۔ اتھارٹی کا رجحان اوّل الذکر کی طرف تھا۔ احمد شلبی، اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود، اس کے اثرات کا اندازہ لگانے میں قطعی طور سے واضح تھا: ''عراقیوں نے آزادی کا استقبال کیا لیکن قبضہ کو مسترد کردیا...عوام چاہتے ہیں کہ وہ خود حکمرانی سے پیدا ہوئی عزت نفس اور قومی وقار کے دوبارہ نفاذ کے لیے اقتدار کی بحالی کا ایک تیز رفتار ٹائم ٹیبل دیکھیں۔ عراقی گورننگ کونسل کو جلد سے جلد ایک اصل عارضی حکومت میں تبدیل ہونا چاہیے اور اتحادیوں کے ساتھ سلامتی کی ذمہ داری اٹھانی چاہیے اور ساتھ میں جمہوریت کی جانب پیش رفت بھی کرنی چاہیے۔ اتحادیوں کے تحت وسیع تر قبضہ عوامی مزاحمت کے لیے راہ ہموار کرتا ہے اور یہ حسین کے منصوبوں کو سیاسی قوت عطا کرتا ہے اور یہ اس کے ہاتھوں میں کھیلتا ہے۔'' (36) اس کا کہنا کرنے سے زیادہ آسان تھا کیونکہ خود گورننگ کونسل طریقہ کار کے سوال

پر بنی ہوئی تھی۔ کونسل کی مقرر کردہ ایک کمیٹی ایک متفق فیصلہ پر پہنچنے میں ناکام رہی۔ اس کے بجائے اس نے تین آپشنز تجویز کیے: دستور ساز اسمبلی کے انعقاد کے لیے الیکشن، قومی کوٹا کے مطابق ایک دستور ساز کمیٹی کا قیام، افغانستان کے لویا جرگہ کے طرز پر پورے عراق سے مقامی اشراف اور اہل الرائے سے ایک وسیع تر مشاورتی مشق (37)۔ 23 دسمبر کو صدر بش نے ماہیت قلب نہیں بلکہ حکمت عملی میں تبدیلی کے طور پر، اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا کہ عراق کی خودمختاری کے موقف میں پیش قدمی کی جائے۔ 16 اکتوبر کو سیکوریٹی کونسل کی قرارداد 1511 میں صراحت کی گئی کہ گورننگ کونسل میں ''عبوری مدت میں ریاست عراق کا اقتدار اعلیٰ شامل ہے، اور سی پی اے سے مطالبہ کیا کہ جتنی جلد عملی طور پر ممکن ہو ذمہ داریاں گورننگ کونسل کو منتقل کردی جائیں۔ (14 اگست کونسل نے قرارداد 1500 کے ذریعہ گورننگ کونسل کی تخلیق کو 'عراقی عوام کے ذریعہ بین الاقوامی سطح پر منظورشدہ، نمائندہ حکومت جو عراق کے اقتدار اعلیٰ کو عمل میں لائے گی، کی تشکیل کی جانب ایک اہم قدم قرار دیا تھا)۔ اس قرارداد نے اقوام متحدہ کو عراق کی تعمیر نو میں ایک اہم (لیکن مرکزی نہیں۔) کردار عطا کیا۔

زوال پذیر سیاسی اور حفاظتی صورت حال نے طریقۂ عمل میں تبدیلی کے لیے مجبور کیا۔ 15 نومبر کو بریمر نے ایک دستاویز بعنوان 'ایگریمنٹ آن پولیٹکل پروسس' پر دستخط کیے۔ اس دستاویز کی رو سے 28 فروری 2004 تک بنیادی قانون کے مسودہ کی تحریر، 31 مارچ تک سیکوریٹی پر معاہدہ اور اتحادی افواج کی حیثیت، 31 مئی تک ایک عبوری قومی اسمبلی (ٹی این اے) کا سلیکشن اور الیکشن، 30 جون تک ایک خودمختار عبوری انتظامیہ (ٹی این اے کے ذریعہ منتخب شدہ) کا قیام، اسی تاریخ کو سی پی اے تحلیل ہوجائے گی، 15 مارچ 2005 تک ڈائرکٹ ووٹنگ کے ذریعہ دستوری کنونشن کا الیکشن، 31 دسمبر 2005 تک دستور کے مسودہ کی تکمیل، ریفرنڈم کے لیے اس کی پیشی اور ایک نئی حکومت کی تنصیب، اسی تاریخ کو بنیادی قانون کی عمل آوری ختم ہوجائے گی۔

مجوزہ معاہدہ کی شفافیت اور مشاورتی نوعیت نے اس کے اصل مقصد یعنی عمل کے ہر مرحلہ پر گورننگ کونسل کی بالادستی کی یقین دہانی کو پوشیدہ رکھا۔ سینئر شیعہ رہنما آیت اللہ سیستانی

نے اس کو مسترد کردیا اور ڈائرکٹ الیکشن کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے متنبہ کیا کہ تاخیر ایک عراقی انتفاضہ کو جنم دے سکتی ہے۔(38)

سیاسی ٹکراؤ کے اندیشے کے پیش نظر، بش انتظامیہ نے اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری سے درخواست کی کہ وہ عراق میں دوبارہ دخل دیں اور ایک ٹیم بھیجیں جو ملک میں الیکشن کے طریقوں کا اندازہ لگائے۔(39) براہیمی کی سرکردگی میں اقوام متحدہ کے مشن نے اپنی رپورٹ 23 فروری کو پیش کردی۔ رپورٹ نے ایک امید، خوف، تناؤ، بے اعتمادی کے ماحول کا ذکر کیا اور بہت بڑی بے روزگاری کے پس منظر کے مقابلہ میں سیاست کے عمل کے حوالے سے سیاستدانوں کا ٹکڑوں میں بٹنے کا بھی مشاہدہ کیا۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ 30 جون تک اقتدار کی منتقلی پر اتفاق رائے ہے اور یہ کہ 16 نومبر کی دستاویز میں مجوزہ سیاسی دھڑوں کے نظام کے لیے حمایت نہیں ہے۔ مزید یہ کہ 30 جون 2004 تک ایک عارضی حکومت کے قیام پر 'ڈائرکٹ الیکشن کے علاوہ کسی اور طریقہ سے، اتفاق رائے ہے۔ اس نے زور دیا کہ الیکشن کے عمل کی کامیابی اور اس میں اقوام متحدہ کی شرکت دونوں کے لیے سیکوریٹی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔(40)

براہیمی نے سیستانی کو سمجھایا کہ وہ فوری الیکشن کے ناقابل عمل ہونے کو قبول کریں (حالانکہ برطانوی حکومت نے مان لیا تھا کہ رائے دہندگان کی فہرست کے مسئلہ کو 'آئل فار فوڈ راشن لسٹ' کو استعمال کر کے سلجھایا جا سکتا ہے(41))۔ آخر میں اقوام متحدہ نے ایک بار پھر خود کو استعمال کر کے رد کیا ہوا پایا۔ 30 جون کے بعد عراقی عبوری حکومت کے انتخاب میں اس نے ثانوی کردار ادا کیا(42)۔ عیاض علوی کا انتخاب خود اس بات کی جانب واضح اشارہ تھا کہ امریکہ حاوی رہا کیونکہ یو ایس انٹیلیجنس سے علوی کے روابط اور 1996 کی ناکام بغاوت میں ان کے حصہ سے سب واقف تھے(43)۔

عبوری انتظامی قانون اور انتقال اقتدار

بالآخر 8 مارچ کو اس پر دستخط ہوئے اور عراق ایک عوامی، وفاقی، جمہوری اور تکثیری ریاست بن گیا۔ یہ ریاست کثیرالاقوامی اور دو زبانوں والی ریاست ہوگی۔ اسلام اس

کا سرکاری مذہب اور قانون سازی کا ماخذ ہوگا۔ اس میں زور دیا گیا کہ عراق کئی قوموں کا ملک ہے اور عراق کے عرب، عرب قوم کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ اس میں بنیادی حقوق پر ایک جامع باب شامل تھا۔ اس نے علاقائی اور وفاقی حکومت کی تفصیل بیان کیں، کرد علاقوں کی زمینی حقیقت پر توجہ کی اور بقیہ اختیارات کو علاقوں پر چھوڑ دیا۔ دفعہ 61(c) نے (شیعوں کی زبردست مخالفت کے باوجود) تین کرد صوبوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ ہر ایک میں دو تہائی اکثریت کے ساتھ دستور کو ایک ریفرینڈم میں مسترد کر سکتے ہیں۔ ٹی اے ایل (عبوری انتظامی قانون) کا سب سے متنازعہ حصہ سیکورٹی انتظامات سے متعلق تھا جو کہ گورننگ کونسل کے ساتھ افواج کی حیثیت پر معاہدہ میں گفت وشنید کی ناکامی کے بعد بنایا گیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر دفعہ 59 نے یہ باور کرایا کہ ''اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل قرارداد 1511 (2003) اور اس سے متعلق بعد میں آنے والی سلامتی کونسل کی کسی بھی قرارداد کی رو سے عراقی مسلح افواج عراق میں کام کرنے والی کثیر الاقوامی افواج کی متحدہ کمان میں بنیادی شریک کار ہوں گی۔'' اس قانون میں مذکور حقوق وفرائض جو اس معاہدہ کے تحت ہیں یا اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل قرارداد 1511 (2003) اور اس سے متعلق بعد میں آنے والی سلامتی کونسل کی کسی بھی قرداد جو کثیر الاقوامی افواج کی سرگرمیوں کو اس وقت تک کنٹرول کرے گی جب تک کہ یہ معاہدے نافذ نہیں ہو جاتے، کو کوئی چیز بدل نہیں سکتی۔ اس قانونی عمل اور اس کو نظریاتی قوت بخشنے میں اگلا قدم سلامتی کونسل کی 8 جون 2004 کی قرارداد 1546 تھی۔ اس قرارداد نے 30 جون کو کام سنبھالنے والی عارضی حکومت اور اس کے اور اتحادی افواج کے حفاظتی تعلقات جو یو ایس سکریٹری آف اسٹیٹ اور نامزد وزیراعظم علوی کے درمیان مراسلت کا نتیجہ تھے، دونوں کی تائید کی۔ قرارداد کے مطابق کثیر الاقوامی فوج کے اختیارات پر حکومت عراق کی درخواست پر یا بارہ مہینے گزرنے کے بعد نظرثانی کی جائے گی اور سیاسی عمل کی تکمیل (دسمبر 2005) پر یہ بھی ختم ہو جائے گی اپنے ووٹ کی وضاحت کرتے ہوئے کونسل میں الجزائری نمائندہ نے عراقی حکومت سے خواہش ظاہر کی کہ 'وہ ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرے جنھوں نے گزشتہ سال کے طریقہ پر کڑی تنقید کی تھی۔' روسی نمائندہ نے

ایک بین الاقوامی کانفرنس کی سفارش کی جس میں عراق کی ''تمام باثر طاقتیں، اس کے پڑوسی اور سلامتی کونسل کے اراکین شامل ہوں۔''(44)

عراقی عوامی تصور

جسمانی اور معاشی تحفظ، عزت، انصاف، حاکم تک رسائی اور محکوم کا اس کے ارادوں کا اندازہ لگانا وہ بنیادی عناصر تھے جو سی پی اے سے متعلق عوامی تاثرات میں کارفرما تھے۔ رائے شماری کرنے والی بیرونی ایجنسیوں بشمول یو ایس ٹوڈے اور سی این این نے عراق میں کی گئی رائے شماری کے ذریعہ مندرجہ بالا ہر عنصر میں منفی رجحان دکھایا۔(45) ابوغریب کے انکشافات اس سلوک کی مثال بن گئے جو عراقی عوام سے کیا جاتا تھا۔ عوامی آہ و بکا سے بہت پہلے، آئی سی آر سی کی ایک رپورٹ میں بیان کیا گیا کہ 'جسمانی اور نفسیاتی جبر و تشدد کے یہ طریقے فوجی انٹیلجنس ایک منظم طریقہ سے استعمال کرتی تھی، تاکہ اقبال جرم کرائے، اطلاعات حاصل کرے یا قیدیوں سے کسی اور قسم کا تعاون حاصل کرے۔''(46)

ایک امریکی دانشور جو سی پی اے میں اعلیٰ عہدہ پر فائز رہا ہے، کے مشاہدہ کے مطابق ''عدم تحفظ نے سیاسی قبضہ کو ایک مادی اور نفسیاتی پناہ گاہ میں دھکیل دیا۔''(47) یہ تبصرہ قبضہ کے شروع میں ہونے والی اس بغاوت کے مجموعی اثر کا احاطہ کرتا ہے جس کو جولائی 2003 میں گوریلا جنگ کا نام دیا گیا۔ یہ کلی طور سے غیر متوقع تھی۔ جس تیز رفتاری سے یہ آگے بڑھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل نقشہ سے ہوتا ہے۔(48)

مہینہ	اتحادی فوجوں پر ہونے والے حملوں کی تعداد
اگست 2003	470
ستمبر	1000
اکتوبر	1010
نومبر	740
دسمبر	510
جنوری 2004	435

فروری	410
مارچ	700
اپریل	1800
مئی	1900
جون	1550
جولائی	1600
اگست	2700

مارچ کے بعد تشدد کی رفتار میں اچانک تیزی کی وجہ فلوجہ اور مقتدی الصدر کو زیر کرنے کا فیصلہ تھا۔ یہ اب تک جاری ہے۔ 25 ستمبر تک یو ایس فوجیوں کی مہلوکین کی تعداد 1048 تک پہنچ گئی جب کہ 7290 فوجی زخمی تھے۔ ان میں سے اکثر تعداد رسمی طور سے جنگ بندی کے بعد کی مدت میں سے ہے۔ عراقی شہری مہلوکین کی تعداد 12927 سے 14981 تک، اور زخمیوں کی تعداد تقریباً 40000 تک بتائی جاتی ہے (49) لہٰذا عملی حلقوں میں اٹھائے جانے والے سوالات صریح اور واضح ہیں: آخر دشمن کون ہے؟ مختلف گروپ اور ذیلی گروپس جیسے شیعہ، سُنی، قوم پرست، بعث پارٹی کے بچے کھچے اراکین، عراقی فوج کے بقیہ سپاہی، مقامی اسلامسٹ، بیرونی اسلامسٹ کی کیا طاقت ہے اور ان کا کیا کردار ہے؟ ان کے مقاصد اور داؤ پیچ کیا ہیں؟ ان سب کے درمیان مذہبی پارٹیاں یا گروپس کیوں حاوی ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام گروپ (یو ایس کے مطابق ان کے اراکین کی تعداد بیس سے بائیس ہزار تک ہے) کثیرالاقوامی فوج کی موجودگی کو ناپسند کرتے ہیں اور قبضہ کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ قابض فوجوں پر حملہ کے لیے مارو اور بھاگو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے مختلف طریقے اپناتے ہیں جیسے کہ دور سے مار کرنے والا تنہا بندوقچی، سڑک کے کنارے کے بم اور گرینیڈ، ہلکے ہتھیاروں سے آراستہ پٹرول کرتے ہوئے فوجی پر حملہ، ڈیوٹی سے باہر فوجی پر حملہ، فوجی گاڑیوں پر گھات لگا کر حملہ،

اتحادی فوجوں سے وابستہ شہری اراکین پر حملہ، قابض فوجوں کے عراقی مددگاروں پر حملہ اور اہم بنیادی سہولتوں کو برباد کرنا۔ اس کے علاوہ جنوب میں کربلا اور نجف جیسے شہروں میں طویل اور گھمسان لڑائیاں ہوئیں اور وسطی عراق میں نام نہاد سنی مثلث میں بھی۔ بھاری جانی نقصان اور متعلقہ شہروں میں تباہی کے باوجود عراقی عوام ان لڑائیوں کو اپنی مزاحمتی صلاحیت کا ثبوت سمجھتے ہیں۔ ان سے یو ایس فوجی طاقت کی حدود بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔

1991 کی بغاوت کے بعد شیعوں پر مظالم کی تاریخ کی روشنی میں صدام حسین کے زوال پر منظم شیعی گروپس کا ردِعمل پہلے سے معلوم تھا۔ وہ محتاط اور عارضی انداز میں نئے نظام کی حمایت کر رہے تھے۔ ان کو یہ امید بھی تھی کہ جمہوری نظام میں ان کو وہ اکثریت اور اختیار حاصل ہوں گے جن سے انھیں اب تک محروم رکھا گیا تھا۔ اپریل 2003 کے آخر میں جب کربلا کے ایک زائر نے یہ کہا کہ ''ہم نے ابھی ایک آمر سے چھٹکارا پایا ہے۔ اب ہم اس کے بجائے دوسرا آمر نہیں چاہتے، ہم ایک منصفانہ حکومت چاہتے ہیں، نہ کہ وہ جو ہم پر تھوپی جائے۔'' تو اس نے اکثر لوگوں کی ترجمانی کی تھی۔ (50) نجف کے بزرگ مذہبی قائد روایت کو نبھاتے ہوئے سیاسی ہنگاموں سے الگ رہے۔ مذہبی قائدین کی سیڑھی کے نچلے حصہ سے نجف کے مقتدی الصدر اور بغداد کے محمد الفرطوسی نے اسلامی حکومت کے قیام کے بارے میں جرأت مندانہ بیانات دیے۔ اتحادی، عظیم آیت اللہ ابوالقاسم الخوئی کے بیٹے عبدالماجد الخوئی کو لندن سے نجف لائے تاکہ وہ معاملات پر اثر انداز ہو سکیں۔ 10 اپریل 2003 کو ان کے قتل نے معاملات کو مزید الجھا دیا۔ جولائی میں جب گورننگ کونسل کی تشکیل ہوئی تو دو شیعہ گروپ۔ ایس سی آئی آر آئی اور دعوی۔ اس میں شرکت کے لیے راضی ہو گئے۔ دوسری جانب سیستانی نے اپنی رائے کا اظہار اپنے بیٹے محمد رضا سیستانی کے ذریعہ کیا جنھوں نے 18 اپریل کو ''الحیات'' سے کہا کہ ان کے والد ہر بیرونی طاقت کو مسترد کرتے ہیں اور مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں۔ ''عراق عراقیوں کے لیے ہے۔ ان کو ہی عراق پر حکومت کرنا چاہیے۔ انھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسا کسی بیرونی طاقت کے تحت کریں۔'' (51) الیکشن کے انعقاد میں تاخیر پر برہمی کی وضاحت کو قبول کر لینے کے بعد

سیستانی نے 3 جون کو ایک فتویٰ جاری کیا اور اس اصول پر زور دیا کہ قانونی جواز کی حقدار صرف ایک منتخب حکومت ہے جو عراقی سماج کے تمام طبقوں اور سیاسی قوتوں کی مناسب نمائندگی کرتی ہو۔ انھوں نے یہ بھی اضافہ کیا کہ عارضی حکومت کو مزید معتبر بنانے کے لیے سیکوریٹی کونسل کی ایک قرارداد یہ واضح کرے کہ انتقال اقتدار سیاسی، معاشی، فوجی اور سلامتی سے متعلقہ امور میں ہر دباؤ سے آزاد ہے؛ اور حکومت ملک کے ہر حصہ میں سلامتی اور عوامی خدمات مہیا کرے۔''(52)

مقتدی الصدر مذہبی رہنماؤں کی سیڑھی میں نچلے حصہ پر تھے اور کم عمر بھی، انھوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر عراقی حب الوطنی کو پکارا اور غریب اور نوجوان دونوں سے مخاطب ہوئے۔ (53) انھوں نے عراق سے یو ایس کے فوری انخلا کا مطالبہ کیا اور عظیم آیت اللہ یا ایس سی آئی آر آئی اور دعویٰ کی طرح اپنے دامن کو سی پی اے سے کسی بالواسطہ یا بلاواسطہ تعاون سے داغدار نہیں کیا۔ سی پی اے کی ناتجربہ کاریوں نے مقتدی الصدر کو مواقع فراہم کیے کہ وہ اپنی شخصیت کی چھاپ عوام کے ذہن میں بٹھائیں اور لڑائی کے میدان میں ان کی مزاحمت نے اس کو مزید تقویت بخشی۔ 7 جون کو سی پی اے کے ایک قانون نے غیر قانونی فوجی تنظیموں کے اراکین پر اپنی تنظیم چھوڑنے کے تین سال بعد تک کسی بھی سیاسی عہدہ کو قبول کرنے پر پابندی لگا دی۔ (54) اس طرح سے مقتدی الیکشن کے عمل سے مؤثر طور سے باہر ہو گئے۔

سنّی علاقوں میں مزاحمت کے اسباب کئی مقاصد کے مرکب تھے۔ کچھ نے سچے دل سے صدام حسین کے زوال کا خیر مقدم کیا لیکن وہ قبضہ کو ناپسند کرتے تھے۔ اکثر ایسے تھے جو ترقی کے ان اثرات سے خائف تھے جو ملک کی طرز حکمرانی کی طاقت کی ساخت میں ایک بری فال لے کر آئے تھے۔ اس کے علاوہ شکست خوردہ و بکھری ہوئی فوج نے اپنے غم و غصہ کے اظہار کے لیے دیگر ذرائع ڈھونڈے۔ معاشی تنگی، بے روزگاری اور بہتر زندگی مہیا کرنے کا وعدہ پورا کرنے میں سی پی اے کی ناکامی جدوجہد اور مزاحمت کا بنیادی سبب بن گیا۔ عراقی قیدیوں سے ذلت آمیز برتاؤ نے صورت حال کو مزید سنجیدہ کر دیا۔ اس کے علاوہ نظریاتی اعتبار سے سماج کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، بے اقتدار بعثی اراکین، عرب نیشنلسٹ

اور اسلامسٹ کے مختلف مزاج رکھنے والے گروپ بھی تھے۔ آخرالذکر دو کا خیال تھا کہ یہ حملہ دراصل ایک بہت بڑے منصوبہ کا حصہ تھا جس میں قومی حیثیت سے عراق کی تباہی، اس کی تیل کی دولت کو ہتھیا لینا عرب اور مسلمانوں کی مجموعی نفسیات پر گہرا اور کاری زخم لگانا، فلسطین کی آخری تباہی کے لیے راستہ ہموار کرنا اور پورے خطہ کو اسرائیل کی بالادستی میں دے دینا شامل ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے ردّعمل کی مختلف صورتیں پیدا کیں جن کی وسعت ناراضگی، غم وغصہ، مزاحمت کاروں سے ہمدردی اور حمایت سے لے کر مزاحمت میں فعال حصہ داری تک ہے۔ یو ایس افسروں کے دعووں کے برعکس مزاحمت کاروں کے گروپ میں بیرونی افراد کی شمولیت نہ ہونے کے برابر تھی۔(55)

شیعہ مزاحمت کی طرح سنّی مزاحمت میں بھی اسلامسٹ عناصر کی موجودگی قابل ذکر ہے جیسا کہ فلوجہ معاملہ سے ثابت ہوتا ہے۔ فلوجہ کے ایک باشندے نے کہا کہ ''پورا شہر اس جہاد کی حمایت کرتا ہے۔ فلوجہ کے لوگ اپنے گھروں کے دفاع کے لیے لڑ رہے ہیں، ہم مسلم مجاہدین ہیں جو ایک جہاد کر رہے ہیں'' (56)۔ کمیونٹی کی سرگرمیوں میں مسجد کا ہمیشہ مرکزی رول رہا ہے۔ اب وہ فعّالی طور سے بھی منسلک ہوگئی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مشقت و مصائب کے زمانہ میں لوگوں کا رجحان مذہب میں سکون اور پناہ ڈھونڈنے کا ہوتا ہے۔ دوسرا سبب وہ مشقتیں اور تکلیفیں ہیں جو پہلی خلیجی جنگ کے بعد بندشوں اور پابندیوں کے زمانے میں جھیلی گئی تھیں۔ صدام حسین کی حکومت نے اپنی قانونی جواز کی مضبوطی کے لیے تجدید اسلام کی کچھ تحریکوں کو بہت محتاط ہو کر آگے بڑھایا(57)۔ عراقی جھنڈے میں کلمہ شہادت کی شمولیت اس کی بہترین مثال ہے اور سنجیدہ کوششوں کے باوجود عراق کے جھنڈے کو بدلنے میں گورننگ کونسل اور سی پی اے کی ناکامی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جذبات کہاں تک بااثر ہو سکتے ہیں۔

عراقی سیاست جو اکثر اپنے خارجی الجھاؤ اور پیچیدگیوں سے بوجھل رہتی ہے، میں عراقی کردوں کی علاقائی خودمختاری اور عراق کے اقتدار کے ڈھانچہ میں ان کا مناسب حصہ بحث و مباحثہ کا ایک مستقل موضوع ہے۔ بعث حکومت نے وعدے کیے اور ان کو توڑا،

اور کردوں کے ساتھ سختی سے پیش آئی۔ اس پس منظر میں جب 'سیف ہیون' اور 'پرووائڈ کمفرٹ'، آپریشن چلائے گئے تو عراق کی زمینی سالمیت کے بارے میں خدشات ابھر کر سامنے آئے۔ بارہ سال تک شمالی عراق کے تینوں کرد صوبوں کی صورت حال معلق رہی۔ وہ ریاست عراق کا حصہ بھی تھے اور مرکزی حکومت کی عملداری سے باہر بھی۔ دونوں کرد پارٹیوں ڈی پی اور پی یو کے جن کے قائد بالترتیب سعود برازانی اور جلال طلبانی تھے، کے درمیان مقامی کنٹرول کے لیے مقابلہ رہتا تھا۔ اکتوبر 1991 میں دونوں پارٹیاں کردستان فرنٹ (کے ایف)، جو دراصل 1988 سے وجود میں تھا، کے شامیانے کے نیچے متحد ہوگئیں تاکہ حقیقی کرد احاطہ کے لیے جو وجود میں آچکا تھا کے لیے انتظامی ڈھانچہ بنائیں اور ایک علاقائی پارلیمنٹ کے الیکشن کی تیاری کریں۔ یہ مئی 1992 میں ہوئے اور اس میں کے ڈی پی نے 50.8 جب کہ پی یو کے نے 49.2 فیصد ووٹ حاصل کیے۔ ایک اگلے الیکشن میں جو کرد تحریک کے واحد رہنما کے لیے منعقد کیا گیا برازانی نے 47.5 اور طلبانی نے 44.9 فیصد ووٹ حاصل کیے۔ کسی بھی طرف سے اس نئے سانچہ کو رسمی طور سے قبول کرنے کے لیے کوئی پیش کش نہیں کی گئی(58)۔

لہٰذا حملہ کے بعد کرد ذہن میں اقتدار کی تقسیم کی صورت کا سوال سب سے زیادہ چبھتا تھا۔ دونوں ہی کرد گروپ سی پی اے کی قائم کردہ گورننگ کونسل میں نمائندہ تھے۔ 9 جولائی 2003 کو نیویارک ٹائمز میں برازانی اور طلبانی نے مشترکہ طور پر جدید عراق کے بارے میں اپنے تصورات پیش کیے۔ ''مناسب مقامی خودمختاری اور ایک وفاقی مرکزی مقتدرِ اعلیٰ کے ساتھ ایک وفاقی طرز حکومت'' انھوں نے کردوں کے جمہوریت کے تجربہ کو پورے عراق کے لیے ایک نمونہ کے طور پر پیش کیا۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ تجویز تھی کہ 'کردوں کو وہ تمام رقومات ادا کی جائیں جو اقوام متحدہ نے ان کو آئل فار فوڈ پروگرام کے تحت (تقریباً 4 بلین یو ایس ڈالرز) دی ہیں' رقم نہ ادا کرنے کا مطلب ہے کہ انصاف کے ایک نازک مسئلہ پر غور نہیں کیا گیا اور نسلی عصبیت کی ان دہائیوں میں واپس چلے جانا ہے جس نے عراقی کردستان سے لاکھوں لوگوں کو جبراً بے گھر کیا۔' کچھ عرصہ بعد انھوں نے کرد ملیشیا کو

خدمت سے سبکدوش کرنے اور اس کو نئی عراقی افواج میں ضم کرنے کی تجویز کو ٹھکرا دیا بہر حال صورت حال کو جوں کا توں رکھنے کا کرد مطالبہ واپس لے لیا گیا جب مارچ 2004 میں سی پی اے نے عبوری انتظامی قانون کو طبع کیا۔(59) کرد منظرنامہ کے ایک امریکی مبصر نے زمینی حقیقت کی تلخیص اس طرح کی: ''کردستان میں کوئی عراقی ٹیکس عائد نہیں ہوتا رہا ہے، کردستان کی راجدھانی میں عراقی علم کہیں بھی نہیں لہراتا اور کردستان خود اپنی بین الاقوامی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کردستان میں الیکشن اکثر کردوں کی قوم پرستانہ حیثیت کو مضبوط کرے گا اور مرکزی حکومت کو مراعات دینے کی امید بھی کم ہے۔ اور کچھ کرد رہنماؤں نے امریکنوں کو متنبہ کردیا ہے کہ اگر الیکشن کے بعد والی مرکزی حکومت نے ان مراعات سے زیادہ پراصرار کیا جو ان کو ٹی اے ایل کے تحت حاصل تھیں تو کردستان الگ ہوجائے گا۔''(60) عراق اور وسیع تر عرب دنیا میں اکثر لوگوں کو یہ اندیشہ ہے کہ ایسا کوئی واقعہ اس بڑے منصوبہ کا حصہ ہوگا جس کے تحت مغربی ایشیا کی عرب مملکتوں کی سرحدوں کو از سر نو کھینچنا ہے۔ کرد علاقہ میں اسرائیلی سرگرمیوں کی اطلاع بھی ملی ہیں (61)۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کے ایک گوشہ سے کردوں کو ایک سخت اور فوری تنبیہ کی گئی ہے: ''امریکی جلد ہی عراق سے چلے جائیں گے۔ اس میں کسی شبہ کی ضرورت نہیں۔ اور وہ تم کو عراق کے مسلمانوں کے لازمی انتظام کے رحم و کرم پر چھوڑ جائیں گے۔ عراق کے مسلمانوں کے خلاف تمھارا یو ایس سے اتحاد، بلکہ اس سے بھی زیادہ واہیات تمھارا اسرائیل کے ساتھ سنگھٹن، عالم اسلام کی نفرت اور حقارت کو کئی نسلوں تک دعوت دیتا رہے گا۔ تمھاری صورت حال کسی امید کے لائق نہیں ہے۔ تمھارے پاس آخری راستہ یہی ہے کہ تم اپنے رہنماؤں سے بغاوت کرو اور خود امریکہ کی مخالفت میں بقیہ عراق کے ساتھ رہو۔ لیکن یہ امریکنوں کے انخلا کے پروگرام کے مصروف ہونے سے پہلے ہونا چاہیے۔ ورنہ تمھاری وفاداری کی تبدیلی کی کوئی قیمت نہ ہوگی اور یہ تمھاری حفاظت نہیں کر پائے گی...تم کو خبردار کیا جاچکا ہے۔''(62)

عراق کی صورت حال کو آخر پھر کس طرح سے پرکھا جائے؟ خود یونائیٹڈ اسٹیٹس میں کچھ عرصہ سے خود احتسابی کا عمل جاری ہے اور عراقی مہم کے محرکات، مبینہ مقاصد،

حکمتِ عملی اور طریقہ کار پر نظر ڈالی جارہی ہے۔ یہ احتساب جس کا دائرہ اخباروں کی رپورٹوں سے کیمونٹی کے اہم تجزیوں تک پھیلا ہوا ہے پچھلے کئی مہینوں سے، انتقال اقتدار سے پہلے اور اس کے بعد، یکساں طور پر منفی رہا ہے۔ اس بات کا واضح اشارہ اس انکشاف سے ملتا ہے کہ عراق میں کام کرنے والے بین الاقوامی ٹھیکیداروں کی حفاظت پر پروجیکٹ کے لیے دستیاب فنڈ کا بیس سے پچیس فیصد حصہ خرچ ہوجاتا ہے۔(63) ایک تجزیہ نگار نے کہا کہ ''ضرورت ایک نئی حکمت عملی کی ہے جو یو ایس کے مقاصد و مفادات کی کٹر سوچ پر مبنی ہو۔ اس کا مطلب عراقی جمہوریت کے خواب سے باہر نکلنا اور عراقی تاریخ و سیاست اور علاقائی رقابتوں کے دہشت ناک منظر میں داخل ہونا ہے۔ اس طرح سیاسی حل کی تلاش پر ان تھک توجہ مطلوب ہوگی۔ اس نئی حکمت عملی کو جاری رکھنے کے لیے ہمیں جو سیاسی حمایت درکار ہوئی اس کے لیے ہمیں فوجوں کی واپسی کی ایک یقینی تاریخ مقرر کرنا ہوگی جو شاید دو سال ہو۔ اگر ہماری کوشش اس سے کچھ کم ہوتی ہے تو 'نتائج سے بے پروا' امریکی افواج کی جلد واپسی کا مطالبہ بڑی شدت سے ابھرے گا جس کو روکنا ممکن نہ ہوگا'' اور اس وقفہ کے دوران کوشش ان پہلوؤں تک محدود رہنی چاہئیں: (a) صوبہ جاتی الیکشن کا انعقاد اور پھر تناسب کے اعتبار سے نمائندگی کے اصول پر وفاقی پارلیمنٹ میں صوبوں کی نمائندگی ہو (b) یو ایس کی مدد کے ساتھ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت (c) فوجی بوجھ میں حصہ داری لیکن ایک یو ایس کمانڈر کے تحت اور (d) غیر دخل اندازی کے وعدوں کے حصول کے لیے علاقائی کانفرنس کا انعقاد اور اس کانفرنس میں امریکی افواج کے انخلا کے ٹائم ٹیبل کا اعلان(64)۔ ایک اور تجزیہ نگار نے بنیادی حکمت عملی کی قدر و قیمت کا اندازہ یوں لگایا: ''موجودہ پالیسی کی تصدیق جھوٹ سے ہوتی ہے، یکطرفہ ہٹ دھری سے آگے بڑھتی ہے، خودفریبی کی پٹی آنکھوں پر بندھی ہے اور اذیت پسندانہ زیادتیوں سے رنگین ہے۔ ان کی اصلاح چند جلد باز تحقیقی اقدامات سے نہیں ہوسکتی۔ اس کا علاج، نوعیت کے اعتبار سے بین الاقوامی کردار، مادی اعتبار سے فوجی کے بجائے سیاسی اور وسعت میں علاقائی نہ کہ صرف عراقی ہونا چاہیے۔'' اس میں اپریل 2005 کو عراق میں یو ایس افواج کی موجودگی کے اختتام کی تجویز بھی رکھی گئی اور مزید کہا کہ ''بغیر

اسرائیلی فلسطینی امن کی کوششوں میں قابل ذکر پیش قدمی کے، قبضہ کے بعد والا عراق امریکہ اور اسرائیلی مخالف ہوگا۔(65) انتقال اقتدار سے دو ہفتہ قبل بی بی سی کے ایک تبصرہ میں کہا گیا کہ اگر 30 جون تک عراقی حفاظتی افواج کو استعمال کرنے کی پالیسی خاطر خواہ نتائج بہم نہیں پہنچاتی، تو پھر توجہ ان حالات کی طرف کرنی ہوگی جن میں اوّل تو فوج کی تعداد کم کی جائے اور پھر شاید واپس بلا لیا جائے۔''(66) ایک وسیع تناظر میں عراق کے ایک ماہر تعلیم کا خیال تھا کہ ''اپریل کی عراقی بغاوت دراصل عراقی قوم پرستی کے دوبارہ ابھرنے کی علامت ہے۔''(67)

30 جون کے بعد سے حفاظتی صورت حال ابتر ہوتی رہی اور ستمبر میں اس کے متعلق یو ایس میڈیا میں رپورٹس آنے لگیں۔ 15 ستمبر کے ٹائمز اور 19 ستمبر کے نیوز ویک میگزین کے شماروں میں پھیلتی ہوئی بغاوت کی تفصیلات شائع ہوئیں۔ سینیٹ فارن ریلیشنز کمیٹی کے اراکین نے بھی ایسے ہی شکوک کا اظہار کیا(68)۔ اس کے بعد پاول اور رمسفیلڈ کا بیان آیا جس میں اوّل الذکر نے سلامتی کی گرتی ہوئی صورت حال کا اقرار کیا اور مؤخر نے اشارہ دیا کہ عراق میں امن کے قیام سے قبل فوجوں کا انخلا ہوسکتا ہے(69) جب ستمبر میں علوی نے واشنگٹن کا دورہ کیا تو میڈیا نے خبر دی کہ عراق کے انتخابی عمل کو تیز تر کرنے اور الگ ہوجانے والے مخالفین کو الیکشن میں حصہ لینے کی ترغیب دینے کے لیے امریکی تجویز ہے کہ عراق کے پڑوسیوں، جی۔8 ممبرز اور سلامتی کونسل کے مستقل اراکین کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جائے(70) اس کے ردّعمل میں سب سے پہلے فرانس کے وزیر خارجہ مائیکل برنیر نے کہا کہ اگر ایجنڈے میں یو ایس افواج کا انخلا اور عراقی مخالف گروپوں کی شرکت شامل ہے تو ان کی حکومت اس کانفرنس میں حصہ لے گی(71)۔ لیکن مقام اور وقت کے بارے میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور عراق چاہتے تھے کہ کانفرنس جلد سے جلد قاہرہ یا عمان میں ہو، فرانس نے مقام کے اعتبار سے اقوام متحدہ کو ترجیح دی، مصر کا خیال تھا کہ میٹنگ رمضان کے بعد ہونی چاہیے (وسط نومبر اور یہ اتفاق نہیں ہے کہ یو ایس الیکشن کے بعد)، اردن کا نقطہ نظر تھا کہ اس وقت الیکشن ہونے سے ''صرف انتہا پسندوں کو فائدہ ہوگا۔''(72)

عراق پر جنگ نے عالمی نظام اور بین الاقوامی کمیونٹی کے طرز عمل کے بارے میں بنیادی سوالات اٹھائے۔ اس نے پیش بینی پر مبنی جنگوں، یکطرفہ کارروائیوں اور حکومت کی تبدیلی جیسے تصورات کو عمل میں لانے کے لیے کیا۔ لیکن اس سے پہلے ایک نیا نظریہ ابھرا جو طاقت کی تاثیر، طاقت کی اخلاقیات اور طاقت کی تمنا سے متعلق تھا تاکہ امریکی گولیور کو چھوٹ دے دی جائے (73)۔ کوشش یہ تھی کہ بالادستی سے (جو کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کے پاس پہلے ہی سے تھی) اولیت یا غلبہ (جس کی تعریف ہیڈلے بُل نے اس طرح کی ہے: بغیر کسی طاقت کے استعمال یا طاقت کے استعمال کی دھمکی اور اقتدار اعلیٰ مساوات اور آزادی کی عام لاپرواہی کی برابر نظر اندازی کے ساتھ غلبہ حاصل کرلینا) کی طرف کوچ کیا جائے۔ لیکن کچھ اس سے زیادہ قابل غور محرکات کو عوامی طور سے ظاہر نہیں کیا گیا۔ عراق خلیج فارس اور بحرابیض کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ ایک لچکدار اور اثر پذیر حکومت اور فوجی اڈوں (جن کی تعمیر قبضہ کے فوراً بعد شروع ہوگئی تھی اور ابھی جاری ہے) کی مدد سے عراق پر کنٹرول اس خطہ کی دیگر ریاستوں کو مجبور کرے گا کہ وہ نئی صورت حال کے پیش نظر اپنے مفادات پر نظرثانی کریں۔ تیل اور اسرائیل اضافی ترغیبات تھیں جو جغرافیائی سیاسی تناظر میں دو گھوڑوں کی گاڑی کی طرح تھی (74)۔ مسلم دنیا پر ایسے غلبہ کا اثر اسی ترتیب سے ہوگا۔ جنگ سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ ''مشرق وسطیٰ میں امن کا راستہ بغداد سے ہوکر گزرتا ہے۔'' عراق کو زیر کرنے سے فلسطینی مسئلہ یو ایس اسرائیلی شرائط پر طے ہوگا۔ ایسے پروگرام کے ہوتے ہوئے بین الاقوامی اور عالمی اداروں اور قوانین کی زبانی خدمت کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دھمکیاں دینے، معیار مقرر کرنے، طاقت استعمال کرنے اور غیر مستحقین کو انصاف دلانے کی ذمہ داری امریکہ کی خودسری نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔'' (75)

لیکن یہ ساری تدبیریں ایک عظیم آیت اللہ کی ضد اور سیکولر اور اسلامسٹ عراقیوں کی وطن پرستی کے جوش کے سامنے الٹی ہوگئیں۔ ان میں وہ دونوں فرقے شامل تھے جن کے درمیان کی خلیج کبھی پاٹی نہیں جاسکتی تھی۔ انھوں نے حملہ آوروں کی مزاحمت اور ہراساں کرنے کے نئے طریقے ایجاد کیے۔ ایک عراقی مزاحمت موجود ہے اور اس کا جغرافیائی پھیلاؤ

بتاتا ہے کہ اس کو وہ عوامی حمایت حاصل ہو جائے گی جس کی اسے ضرورت ہے'' (76) نتیجہ کے طور پر باہر نکلنے کی حکمت عملی کی گفتگو فضا میں ہے اور کم سے کم ایک مبصر نے یہ مشورہ دیا ہے کہ صرف ڈیگال آپشن ہی واحد راستہ ہے'' (77)

جنگ نے اقوام متحدہ کی ساکھ کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ عراق پر بین الاقوامی رائے میں کٹاؤ پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اور 1998 تک سامنے آ گیا تھا۔ یکطرفہ اور پیش بینی پر مبنی محرک کی کھوج میں مارچ 2003 میں سیکورٹی کونسل کی حاکمیت انتہائی سنگینی اور حقارت سے مجروح ہوئی۔ دو مہینہ بعد اسی کونسل کو خلاف ورزی اور اس کے نتائج کو قانونی جواز اور تائید فراہم کرنا پڑی۔ سلامتی کونسل کی آئندہ تمام قراردادوں کی بنیاد اسی ابتدائی قانونی جواز پر مبنی ہے اتحادی اقوام متحدہ کو اپنے مقاصد کے لیے بغیر کسی جوابدہی کی ذمہ داری کے استعمال کرتے رہے۔

ایک برطانوی افسر ٹی ای لارنس نے 27 اگست 1920 کے ایک مراسلہ میں 'سنڈے ٹائمز' کو لکھا تھا:

> میسوپٹامیا (عراق) میں انگلستان کے لوگ ایک ایسے جال میں پھنس گئے ہیں جس سے عزت و وقار کے ساتھ نکلنا مشکل ہوگا۔ وہ ایک مسلسل اطلاعات کی پوشیدگی کے جال میں آ گئے۔ بغداد اعلامیے نامکمل، غیر مخلص اور بعد از وقت ہیں۔ حالات اس سے زیادہ خراب ہیں جتنا ہم کو بتایا گیا تھا۔ ہماری انتظامیہ اس سے زیادہ خونی اور نااہل ہے جتنا عوام جانتی ہے۔ یہ ہمارے شاہی ریکارڈ پر ایک دھبہ ہے جو جلد ہی اتنا بھڑک سکتا ہے کہ عموی علاج سے ٹھیک نہیں ہو سکے گا۔ آج ہم تباہی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔
>
> ہم نے کہا کہ ہم میسوپٹامیا ترکی کو شکست دینے آئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہمارا قیام عربوں کو ترکی حکومت کے ظلم سے

> نجات دلانے اور اس کے مکا اور تیل کے ذخائر کو دنیا کے لیے
> دستیاب کرنے کے لیے ہے... ہماری حکومت پرانی ترکی
> حکومت سے بدتر ہے۔ اس بغاوت میں ہم ایک ہزار چار سو
> عرب موسم گرما میں قتل کر چکے ہیں... ہم اس اوسط کو برقرار
> رکھنے کی امید نہیں رکھ سکتے۔

چوراسی سال بعد 2004 میں ایک باریک بین مشاہد اسی خلاصہ کے نزدیک پہنچا:

> عراق ایک بہت تکلیف دہ بیداری ثابت ہوا۔ بڑھتی ہوئی
> عراقی مزاحمت نے مغرب کو نوآبادیاتی مخالف زمانہ کا بھولا ہوا
> سبق یاد دلا دیا ہے کہ مختلف نسل اور ثقافت کے لوگ کسی اجنبی
> حکمراں جو دنیا کے دوسرے حصہ سے تعلق رکھتا ہو، کی رعایا
> بننے کو تیار نہیں ہیں۔ فی الوقت امریکی اور برطانوی افواج کے
> مجرمانہ برتاؤ کے بڑے انکشاف اس امر کی دل دوز عکاسی ہے
> کہ 'مغربی اخلاقی خوبی' مغربی کہانی کا محض ایک عنصر ہے۔

پال بریمر نے جس کام کا تذکرہ بڑی خوش فہمیوں کے ساتھ کیا تھا وہ نزاع کے پیچھے بھاگنے والی ذمہ داری نکلی:

> انسانی ذہن کئی منصوبے بناتا ہے۔
> لیکن صرف مالک ومختار کی مرضی ہے جو چلتی ہے۔
> (امثال 19:21)

حواشی

1- شدید، انھونی واشنگٹن پوسٹ، 1 جولائی 2003

2- عراق میں عرب قوم پرستوں نے ان انتظامات پر اعتراض کیا اور 1930 کی دہائی میں اس معاملہ پر جرمنی سے مدد کے طالب ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کی شروعات کے بعد غیر جانب داری کے اعلان اور محوری طاقتوں کی عربوں کی حمایت میں ایک قرارداد کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ یروشلم کے مفتی نے 20 جنوری 1941 کو ہٹلر کے نام ایک خط میں برطانیہ پر الزام لگایا کہ اس کا منصوبہ ہے کہ وہ عراق میں برطانوی ہند سے لاکھوں ہندو لا کر بسا دے۔ اس مراسلہ کا متن ماجد خدوری کی کتاب ''انڈی پنڈنٹ عراق 1958-1932: اے اسٹڈی ان عراقی پالیٹکس'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن 1960) تتمہ 4، صفحات 80-378، خفیہ گفت و شنید کی تفصیلات کے لیے دیکھیے صفحات 92-179

3- بطاطو ہنا۔ ''دی اولڈ سوشل کلاسز اینڈ دی ریولوشنری موومنٹس آف عراق'' (پرنسٹن یونیورسٹی پریس، پرنسٹن، نیو جرسی، 1978) صفحات 986-985، نے کچھ پس و پیش کے ساتھ اس کو تسلیم کیا۔ آنے والے امریکی بیانات زیادہ واضح اور حتمی ہیں۔

4- ایف سی او 17/871، برطانوی سفارت خانہ بغداد کا 20 جنوری 1969 کا

مراسلہ۔ ''دی صدام حسین سورس بک'' ڈوکومنٹ نمبر 2، نیشنل سیکورٹی آرکائیو، واشنگٹن۔ http://www.govt.edu/nsarchiv/special/Iraq/ index.html

5- طبی بسام، ''عرب نیشنلزم: بٹوین اسلام اینڈ دی نیشن اسٹیٹ'' (تیسرا ایڈیشن، سینٹ مارٹنز پریس، نیویارک، 1997) صفحہ 216

6- پاسر، مائیکل اے، ''گارجینز آف دی گلف: اے ہسٹری آف امریکاز ایکسپینڈنگ رول ان دی پرشین گلف'' (میکملن نیویارک 1992) صفحات 3-101

7- گراہم براؤن، سارہ: ''سینکشننگ صدام: دی پالیٹکس آف انٹروینشن ان عراق'' (آئی بی ٹوریس، لندن، 1999) صفحہ 2

8- بکش، شال۔ ''دی رین آف آیت اللہ: ایران اینڈ دی اسلامک ریوولوشن'' (آئی بی ٹوریس، نیویارک 1984) صفحہ 4

9- گراہم براؤن۔ حوالہ بالا صفحہ 2، گورڈن مائیکل اور ٹریز ہرنارڈز سی کی کتاب ''دی جنرلز وار'' (لٹل براؤن اینڈ کمپنی، 1995) صفحہ 8 سے اقتباس۔

10- رولیو، ایرک 'یوروپین یونین اینڈ فرنچ ویوز آف دی اسلامک ری پبلک'۔ ایرک ہوگ لنڈ (ایڈٹ) ''ٹوئنٹی ایرس آف اسلامک ریوولوشن'' (سائرا کیوز یونیورسٹی پریس، سائرا کیوز، نیویارک 2002) صفحہ 147 اور شوبین ایس اینڈ ٹرپ سی ''ایران اینڈ عراق ایٹ وار'' (آئی بی ٹوریس، لندن 1989) صفحہ 154

11- حوالہ سابق صفحہ 194

12- حوالہ سابق صفحہ 214

13- گراہم براؤن، حوالہ بالا صفحہ 5

14- حوالہ سابق، صفحہ 8

15- کوک برن اینڈریو، اینڈ کوک برن پیٹرک، ''آؤٹ آف دی ایشز: دی ریسرکشن آف صدام حسین'' (ہارپر کولنس، نیویارک، 1999)، صفحات 30-14

16- خالد بن سلطان: ''ڈیزرٹ وار: اے پرسنل ویو آف دی گلف وار بائی دی جوائنٹ فورسز کمانڈر'' (لینسر، نئی دہلی 1997) صفحہ 439

17- کوک برن اینڈ کوک برن، حوالہ بالا صفحہ 31 اور گراہم براؤن حوالہ بالا صفحہ 64

18- گراہم براؤن حوالہ بالا، صفحات 30-25

19- کوک برن اینڈ کوک برن، حوالہ بالا، صفحہ 230

20- مارچ 1997 میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں عراق پر تقریر

21- گراہم براؤن حوالہ بالا، صفحہ 65

22- حوالہ سابق، صفحات 43-219

23- 'عراق سینکشنز: ہیومنی ٹیرین اپلی کیشنز اینڈ آپشنز فار دی فیوچر'۔ 6 اگست 2002۔ http://www.globalpolicy.org/security/sanctions/iraq1/2002/paper.html

24- بی بی سی کو انٹرویو 16 ستمبر 2004

25- زوی باریئل، 28 اپریل 2003 کے 'ہاریٹز' میں

26- http://www.cooperativeresearch.org/evitity

27- 'چیرز اپ ڈیٹ ٹو دی رپورٹ آف این انڈیپنڈنٹ ٹاسک فورس آن پوسٹ کانفلکٹ عراق اسپونسرڈ بائی دی کونسل آن فارن ریلیشنز'۔ 25 جون 2003

28- 'عراقز پوسٹ کانفلکٹ ری کنسٹرکشن: اے فیلڈ ریویو اینڈ ریکمنڈیشنز'۔ 17 جولائی 2003

29- تلوار، پیٹ اینڈ پیرالیسٹی، اینڈریو 'رپورٹ فار سینٹرز لوگرانیڈ بائیڈن، سینٹ فارن ریلیشنز کمیٹی'۔ 30 جولائی 2003

30- مرے، اینڈریو، 'دی گارجین'۔ 1 جولائی 2003

31- آئی سی جی، 'بغداد: اے ریس اگینسٹ ٹائم' 11 جون 2003، صفحہ 17

32- جہاد الخازن 'الحیات'۔ 1 نومبر 2003

33- گلب، لیزل ایچ: 'وہاٹ کمزنیکسٹ؟' دی وال اسٹریٹ جرنل، 20 مئی 2004

34- بروکنگ انسٹی ٹیوشن، واشنگٹن۔ عراق انڈکس، 18 اگست 2004، صفحات 20-26، جون 2004 میں سی ایس آئی ایس کے پروفیسر اے کارڈ زمین کے اندازہ کے مطابق اصل ترقی سی پی اے کی سرکاری رپورٹ کے ''اسپن'' سے ممتاز ہے: ''امداد کے 18.4 بلین ڈالر میں سے گیارہ بلین ڈالر کو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، 7.6 بلین کا وعدہ کیا گیا ہے، 4.8 کو لازمی قرار دیا گیا اور تمام کا تمام 333 ملین ڈالر حقیقت میں خرچ کیا گیا۔'' سوزین گولڈن برگ بھی اسی نتیجہ پر پہنچی کہ امریکہ کی بلین ڈالر امداد میں سے عراق کو بس ایک جز ہی ملتا ہے۔ 'دی گارجین'۔ 5 جولائی 2004

35- ڈریژن، یو جی جے، اینڈ کوپر کرسٹوفر۔ 'بیہائنڈ دی سین' یو ایس ٹائکس گرپ آن عراقز فیوچر،' دی وال اسٹریٹ' 13 مئی 2004

36- شلبی احمد، 'دی ویو فرام عراق'۔ واشنگٹن پوسٹ، 1 ستمبر 2003

37- کلوور چارلس، 'عراق کونسل ممبروپش یو ایس آن گرانٹس'۔ فنانشیل ٹائمز، 1 اکتوبر 2003

38- 'دیر اسپیگیل' کو انٹرویو۔ 20 فروری 2004

39- کیش مین، جان ایچ: 'بریمر ول پریس یو این آن لارجر رول' ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون'' 16 جنوری 2004۔ رائٹ رابن اینڈ ولیمز ڈینیل، 'یو ایس اسکریمبلز ٹو سالویج ٹرانزیشن''۔ واشنگٹن پوسٹ'' 16 جنوری 2004، سیولینو ایلین اینڈ ہوج وارن ''یو این ٹو سینڈ ٹیم ٹو عراق ٹو اسیس ٹرانسفر آف پاور'' انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون، 28 جنوری 2004

40- پیراگراف 8، 10، 47 اور (7)50، براہیمی رپورٹ۔ سیکوریٹی کونسل کے صدر کے نام 23 فروری 2004 کا اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری کے خط سے ملحق۔

41- لارڈر ہنسارڈ۔ لارڈ گریوز کے سوال کا بیرونیس سائمنس کا تحریری جواب۔

16- خالد بن سلطان: ''ڈیزرٹ وار: اے پرسنل ویو آف دی گلف وار بائی دی جوائنٹ فورسز کمانڈر'' (لینسر، نئی دہلی 1997) صفحہ 439

17- کوک برن اینڈ کوک برن، حوالہ بالا صفحہ 31 اور گراہم براؤن حوالہ بالا صفحہ 64

18- گراہم براؤن حوالہ بالا، صفحات 30-25

19- کوک برن اینڈ کوک برن، حوالہ بالا، صفحہ 230

20- مارچ 1997 میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی میں عراق پر تقریر

21- گراہم براؤن حوالہ بالا، صفحہ 65

22- حوالہ سابق، صفحات 43-219

23- 'عراق سینکشنز: ہیومینی ٹیرین اپلی کیشنز اینڈ آپشنز فار دی فیوچر'۔ 6 اگست 2002۔ http://www.globalpolicy.org/security/sanctions/iraq1/2002/paper.html

24- بی بی سی کو انٹرویو 16 ستمبر 2004

25- زوی باریئل، 28 اپریل 2003 کے 'ہاریٹز' میں

26- http://www.cooperativeresearch.org/evitity

27- 'چیرز اپ ڈیٹ ٹو دی رپورٹ آف این انڈیپنڈنٹ ٹاسک فورس آن پوسٹ کانفلکٹ عراق اسپونسرڈ بائی دی کونسل آن فارن ریلیشنز'۔ 25 جون 2003

28- 'عراقز پوسٹ کانفلکٹ ری کنسٹرکشن: اے فیلڈ ریویو اینڈ ریکمنڈیشنز'۔ 17 جولائی 2003

29- تلوار، پنیت اینڈ پیرالیسٹی، اینڈریو 'رپورٹ فار سینٹرز لوگر اینڈ بائیڈن، سینٹ فارن ریلیشنز کمیٹی'۔ 30 جولائی 2003

30- مرے، اینڈریو، 'دی گارجین'۔ 1 جولائی 2003

31- آئی سی جی، 'بغداد: اے ریس اگینسٹ ٹائم' 11 جون 2003، صفحہ 17

32- جہاد الخازن 'الحیات'۔ 1 نومبر 2003

33- گلب، لیزل ایچ، 'وہاٹ کنز نیکسٹ؟' دی وال اسٹریٹ جرنل، 20 مئی 2004

34- بروکنگ انسٹی ٹیوشن، واشنگٹن۔ عراق انڈکس، 18 اگست 2004، صفحات 20-26، جون 2004 میں سی ایس آئی ایس کے پروفیسر اے کارڈ زمین کے اندازہ کے مطابق اصل ترقی سی پی اے کی سرکاری رپورٹ کے ''اسپن'' سے ممتاز ہے: ''امداد کے 18.4 بلین ڈالر میں سے گیارہ ملین ڈالر کو حصوں میں تقسیم کردیا ہے، 7.6 بلین کا وعدہ کیا گیا ہے، 4.8 کو لازمی قرار دیا گیا اور تمام کا تمام 333 ملین ڈالر حقیقت میں خرچ کیا گیا۔'' سوزین گولڈن برگ بھی اسی نتیجہ پر پہنچی کہ امریکہ کی بلین ڈالر امداد میں سے عراق کو بس ایک جز ہی ملتا ہے۔'دی گارجین'۔ 5 جولائی 2004

35- ڈریزن، یوچی جے، اینڈ کوپر کرسٹوفر۔'بیہائنڈ دی سین' یو ایس ٹائکنس گرپ آن عراقز فیوچر'، 'دی وال اسٹریٹ' 13 مئی 2004

36- شلبی احمد، 'دی ویوفرام عراق'۔ واشنگٹن پوسٹ، 1 ستمبر 2003

37- کلوور چارلس، 'عراقی کونسل ممبر وپش یو ایس آن گرانٹس'۔ فنانشل ٹائمز، 11 اکتوبر 2003

38- 'دیر اسپیگیل' کو انٹرویو۔ 20 فروری 2004

39- کیش مین، جان ایچ: 'بریمر ول پریس یو این آن لارجر رول' ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون'' 16 جنوری 2004۔ رائٹ رابن اینڈ ولیمز ڈینیل، 'یو ایس اسکریمبلز ٹو سالویج ٹرانزیشن''۔ واشنگٹن پوسٹ'' 16 جنوری 2004، سیولینو ایلین اینڈ ہوج وارن ''یو این ٹو سینڈ ٹیم ٹو عراق ٹو اسیس ٹرانسفر آف پاور'' انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون، 28 جنوری 2004

40- پیراگراف 8، 10، 47 اور (7)50، براہیمی رپورٹ۔ سیکوریٹی کونسل کے صدر کے نام 23 فروری 2004 کا اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری کے خط سے ملحق۔

41- لارڈر ہنسارڈ۔ لارڈ گریوز کے سوال کا بیرونیس سائمنس کا تحریری جواب۔

15 جنوری 2004

42- اسوشیئڈ پریس، 27 مئی 2004: 'رابرٹ بلیک ویل: 'ویٹیرن ڈپلومیٹس ہلپنگ ٹو سیٹ اپ انٹریم گورنمنٹ''۔

43- کوک برن اینڈ کوک برن، حوالہ بالا صفحات 46,47، 68-167، 24-223 مزید دیکھیے گلبریتھ پیٹر ڈبلیو، ''عراق: دی بنگلڈ ٹرانزیشن''۔ نیویارک ریویو آف بکس، جلد 51، شمارہ 14، 23 ستمبر 2004، یہاں پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ اپریل 2004 میں یو ایس حکومت کے ذریعہ کروائی گئی ایک رائے شماری میں: ''علاوی عراق کے سب سے کم مقبول سیاستداں ہیں اور آبادی کا 61% حصہ انھیں ناپسند کرتا ہے۔''

44- 8 جون 2004 کی یو این پریس ریلیز ایس سی/8117، جس میں قرارداد کا متن، مراسلات اور بیانات ہیں۔ http://www.un.org/news/press/does /2004/pc8117.doc.html

45- عراق انڈکس، صفحات 42-27

46- جنیوا کنونشن کے تحت عراق میں جنگی قیدیوں اور دیگر محفوظ افراد سے گرفتاریوں، نظربندی اور تفتیش کے دوران اتحادی افواج کے سلوک پر ریڈکراس کی انٹرنیشنل کمیٹی کی رپورٹ۔ فروری 2004، پیراگراف 26-24 عرب میڈیا نے یہ رپورٹ بھی پیش کی ہیں کہ 'جو ناروا سلوک اسرائیلی فلسطینیوں سے کرتے ہیں اس میں اور ابوغریب کے عراقی قیدیوں سے سلوک میں بڑی مشابہت ہے۔' (الحیات، 12 جولائی 2004)۔ اس کے ساتھ ساتھ اس الزام نے کہ ابوغریب میں اسرائیلی مفتشین کو استعمال کیا گیا ہے عراقی اور عرب رائے کو مزید مستحکم کردیا ہے۔

47- ڈائمنڈ، لیری، ''وہاٹ وینٹ رانگ ان عراق''، ''فارن افیرز'' (ستمبر/اکتوبر 2004)

48- عراق انڈکس سے تفصیلات، ستمبر 2004، صفحہ 15

-49 www.iraqbodycount.org اور http://www.antiway.com/
casualities۔ عراقی شہری اموات کے دوسرے اندازے تیس سے چالیس ہزار
کے قریب ہیں (سیل بیٹرک، کین امریکا ون ان عراق؟ ''الحیات'' ستمبر 2004)

-50 نکش یتزاک 'دی شیعائٹس اینڈ دی فیوچر آف عراق' ''فارن افیرز'' (82:4 جولائی راگست 2003)

-51 کول، جوان۔ 'عراق: آل ٹوگیدر اکسیپٹ اکوپیشن'۔ ''لاموند ڈپلومیٹک'' مئی 2004

-52 http://www.guaucole.com/2004_06_01_guaucole_ archive.html

-53 مصر کی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے 21 ستمبر کے الحیات میں ایک مضمون میں لکھا کہ مقتدی کی تحریک دراصل عراق کی یکجہتی کا ثبوت ہے۔

-54 اسٹیل جوناتھن، 'یو ایس بینز کلیرکس فرام عراق الیکشنز' ''دی گارجین'' 8 جون 2004

-55 ایزلر، پیٹر اینڈ اسکیوٹارتی، 'فارن ڈیٹینیز فیو ان عراق'۔ usatoday.com، 7 جون 2004 رپورٹ 5700 قیدیوں میں سے دو فیصد کا ذکر کرتی ہے

-56 کرین جم 'فاریئرز رول ان عراق انسرجینسی اسمال'۔ ''دی گارجین'' 3 مئی 2004۔ مزید (بیروت)، 7 اپریل 2004 واضح کرتا ہے کہ 80 فیصد جنگجو مقامی اسلامسٹس؛ 13 فیصد نیشنلسٹ، 2 بعثی اور 5 فیصد بیرونی اسلامسٹس تھے۔

-57 ہاشم احمد ایس۔ 'دی سنی انسرجنسی ان عراق'، ''مڈل ایسٹ انسٹی ٹیوٹ پرسپکٹیوز'' 2003

-58 گراہم براؤن، حوالہ بالا صفحات 21-219

-59 دفعہ 9 نے عربی کے ساتھ ساتھ کردی زبان کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا۔ دفعہ 42 نے وفاقی نظام کو قبول کیا۔ دفعہ 53 نے کردستان ریجنل گورنمنٹ کو ان

تمام علاقوں کی قانونی حکومت تسلیم کیا جو 13 مارچ 2003 کو اس کے زیر انتظام تھے اور دفعہ 54 نے کے آر جی کو کرد علاقوں میں وفاقی قانون کی ترمیم کا اختیار دیا۔

60- گلبریتھ، حوالہ بالا

61- یونگ گیری۔ 'اسرائیلز یوزنگ کروز ٹو بلڈ پاور بیس'۔ ''دی گارجین'' 21 جون 2004۔ یونگ نے اپنی رپورٹ کی بنیاد ''نیویارکر'' میں سیمور ہرش کے ایک حالیہ مضمون پر رکھی ہے۔ ہرش کے مطابق اسرائیل کے مقاصد یہ ہیں کہ کردوں کی فوجی طاقت کو مضبوط کیا جائے تاکہ شیعہ عسکریت کی طاقت کو درہم برہم کیا جائے اور ایران میں ایک اڈہ بنایا جائے جہاں سے وہ ایران کے مشکوک جوہری توانائی کی سہولتوں پر نظر رکھ سکیں...اسرائیل نے کردستان میں اپنے عمل دخل کو اس وقت آگے بڑھایا جب یہ صاف ہوگیا کہ عراق میں یو ایس دخل اندازی کمزور پڑ رہی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ خوف ہے کہ انتشار ایران کو مضبوط بنائے گا۔''

62- الفیصل، عمرو محمد، 'لیٹر ٹو عراقی کردز'' ''عرب نیوز'' 26 ستمبر 2004

63- کردکر باتھ شیبا۔ 'ریکنسٹرکٹنگ عراقز اکنامی'۔ ''دی واشنگٹن کوارٹرلی'' خزاں 2004، صفحہ 82

64- گلب، حوالہ بالا

65- بریزنسکی زگنیو، 'فیس ریلیٹی'۔ ''دی نیو ری پبلک'' 28 مئی 2004

66- رینالڈز پال، 'عراق: ٹائم فار ایگزٹ انرجی'۔ بی بی سی نیوز 13 مئی 2004

67- کول جان، حوالہ بالا

68- نولٹن، برائن، 'ریپبلکن سینٹرز ساؤنڈ دی الدرم اوور عراق'۔ ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون'' 20 ستمبر 2004

69- ''فنانشیل ٹائمز'' 26 ستمبر رائٹرز کی رپورٹ سے ماخوذ اور الجزیرہ 24 ستمبر

70- ویزمین اسٹیو آر۔ 'بش وانٹس پارلے آن عراقی الیکشن' ''انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون''

25 ستمبر 2004

71- انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون، 28 ستمبر اور فنانشل ٹائمز 28 ستمبر

72- ''الزنگارو'' کو شاہ عبداللہ کا انٹرویو۔ بی بی سی، 28 ستمبر

73- کگان روبرٹ: ''آف پیراڈائز اینڈ پاور: امریکا اینڈ یوروپ ان دی نیو ورلڈ آرڈر'' (نوف، نیو یارک، 2003) صفحات 3 اور 102

74- سوروس جارج، ''دی ببل آف امریکن پاور'' (پبلک افیرز، لندن، 2004) صفحہ 54

75- کاکس مائیکل۔ 'دی ایمپائرز بیک ان ٹاؤن: آن امریکاز امپریل ٹمپٹیشن۔اگین' ''ملینیم: جرنل آف انٹرنیشنل اسٹڈیز'' (32:1، 2003) صفحات 27-1

76- ڈی لاگورس پال میری۔ 'عراق: دی پوسٹ وار کانفلکٹ'۔ ''لاموند ڈپلومیٹک'' مارچ 2004

77- فاف ولیم۔ 'ڈیگال آپشن سے بی اور بیسٹ ایگزٹ اسٹریٹجی' ''ایڈیٹوریلز اینڈ اوپینین'' 26 ستمبر 2004

78- جَیلس مارٹن۔ 'اور مورل واٹرلو۔'' دی گارجین'' 15 مئی 2004

'عظیم تر مشرق وسطیٰ' کی اصلاح

ایران کس رخ پر جا رہا ہے؟

ایک دہائی کے بعد اور، امیدوں اور اندیشوں کے امتزاج کے ساتھ، ایران کا دورہ جوش سے پُر تھا۔ اکثر افراد نے انقلابی ولولہ کے بعد انقلابی معقولیت کا ذکر کیا تھا۔ اب یہ ایک موقعہ تھا کہ ان سب کا ذاتی طور سے مشاہدہ کیا جائے اور سنا جائے۔

گزشتہ پچیس سالوں میں ایران نے ایک انقلاب، ایک جنگ، تعمیر نو کی ایک مدت اور ایک جمہوری نمود کا تجربہ کیا ہے۔ اس نے معاشی تنگی، خارجی دباؤ اور سفارتی اکیلے پن کا سامنا کیا ہے۔ اس نے اپنی پالیسی میں لغزشیں اور زیادتیاں کیں۔ ان میں سے ہر ایک نے سیاسی میدان میں اپنے نقوش چھوڑے۔ مجموعی طور سے یہ ایرانی صورتحال کے تنقیدی جائزہ کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس سے قبل بھی کئی بار ایسا ہوا ہے کہ اپنی طویل تاریخ میں ایرانیوں نے خود کو تنہا محسوس کیا ہے اور اس کا تدارک انھوں نے خود احتسابی اور خود بقائی کی تدبیروں کو آگے بڑھا کر کیا ہے۔ اس طریقہ عمل میں اجتہاد اور تعتیہ کے مذہبی نظریات نے بھی مدد کی۔

امام خمینی کا انتقال 1989 میں ہوا۔ انھوں نے عوام سے اسلامی حکومت میں عیب نہ نکالنے کی وصیت کی۔ انھوں نے حکومت کو ہدایت کی وہ کبھی عوام کی حمایت کو ہاتھ سے نہ

جانے دے۔ انھوں نے علما کو ہدایت کی کہ معاشرہ کے نازک و اہم مسائل میں شرکت کرنے میں لیت ولعل سے کام نہ لیں۔ یہ خواہشیں جزئی طور سے پوری ہوئیں۔ ایک ایسے عوام جنھوں نے جنگ کے ماہ وسال کی مشقتیں برداشت کی ہوں، جنگ کے بعد ایک بہتر زندگی کے خواہش مند تھے۔ ایک نوجوان نسل اپنی توقعات کی بارآوری چاہتی تھی۔ امام خبردار کر چکے تھے کہ دنیا پروپیگنڈے کے پہیوں پر چلتی ہے۔ پبلسٹی کی سرکاری مشین عوام کو یہ باور نہیں کرا سکی کہ انھیں ابھی سیاسی اور معاشی محرومیوں اور غیر لچکدار معاشرتی تقسیم کے ساتھ زندگی کو جاری رکھنا ہوگا۔ محمد خاتمی کا ظہور ان سب کا منطقی نتیجہ تھا۔ انھوں نے 1997 کا الیکشن دوتہائی اکثریت سے جیتا اور تبدیلیوں کا وعدہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ مذہبی قیادت پر بھروسہ ناگزیر ہے لیکن کافی نہیں ہے اور یہ کہ نظام کو ڈسپلن اور جوابدہی کی ضرورت ہے اور یہ کہ اصل اسلام کو انحطاط پذیر اور ملاوٹ والے اسلام سے ممیز کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ آزادی کو ترقی پر ترجیح حاصل ہے اور یہ کہ آزادی کے فقدان سے معاشرتی ارتباط کو نقصان ہوتا ہے لہٰذا قومی سلامتی بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔

پالیسی بہت عمدہ طریقہ سے وضع کی گئی تھی اور اس کا استقبال پرجوش طریقہ سے ہوا۔ عوام کی امیدیں کافی بڑھ گئیں اور دنیا ایک نئی صبح کی منتظر ہوگئی۔ لیکن سب کچھ ایسا نہیں ہوا اور عمل شعلہ بیانی کا ساتھ نہ دے سکا۔ صدر نے محسوس کیا کہ نظام میں پوشیدہ دباؤ اور پابندی اور مفادات کی امیدیں اگر ان کی تبدیلیوں کے ایجنڈے کو شکست نہیں دے سکتیں تو کم سے کم اس کی رفتار کو مدھم کرسکتی ہیں۔ نتیجہ کے طور پر آج ایران میں اکثر لوگ مایوی اور دل شکستگی کا شکار ہیں۔

تو آخر چیزیں راستے سے کیوں بھٹک گئیں؟ اصل غلطی اس نظام کی ساخت میں ہے جو بیک وقت انقلابی، مذہبی، جمہوری اور معتدل بھی ہے۔ ہر جز نے طاقت حاصل کررکھی ہے اور دوسرے کے لیے روک تھام کا کام کرتا ہے۔ تضادات بھی احاطہ کیے ہوئے ہیں جو اسلامی قانون دانوں اور سیکولر عناصر کے درمیان، جمہوری اور غیر جمہوری عناصر کے درمیان، خود اسلامی قانون دانوں کے درمیان جہاں ایک طرف مذہبی رہنماؤں

کے حامی ہیں اور دوسری جانب وہ جو اس کی ساخت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ دستور میں ترمیم کی گفتگو کا سامنا ایک سخت ترین دشواری سے ہوتا ہے جو دراصل ترمیم کا ناممکن طریقہ کار ہے جو ایک مختصر دستور ساز اسمبلی کی تشکیل نو کی جانب لے جاتی ہے اور جو قدامت پسندوں کے حق میں ہے۔ انجام کار اور ایک ایسی صورتحال جو تبدیلی کی فضا سے بھرپور ہو نہ ہی منتخب مجلس مقتدر اعلیٰ ہے اور نہ ہی براہ راست منتخب صدر یہ اختیار رکھتا ہے کہ اپنے ایجنڈے کو نافذ کر سکے۔ گارجین کونسل کو سب سے بڑی روک سمجھا جاتا ہے اور ایکسپیڈنسی کونسل نے ابھی تک دخل اندازی کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کے باوجود مذاکرات کے تسلیم شدہ قاعدہ کے مطابق بحث جاری رہے گی تاکہ تازہ ترین نازک فرق سامنے آئیں اور ابلتے ہوئے درجہ حرارت سے نیچے رہیں۔

احساسات و جذبات کے یہ نازک فرق کیا ہیں؟ اگر ایرانیوں کی نظریہ سازی اور ربط و تعلق کی مہارت کو مدنظر رکھا جائے تو تیر صحیح نشانے پر لگ رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ مظاہر عبدالکریم سروش (حالانکہ سرکاری طور سے اب ان کو پسند نہیں کیا جاتا ہے) کے شناخت کے تین تصورات۔ یعنی ایرانی، اسلامی اور مغربی۔ ایک ابھرتی ہوئی چست شناخت سے پراسرار طور پر مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ مانا جاتا ہے کہ معاشرہ ایک عبوری دور میں ہے اور روایت پرستی اور جدیدیت، خدا اور انسان کے درمیان سمجھوتہ کے راستوں کی تلاش میں ہے۔ ایران کا مذہبی چہرہ باقی رہے گا لیکن مذہب سے متعلق بیانیہ بدل جائے گا۔ زمینی حقیقت یہ ہے کہ ایک نسل کے پاس اختیار ہے جب کہ دوسری (جس کی تعداد بڑی اکثریت میں ہے) کے پاس مطالبات ہیں۔ ان میں سمجھوتہ ہونا چاہیے۔ اگرچہ پس و پیش کے ساتھ سہی لیکن مذہبی قیادت اس کو اپنا رہی ہے۔ نظام کی بالائی سطح سے متعلق ایک بحث کی موجودگی کو تسلیم کیا گیا لیکن بغیر کسی متعین تبصرہ کے۔ یہ مان لیا گیا کہ تبدیلی شعوری طور سے نہیں بلکہ واقعات کے تسلسل کے ذریعہ آئے گی۔

بات صرف نظریہ کی آسانی شفافی تک نہیں محدود ہے۔ ایک انکشاف یہ بھی ہے کہ دنیا میں طاقت کا توازن بدل گیا ہے۔ دو غیر مستحکم علاقوں کے بیچ اور ظاہری اور پوشیدہ

دباؤ کے زیراثر ایران تنہا ہوگیا ہے۔ پالیسیوں کی شبیہ بلکہ دوستوں کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ضرورت یہ ہے کہ ایک اجنبی سرمایہ کاروں کی دوست پالیسی اختیار کی جائے۔اس مقصد کے لیے انقلاب کے آسیبی نظریہ میں بھی کتر بیونت کرنی پڑے گی۔ اکثر ایرانیوں کی مرضی یہی ہے کہ یوایس سے بہتر تعلقات قائم کیے جائیں اور کشیدگی کو نظرانداز کیا جائے۔ اسرائیل بھی اب نظریاتی یا سلامتی مسئلہ نہیں ہے۔فلسطینیوں کی حمایت بھی پس پردہ چلی گئی ہے۔امید کی جاتی ہے کہ یہ اور اس کے ساتھ ساتھ افغانستان اور عراق کی جانب ایک ذمہ دارانہ رویہ، امریکہ کے تصور میں تبدیلی لائے گا۔ ایران کا فیصلہ یہ ہے کہ تنازعہ کے دونوں میدان میں بجائے فوجی کے سیاسی حل کی کھوج کرنا چاہیے۔ مسائل کے حل کے لیے یوروپین ممالک بھی یوایس کے زور اور دباؤ کے مقابلے میں مذاکرات کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں تک آئی اے ای اے کا سوال ہے اس کے ٹیکنیکل اور سیاسی پہلوؤں کے درمیان ایک امتیازی لائن کھینچ دی گئی ہے اور ظاہری مغربی دباؤ کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے۔

ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ داخلی اور خارجی آپس میں گندھے ہوئے ہیں اور کچھ دور تک ساتھ رہنا چاہیے۔ کچھ لوگوں کی یہ خوش خیالی بھی ہے کہ تبدیلی کے لیے چینی نمونہ یعنی معاشی اصلاحات بغیر سیاسی اصلاحات کے، بھی ایک حل ہوسکتا ہے۔لیکن اکثریت نے اس کو مسترد کردیا ہے۔ آبادی کی اکثریت نوجوان اور مضطرب ہے۔ اگلی دہائی کے لیے یہ سب اہم حلقۂ انتخاب ہے اور اس کی آرزوؤں اور امنگوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔

مشکل سوالات کا جواب ابھی باقی ہے۔کیا تبدیلی کو سنبھالا جاسکتا ہے؟ اس میں کتنا وقت لگے گا؟ دستوری پیچیدگی کا انجام کیا ہوگا؟ کیا تبدیلی ایک زیادہ بااختیار مجلس اور زیادہ مکمل جمہوریت کی جانب ہوگی؟ کیا یوایس کے ساتھ تعلقات معمول پر آجائیں گے؟ اس کے خطہ پر کیا اثرات ہوں گے اور ایران کا اس میں کیا کردار ہوگا؟ کیا متبادل منظرنامے، جو اتنے مہربان نہ ہوں، ایران کے سامنے آسکتے ہیں؟ موجودہ نظام کا ان پر کیا ردعمل ہوگا؟ مختلف چھوٹے علاقوں میں اور وہ خود جس خطہ کا محور ہے اس میں ایران کیا کردار ادا کرے گا؟

اب سے دس سال پہلے ایک ادیب نے ایران کی مشکلات پر غور کرتے ہوئے حافظ کے ایک شعر میں پناہ ڈھونڈی تھی جہاں شاعر سیاہ رات کی تاریکیوں میں بھٹکا ہوا قطب تارے کی تلاش میں ہے۔ دس سال بعد، اگر چہ اندرونی جتھ بندی میں کوئی کمی نہیں ہے لیکن صورتحال بہتر ہے۔ ایران اب اپنی راہ کو بشمول اس کے نشیب وفراز کے دیکھ سکتا ہے اور اس پر چلنا چاہتا ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ اپنے ہی ایک بیٹے کی نصیحت کو فراموش نہیں کر سکتا: ''ہمارا معاملہ حقیقی دنیا میں کسی اور سے نہیں انسانوں سے ہے۔ ہمیں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ ہمیں منصفانہ طور سے اس دنیا کے وسائل میں محدود رہنا چاہیے اور مہارت کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو اس کی حدود کے اندر استعمال کرنا چاہیے۔''

(اکتوبر 2003)

عراق کے بعد ایران؟

1979 کے بعد یہ پہلی بار نہیں ہوا ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں اکثر افراد ایران کے کاموں میں مداخلت پر اڑے ہوئے ہوں۔ عراق کی جنگ کے بعد یہ نشانیاں مزید واضح ہوگئی ہیں۔ تہران میں طلبا کے حالیہ مظاہرے اور اس پر علی خامنہ ای کا ردعمل اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اچانک دھاوا بولنے کے آثار زیریز میں موجود ہیں۔

پچھلے مہینے واشنگٹن میں ''جنگی سبھا'' کی ایک خاص محفل جس میں کئی ''جنگ باز'' اکٹھا ہوئے نے یہ فیصلہ کیا کہ بش انتظامیہ کو اکسایا جائے کہ 'دہشت گردوں کے آقاؤں' کو نشانہ پر رکھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس خطہ میں ایران سب سے اہم ملک ہے۔ وہاں پر امریکی کامیابی ''بنیادی طور سے مشرق وسطیٰ کو آزاد کرائے گی اور اس کا رخ بدل دے گی۔'' اس محفل کے شرکا میں ہم خیال جنگ باز، ایک باوزن سینٹر، اسرائیلی وزارت دفاع کا ایک سینئر فرد، غیر مستند شناخت کے ایرانی جلاوطن، ایک صحافی اور ایک معتبر فرانسیسی دانشور شامل تھے۔ تجزیہ نگاری کے مقصد کے تحت یہ لازم ہے کہ اس عمل کے حقیقی اور بیان کیے گئے اسباب کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس کو عام ضابطوں سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ واشنگٹن سیمینار میں شرکا نے کافی زور یہاں صرف کیا اور ان مقاصد کو پیش کیا: مذہبی حکومتوں کا خاتمہ، دہشت گردی پر آخری ضرب عالمی تباہ کاری کے ہتھیاروں کی صلاحیت کی بربادی، آزادی کی بحالی، خواتین، مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے لیے آزادی عمل اور خود مشرق وسطیٰ میں جبر و استبداد کے اداروں کی تباہی۔ ان پر جوش تقریروں کے پیچھے تین ٹھوس اسباب بکھرے ہوئے تھے عراق اور افغانستان میں یو ایس بالادستی کا قیام، امریکی تاجروں کے لیے ایران کی مارکیٹ کی دستیابی اور وسط ایشیا کی توانائی کو منتقل کرنے کے لیے (امریکی شرائط پر) ایران کی سرزمین کی دستیابی۔ ان پر محتاط طریقہ سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ عراق اور افغانستان میں امن اوّلین ضرورت ہے اور دونوں ہی جگہ یہ عنقا ہے۔ اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس جو پہلے تنہا ہی جنگ کرنے کی خواہش مند تھی اب امن کا بوجھ اٹھانے کے لیے دوسروں کو دعوت دے رہی ہے۔ امریکی عوام خواہ اب یا بعد میں، ان غلط اندازوں اور غلط نظریوں کے بارے میں جواب ضرور طلب کریں گے۔ ایران کے ساتھ جو عفریتی تصور منسلک ہے وہ ایسے مواقع پر کام آتا ہے۔

ایران بلاشبہ افغانستان اور عراق دونوں کا پڑوسی ہے اور جغرافیائی سیاسی چالبازی کی صلاحیت کا حامل ہے۔ لیکن اس کا دائرہ کار محدود ہے عراقی شیعوں پر تشہیر شدہ ایرانی اثر نے ایران عراق جنگ میں کوئی زیادہ مدد نہیں کی۔ تہران نے اب تک دونوں ہی جگہ ذمہ داریوں سے کام لیا اور یو ایس افسران نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور دیگر ممالک کے بارے میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ تجارت کے مواقع اور توانائی کی حفاظت کی تلاش کریں۔ ان دونوں کو معمول کے مطابق حمایت اور نیلامی میں بولی لگا کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی طریقہ امریکی سیاستدانوں یا اس کی تاجر کمیونٹی کے لیے نامانوس نہیں ہے۔ اس میں سے کسی کو خارجہ مداخلت کاری یا پیوندکاری کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ کتنا لازمی ہے کہ یہ قطعی طور پر وہی چیز ہے جسے یونائیٹڈ اسٹیٹس ایران میں 1953 میں بحال کرنا چاہتی تھی اور بعد میں پچھتائی بھی۔ واشنگٹن سیمینار کے کارکنوں کو

محمد خاتمی کی تحریک اصلاح کی ناکامی اور نوجوان نسل جو ایرانی آبادی کا 60 فیصد حصہ ہیں، کی ثابت شدہ بے اطمینانی سے مسالہ ملا۔ انھوں نے موجودہ بے اطمینانی کو برقرار رکھنے اور پروان چڑھانے کے لیے سخت اقدامات تجویز کیے۔ اس سلسلہ میں سینٹر سام براؤن بیک کافی آگے بڑھ گئے اور کہا ''ہم اس وقت تک ایک آزاد اور محفوظ عراق یا افغانستان قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ ایران کی حکومت مستحکم ہے۔'' ایران خود ہی یہ مسئلہ حل کر رہا تھا۔ ''وہ ہم سے سوائے ایک مستقل اور مضبوط سیاسی اور اخلاقی حمایت کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے۔'' اس کو سینٹ فارن اتھوریزائشن بل میں ترمیم، جسے ایران ڈیموکریسی ایکٹ کہا جائے گا اور ایک ایران ڈیموکریسی فاؤنڈیشن کی تخلیق، کے ذریعہ کیا جائے گا۔ دونوں ہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو مالی تعاون دیں گے تاکہ امریکہ میں پرانے جلاوطن ایرانی نظام کے خلاف اپنی جمہوری جدوجہد جاری رکھ سکیں۔

دیگر ہم خیالوں نے بھی یہی محسوس کیا کہ بالآخر حکومت ایک اچانک دھماکہ کی طرح اڑ جائے گی لیکن اگلے چوبیس مہینوں میں کسی سنجیدہ پیش قدمی کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ ایک نوجوان ایرانی نژاد تاجر جو کیسپین توانائی کے کاروبار میں ہے، نے حکومت کی تبدیلی کے نتائج کے بارے میں پیشین گوئی کرتے ہوئے حتمی طور سے بیان کیا: 'ایک طرز حکمرانی کی حیثیت سے اسلام کی ناکامی' ایران کے قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کو امریکہ کے لیے ایک موقع، دنیا کے لیے کیسپین خطہ کا کھل جانا اور دوسرے چیزوں کے ساتھ اسرائیلی فلسطینی تعلقات پر ایک خوش گوار اثر۔''

یہ سارے دلائل جوں کے توں نہیں قبول کر لیے گئے۔ اس جانب توجہ دلائی گئی کہ اصلاحات نے زیادہ سیاسی گنجائش دی ہے، اسٹاک مارکیٹ میں استحکام اور تاجر کمیونٹی کو اعتماد بخشا ہے۔' اکثر ایرانی ان دباؤ سے واقف ہیں جو خاتمی پر ہیں۔ وہ تبدیلی چاہتے ہیں مگر تشدد نہیں اور ایک اور انقلاب نہیں چاہیے۔ ان کی خواہش ہے کہ تبدیلی اندر سے آئے۔'

صورتحال پیچیدہ ہے اور یہ ایک محض روایت بمقابلہ جدیدیت معاملہ نہیں ہے کیونکہ جدیدیت کے اکثر عناصر پہلے ہی سے موجود ہیں۔ یہ تین طاقتوں یعنی اسلام، قومیت

اور سائنس و ٹیکنالوجی کی تلاش میں باہمی مقابلہ ہے۔ تینوں محرکات اصل اور جائز ہیں۔ ایران واحد ملک ہے جس نے پچیس سال تک سیاسی اسلام کا تجربہ کیا ہے۔ حکمراں طبقہ بھی کوئی یک سنگی مجسمہ نہیں ہے۔ اسے علم ہے کہ طاقتوں کے نئے توازن کو حاصل کرنا ہے۔ اصل سوال ملاؤں سے نجات حاصل کرنے کا نہیں ہے بلکہ ان کے لیے ایک نئی جگہ کی تلاش ہے۔ ''یہ ایک بہت نازک مسئلہ ہے اور عوام اس پر غور کر رہے ہیں۔''

دلائل کے دو جوڑے ہیں، ترجیحات اور پیشین گوئیوں کے دو جوڑے ہیں پہلے حامی امریکی یا اسرائیلی اور خود جلاوطن ہوئے ایرانی ہیں۔ دوسرے کے حامی دیگر شہریتوں کے افراد ہیں۔ دونوں ہی معاشرہ کے اندرونی محرکات کو ظاہر کرتے ہیں۔ پہلا اس کے مستند ہونے سے انکار کرتا ہے دوسرا اسے قبول کرتا ہے۔ مقصدیت کا کردار صاف ظاہر ہے اور گیری سِک کے اس تبصرہ کو تقویت پہنچاتا ہے کہ جہاں تک ایران کا تعلق ہے امریکی 1979 کے زمانے کی کج روی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر عبوریت پہلے تو انقلابی جوش سے انقلابی معقولیت، اس کے بعد انفرادی اور اجتماعی معقولیت پسندی، بغیر قدردانی کے گزر گئی۔ اسی طرح سے مباحثہ کی اثرپذیری اور وسعت جو مذہب سے لے کر نازک معاشرتی امور کا احاطہ کرتی ہے اور ایسی تبدیلی کی تمنا کا اظہار کرتی ہے جو جمہوری طرز پر عمل پیرا ہو اور گزشتہ سالوں میں اس کی کوئی مثال خطہ میں سوائے ترکی کے نہ ہو، بھی ضائع ہوگئی۔ لہٰذا دوسروں کو جدیدیت یا تجدید کا نمونہ بنانا خاصا تجسس طلب اور دلچسپ ہے۔

ایران کی مرکزیت اور ضروریات کچھ بھی ہوں، ایک سازشی غیر استحکام کا امکان بشمول جنوبی ایشیا کئی خطوں پر سیاسی اور معاشی اثرات چھوڑے گا۔ خلیج میں یہ توقعات کہ عراق میں حکومت کی پچھلی تلخیوں کو ختم کردے گی اور مقابلہ کے بجائے تعاون و سلامتی کا زمانہ آئے گا، کو صدمہ پہنچے گا۔ یہی حشر موجودہ تجارت اور پائپ لائن کی تجاویز کا ہوگا جو ایران سے گزرتی ہیں۔

یہ کہا گیا ہے کہ عوام انقلاب میں کسی معاشرتی تعمیرنو کے منصوبہ کے ساتھ شامل نہیں ہوتے بلکہ اس شدید جذبہ کے ساتھ کہ وہ موجودہ حکومت کو مزید برداشت نہیں کرسکتے۔

ایران کے 1979 کے واقعات کی بھی یہی سچائی تھی۔ اس وقت کہا جاتا تھا کہ انقلاب تربوز کی قیمت کی وجہ سے نہیں برپا کیا گیا ہے۔ لیکن تجربہ نے ثابت کیا کہ اگرچہ خاص طور سے ایسا نہیں تھا لیکن تربوز کی قیمت انقلاب میں شامل تھی۔ ایران کا سیاسی ارتقا، تسلسل اور تبدیلی کے مابین توازن ایرانی عوام کا مسئلہ ہے۔ دوسروں کی ترجیحات کو پہلے ہی سے نہیں لکھا جاتا۔ گروپس کو اخلاقی، سیاسی اور مالی تعاون دینے کا فیصلہ (اگر لیا گیا تو) اس زبان کی یاد دلائے گا جو ہمارے پڑوس میں بولی جاتی ہے۔ عراقی جلاوطن گروپس کے ساتھ کا تجربہ اور جمہوریت نافذ کرنے کی کوشش، آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

(جون 2003)

مغربی ایشیا کی جدیدیت کی آرزو؟

ایڈورڈ سعید نے لکھا ہے کہ مغرب و مشرق کے درمیان تعلقات 'طاقت اور غلبہ کے مختلف درجوں کی پیچیدہ بالادستی کے تعلقات ہیں۔' ابتدا زمانہ کے ساتھ اس نے تصوراتی اور روایتی ٹائپ تحقیق کیے۔ یہاں تک کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں مارک ٹوئن اور تھیوڈور روزویلٹ بھی اس سے بری نہیں تھے اور نہ ہی 'یو ایس ایس ٹکون ڈے روگا' کے کموڈور رابرٹ شوفلٹ بھی جو 1879 میں شط العرب کے ساحل پر بصرہ تک گئے اور کہا کہ "دنیا میں کوئی اور جگہ ایسی نہیں ہے جہاں ایک مہذب قوم کی اخلاقی قوت کے علم کو پھیلانے کے لیے طاقت کے جسمانی مظاہرہ کی اتنی ضرورت ہو جتنی ان ساحلوں پر رہنے والے وحشی لوگوں کے لیے درکا ہے۔"

جسمانی اور اخلاقی طاقت کا یہ مخصوص آمنا سامنا مشرق وسطی کی اصلاحات کے بارے میں فروری میں شروع کی گئی ایک بحث کے حوالہ سے عصری مطابقت رکھتا ہے جب کہ جی ایٹ چوٹی کانفرنس کے متعلق یو ایس تجاویز کا مسودہ ایک لندن روزنامہ کو لیک آؤٹ ہوگیا۔ اس کا فوری نتیجہ عرب دنیا میں ایک ہنگامہ تھا، پہلے تو عرب چوٹی کانفرنس کو ملتوی کردیا گیا۔ جب اس کو دوبارہ بلایا گیا تو یہ بغیر کوئی فیصلہ لیے ختم ہوگئی۔ اس کو اب 'براڈر مڈل

ایسٹ اینڈ نارتھ افریکا انی شیٹو' کے نام سے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے اور جی ایٹ کے 9 جون کے بیان میں اس کو آخری شکل دی گئی۔

اس کی فروری کی دستاویز سے کوئی مشابہت نہیں ہے اور اس فاصلہ کا ایک پیمانہ ہے جو اس تصور کے بانی صدر جارج ڈبلیو بش نے ذاتی طور سے الٹے پاؤں طے کیا تھا۔ یہ اسی ہفتہ جب کہ عراق پر سلامتی کونسل کی قرارداد آنے والی ہے، آرہا ہے۔ ساتھ مل کر یہ دونوں ایڈورڈ گبن کے اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں کہ 'خود قادر مطلق بھی اپنے غیر مطمئن پرستاروں کی تنقید سے نہیں بچ سکتا۔''

ابتدائی 'عظیم تر مشرق وسطیٰ' کی تجویز میں ہدف کے علاقہ کی تعریف ''عرب دنیا اور اس کے ساتھ پاکستان، افغانستان، ایران، ترکی اور اسرائیل'' کی گئی تھی۔ اس نے اپنے پوائنٹ آف ریفرنس میں یو این ڈی پی کی عرب ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹس (اے ایچ ڈی آرز) برائے 2002 اور 2003 کو اختیار کیا اور ان کے مطابق اس خطہ کی تین بڑی کمزوریوں یعنی آزادی، علم اور خواتین کے اختیارات پر کام کرنے کو اپنایا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ تینوں اس علاقہ کی سلامتی کے لیے براہِ راست خطرہ ہیں اور ان حالات کی تخلیق میں معاون ہیں جو تمام جی ایٹ کے ممبران کے قومی مفادات کے خلاف ہیں۔ اس نے سفارش کی کہ سیاسی، معاشی اور سماجی اصلاحات کو آگے بڑھانے کے لیے متحدہ اور مربوط کوشش ہی واحد راستہ ہے۔

ان کی کچھ تفصیل بھی بتائی گئی۔ اس کے دو پہلو قابلِ غور تھے۔ دونوں ہی شناخت کے سوال سے متعلق تھے اور دونوں ہی یکطرفہ تھے: پہلا خطہ کی تعریف سے متعلق تھا اور دوسرا یہ کہ جی ایٹ کے قومی مفادات کی ساخت کیا ہے۔ اس کے باوجود اس تجویز کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اگرچہ اس میں غیر عرب ریاستوں کو بھی شامل کیا گیا تھا لیکن ان کا کوئی ذکر اے ایچ ڈی آرز کی ان دو رپورٹوں میں نہ اس کا کوئی تذکرہ اور نہ ہی کوئی امدادی اعداد و شمار ملتا ہے جن پر اس نے انحصار کا دعویٰ کیا ہے۔ آخر میں اس زمرہ میں اسرائیل کی شمولیت پر اصرار ہے کیونکہ مذکورہ بالا تینوں کمیاں اسرائیلی سماج میں موجود نہیں ہیں۔ اے ایچ ڈی آرز

میں موجود اعداد و شمار کم سے کم دس سال سے سالانہ ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹس جو انسانی تحفظ کے مختلف گوشوں کی عالمی تصویر پیش کرتی ہے، میں دستیاب نہیں۔ نہ ہی اس کے اصلاحی نسخہ میں کوئی نئی بات ہے کیونکہ تعلیم، خواتین کا رول اور اہل سیاسی قیادت کو پال کینیڈی نے 1993 میں اکیسویں صدی کے تین فیصلہ کن عناصر قرار دیا تھا۔

تو پھر جی ایم ٹی کی جدّت اور معقولیت کہاں ہے؟ اس تجویز کے پیچھے سوچ کے ایک پہلو کا انکشاف اس وقت ہوا جب سینیٹر رچرڈ موگر نے اپریل میں اس کے بارے میں زبان کھولی اور یہ مشورہ دیا کہ ''امن میں تعاون'' کے پروگرام میں ناٹو کو ان ممالک سے سلسلہ جنبانی کرنی چاہیے تاکہ ان کو بین الاقوامی کمیونٹی میں ضم کیا جائے۔'' انھوں نے اسرائیلی فلسطینی تعلقات کے تعطل پر بھی بات کی اور ترشول نما رویہ کا مشورہ دیا: سعودی عرب اور مصر کی شمولیت سے کوارٹریٹ کی توسیع، غزہ سے یکطرفہ انخلا کا شیرون پلان تسلیم کرنا کیونکہ یہ روڈ میپ کو ترک کیے ہوئے بغیر ایک فائدہ مند دائرہ مہیا کرے گا، اور فلسطینی اراضی کے لیے ٹرسٹی شپ کو تسلیم کرنا جس میں عرب ممالک کو انتظامیہ کی ذمہ داری سپرد کی جائے گی۔

اسی وقت سینٹرز لیبرمین اور ہیگل نے مفادات کے علاقہ میں توسیع کرتے ہوئے 'گریٹر مڈل ایسٹ اینڈ سینٹرل ایشیا ڈیولپمنٹ ایکٹ (2004)' کو پیش کیا اور ان 33 ممالک کے سیاسی اور معاشی فروغ کے لیے جی ایم ای اینڈ سی اے ڈیولپمنٹ بینک، فاؤنڈیشن اور ٹرسٹ فار ڈیموکریسی کے ذریعہ پانچ سال کی مدت کے لیے پانچ بلین ڈالر کی رقم طلب کی۔ یہ پیش پا افتادہ امر ہے کہ دونوں، خطوں یعنی مشرق وسطی اور وسطی ایشیا میں دو عناصر ہی قدر مشترک ہیں۔ وہ توانائی اور مسلم آبادی ہیں۔ لہٰذا یہ ساری مشق ان تمام ریاستوں کو اعتدال پسند اور جدید بنانے کے لیے ہے جیسا کہ این ایس ایس 2002 میں مشروط ہے۔

9 جون کو دیا گیا جی ایٹ کا بیان جمہوری، سماجی اور معاشی اصلاحات جو اس علاقہ کی اپنی ہوں، کو تعاون دیتا ہے۔ آزادی اور اصلاحات کی حمایت میں جی ایٹ کی خصوصی ذمہ داری پر زور دیتا ہے اور خود پر ترقی میں اشتراک، کی ذمہ داری لیتا ہے جو علاقہ کی حکومتوں، بزنس اور سب کے لیے آزادی، جمہوریت اور خوشحالی مضبوط کرنے والی نمائندہ

سول سوسائٹیز پر مبنی ہو۔ اس کے علاوہ یہ خود پر آٹھ اصولوں کے مجموعہ کی ذمہ داری لیتی ہے۔ ان میں سب سے اہم عرب اسرائیلی تنازعہ ہے جو سلامتی کونسل قرارداد 242، 338، 425 اور 4 مئی 2004 کو کوارٹریٹ کے دیے ہوئے بیان کی روشنی میں حل ہونا چاہیے۔ یہ بیان تسلیم کرتا ہے کہ 'تبدیلی نہ باہر سے آنا چاہیے اور نہ ہی آسکتی ہے' اور یہ کہ ہر ملک اپنی نوعیت میں اکیلا ہے اور اس انفرادیت کا احترام کرنا چاہیے اور یہ کہ ہر معاشرہ کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے یہاں تبدیلی کی وسعت اور رفتار مقرر کرے۔'

جی ایٹ کا بیان یوروپین یونین کے ان کئی اقدامات سے ملتا جلتا ہے جو گزشتہ سالوں میں اٹھائے گئے اور جن سے کسی کا دل میلا نہیں ہوا۔ اس کا فلسطینی مسئلہ کے حل کی ضرورت کو دوہرانا یونائیٹڈ اسٹیٹس کی پیش قدمی کی جانب اشارہ ہے۔ یہ دیکھنا باقی ہے کہ امریکی گھریلو سیاست میں اسرائیلی عنصر پر اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔

کچھ سوالات کے جواب باقی ہیں: کیا اس خطہ کی پسماندگی کے اسباب تاریخی اور ثقافتی ہیں؟ کیا یونائیٹڈ اسٹیٹس اس علاقہ میں انتخابی سیاست کے نتائج بشمول اسلامسٹ پارٹیوں کے اقتدار میں آنے کے امکان کے ساتھ، کے لیے تیار ہے؟ ترقی یافتہ دنیا کی جانب سے ان ملکوں کو اتنی تندہی سے فروخت کیے جانے والے اسلحہ پر جو کثیر اخراجات ہورہے ہیں ان میں کیا معقولیت ہے؟ کیا اصل معاملہ یہ نہیں ہے کہ استعماریت اور جدیدیت (ہشام شربی کی اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے) کے میل نے ایک کمزور حاکمانہ ڈھانچہ تخلیق کیا جو مغرب میں آٹھ دہائیوں تک قابل اعتماد دوستوں میں شمار کیا جاتا رہا؟ آج جدیدیت کے جبری نفاذ کے لیے ان کو ٹوٹنے کی حد تک جھکایا جارہا ہے۔ یہ حکمرانوں کو ششدر اور ان کی رعایا کو بدگمان اور شک کی حالت میں چھوڑتا ہے۔ اس موضوع پر جی ایٹ میں مباحثہ کے لیے مدعو کیے ہوئے عرب قائدین میں سے اکثر نے جانے سے انکار کردیا۔ وہ اس سے نیچے اترنے کو اپنے موقف کی بے گناہی کا ثبوت مانیں گے۔ کیا یہ ان اصلاحات کی تیز رفتاری میں مدد کرے گا جو رائے شماری کے مطابق فوراً شروع ہونی چاہئیں کیونکہ صورتحال اور زیادہ برداشت نہیں کی جاسکتی؟

(جون 2004)

عرب اضطراب

انیسویں صدی میں عرب قوم پرستی کے ابتدائی دنوں کا بغاوت انگیز نعرہ 'اٹھو اے عرب اور جاگو' تھا۔ اس نعرہ نے ان کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف اٹھ کھڑا کیا لیکن بعد میں آنے والے برطانیہ اور فرانس کے منصوبوں پر کوئی روک نہ لگا سکا۔ آزادی کا لمحہ نئے غلبہ کی شروعات بن گیا۔

1958 میں ایک نامور مغربی دانشور نے اپنے ایک مضمون میں عربوں کی مغرب سے مزاحمت کے سلسلہ میں تین امکانی راستے سامنے رکھے تھے: اطاعت شعاری، پرواہ نہ کرنا اور صورتحال کو چھوڑ دینا یا اپنے معاشرہ کی اندرونی تجدید کے بعد مساوی تعاون کی شرائط پر سامنے آنا' موخرالذکر کے لیے اولین شرط جھنجھلا دینے والی خارجی مداخلت کا خاتمہ ہے۔ لیکن یہ مداخلت جاری ہے۔ ایک محتاط مبصر کے الفاظ میں آج کی عرب دنیا ''منقسم اور زخم خوردہ، سارے قومی فخر سے محروم، کسی بھی طرح کی خوداعتمادی اور یگانگت سے عاری، دوسری جنگ عظیم کے بعد بیرونی غلبہ سے سب سے زیادہ بوجھل' اور اپنے ہی ناراض شہریوں کے مقابل صف آرا ہے۔''

عرب لیگ کی الجزائر کی چوٹی کانفرنس نے عرب ریاستوں کے نظام کی حدبندی کا کافی ثبوت پیش کیا۔ خارجی عنصر اس کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا سبب جو زیادہ اندرونی ہے کیوں اور زیادتیوں کے سماجی سیاسی لغزشوں کے جالے میں الجھا ہے۔ کئی دہائیاں قبل شامی مورخ کنسٹینٹن زورایک نے یہ مشاہدہ کیا تھا کہ آفتوں کو نہ سمجھنا افراد کے لیے خود آفتوں سے زیادہ تباہ کن ہے۔ لہٰذا ادراک میں ناکامی اس بحران کی مرکزی وجہ ہے جس نے علاقہ کو لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

عرب لیگ کو تفویض کردہ مقاصد میں ممبر ریاستوں کے درمیان تعلقات میں استحکام، پالیسیوں کے ارتباط کے ذریعہ تعاون کا حصول اور ممبر ریاستوں کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ

کا تحفظ شامل ہیں۔ یہ ان میں سے ہر محاذ پر ناکام ہوئی ہے۔ عام حالات اور تناؤ کے لمحوں میں اس کا عمل تفریح و اختلاف سے بھرپور رہتا ہے۔ اس کی ناکامی اس کے اراکین کی ناکامی ہے۔ ان میں سیاسی قوت ارادی کی کمی ہے۔ پچھلے ساٹھ سالوں میں یہ مقصد کی یکسانیت اور مفادات کے میلان کو آگے نہیں بڑھا سکیں۔ عرب اتحاد سے متعلق مسحور کن بیانات نے اس کی ناکامی کے اثر کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ کیا یہ مقصد اور طریقہ عمل پر نظر ثانی کا ایک معاملہ ہے؟

فلسفی ترتیب وار گمراہ کن بیانات کے خلاف متنبہ کرتے ہیں اور وکیل ارادوں اور نیتوں کے ڈھیلے ڈھالے الفاظ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عرب سرزمین میں دانشوروں کی دونسلیں دونوں جرائم کی مرتکب ہوئی ہیں۔ مراکشی مورخ عبداللہ العروی کے مطابق مسئلہ ان کے عرب تاریخ کے تصور کی باطنی قدر کا نہیں ہے بلکہ آج کی دنیا میں جو اصل تعلقات ابھر رہے ہیں، کا ہے۔ انھوں نے کہا کہ توجہ روایت کے جواہری حصے پر ہونی چاہیے اور روایت ایک ڈھانچہ کی حیثیت سے اور روایت ایک قدر کی حیثیت سے، میں امتیاز کرنا چاہیے۔

کیا دانشور اس کو سمجھ پائے اور پھر اسے عمل میں ڈھالا؟ ان کے ذہنوں میں اکثر استعمال شدہ اصطلاحات جیسے آزادی، خودمختاری، قانونی جواز، آمریت، انقلاب، طرز حکمرانی، اشتراک اور مشاورت وغیرہ کا کیا تصور تھا؟ کیا دانشوروں کے تصورات تمام کے تمام آزادانہ تھے؟ بیرونی مفادات نے ان کی تشکیل اور برقراری میں کیا کردار نبھایا؟

مغربی ایشیا کی جغرافیائی سیاسی مرکزیت اور معاشی ناگزیری جدید وقت کی لعنت ہے چاہے مالی طور سے وہ بے مثال خوشحالی کے حامل ہوں۔ اس لعنت نے خود کو ایک 'ذیلی تاریخی ذہن' میں ڈھال لیا جس نے عمومی ارتقا کو سست رو کر دیا۔ اس نے دانشوروں اور اس ذہن سے بڑے بیرونی فائدہ اٹھانے والوں نے فائدہ اٹھایا۔ جدید اجدادی ''عرب رائٹ'' اس عمل کا اٹوٹ حصہ بن گیا اور اس کو مقامی، علاقائی اور عالمی سطح پر ایک حلیف مان لیا گیا۔ اس کی مذہبی شناخت نے لادینی دشمنوں کے خلاف لڑائی میں مزید تقویت بخشی۔ 9/11 سے قبل اعتدال پسند مسلمان کو ترجیح دی جاتی تھی اور اس کے بعد اعتدال پسند اور عصری جدت پسند کو دی جانے لگی۔ عمل کے اس تسلسل میں عرب (اور مسلمان) دانشوروں کی حقیقی یا مبینہ

ناکامی کے مترادف بن گئے اور اس طرح سے 'کلین بریک' نظریہ کے نفاذ کی بنیادیں اٹھائی گئیں۔ لیکن سیدھی سادی ترکیبیں کارگر نہیں ہوتیں اور عراق نے دکھا دیا ہے کہ بہترین سے بہترین منصوبہ بھی گڑبڑ کا شکار ہو سکتا ہے۔

کچھ سوالات اب بھی جواب کے منتظر ہیں۔ تبدیلی سے متعلق اندرونی کوشش میں کہاں تک سنجیدگی ہے؟ یو این ڈی پی کی تین عرب ہیومن ڈیولپمنٹ پوزیشن نے کیوں کی شناخت تین نقصان یعنی تعلیم، آزادی اور خواتین سے کی ہے۔ ڈیووس اکنامک فارم کی عرب مقابلہ بازی پر ایک رپورٹ میں زیادہ زور آبادی کے بڑھنے اور نوجوانوں کی بے روزگاری پر دیا گیا ہے اور کرایے کی معاشیات پر مکمل انحصار سے ہٹنے کی سفارش کی گئی ہے۔ ضرورت یقیناً اصلاحی اقدام کی تحریک کو جنم دے گی۔ یہ آہستہ رو بلکہ کسی حد تک گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ کی طرح ہوگی لیکن سیاسی اور معاشی طاقت کے محل وقوع کو نہیں چھیڑے گی۔ میکاولی کا یہ قول کہ 'لوگ اپنے باپ کی موت کو آسانی سے بھلا دیتے ہیں لیکن باپ کی میراث کے نقصان کو نہیں' صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اصلاحی اقدام حصہ داری کو ایک خاص حد تک لے جائیں گے لیکن سیاسی اختیارات، معاشی طاقت اور فیصلہ لینے کی طاقت کے معنی خیز منتقلی میں ملوث نہ ہوں گے۔

کیا بیرونی دلچسپی کا مقصد بے غرض ہے؟ ایک ایسا عمل جس میں طبقہ اشرافیہ کو مرکزیت حاصل ہو، سے کہہ دیا گیا ہے کہ اب کھیل کے ضابطے بدل دیے گئے ہیں، لہٰذا ان کو انہی قوانین کے تحت کھیلنا ہوگا۔ اشراف جہاں پر لازمی ہوگا ہدایات مانیں گے اور انھیں چالاکی اور حیلہ سازی سے کام لینا ہوگا۔ واقعات کے تسلسل میں بڑی آسانی سے اے ایچ ڈی آر 2005 کے دیگر مشاہدات کو نظرانداز کر دیا گیا: ''فلسطینی سرزمین پر اسرائیل کا مسلسل قبضہ، یو ایس کی قیادت میں عراق پر قبضہ اور دہشت گردی میں اضافہ نے انسانی فروغ پر ناخوش گوار اثر چھوڑا ہے۔ (مذکورہ بالا بیان اور 250 صفحات کی رپورٹ کے کچھ اور جملوں نے یو ایس حکومت کو ناراض کر دیا۔ اس نے فنڈز میں کمی کر دی اور یو این ڈی پی کے ایڈمنسٹریٹر کو مجبور کیا کہ وہ ان خلاصوں سے اقوام متحدہ اور یو این ڈی پی کو الگ رکھیں)۔

عرب کی گلی بھی اپنا وجود رکھتی ہے اور اسی طرح وہ عراقی مشہدی جسے اپنے وقار، آبرو اور شناخت کی مرکزیت کا احساس ہے بھی موجود ہے۔ وہ خارجی اور داخلی عناصر کے تعامل اور ان میں سے ایک کی ترجیح اور دوسرے کی نظرانداز ی کے مقاصد سے واقف ہے۔ اس کو اچھی طرح علم ہے کہ بغیر مالی طاقت اور قانون کی بالادستی کے بغیر حصہ داری کی طرز حکمرانی اسی طرح کا خالی نعرہ ہے جیسے کہ بغیر اقتدار اعلیٰ کی جمہوریت ہے۔ لہٰذا عرب شہری کے سامنے چیلنج کثیر جہتی ہے۔ اندرونی طور سے جدید اجدادی نظام حصہ دار طرز حکمرانی کے لیے جگہ خالی کرے گا۔ ہرسول سوسائٹی آزادانہ طور پر خود فیصلہ کرے کہ اس کی رفتار اور متن کیا ہوگا۔ اس کو معنی خیز ہونا چاہیے لیکن پہلے سے تحریر شدہ نہ ہونا چاہیے۔ علاقائی طور سے عربیت ہونا اور بننا، دونوں کو واضح طور سے نشان زد ہونا چاہیے اور ایک سایہ فگن عرب شناخت (وہ تمام لوگ جن کے رہن سہن اور روایتیں عرب سانچہ میں ڈھل چکی ہیں اور جن کی مادری زبان عربی ہے) کو اس کی ثقافتی زرخیزی کی خاطر باقی رکھنا ہے لیکن یہ پچھلی چھ دہائیوں کے غیر پائیدار سیاسی بوجھ کے بغیر ہو۔ نئے علاقائی اور ذیلی علاقائی اجزا جو معاشی مفادات سے بندھی ہوئی باشناخت کمیونٹی ہو ایک متبادل ہو سکتے ہیں۔ فلسطینی مسئلہ اور موقف عربوں اور مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ بین الاقوامی سطح پر پناہ گاہوں، محفوظ قلعہ اور اہم اور ضروری خام مال کے مقبوضہ وسائل کی تخلیق کی خواہش کو بین الاقوامی تعلقات اور تجارت کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔

برزمرہ میں محفوظ طاقت اور منتج طاقت کی مساوات کا ٹکراؤ چیلنج ہے باہمی روابط کے باعث کوئی بھی اکیلے نہیں سلجھایا جاسکتا اور نہ ہی نکھارنے والے انتظامات کارگر ہو سکتے ہیں۔

(مارچ 2005)

عرب سیاست میں پڑاؤ اور راستے کے پتھر

حال ہی میں ''ہارٹیز'' کے ایک کالم نویس نے لکھا کہ ''عرب جمہوریت کے پریشان کن پہلو اس کے اسرائیل پر اثرات ہیں۔'' ان کی فہرست اس طرح ہے: عرب ممالک

میں جمہوریت کی آمد سے اسرائیل اپنے انفرادی کردار اور اس سے ظہور میں آنے والی امریکہ کے ساتھ 'قدر مشترک' کھو دے گا؛ اگر انتخاب کی آزادی دی گئی تو عرب ووٹرز شاید اسلامسٹ انتہا پسندوں کو منتخب کریں؛ تازہ ترین عرب ہیومن ڈیولپمنٹ رپورٹ کے مطابق عرب ذہن مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی کارروائیوں پر تنقید میں گھرا ہوا ہے اور منتخب تنظیموں میں اس کی عکاسی ایک تشویشناک خبر ہوگی۔ علاقہ میں سیاسی اصلاحات سے اسرائیل کس طرح متاثر ہوگا اس بارے میں دل کی بات جاننے کے لیے دوررس تحقیق کی ضرورت ہے۔

عرب جمہوریت کے لیے ایک بظاہر متناقص محرک واشنگٹن کے نزدیکی اسرائیلی سیاستداں کی جانب سے آیا ہے۔ ناتھن شرانسکی کی تحقیق یہ ہے کہ کیونکہ جمہوریتیں فطری طور پر امن پسند ہوتی ہیں لہٰذا عرب جمہوریتیں اسرائیل کو قبول کرلیں گی۔ دوسری جانب عرب جمہوری گروپس کے ترجمان اندرونی آزادیوں کو یروشلم کی بازیابی سے جوڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔

حصہ داری کی حکمرانی کا فروغ محض خالی خولی مشق نہیں ہے۔ گزشتہ سال یوروپین یونین کی ڈچ پریزیڈنسی کے موقع پر وزیر خارجہ برنارڈ بوٹ نے امن عمل کی ترقی اور ایجنڈا برائے اصلاح میں ربط کو اجاگر کیا تھا۔

غیر بیان شدہ بڑی تمہیدیں ان تصورات کو نیچے دبا دیتی ہیں۔ اسرائیل کی توجہ کی طالب خاص خاص امور یہ ہیں: غزہ سے یکطرفہ انخلا کا نفاذ، نئی فلسطینی قیادت پر دباؤ، حماس پر دباؤ میں اضافہ، روڈ میپ کے نفاذ میں امریکی اقدامات کو آخر حد تک بے اثر کرنا اور امن عمل میں بیرونی دلچسپیوں سے، لبنان، شام، ایران اور مصر میں واقع ہونے والے حالات کو سامنے لاکر توجہ کو موڑنا۔

مقصد یہ کہ آخری حل تک پہنچانے والے سارے راستوں میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ ایک متبادل منظرنامہ کو پیش کرتے ہوئے موساد کے سابق سربراہ اور حالیہ قومی سلامتی مشیر افرائیم ہلیبومی نے عرب دنیا کے بیچوں بیچ (بشمول فلسطینی علاقے) یو ایس افواج کی طویل مدتی موجودگی کی سفارش کی ہے۔

ذائقہ کی تبدیلی کے لیے مشرقی عرب دنیا کی توجہ انتخابی امور پر بھی لائی جارہی ہے جومئی میں لبنان، جولائی میں فلسطینی علاقے اور ستمبر میں مصر میں ہوں گے۔ لبنان میں ایشو بناوٹی طور پر داخلی ہے لیکن حقیقی طور سے جغرافیائی سیاسی ہے یعنی حزب اللہ کا رول اور لبنانی سیاست کے رخ کو بدلنا۔ فلسطینی اتھارٹی کے زیراثر علاقوں میں ان فائدوں کی جانب توجہ دلائی جارہی ہے جن کو حماس حاصل کرسکتی ہے۔ مصر میں مسئلہ ایک پارٹی اور ایک آدمی کی حکومت کا ہے۔

بے حد ہلکی چیزیں اگلے قدم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اگر حزب اللہ دوبارہ ایک مستند سیاسی یونٹ کے طور پر ابھرتی ہے، اگر حماس کو اکثریت حاصل ہوجاتی ہے یا وہ اچھی خاصی تعداد میں نشستوں پر قبضہ کرلیتی ہے، اگر مصر میں ایوان اقتدار میں لرزش آتی ہے تو کیا ہوگا؟ الاہرام کا خیال ہے کہ انتخابات دراصل جولوگ یو ایس۔ اسرائیل اسکیم سے تعاون کرنا چاہتے ہیں اور جو اس کے مخالف ہیں کے درمیان جدوجہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ سعودی عرب میں معتدل مگر اہم میونسپل انتخابات، جو اسی سال قبل حجاز میں رائج تھے، کا اعادہ ہے، کے پیغام کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ علما کی مہرشدہ امیدواروں کی ایک سنہری فہرست دن کی سب سے اہم خبر رہی۔ کیا یہ سب جیسا کہ ڈیوڈ ہرسٹ کا خیال ہے، ایک ظاہری تناقض کی جانب نہیں لے جارہا؟ ''استعماری امریکا کبھی اس جمہوری عرب دنیا کو پسند نہیں کرے گا جس کو ایک تبلیغی امریکا نے پھیلنے میں مدد کی ہو۔''

ولی عہد عبداللہ کا بش کی رانچ کا دورہ اہم ہے۔ اس کے نتیجہ میں باہمی دلچسپیوں کے سمجھوتہ پر مبنی 'نئے تعلقات' کا آغاز ہوا۔ سعودیوں نے اپنا یہ موقف دوہرایا کہ ''ان سب کو دعوت ہے جو، امن، اعتدال، تحمل کے اسلامی عقائد پر مضبوطی سے قائم رہنے کا درس دیتے ہیں اور اس کی تبلیغ کرتے ہیں اور جو ان اصولوں سے انحراف کرتا ہے اس کو رد کرتے ہیں۔''

اس معلومات اور غزہ اور مغربی کنارہ کے کچھ علاقوں سے اسرائیلی انخلا کی تائید کے جواب میں جناب بش نے سعودی اصلاحی اقدامات کی تعریف کی اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن میں 2005 سے پہلے داخلہ کا وعدہ فرمایا۔ اس کی توثیق کے لیے یونائیٹڈ

اسٹینس نے ولی عہد عبداللہ کے مارچ 2002 کے امن پلان کے لیے شکریہ ادا کیا لیکن اس کی تائید نہیں کی۔

اس وقت کے جاری رہنے والے کھیلوں کی پیچیدگیاں اب عیاں ہو چکی ہیں۔ ریاستی سطح پر ہر کھلاڑی دوسرے کی چالوں کو ناکام بنانا چاہتا ہے، کم سے کم دینا چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ لینا چاہتا ہے۔ ایک دوسرے میدان میں عوامی تصورات اصولوں کے بارے میں زورآور ہیں اور ان حدوں کو جاننا چاہتے ہیں جو حاصل کی جاسکتی ہیں۔ بحرین اور مصر کے احتجاج اس کا ایک مظہر ہیں اور سعودی عرب اور کویت میں تشدد اس کا دوسرا مظہر ہے۔

اس سے زیادہ بدشگونی کا واقعہ اس ہفتہ سلطان کا تختہ پلٹنے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی سازش کے الزام میں تیس عمانیوں پر مقدمہ اور ان کی سزایابی ہے۔ چارج شیٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خالص مقامی گروپ تھا۔ ملزمین کے دفاع میں کہا گیا کہ وہ دراصل 'عبادی اسلام'۔ مسلم تاریخ کا سب سے قدیم اور بااصول انحراف، کی تبلیغ کررہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصلاحات کا عمل مستقبل قریب میں حکومت کے ہاتھوں میں رہے گا۔ عرب ریاست کی باہری حدود کو مزید مضبوط کیا جائے گا تاکہ اگر اس درمیان اندرونی خلفشار واقع ہو تو سنبھالا جاسکے۔ فیصلہ کرنے کے اختیار پر جو دباؤ پڑیں ان کو گلوبلائزیشن کے لازمی اثرات سے منسوب کردیا جائے گا۔

ابھی حال ہی میں ''اندر والوں'' کے درمیان پریس کلب واشنگٹن میں امن عمل کے نازک و اہم فرق پر مباحثہ ہوا۔ کلنٹن زمانے کی تباہ کن غلطیاں شناخت کی گئیں۔ ان میں بستیوں کی سرگرمیوں کے حوالے سے زبان اور لغت میں تبدیلی اور اسرائیل کے وکیل کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ موجودہ وقت سفارتی سرگرمیوں کے لیے موزوں نہیں ہے کیونکہ ابو مازن کا ارادہ اسرائیل سے معاملہ کرنے کا ہے لیکن ان کے پاس استعداد و وسائل نہیں ہیں جب کہ اریل شیرون کے پاس وسائل و استعداد موجود ہے لیکن ارادہ کی کمی ہے۔

ایک شریک کار نے کہا کہ بش انتظامیہ کی ترجیح جمہوریت کو فروغ دینے میں ہے نہ کہ امن کو آگے بڑھانے میں۔ اگر دونوں کو ایک ساتھ بڑھانے کا راستہ نہ ملا تو ''شاید ہم اس عمل کو بغیر جمہوریت اور بغیر امن کے ختم کریں گے۔'' ایک اور شریک کار دو ریاستی حل کی جانب قدم بہ قدم رویہ پر نکتہ چیں تھے۔ ''شیرون یا تو طویل مدتی عارضی معاہدہ پسند کرے گا، یا عارضی سرحدوں کے ساتھ ایک فلسطینی ریاست، جو کہ کم و بیش ایک ہی چیز ہے۔ ابو مازن کہہ چکے ہیں کہ وہ فائنل اسٹیٹس معاہدہ سے کم کسی بات پر راضی نہ ہوں گے۔'' صدر بش اگرچہ رسمی طور پر خود کو دو ریاستی حل سے وابستہ کر چکے ہیں لیکن آپشنز کے بارے میں وہ کچھ سست خرامی سے کام لے رہے ہیں اور اس کام کو وہ اہم ترجیح نہیں دیتے۔

اس خلاصہ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ امریکی اسٹریٹجک مفادات کے لیے اسرائیل کی رفتار ہی مناسب ہے۔ عرب قائدین کے ساتھ دستخط شدہ رسمی معاہدوں میں منصفانہ، مذاکراتی تصفیہ کی بات کو دہرایا جاتا ہے۔ عرب رائے عامہ کا خیال ہے کہ صورتحال غیر منصفانہ، جبری اور تصفیوں کی جاری رکھنے والی حکومت ہے۔

اس درمیان پر جوش خطابت جاری ہے۔ صدر کے ایک بہت بڑے حامی نے لکھا ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس نے ''نوجوان، نئے اور نامعلوم پر داؤ لگانے کے لیے اپنی رضامندی کا اشارہ دے دیا ہے۔'' عوامی سیاست پر بھی توجہ مرکوز ہے۔ بیروت کے ایک ایڈیٹر جو اس موقف کے حامی ہیں نے طریقہ کار کے بارے میں ایک عملی نصیحت کی پیش کش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اصل زور طرز، کردار، اعتماد، تسلسل، واضح مقاصد، سیاق سے تعلق، قانونی جواز اور عسکریت کو ہٹانے پر ہونا چاہیے۔

عسکریت کے بارے میں مزید ثبوت اس خفیہ میمورنڈم کے متن میں موجود ہے جس کو وزیراعظم ٹونی بلیر نے مجبوراً اس ہفتہ ظاہر کیا۔ یہ 23 جولائی 2002 کو لکھا گیا تھا اور یہ اس کے اندازہ کے مطابق ''بش نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ فوجی حملہ کریں گے'' اور ''انٹیلیجنس اور واقعات اسی پالیسی کے گرد گھوم رہے ہیں۔'' اس غیر معمولی دستاویز کا ایک آخری جملہ قابل غور ہے: ''واشنگٹن میں اس موضوع پر بہت کم بحث ہوئی کہ فوجی حملہ کے بعد کیا ہوگا!''

(مئی 2005)

ایران نام کا ایک عجیب وغریب ملک

ایرانی تہذیب کا میلان جدت پسندی کی طرف ہے۔ اختراعات ایک متجسس ذہن کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ایران میں ایسے افراد اور تحریکیں اٹھی ہیں جنھوں نے اخلاقی مبادیات کے لیے کوشش کی ہے اور صورتحال کو درہم برہم کیا ہے۔ حالیہ واقعات میں بھی ایرانی شخصیات کی یہی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جون کے صدارتی الیکشن میں ظاہری تناقض کی کثرت ہے: یہ حکومت کے خلاف نہیں بلکہ نظام کے خلاف تھا۔ یہ مذہبی رہنماؤں کے خلاف تھا لیکن اسلامی انقلاب کے اصولوں کی تائید میں تھا، اصلاح پسندوں کے خلاف لیکن جمہوری تھا۔

1979 کے اسلامی انقلاب نے ایک ''آمر'' کو اکھاڑ پھینکا اور خطہ میں طاقت کے توازن کو بدل دیا۔ اس نے ایک عظیم طاقت کو ذلیل کیا، ایران کی داخلی اور خارجی پالیسی کو ازسرنو مرتب کیا اور ایک حملہ کو طاقت سے روکا۔ رفتہ رفتہ انقلابی جوش نے انقلابی معقولیت کو راستہ دیا۔ رفسنجانی کی صدارت نے جنگ کے بعد کی تعمیرنو پر توجہ دی اور داخلی اور خارجی پالیسیوں کو ضرورت کے مطابق ایڈجسٹ کیا۔ 1997 میں خاتمی کے الیکشن نے یہ ظاہر کردیا کہ عوام دور رس سیاسی اور سماجی اصلاحات کے خواہاں ہیں۔ لیکن صدر کی نیک نیتی اس معاملہ میں کافی نہیں ہوئی۔ ان کے اصلاحی پروگرام میں گارجین کونسل کی شہ پر مجلس نے اوّل تو روڑے اٹکائے اور پھر رفتہ رفتہ اس کو ختم کردیا۔

امام خمینی نے ٹوک اور توازن کا ایک ایسا واضح سیاسی نظام پروان چڑھایا جس میں ایرانی انقلاب کے تمام محرکات کے لیے گنجائش تھی۔ ایک عوامی نظام پر 'فقہا کا حکم' کی پیوندکاری کرکے انھوں نے جمہوری عناصر کو قابو میں رکھا۔ ایران کی کارروائیوں کو [illegible] لیے یہ لازمی ہے کہ اس کے ظاہری تناقض کو سمجھ لیا جائے۔ یہ ایک عوامی جمہوریت ہے جس کا سربراہ ایک قانون داں (فقیہ) ہے جو مفتی ہونے کا اہل ہے اور جو مذہبی رہنماؤں کی ایک

ایک شریک کار نے کہا کہ 'بش انتظامیہ کی ترجیح جمہوریت کو فروغ دینے میں ہے نہ کہ امن کو آگے بڑھانے میں۔ اگر دونوں کو ایک ساتھ بڑھانے کا راستہ نہ ملا تو ''شاید ہم اس عمل کو بغیر جمہوریت اور بغیر امن کے ختم کریں گے۔'' ایک اور شریک کار دو ریاستی حل کی جانب قدم بہ قدم رویہ پر نکتہ چیں تھے۔ ''شیرون یا تو طویل مدتی عارضی معاہدہ پسند کرے گا، یا عارضی سرحدوں کے ساتھ ایک فلسطینی ریاست، جو کہ کم و بیش ایک ہی چیز ہے۔ ابو مازن کہہ چکے ہیں کہ وہ فائنل اسٹیٹس معاہدہ سے کم کسی بات پر راضی نہ ہوں گے۔'' صدر بش اگرچہ رسمی طور پر خود کو دو ریاستی حل سے وابستہ کر چکے ہیں لیکن آپشنز کے بارے میں وہ کچھ سست خرامی سے کام لے رہے ہیں اور اس کام کو وہ اہم ترجیح نہیں دیتے۔

اس خلاصہ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ امریکی اسٹریٹجک مفادات کے لیے اسرائیل کی رفتار ہی مناسب ہے۔ عرب قائدین کے ساتھ دستخط شدہ رسمی معاہدوں میں منصفانہ، مذاکراتی تصفیہ کی بات کو دہرایا جاتا ہے۔ عرب رائے عامہ کا خیال ہے کہ صورتحال غیر منصفانہ، جبری اور تصفیوں کی جاری رکھنے والی حکومت ہے۔

اس درمیان پر جوش خطابت جاری ہے۔ صدر کے ایک بہت بڑے حامی نے لکھا ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس نے ''نوجوان، نئے اور نامعلوم پر داؤ لگانے کے لیے اپنی رضامندی کا اشارہ دے دیا ہے۔'' عوامی سیاست پر بھی توجہ مرکوز ہے۔ بیروت کے ایک ایڈیٹر جو اس موقف کے حامی ہیں نے طریقہ کار کے بارے میں ایک عملی نصیحت کی پیش کش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اصل زور طرز، کردار، اعتماد، تسلسل، واضح مقاصد، سیاق سے تعلق، قانونی جواز اور عسکریت کو ہٹانے پر ہونا چاہیے۔

عسکریت کے بارے میں مزید ثبوت اس خفیہ میمورنڈم کے متن میں موجود ہے جس کو وزیراعظم ٹونی بلیر نے مجبوراً اس ہفتہ ظاہر کیا۔ یہ 23 جولائی 2002 کو لکھا گیا تھا اور یہ اس کے اندازہ کے مطابق ''بش نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ فوجی حملہ کریں گے'' اور ''انٹیلیجنس اور واقعات اسی پالیسی کے گرد گھوم رہے ہیں۔'' اس غیر معمولی دستاویز کا ایک آخری جملہ قابل غور ہے: ''واشنگٹن میں اس موضوع پر بہت کم بحث ہوئی کہ فوجی حملہ کے بعد کیا ہوگا!''

(مئی 2005)

ایران نام کا ایک عجیب وغریب ملک

ایرانی تہذیب کا میلان جدّت پسندی کی طرف ہے۔ اختراعات ایک متجسس ذہن کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ایران میں ایسے افراد اور تحریکیں اٹھی ہیں جنھوں نے اخلاقی مبادیات کے لیے کوشش کی ہے اور صورتحال کو درہم برہم کیا ہے۔ حالیہ واقعات میں بھی ایرانی شخصیات کی یہی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جون کے صدارتی الیکشن میں ظاہری تناقض کی کثرت ہے: یہ حکومت کے خلاف نہیں بلکہ نظام کے خلاف تھا۔ یہ مذہبی رہنماؤں کے خلاف تھا لیکن اسلامی انقلاب کے اصولوں کی تائید میں تھا، اصلاح پسندوں کے خلاف لیکن جمہوری تھا۔

1979 کے اسلامی انقلاب نے ایک ''آمر'' کو اکھاڑ پھینکا اور خطہ میں طاقت کے توازن کو بدل دیا۔ اس نے ایک عظیم طاقت کو ذلیل کیا، ایران کی داخلی اور خارجی پالیسی کو ازسرنو مرتب کیا اور ایک حملہ کو طاقت سے روکا۔ رفتہ رفتہ انقلابی جوش نے انقلابی معقولیت کو راستہ دیا۔ رفسنجانی کی صدارت نے جنگ کے بعد کی تعمیرنو پر توجہ دی اور داخلی اور خارجی پالیسیوں کو ضرورت کے مطابق ایڈجسٹ کیا۔ 1997 میں خاتمی کے الیکشن نے یہ ظاہر کردیا کہ عوام دور رس سیاسی اور سماجی اصلاحات کے خواہاں ہیں۔ لیکن صدر کی نیک نیتی اس معاملہ میں کافی نہیں ہوئی۔ ان کے اصلاحی پروگرام میں گارجین کونسل کی شہ پر مجلس نے اوّل تو روڑے اٹکائے اور پھر رفتہ رفتہ اس کو ختم کردیا۔

امام خمینی نے ٹوک اور توازن کا ایک ایسا واضح سیاسی نظام پروان چڑھایا جس میں ایرانی انقلاب کے تمام محرکات کے لیے گنجائش تھی۔ ایک عوامی نظام پر 'فقہا کا حکم' کی پیوندکاری کر کے انھوں نے جمہوری عناصر کو قابو میں رکھا۔ ایران کی کارروائیوں کو سمجھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس کے ظاہری تناقض کو سمجھ لیا جائے۔ یہ ایک عوامی جمہوریت ہے جس کا سربراہ ایک قانون داں (فقیہ) ہے جو مفتی ہونے کا اہل ہے اور جو مذہبی رہنماؤں کی ایک

الیکٹرول کالج کا منتخب کیا ہوا ہے۔ اس کی مدت کار غیر معین ہے۔ اس کے اختیارات اور ذمہ داریاں کثیر جہتی ہیں جن میں پالیسی، تقررات اور احکامات سب شامل ہیں۔ ایران کی مقننہ براہِ راست منتخب شدہ ہے لیکن اس کے فیصلوں کی توثیق بارہ عام آدمی اور مذہبی قانون دانوں پر مشتمل ایک غیر منتخب تنظیم کرے گی جو ایک جانب وضع کردہ قانون کی اسلامی اصولوں سے مطابقت پر غور کرے گی اور دوسری جانب اس کی دستور سے ہم آہنگی پر نظر رکھے گی۔ ایران کا صدر براہِ راست منتخب ہوتا ہے وہ منتظمہ کا صدر ہے لیکن چیف ایگزیکٹیو نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور تنظیم ہے ایکسپیڈنسی کونسل۔ اس کا کام ہے کہ وہ ریاست اور ان شعبوں کے درمیان تنازعات کو حل کرے اور عوامی مفاد میں مشورہ دے۔ لہٰذا اس نظام کی مانگ ہے کہ قانونی طور سے جائز مذہبی قائد اور قانونی طور سے جائز جمہوری صدر حکومت کی آسان کارکردگی کے لیے اپنے درمیان توازن قائم رکھیں، ایسا توازن جو تعریف کے لحاظ سے اوّل الذکر کی جانب مائل ہے۔

جون 2005 کے الیکشن کے نتائج بہت واضح طور سے تبدیلی کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ نہ یہ اچانک ظاہر ہوئی اور نہ ہی اس کا فروغ خلا میں ہوا۔ انقلاب نے روایتی سماجی ڈھانچہ کو تتر بتر کر دیا اور امیدیں بڑھا دیں۔ عراق کے ساتھ طویل جنگ نے قربانیوں کی مانگ کی اور مشقتوں کو اوپر ڈالا۔ انقلاب کے بعد کے اکیلے پن نے ایرانی قوم پرستی کو مہمیز دی اور یہی کام جنگ نے بھی کیا۔ لیکن بہرحال اس کی قیمت مغربی (خصوصاً امریکی) سرمایہ کاری ساز و سامان، ٹیکنالوجی اور تجارتی مواقع سے محرومی کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ چار عناصر نے نئی بیداری کو مزید تقویت بخشی: ایک کم سن آبادی جو افزائش نسل میں تیزی کا نتیجہ تھی، شہروں کو بسانے بسنے میں تیز رفتاری، تعلیم میں فروغ اور ذرائع ابلاغ میں انقلاب۔ (1979 کے خمینی انقلاب میں آڈیو کیسٹ کا رول یہاں پر قابل ذکر ہے)۔ ایک اور انقلابی تناؤ ابھر کر سامنے آیا۔ محسن سازگارا نے اکثر افراد کی ترجمانی کی جب انھوں نے کہا: ''ہم نے انقلاب کو دوبارہ سوچنا شروع کیا اور جو ہم کر چکے ہیں اس کو دوبارہ سوچنا شروع کیا اور آزادی، جمہوریت، پارلیمنٹ اور انصاف اور دوسرے نظریات کے بارے میں

گفتگوشروع کی۔''

خاتمی کی صدارتی مدت کے آخر میں یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ ایک نسل کے پاس طاقت ہے جب کہ دوسری کے پاس مطالبات ہیں۔ ان کے مطالبات کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ اس میں بے روزگاری، دولت کی غیر مساوی تقسیم، بدعنوانیوں کی روک تھام، سماجی انصاف، آزادی رائے پر پابندی کا خاتمہ، حقوق انسانی کے لیے زیادہ احترام، سماجی پابندیوں پر ڈھیل، ایک زیادہ کھلا ہوا سیاسی نظام، اور بغیر قومی وقار کو مجروح کیے مغرب سے تعلقات میں بہتری شامل تھے۔ خاتمی کے ارادے اور صلاحیتیں سوالات وشکوک کی زد میں آ گئے۔ ایک مذہبی رہنما اور منظم فرد کی حیثیت سے انھوں نے کسی تنازعہ کو نظرانداز کیا کیونکہ اس سے منطقی طور پر نظام کی بنیادوں پر سوال اٹھیں گے۔ 2004 کے الیکشن میں مجلس کی ساخت میں تبدیلی ہوئی جو کہ کچھ حد تک اصلاح پسند امیدواروں کی خاصی تعداد کو نااہل قرار دینے سے ہوئی۔ اس نے خاتمی کے اصلاح کے پروگرام پر مہر لگا دی۔

17 جون کے الیکشن کے پہلے راؤنڈ میں سات امیدواروں نے عوامی شکایتوں کی فہرست کے مختلف پہلوؤں پر توجہ دی اور مختلف انتخابی حلقوں کو خطاب کیا۔ ایران اور ایران کے مبصرین کی بالاتفاق رائے یہ تھی کہ ووٹروں کا انتخاب اصلاح پسندوں اور جمہوریت پسندوں یا بالفاظ دیگر سابق صدر رفسنجانی اور جمہوریت وحقوق انسانی کے وکیل مصطفیٰ معین کے درمیان ہوگا۔ عجیب بات ہے کہ کسی مبصر نے تہران یونیورسٹی میں 11 جون کو ہوئی رائے شماری کا کوئی نوٹس نہیں لیا جس کے مطابق پہلے راؤنڈ میں پہلا مقام احمدی نژاد، دوسرا مصطفیٰ معین، تیسرا قالیباف اور آخری رفسنجانی کو ملا تھا! الیکشن کی زبردست ہماہمی، جو ایران کے لیے نئی تھی، نے مبصرین کو تین اہم انتخابی حلقوں سے غافل کردیا: شہر میں رہنے والے غریب، دیہاتی ووٹرز اور پارلیمنٹری باسز اور انقلاب کے محافظین (آئی آر جی سی) کی ترجیح۔ آخرالذکر دوسرے راؤنڈ کی ووٹنگ میں زیادہ تنقید کرنے لگے کچھ تو احمدی نژاد کے پایج پس منظر کی وجہ سے اور کچھ رفسنجانی کے ساتھ آئی آر جی سی کی طویل مدتی سردمہری رفسنجانی کی سیاسی زیرکی سے اکثر لوگ خائف تھے اور ایسے بھی تھے جو اُن کے آٹھ سالہ آفس ریکارڈ پر

انگلیاں اٹھاتے تھے۔ ''قائد'' کی مبینہ ترجیح نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہوگا۔ ان کے بیٹے مجتبیٰ نے مجلس کے اسپیکر حداد عادل کی لڑکی سے شادی کی تھی اور وہ احمدی نژاد کے اندرونی ٹیم میں تھے اور جب آخری نتیجہ آیا تو حداد عادل نے اپنی خوشی کا برملا اظہار کیا۔

'سرکاری طاقت' کے ممکنہ استعمال کے اس ثبوت کے باوجود موضوعی عناصر پر زیادہ مطالعہ کرنے کے میلان کو روکنا چاہیے۔ جیتنے والے کی فتح بہت واضح تھی۔ دوسرے راؤنڈ میں سینتالیس ملین رائے دہندگان نے اپنے حق کا استعمال کیا اس میں احمدی نژاد کو 61.6 فیصد اور رفسنجانی کو 35.9 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ لیکن مطلق گوشوارہ میں فاتح کو کل ووٹ ڈالنے والوں کی 35 فیصد حمایت حاصل ہوئی۔ دوسرے الفاظ میں وہ جنھوں نے رفسنجانی اور دوسرے اصلاح پسندوں کو ووٹ دیا یا ان قدامت پرستوں کو ووٹ دیا جو پہلے ہی راؤنڈ میں ہار گئے یا جنھوں نے (کسی بھی وجہ سے) ووٹ ہی نہیں ڈالا، ووٹرز کی تعداد کا اہم حصہ ہیں۔ للہٰذا یہ الیکشن ایرانی رائے عامہ میں کوئی اہم جھکاؤ کی نشاندہی نہیں کرتے جو اب بھی اصلاح پسندوں اور قدامت پرستوں میں منقسم ہے اور اس میں اعتدال پسندانہ رجحان بہت کم ہے۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ رجحان میں کیا تبدیلی آتی ہے۔

زیادہ تر انحصار اس بات پر ہوگا کہ نئے صدر کا ایجنڈا کیا ہے اور وہ کس طریقہ سے اپنے وعدہ اور اس کی ادائیگی میں واقع فاصلہ کو پُر کرتے ہیں۔ صاف گوئی، ایک منتظم کی حیثیت سے آفس ریکارڈ اور عوام کے محروم طبقہ کے مسائل کی صحیح صحیح سمجھ ان کا سرمایہ ہے۔ شیریں عبادی نے اگرچہ ان کے خلاف ووٹ دیا لیکن ان کا کہنا ہے وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے سچ بولا۔ ان سب سے الگ ان کی عمر (49 سال) ان کو ایرانی آبادی کی اکثریت سے قریب کر دیتی ہے اور انقلاب کے بعد کی دوسری نسل کو اقتدار کی منتقلی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ مذہبی رہنما نہیں بلکہ انجینئر ہیں۔ یہ بات بھی ماضی سے کاٹتی ہے اور عام لوگوں پر اچھا اثر چھوڑتی ہے۔

الیکشن کے دوران احمدی نژاد نے اسلامی انقلاب کی اقدار کی تجدید کی بات کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ وہ اوّلین انقلابی شخصیتوں جیسے بہشتی اور بہانور کے نقش قدم پر چلیں

گے۔ اس کے عملی اثرات کا اندازہ لگانا ہوگا۔ انھوں نے اپنی مذہبی سند کی وضاحت کے لیے موقعہ ملتے ہی قم کا دورہ کیا اور اپنے مرجع تقلید (ہر شیعہ کو لازم ہے کہ سماجی اور دینی معاملات میں ہدایت کے لیے ایک مرجع تقلید کا پابند ہو اور جس کو مذہبی ٹیکس ادا کیے جائیں) آیت اللہ مصباح یزدی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسلامی انقلاب کے موقف میں خود ان کی خدمات متاثر کن ہیں اور اسی طرح ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے مختلف دفتروں میں ان کا ریکارڈ بھی۔ تہران کی میئر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے الیکشن میں کہا تھا کہ ''پارسائی، نیکی، صداقت، کارکردگی، اور امانت داری منیجروں کے انتخاب کا معیار ہوں گے، میئر کا آفس بدعنوان افسروں اور مشکوک مالی لین دین سے پاک ہونا چاہیے۔''

سیاسی نظام پر الیکشن کا اثر متحد کرنے والا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس نے بنیادی قدامت پرست، اصلاح پسند/نتیجہ پسند تقسیم جو 1989 میں امام کے انتقال کے بعد شروع ہوئی اور خستمی کے عہد میں پروان چڑھی، کو ختم کردیا ہے۔ الیکشن کے نتیجہ کے ظہور کے کچھ دن بعد مجلس کا ایک وفد منتخب صدر سے ملا اور ایک مراسلہ کے ذریعہ جس میں مجلس کے 290 میں سے 260 اراکین کے دستخط تھے، اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ ایسی ہی یقین دہانی ایرانی افواج کے سربراہ، ریوولشنری گارڈز اور باسج کی قیادت سے بھی آئی۔ یہ کچھ تعجب خیز تھا کیونکہ دستور کے مطابق مسلح افواج اور گارڈز کی کمانڈ قائد کے ہاتھ میں ہے نہ کہ صدر کے۔

ان کارروائیوں سے باہر آنے والا مرکزی پیغام یہ ہے کہ ریاست کے خاص اعضا اب قدامت پرستوں کے کنٹرول میں ہیں اور اصلاح پسندوں کے تمام رنگ اب بنیادی طور سے نظام سے خارج ہیں۔ اس طرح سے انھیں صف بندی میں مدد ملے گی اور اپنی توجہ بجائے روزمرّہ کے امور میں ایڈجسٹ منٹ کے، پالیسی کے امور پر مرکوز کرے گی۔ جہاں تک قدامت پرستوں کا تعلق ہے ان کو بھی چھانٹنے کی ضرورت ہے۔ ایک وسیع سماجی بنیاد ہونے کے علاوہ احمدی نژاد اور ان کے حلقہ کا تعلق نوجوان نسل سے ہے جو انقلاب کے بعد کی دو دہائیوں کے، قدامت پرستوں سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باعمل ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش

کی دنیا کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں اور انھیں دھارے کی مخالف سمت تیرنا پسند نہ ہو۔ ان کی لغت میں حصہ داری کی طرز حکمرانی، قانون کی بالادستی، بہتر کارکردگی، جوابدہی، چست تنظیم، بہتر مینجمنٹ، بدعنوانیوں کے خاتمہ جیسے الفاظ موجود ہیں۔

لہٰذا ایک مستحکم صدارت کی توقع بجا ہے۔ سماجی اور معاشی پالیسیوں کے تئیں ان کا کیا رویہ ہوگا؟ خارجی تعلقات کو کس طرح گرفت میں لیا جائے گا؟ یہ پالیسیاں کیسے اور کس حد تک اس کے پیش رووٗں سے مختلف ہوں گی۔

الیکشن کے دوران جس نوعیت کی مہم صدر نے چلائی تھی اس کی روشنی میں عوام کو یہی امید ہوگی کہ بے روزگاری، آمدنی میں نابرابری، بدعنوانیوں اور سماجی قانون پر کام جلد شروع ہوگا۔ منتخب صدر نے کہا کہ ان کی حکومت ''پیار محبت اور اعتدال کی حکومت ہوگی۔ ہر قسم کی انتہا پسندی کو نہ صرف درکنار کیا جائے گا بلکہ ان سے سختی سے نمٹا جائے گا۔'' ان کی مہم کے دوران کیے گئے اعلانات اس سوچ پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:

> ''اگر منتخب ہوگیا تو میں عوام کی خواہشات اور انصاف کی بنیاد پر ڈیولپمنٹ پروجیکٹس جاری کروں گا۔ سیاسی، ثقافتی اور معاشی ترقی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں اور ان کی ریڑھ کی ہڈی عوام کا اتفاق رائے اور انصاف ہے۔ میری ترجیحات میں جوانوں کی بے روزگاری، رہائش اور شادی کے مسائل ہیں۔ سیاسی فروغ سے متعلق میرا نظریہ اس کی بیرونی ترجمانی سے مختلف ہے۔ ہمیں آزادی کو کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے وسیع کرنا ہے اور ان راستوں کا تعین کرنا ہے جہاں اس کا استعمال ہوسکتا ہے۔ جو سلوک ہم نوجوانوں سے شاہراہوں پر کررہے ہیں، اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔
>
> بے روزگاری کے مسئلہ کے حل کے لیے ریاست کی مالی امداد، کاشت کاروں کو اراضی کی تقسیم اور چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں کی

ضرورت ہے۔ ریاست افراد کا براہ راست تقرر کرے اور
ٹھیکیداروں کو درمیان سے ہٹا دے۔ سرکاری ملازمین کو رہائش
اور بہتر تنخواہ ملنی چاہیے۔ ریاستی بجٹ کا ایک فیصد حصہ، ینگ
پیپلز فنڈ' کی تخلیق کے لیے مخصوص کرنا چاہیے جو اور دیگر
کاموں کے علاوہ نوجوانوں کے لیے روزگار مہیا کرے گا۔''

تیل کی موجودہ اونچی قیمتیں احمدی نژاد کو نئی روزگار اسکیموں کو بنانے اور لازمی و بنیادی اجناس کی قیمتوں پر اصلاحی اقدام نافذ کرنے میں کافی سہارا دیں گی۔ اس کا مطلب ہے کہ معاشی پالیسی پر ریاست کا عمل دخل زیادہ ہوگا۔ بڑی سطح پر پھیلی ہوئی بدعنوانی پر لگام سے، صدر کو فوری عزت حاصل ہوگی اور سیاسی فائدہ بھی۔ مخصوص گروپوں کی جانب سے اس کی مزاحمت بھی ہوگی۔

سماجی کنٹرول کے مسئلہ پر تذبذب کے کئی موڑ آئیں گے۔ ایران کی نوجوان نسل مضطرب ہے اور وہی احمدی نژاد کو اقتدار میں لائی ہے۔ عمرانیات کی اصطلاح میں وہ کوئی یک سنگی مجسمہ نہیں ہیں اور سماجی کنٹرول پر ان کے مطالبات میں امتیاز برتنا ہوگا۔ زیادہ تر توقع یہی ہے کہ ہم 'عزب زدگی'۔ جدیدیت بنام مغربیت کے پرانے مباحثہ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔ انتخابی مہم کے دوران جو آزادی دیکھی گئی تھی اس سے واپسی نہ ہی آسان ہے اور نہ ہی مقبول۔ مخصوص ایرانی طرز پر سمجھوتہ کا ایک اشارہ الیکشن کے ایک دن بعد کیا گیا جب جنوبی تہران کے احمدی نژاد حامیوں کے گروپس نے شہر کے زیادہ متمول شمالی حصہ کا دورہ کیا اور وہاں نوجوانوں میں پھول تقسیم کیے۔ پالیسی کے نام پر وہ کچھ ڈھیل دے سکتے ہیں جب کہ 'اسلامی جدیدیت' کی نئی تعریف کریں گے۔

بے روزگاری اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے علاوہ، معاشی پالیسی کے نازک مسائل سود کی شرح، قیمتیں کم کرنے کے لیے امداد، نجی کاری اور بیرونی سرمایہ کاری ہیں۔ گزشتہ سالوں میں تہران اسٹاک ایکسچینج میں اچھال آیا ہے اور ٹی ایس ای انڈکس میں پچھلے پانچ سالوں میں 80 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ راست، بیرونی سرمایہ کاری کے قوانین میں ردوبدل نے کچھ درمیانہ

درجہ کے نتائج برآمد کیے ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس کی پالیسیاں سب سے بڑی رُکاوٹ ہیں۔ یہ ابھی واضح نہیں کہ اس علاقہ میں منتخب صدر کس قسم کی تبدیلیاں لائیں گے۔ کسی بھی نئی پالیسی کا اثر بازار کے لیے نازک اہمیت کا حامل ہوگا۔ ایک تاجر نے کہا کہ ''اگر وہ ہمارے معاملات میں مداخلت کریں گے تو جس رفتار سے آئے ہیں اس سے زیادہ رفتار سے واپس جائیں گے۔''

وسطی اور مغربی ایشیائی خطہ میں مرکزیت کے حامل ہونے کی وجہ سے دنیا کی نگاہیں منتخب صدر کی خارجہ پالیسی کے رویہ پر لگی ہوئی ہیں۔ یہاں ایک بار پھر نظام کی ساختی پیچیدگیاں صدر کے خارجہ پالیسی کے اختیارات کو سمجھنے کے لیے موزوں ہیں۔ دستور میں چھ دفعات ہیں جو عام اصولوں کو منضبط کرتی ہیں۔ صدر کے بجائے امام کو یہ اختیار ہے کہ وہ عام پالیسیوں اور ان کے نفاذ کی نگرانی کرے۔ امن اور جنگ کے تمام مسائل اور مسلح افواج کی نقل و حرکت بھی امام کے اختیارات میں شامل ہے۔ دستور کا ایک اور سیکشن قومی سلامتی کونسل، جس کا سربراہ صدر ہے، کو اختیار دیتا ہے کہ وہ دفاعی اور قومی سلامتی کی پالیسیاں وضع کرے لیکن ''امام کے بنائے ہوئے اصولوں کے فریم ورک کے اندر'' جو امام کی توثیق کے تابع ہوں گے۔ یہ طریقہ خود ایرانیوں کے اپنے خیال میں پیچیدہ اور طویل ہے اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

پرجوش خطابت کے باوجود، کئی سالوں سے خارجہ پالیسی کی اصل کارکردگی عملیت، احتیاط اور ایران کے راست مفادات پر توجہ سے پُر ہے۔ اس رویہ سے بہتر نتائج پیدا ہوئے اور ایران کا اکیلا پن کم ہوگیا لہٰذا اس کی امید کم ہے کہ احمدی نژاد کے تحت اس پالیسی میں کوئی تبدیلی ہوگی۔ خارجہ امور سے ان کی نامانوسیت کو ان کی کمزوری قرار دیا جارہا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی انتخابی مہم میں اس پر گفتگو کی تھی اور اس کے اہم نکات قابل غور ہیں:

> ہر ملک کے ساتھ تعلقات میں وسعت ایجنڈے میں ہے، یہ تعلقات باہمی احترام اور ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری پر مبنی اور یہ تعلقات متوازن ہونے چاہئیں۔ کچھ ممالک اس دائرہ سے ایران کے متعلق اندھے رویے کی وجہ سے خارج ہیں۔

تعلقات میں ترجیح پہلے قریب ترین پڑوسیوں کو دی جائے گی،
پھر وہ ممالک جو کبھی ایرانی تہذیب کے دائرہ میں آتے تھے،
پھر مسلم ممالک اور آخر میں وہ تمام ممالک جو ایران کے خلاف
نہیں ہیں (انھوں نے 26 جون کو ایک پریس کانفرنس میں کہا
کہ خلیج فارس دوستی اور امن کی خلیج ہے)

''ہماری خواہش ہے کہ علاقائی ریاستوں سے تعلقات میں
وسعت پیدا ہو۔ ہمارا یقین ہے کہ ویزا کوٹا ختم کر دیا جائے اور
لوگ جہاں چاہیں آزادی کے ساتھ سفر کرسکیں۔ لوگوں کو
زیارت اور تفریحی سفر کی آسانی ہو۔''

ایران کو یونائیٹڈ اسٹیٹس سے زبردستی کے تعلقات کی کوئی ضرورت
نہیں ہے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس نے ایرانی قوم کو نقصان پہنچانے کے
لیے تعلقات توڑ دیے تھے اور اسی طرح انھوں نے بھی جواب
یونائیٹڈ اسٹیٹس سے تعلقات کی بحالی چاہتے ہیں۔

اقوام متحدہ کا ڈھانچہ یکطرفہ ہے اور اسلامی دنیا کا مخالف ہے۔
1.5 بلین آبادی کی مسلم دنیا کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں
ایک نشست ملنی چاہیے۔'جہاں کچھ گروپ ویٹو کا حق رکھتے ہیں۔'

ایران کا جوہری توانائی کا پروگرام اس کا خالص اپنا ہے اور اس
میں کوئی بیرونی مدد شامل نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی ایرانی قوم کے
ہاتھ میں ہے۔ کچھ طاقتیں اس کو تسلیم نہیں کرتیں۔ مجھے یقین
ہے کہ تھوڑی سی سمجھ اور شعور سے یہ معاملہ حل کیا جاسکتا ہے۔
اس میں اپنی خوداعتمادی کے ذریعہ ایرانی قوم کی لامتناہی قوت
پر بھروسہ کرتے ہوئے موقعہ کا استعمال کرنا ہوگا۔ موجودہ
مصنوعی موڑ سیاست کے ہاتھ کی صفائی ہے۔ اس موڑ کا مقصد

اسلامی جمہوریت کی داخلی ترقی کو متاثر کرتا ہے۔ سائنسی ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ (الیکشن میں جیت کے بعد انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ وہ ای یوتھری سے مذاکرات جاری رکھیں گے اور" نہ ہی اپنا موقف اور نہ ہی ایرانی وفد کے اراکین کو بدلیں گے۔")

خطرے ایران کے لیے کوئی حالیہ وقوعہ نہیں ہیں۔ آج ایران ایک طاقتور قوم ہے اور دشمن اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

ایرانیوں کا اثر عالمگیر ہے:"ایرانی دانشوروں کی اچھی خاصی تعداد جو دنیا کے دوسرے حصّوں میں موجود ہے، ایرانی قوم کا قیمتی سرمایہ ہے۔"

اس فریم ورک اور سرکاری ڈھانچہ جو پالیسی سازی کو کنٹرول کرتا ہے سے پتہ چلتا ہے کہ یوایس ایران تعلقات میں آگے دشوار کن مقامات آئیں گے خاص طور پر ای یوتھری کے ساتھ نیوکلیر گفتگو کے مسئلہ پر۔

جولائی 2004 میں کونسل فار فارن ریلیشنز، نیویارک کی ایک خصوصی ٹاسک فورس نے یہ تجویز کیا کہ" یہ یونائٹیڈ اسٹیٹس کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ علاقائی استحکام کے فروغ کے لیے ایران سے جداگانہ مذاکرات کرے، ایران کو جوہری ہتھیار بنانے سے باز رکھے، توانائی کی بھروسہ مند سپلائیوں کو قائم رکھے، دہشت گردی کے خطرے کو کم کرے اور جمہوریت کے فقدان کو گرفت میں لے جو تمام مشرق وسطیٰ کا مسئلہ ہے۔" ایسی سیاسی گفتگو اس وقت تک التوا میں نہ رکھی جائے جب تک کہ ایرانی جوہری امنگوں اور علاقائی تنازعات میں اس کی ناگوار شرکت کے مسئلہ کو حل نہ کرلیا جائے۔ اصل میں جداگانہ تعلقات کا طریقۂ کار بذات خود ان اختلافات کو حل کرنے کی نشاندہی کرتا ہے۔ واشنگٹن کو چاہیے کہ ایران کے ساتھ مشترکہ مفادات کی جستجو کرے اور ساتھ ہی ساتھ قابل اعتراض پالیسیوں کی مخالفت بھی کرتا رہے۔

اس سفارش نے سرکاری پالیسی پر قطعاً کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ جون الیکشن سے پہلے اور بعد والے بش انتظامیہ کے بیانات سے کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ وہ پالیسی پر نظرثانی کے لیے راضی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ امریکی تقریریں اور بیانات نے ایرانی ووٹر کے ذہن میں کوئی جگہ نہیں بنائی ہے۔ وہ شعوری طور سے ان امیدواروں کو مسترد کرتے آرہے ہیں جن کے دل میں امریکہ کے لیے نرم گوشے ہیں۔ عراق میں یو ایس کی مشکلات اور اس کے نتیجہ میں تہران کے خلاف حکومت میں تبدیلی کے سیاسی تناؤ سے قطع نظر، یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوریاں جاری رہیں گی۔ وسطی ایشیا سے متعلق بدلتے ہوئے تصور سے ایران مطمئن ہوگا۔ اس درمیان ای یو تھری کے ساتھ پیچیدہ اور مشکل مذاکرات جاری رہیں گے۔

ہندوستان کا شمار احمدی نژاد کی بیان کردہ ریاستوں کے دوسرے نمبر کے زمرہ میں ہوتا ہے یعنی ایک علاقائی ریاست اور ایسی تہذیب جس کے ایرانی تہذیب سے صدیوں کے تعلقات ہیں۔ آج ہندوستان سے تعلقات قومی سلامتی مفادات کے ایک مجموعہ جو توانائی، تجارت شمال و جنوب کا ریڈور اور افغانستان کو جانے والی چابہار، زرنج روڈ دونوں ہی ایران سے گزرتے ہیں، پر مبنی ہیں۔ ایران ہندوستانی توانائی مارکیٹ میں حصہ چاہتا ہے۔ علاقائی استحکام دونوں ہی کے مشترک مفاد میں ہے۔ ایران میں صدر کی تبدیلی سے ان میں سے کسی کو خطرہ نہیں ہے۔ اس کی توقع ہے کہ اونچے اونچے الفاظ والا ''نیو فریم ورک فار یو ایس انڈیا ڈیفنس ریلیشن شپ''، جس پر 28 جون 2005 کو واشنگٹن میں دستخط ہوئے، سے قطع نظر ہندوستان ایران میں امریکی مہمات سے الگ رہے گا۔

بدعتیں کبھی کبھی بدعتیں ہی رہتی ہیں اور کبھی وہ جدید صحیح عقیدہ بن جاتی ہیں۔ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ کیا منتخب صدر کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرتے ہیں اور کل عوام، نہ صرف ان لوگوں کو جنھوں نے ان کو ووٹ دیا، کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ بلاشبہ وہ خمینی کی دستاویز کی اس نصیحت سے واقف ہیں کہ ''اسلامی انقلاب کی فتح عوام کی حمایت کی مرہونِ منت ہے...ان کی حمایت کے بغیر تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔''

(جولائی 2005)

او آئی سی اور ہندوستان: نظر ثانی کے اشارے

اپنے ہندوستان کے دورہ سے فوراً قبل، اور پھر ایک ہندوستانی روزنامہ کو انٹرویو دیتے وقت سعودی عرب کے بادشاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے یہ رائے دی کہ ''آرگنائزیشن آف دی اسلامک کانفرنس میں ہندوستان کو ایک مشاہد کا درجہ حاصل ہونا چاہیے بالکل اسی طرح جیسے کہ روس کو حاصل ہے۔'' انھوں نے مزید کہا یہ بہت فائدہ مند ہوگا اگر ہندوستان کے داخلہ کی تجویز پاکستان جیسے کسی ملک کی جانب سے آئے۔

کسی تحریری نقل کی غیر دستیابی کے باعث، سوال اور جواب دونوں ہی کے سیاق وسباق کا تصور مشکل ہے۔ ظاہری طور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب او آئی سی (یا کم سے کم اس کا ایک اہم رکن) روس کے بعد ہندوستان کو مشاہد کا درجہ دینے کے لیے جھک رہا ہے۔ اس سے ایک ترجیحی طریقۂ کار کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ یہ تجویز سے متعلق ایک عارضی عنصر کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے اور اس کو ایک آزمائشی غبارہ بنا دیتا ہے۔ پاکستان میں ہونے والے ردعمل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایسا ہی تھا اور اسی لیے غبارہ جلد ہی پھٹ گیا۔ اسلام آباد میں وزارت خارجہ کے ایک سرکاری ترجمان نے کہا کہ کوئی بھی ملک جو او آئی سی میں ممبر یا مشاہد کے درجہ کا خواہاں ہو 'کسی بھی ممبر ریاست سے کسی بھی تنازعہ میں ملوث نہ ہو'

ہندوستان کے ساتھ او آئی سی کے تعامل کی ایک تاریخ ہے۔ آرگنائزیشن بذات خود 25-22 ستمبر 1969 کو رباط میں منعقد ہونے والی اسلامی چوٹی کانفرنس کی تخلیق ہے۔ اس اجتماع کی وجہ یروشلم میں مسجد اقصیٰ کی آتشزدگی تھی۔ کانفرنس میں ہندوستان کو مدعو کرنے میں سعودی عرب کے شاہ فیصل ذاتی طور سے محرک تھے۔ انھوں نے اس دلیل کو قبول کیا کہ اسلام کے تیسرے سب سے مقدس مقام کی آتشزدگی محض مسلم ریاستوں کا معاملہ نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے اور اپنی بہت بڑی مسلمان آبادی کی وجہ سے ہندوستان بھی اس مسئلہ میں شامل ہونے کا حقدار ہے۔ بہرحال کیونکہ یہ اجتماع بین الحکومتی تھا، دعوت نامہ

صرف ہندوستانی حکومت ہی کو ارسال کیا جاسکتا تھا۔ نتیجتاً ہندوستان نے 23 ستمبر کی سہ پہر میں کانفرنس کے تیسرے سیشن میں شرکت کی۔ کانفرنس کے صدر، مراکش کے شاہ حسن نے مقررین کی مجوزہ ترتیب کو نظرانداز کرتے ہوئے 'ہندوستان کے سفیر جو اپنے ملک کی نمائندگی کررہے ہیں جب کہ کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کی نمائندگی ہونی چاہیے' کو تقریر کے لیے بلایا ہندوستانی وفد کی تقریر کانفرنس کی سرکاری تحریری نقل کا حصہ ہے۔

بعد کے ہونے والے واقعات اور اس وقت کے پاکستانی صدر کی مضحکہ خیز حرکات سب کو اچھی طرح معلوم ہیں اور انھیں دوہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، نتیجہ میں ہندوستانی وفد کو بعد میں ہونے والے کانفرنس کے ہر سیشن سے جبراً علاحدہ کردیا گیا۔ اس کے علاوہ کانفرنس کی قرارداد اس طرح تیار کی گئی کہ اس میں ہندوستانی وفد کو 'ہندوستانی مسلم کمیونٹی کا نمائندہ' بتایا گیا۔

آنے والے سالوں میں ہندوستان کو کوئی دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا اور رباط واقعہ کے داخلی سیاسی ردعمل نے اکثر افراد کو او آئی سی اور اس کی سرگرمیوں سے الگ رہنے کے خیال پر مجبور کیا یہاں تک کہ 1990 میں پاکستانی سفارتکاری نے محسوس کیا کہ ہندوستان مخالف قراردادوں کے لیے یہ ایک بہت زرخیز زمین ہے۔ اس اقدام کا مقابلہ کرنے کی عملی ضرورت سے دو چار، مختلف جگہوں پر ہندوستانی سفارتکاروں کو ہدایت دی گئی کہ وہ او آئی سی کے افسروں سے رابطہ قائم کریں اور معاملہ کی ہندوستانی صورت حال پیش کریں۔ اس مشق سے رویے تو کچھ نرم ہوئے لیکن سرکاری خطوط پر کم اثر پڑا۔

او آئی سی کے منشور کو آخری شکل مارچ 1972 میں دی گئی اور یکم فروری 1974 کو اقوام متحدہ میں رجسٹر ہوا۔ او آئی سی نے ایک بین الحکومتی تنظیم کی حیثیت کا دعویٰ کیا جس کو تسلیم کرلیا گیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی ایک معمول کے مطابق ہر سال یو این اور او آئی سی کے درمیان تعاون کی ایک قرارداد بالاتفاق منظور کرتی ہے۔ یہ بنیادی طور سے ایک معنی خیز عمل ہے، جس میں علامت کا رنگ بھی شامل تھا، کہ ہندوستان نے اس اتفاق رائے کی کبھی مخالفت نہیں کی۔

کئی مہینوں بعد اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہندوستان کے مقابلہ میں او آئی سی کی پوزیشن پر نظر ثانی کا وقت آیا اور بہت محتاط طریقہ سے اس کی ابتدا اوّل تو سوڈان نے کی اور پھر قطر نے اس کی اتباع کی۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسلسل مذاکرات کے نظر ثانی کی سوچ کو اس امید پر آگے بڑھایا کہ ایک 'مسلم موقف' کو او آئی سی میں ترقی کے لیے تنظیم کے اندر کوئی کفیل ہونا چاہیے۔

اس درمیان چیچنیا کی صورتحال سے مجبور ہوکر روس نے مسلم دنیا میں دشمنی کم کرنے کے لیے کچھ ایسے اقدامات کیے جو بعض اسباب کی خاطر قبول کر لیے گئے اور اسی وجہ سے مشاہد کے درجہ کی پیش کش کی گئی جو کہ فوراً قبول کر لی گئی۔ دوسروں کی طرح روس نے بھی اس بات کو جان لیا کہ ایک 'مسلم موقف' کو او آئی سی میں ترقی کے لیے تنظیم کے اندر کوئی کفیل ہونا چاہیے۔

اس پس منظر میں ہندوستانی حکومت نے شاہ عبداللہ کے اس مجسسانہ مشورہ پر کسی کھلے ردّعمل کا اظہار نہیں کیا ہے۔ بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ او آئی سی کو قطعی نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ ہمارے خلاف اس کی غیر دوستانہ حرکتیں عروج پر پہنچ چکی ہیں اور بظاہر اس کو بدلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ لیکن دوسری جانب ایک ایسا ہندوستان جو محصور نہیں ہے مختلف انداز میں ردّعمل کا اظہار کر سکتا ہے۔

اگر یہ مباحثہ دوبارہ شروع کیا جاتا ہے تو پھر اسے ابتدا سے شروع کرنا ہوگا۔ اگر ہندوستان اوّلین مدعوئین میں سے تھا تو اس کو ایک مشاہد کی حیثیت کی پیش کش کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اس کے بجائے سیدھے طور سے اس کی بانی رکنیت کو بحال کر دیا جائے جس کو ہاتھ کی صفائی کے ساتھ ہندوستان سے چھین لیا گیا تھا اور ایسا کرنے والوں کو کوئی سرخروئی حاصل نہیں ہوئی۔ حقیقت میں کسی متبادل حیثیت کی پیش کش اور قبولیت 1969 میں ہونے والے واقعات کو پھر سے قانونی شکل دینا ہے۔ اس وجہ سے اس کو مسترد کر دینا چاہیے۔

یہ مباحثہ ہندوستان کی انفرادیت سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ یہ مسلم دنیا کا حصہ نہیں ہے لیکن اس سے دور بھی نہیں ہے، تعداد کے اعتبار سے یہ مسلم اکثریتی ریاست نہیں ہے لیکن

دنیا کی دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی کا وطن ہے، اگرچہ یہ ایسا سماج نہیں ہے جہاں صرف مسلمانوں کی بہبود کا ہی خیال رکھا جاتا ہو بلکہ وہ ایک بڑے کل کے جزو لاینفک کی حیثیت سے ہر اس فائدہ اور توجہ کا مستحق ہے جو آبادی کے دوسرے سیکشن پاتے ہیں۔

تکثیری سماج، سیکولر سیاست اور سیاست کے جمہوری ڈھانچے کا ہندوستانی تجربہ ان تمام ملکوں کے لیے موزوں و مناسب ہے جو متجانس نہیں ہیں، اور یہ ان تمام تکثیری ثقافتی نمونوں کو ایک متبادل پیش کرتا ہے جو آج کل مغربی دنیا میں بہت دباؤ میں ہیں۔ ہندوستان تکثیریت کے فکر و عمل میں ایک سلاد کی قاب کی طرح ہے۔

دو سوالاات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کیا او آئی سی اس سوال پر دور تک جاسکتی ہے؟ کیا ہندوستان اس انجمن میں اپنی مکمل رکنیت حاصل کرسکتا ہے؟

کچھ عرصہ سے یہ بات سامنے آرہی ہے کہ او آئی سی کے ممبران انفرادی طور سے تنظیم اور اس کی کارروائیوں کے احتساب میں مصرف ہیں۔ ملیشیا نے اس میں پہلا قدم اٹھایا اس کے بعد کچھ حد تک ترکی نے جو آبادی کے لحاظ سے ایک مسلم اکثریتی ریاست ہے لیکن دستوری اعتبار سے سیکولر ریاست ہونے کی انفرادیت کی حامل ہے۔ خاتمی کے زمانہ میں ایران نے بھی ایسا ہی کیا۔ گزشتہ مہینوں میں اس تنظیم کے مقاصد پر نظرثانی اور فکر مکرر کے لیے سعودی عرب کے شاہ عبداللہ نے بھی اوّل تو مسلمان دانشوروں کی ایک کانفرنس بلاکر اور اس کے بعد او آئی سی اراکین ممالک کے سربراہان حکومت کی میٹنگ بلاکر، ان اقدامات کی ابتدا کی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ ابھی تک 1969 کے واقعات کے حصار میں ہے۔ اس کو مزید بڑھاوا او آئی سی کے منفی نظریات ہیں جو اس کی قراردادوں میں طوطے کی طرح دوہرائے جاتے ہیں۔ ان قراردادوں کو پاکستان بھی اپنی موجودہ سیاسی صورتحال میں فائدہ مند نہیں سمجھے گا۔ لیکن ان سب کے باوجود ظاہری صورتحال سے پرے بھی سوچا جاسکتا ہے۔

او آئی سی میں اقوام متحدہ کی کل تعداد میں سے 29 فیصد اراکین شامل ہیں، افریکن یونین کے 47 فیصد اور عرب لیگ، جی سی سی اور ای سی او کے سو فیصد اراکین اس کے ممبر ہیں۔ سارک کے سات ملکوں میں سے تین اور ایسیان ریاستوں میں سے تین اس کے ممبر ہیں جب کہ اس کے دو اور ممالک (فلپائن اور تھائی لینڈ) اس کی مجلسوں میں مہمان کی حیثیت سے حاضر رہتے ہیں۔ لہٰذا کثیر جہتی اجتماعات میں او آئی سی کا عنصر بہت اہم ہے اور یہ یقیناً اقوام متحدہ کی دیگر تنظیموں کے انتخابات اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

جغرافیہ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ مسلم معاشرے اور ممالک جنوب، جنوب مشرق، وسطی اور مغربی ایشیا میں ہندوستان کے پڑوس اور بیچ میں ہیں۔ ہمارے خارجی تعلقات مسلم ممالک سے روابط نمایاں رنگ کے حامل ہیں۔ اس میں زیادہ تر وجہ ٹھوس معاشی آسودگی اور ہماری ترقی پذیر صلاحیتوں کی قابل غور اہلیت کی ہے۔ ان کا ہمارے اسٹریٹجک ماحول سے تعلق ہے۔

اب سامنے یہ چیلنج ہے کہ پالیسی کی وہ کیا حدود ہونا چاہئیں جو ان تعلقات کو تقویت بخشیں۔ موجودہ وقت کے امکانات کی شرائط کو سامنے رکھتے ہوئے: (i) باہمی منافع بخش تعاون کو وسیع کریں (ii) غلط فہمیوں یا باہمی تضاد کے دائرہ کو سمیٹیں (iii) ان مفادات کو مزید آگے بڑھائیں جو ہندوستان کے حق میں ہوں۔

کئی سال پہلے اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کو ہندوستان میں ایک پروگرام شروع کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اسی طرح سے ثقافتی میدان میں بھی او آئی سی کے ملحقین سے کچھ رابطے قائم ہوئے ہیں۔ اس کو ہماری ثقافتی پالیسی کی طرح فروغ دیا جاسکتا ہے اور اس کا مقصد ہندوستان کا مسلم چہرہ دکھانا نہ ہونا چاہیے بلکہ وہ ہندوستانی چہرہ دکھانا چاہیے جس میں مسلم جھلک نظر آرہی ہو۔

نہ ہی شتر مرغ کی طرح او آئی سی کو نظرانداز کرنے اور نہ ہی گرم جوش بغلگیری سے ہندوستان کا مقصد حاصل ہوگا۔ وقفہ وقفہ کے ساتھ باہمی تعامل اور اوریجنل رکنیت پر خاموش اصرار بہترین متبادل ہوگا۔

(30 جنوری 2006)

ایران کا انتخاب اور اس کے بعد

بورڈ آف گورنرس کی میٹنگ کا جوش وخروش ختم ہو چکا ہے اور نتیجہ کے بارے میں شرکا اپنی رائے دینے میں سستی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ ایرانی ضد پر اڑے ہیں، امریکی فاتح ہیں، روسی محتاط ہیں، یوروپین مگن ہیں، چینی غیر شفاف ہیں، عرب خوش ہیں کہ انھیں اسرائیل کے خلاف ایک اور دلیل مل گئی، اسرائیل ایران کی دشواریوں پر خوش ہے لیکن ان کے جوہری ابہام پر ناخوش بھی اور ہندوستانی خودساختہ نیکوکار ہیں۔ ایک چار صفحہ کی دستاویز میں یہ سب ہونا بجائے خود ایک کارنامہ ہے!

ویانا میں کیا مسائل اٹھائے گئے؟ ان کو کس طرح سے سلجھانے کی کوشش کی گئی؟ اور یہاں سے بحث نے رخ کس طرف موڑا؟ کیا خاص کردار کچھ گنجائش دیں گے یا اپنی اپنی ضدوں پر اڑے رہیں گے؟

4 فروری کے آئی اے ای اے کی قرارداد کے تیرہ تمہیدی اور عملی سیکشن کے نو پیراگراف کا دقیق نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ ایران کی کہانی ویانا کے فاتحین کے نقطۂ نظر سے بیان کرتے ہیں۔ جنگ کے بعد کے تبصرے اس کو واضح طور سے مزید روشن کرتے ہیں۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس نے ایران وعراق میں 1991 کے بعد نافذ ہونے والی دوہری حکمتِ عملی کی ناکامی کے منطقی انجام کی وجہ سے ایران کو سلامتی کونسل میں گھسیٹ کر اپنے مقصد کو حاصل کرلیا۔ اس طریقۂ عمل میں ایران کو این پی ٹی کے تحت دیے گئے تمام حقوق بشمول جوہری تحقیق سے محروم کر دیا گیا اور اس کے اوپر وہ ذمہ داریاں اور فرائض تھوپ دیے گئے جو 'اعتماد سازی کی ایک طویل مدت' کے لیے معاہدہ سے باہر تھے۔ یہاں موضوعیت اتنی ہی یقینی ہے جتنی کہ معاہدہ ورسیلز کے معاملہ میں تھی، اسی طرح سے دماغی خلل بھی واضح ہے۔

ورسیلز کی طرف جانے میں نئے عالمی انتظامات کے انکشاف ہوئے۔ لندن میں پی فائیو پلس ون ڈنر میٹنگ میں سلامتی کونسل کی پندرہ ریاستوں کی ترجمانی اپنے ذمہ لے لی۔

ہندوستان میں اس مخصوص گروپ میں جرمنی کی حقیقی شمولیت پر کسی نے غور نہیں کیا۔ روس کی یہ تجویز کہ وہ اپنی سرزمین پر ایرانی یورینیم کی افزودگی کی اجازت دے گا، نے مغربی تائید حاصل کی اور اہمیت بھی۔ اس کے حامیوں نے دراصل ایران اور ایرانی قوم پرزار روس اور سوویت استعماری مہم جوئی نے ان کو بار بار منتشر کیا ہے۔

طریقۂ کار میں ایک جلد بازی اور سر پہ منڈلاتے ہوئے خطرہ کا احساس ہے۔ کیا واقعتاً ایسا ہی ہے؟ کیا ایران کو غیر مذکورہ اوزار حاصل ہو گئے ہیں؟ یو ایس انٹلیجنس چیف جان نیگرو پونٹے نے 2 فروری کو سینٹ میں اپنی گواہی میں حتمی الفاظ میں کہا کہ ''ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ ایران کے پاس ابھی تک کوئی جوہری ہتھیار نہیں ہے۔ اور شاید وہ ابھی تک جوہری انشقاق کا لازمی مواد بھی تیار یا حاصل نہیں کر پائے ہیں۔'' اس کے باوجود صدر اور ان کے ڈیفنس سکریٹری نے اپنی میز سے (یک طرفہ) فوجی حملہ کا آپشن نہیں ہٹایا ہے۔

5 فروری کے اسرائیلی روزنامہ 'ہارٹیز' میں خاصے انکشاف ہوئے ہیں: ''اسرائیلی انٹلیجنس کے مطابق یورینیم کی افزودگی کی شروعات سے 12 سے 18 مہینوں بعد ایران جوہری ہتھیار کی تخلیق کی جانکاری، صلاحیت اور ٹیکنالوجی کا حامل ہو جائے گا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایران کو اپنا پہلا ایٹم بم بنانے کے لیے جس مقدار میں مواد کی ضرورت ہوگی اسے حاصل کرنے میں دو یا تین سال لگ جائیں گے۔ اس کے برعکس امریکی انٹلیجنس نے آلات، مواد، ٹیکنالوجی اور جانکاری کے حصول میں دشواریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آٹھ سال کا عرصہ رکھا ہے۔''

عملی سیکشن کے پیراگراف 3 میں جو کچھ ظاہر اور پوشیدہ ہے اس میں لالچ اور مایوسی دونوں ہیں۔ ایک صفحہ کی یہ دستاویز جس کو ایران نے رضا کارانہ طور پر آئی اے ای اے انسپکٹرز پر ظاہر کیا پر ناراضگی کا اظہار ہو رہا ہے لیکن اس کے جانے مانے مبدا پر خاموشی ہے۔ دراصل افزائش وتوسیع میں اس کے رول کو چھپانے کی فکر وتشویش ویا نامشق کی احمقانہ سیاسی نوعیت پر اور زیادہ روشنی ڈالتی ہے۔ اگر ایران کی مبینہ قابل مذمت حرکات کی نمائش ہی کرنی ہے تو وہ تمام کردار۔ سرکاری یا غیر سرکاری۔ جو ان کاموں میں مدد معاون تھے، کا بھی

انکشاف کیا جائے۔ ایسا نہ کرنے پر علاحدہ گٹھ جوڑ کا گمان ہوگا۔ افزوں گروں کی فہرست خاصی متاثر کن ہے یعنی فرانس (اسرائیل کے معاملہ میں) چین (پاکستان کے لیے) اور پاکستان (ایران کے لیے)۔

اس مباحثہ میں ایک موزوں عنصر نیتوں اور صلاحیتوں کا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ نیتیں بدلتی رہتی ہیں جب کہ صلاحیتیں برقرار رہتی ہیں۔ اس پیانہ پر جرمنی، جاپان، جنوبی افریقہ اور دیگر ممالک میں افزودہ یورینیم کی مقدار باعث تشویش ہونی چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیوں؟

آخر میں ہندوستانی ردّعمل پر نظر ڈالیں۔ وزیراعظم نے اپنی پریس کانفرنس میں صحیح باتیں کہیں یعنی سفارتکاری، آئی اے ای اے کے فریم ورک میں اور اتفاق رائے سے مذاکرات۔ این پی ٹی کے تحت ایران کو تمام حقوق حاصل ہوں اور وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ لیکن ویانا ووٹ کا آخری نتیجہ ان سب کے منافی ہے۔ حکومت ریوولوشن کو ایک متوازن دستاویز قرار دیتی ہے۔ ایک قاری یہ ضرور سوچے گا کہ پھر غیر متوازن دستاویز کیا ہوگی؟ خارجہ پالیسی آخرکار بنائے مخاصمت بن گئی ہے اور اس اختلاف کے اشارے عوامی احتجاج میں ملتے ہیں۔

کوئی بھی ذی ہوش جوہری افزائش نہیں چاہتا۔ لیکن مباحثہ کا مرکزی نقطہ منتخب افزائش کو جائز قرار دینا رہتا ہے: پی فائیو کا یہ پیدائشی حق ہے، اسرائیل مغربی ایشیا میں مغرب کے مفادات کا محافظ ہے، ہندوستان و پاکستان وہ ناخواندہ مہمان ہیں جنھیں مغرب نے اپنا دوست بنا لیا ہے۔ اگرچہ جوہری اسلحہ کی تخفیف این پی ٹی کی لازمی شق ہے لیکن وہ ناقابل ذکر ہی رہتی ہے۔

اسی طرح سے ایران کی عزت وقار کا احساس اور مغربی حاکمیت کے خلاف اس کی مزاحمت کی طویل تاریخ بھی قابل ذکر نہیں سمجھی جاتی۔ ہندوستانی عوام حساس اور ذی فہم ہیں لیکن کیا یہی بات اس دانشور طبقہ کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جو غرب زدگی کا متلاشی ہے۔

(18 فروری 2006)

مغربی ایشیا کے بحران میں متبادل رویے

اس کی ابتدا ایران میں سو سال قبل 1906 میں ہوئی۔ مطالبہ ایک 'عدالت خانہ' کا تھا۔ کچھ ہی مہینوں میں ایک منتخب مجلس قائم ہوگئی۔ ایک سال بعد برطانوی و روسی موافقت نے ایران کو برطانوی و روسی زیراثر علاقوں میں تقسیم کردیا اور درمیان میں ایک چھوٹا سا غیر جانبدار علاقہ چھوڑ دیا۔ مورخ نکی کیڈی نے لکھا ہے کہ 'اس معاہدہ میں نہ ایرانیوں سے کوئی مشورہ کیا گیا اور نہ ہی ان کو شرائط سے آگاہ کیا گیا'۔

1904 میں پیرس میں نجیب آزوری نے 'لیگ ڈی لا پاٹرے عریب' قائم کی جس کا مقصد شام اور عراق کو عثمانی سلطنت سے آزادی دلانا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران عرب قوم پرستی کی شورشیں جنگی مہم کی استعماری سازشوں میں پھنس کر رہ گئیں۔ 1916-1915 کی حسین، میک موہن مراسلت میں جو وعدے کیے گئے تھے وہ مئی 1916 کے سائیکس، پکوٹ معاہدہ میں منسوخ کردیے گئے۔ جب انقلابی روس نے اس کو عوام پر ظاہر کیا تو اس کو 'پُرعناد بالشویک تصورات کا واہمہ' قرار دے کر مسترد کردیا گیا۔

دونوں ہی بلکہ اور بھی کئی مثالوں میں مغرب سے مقابلہ آرائی میں مغربی ایشیا کی یادداشت مغرب کی ہٹ دھرمی، دھوکے بازی، عہد شکنی اور قبضہ سے پُر ہے۔ تاریخ اس پر گواہ ہے۔ آج کے زمانے میں فلسطین، عراق اور ایران میں اس کی نشانیاں ہیں۔ ان میں سے ہر معاملہ میں مغربی نسخہ پہلے سے لکھا لکھایا ہے لیکن کامیاب نفاذ کی صلاحیت سے محروم ہے۔ ہر معاملہ میں قوت کے بڑے فرق کے باوجود مقامی ردّعمل منفی ہی رہا ہے۔ کیا اس سے استحکام میں مدد ملی ہے؟

فلسطین میں 1967 اور عراق میں 2003 سے مقبوضہ اراضی کا تجربہ روسو کے اس فیصلہ کی تائید کرتا ہے کہ ''سب سے طاقتور شخص بھی اتنا طاقتور نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ آقا بنا رہے۔'' اسی طرح سے ایران نے دکھا دیا ہے کہ بیرونی دباؤ سے ہمیشہ مزاحمت کی غیر معمولی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ مشرق وسطی سے متعلق عظیم منصوبے بارآور نہیں ہوئے۔ 9/11 نے دوبارہ فکر کرنے پر مجبور کیا لیکن تمام لوازمات غلط اور خلاصے مغالطہ آمیز تھے۔ اس عمل میں ہینس مور گنتھاؤ کا یہ قول بھلا دیا گیا کہ کامیاب سیاست گری کا انحصار ''سیاسی حقیقت سے بے تعلق ہوئے اصولوں کے ایک مجموعہ اور سیاسی حقیقت سے اخذ کیے ہوئے اصولوں کے دوسرے مجموعہ کے درمیان انتخاب پر ہے۔''

2003 میں عام طور پر یہ دلیل دی جاتی تھی کہ عراق میں حکومت کی تبدیلی اور جمہوریت کی آمد وہ حالات پیدا کرے گی جو فلسطینی، اسرائیلی مسئلہ کا حل اور کوارٹیٹ روڈ میپ کے نفاذ کے لیے سازگار ہوں گے۔ اب یہی دلیل ایران کے لیے دی جارہی ہے۔ تینوں کو ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بتایا جارہا ہے۔ تو کیا یہ ایک پیکیج حل کے لیے قابل غور نہیں ہوگا؟ کیا ایسا کوئی رویہ حکومت میں تبدیلی جیسے مذموم آپشن سے زیادہ مثبت حل پیش کرے گا؟

شاید بنیادی حدود کے دوبارہ مطالعہ سے شروعات ہوسکتی ہے۔ ان کا تعلق اس یقین سے ہے کہ (i) خلیج فارس کے تیل تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذرائع پر سیاسی کنٹرول حاصل ہو (ii) مغربی ایشیا کی حکمرانی کے نیو اجدادی نظام جو حکومت کے استحکام و سلامتی کے لیے بیرونی حمایت پر منحصر رہتے ہیں، سپلائی کی یقین دہانی میں، ساز باز کرنے کی جانب مائل ہیں (iii) علاقہ میں انقلابی حکومتوں۔ ایران اور شام۔ کو نظرانداز اور تنہا چھوڑا جاسکتا ہے۔ (iv) کبھی کبھی پھٹ پڑنے کے باوجود عوامی رائے کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے (v) اسرائیل کو اس کی یقینی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی سرحدوں کی پہچان کے لیے نئی زمینی حقیقتوں کی تخلیق کرے اور اس کی سلامتی کے مطلوبہ لوازمات جو اس کی بالادستی کے ضامن ہوں، اور (vi) دیدہ زیب پیکیجنگ اور چست و چالاک انداز فروخت سے خطہ کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو بے ترس دباؤ یا طاقت کا استعمال ناگزیر ہوگا۔

ہر تمہید متنازعہ ہے۔ ایک ساتھ مل کر نہ یہ سلامتی مہیا کرسکے ہیں اور نہ ہی استحکام لہٰذا متبادلوں کی تلاش ناگزیر ہے۔ رشتوں و رابطوں کو دیکھتے ہوئے تین راستوں یا پگڈنڈیوں پر متوازی اور فوری ترقی کے مقابلہ میں ترجیحات سے گریز کرنا ہوگا۔

فلسطین میں، بغیر مکمل ریاست کے نہ ہوتے ہوئے بھی فلسطینیوں نے ثابت کردیا ہے کہ وہ مائل بہ جمہوریت ہیں۔ ایک قوم جو امتیازی طریقہ سے جمہوریت کا انتخاب کرتی ہے یقیناً آزادی اور بیرونی قبضہ سے نجات کی مستحق ہے۔ ایریل شیرون نے کوارٹیٹ روڈ میپ کو پہلے تو موخر کیا اور پھر برباد کردیا۔ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس نے صریح الفاظ میں مقبوضہ اراضی پر دیوار کی تعمیر سے منع کیا۔ رفتہ رفتہ یہ دلیل عملی اور اخلاقی طور سے اسرائیل کے خلاف جارہی ہے۔ اس تعطل کو کچھ فلسطینی اور اسرائیلی سربرآوردہ عوامی شخصیات کے مشترکہ طور پر تیار کیے ہوئے غیرسرکاری جنیوا اکارڈ کوتسلیم کرکے توڑا جاسکتا ہے۔

اس معاہدہ کا عالمی طور سے اور خود اسرائیل میں خوش دلی کے ساتھ استقبال ہوا لیکن لکویڈ حکومت کی جانب سے نہیں۔ یہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ''امن کے لیے جنگ اور تصادم کی منطق سے امن اور تعاون کی منطق کی طرف جانا ہوگا۔'' یہ موجود معاہدوں اور تجاویز پر کہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان مستقل سرحدیں 4 جون 1967 کے خطوط پر ایک ایک کے تناسب سے ترمیم کی گنجائش کے ساتھ ہونی چاہئیں، پر اس معاہدہ کو تعمیر کرتے ہیں اور یہ دستاویز سے منسلک ایک نقشہ میں ظاہر ہونا چاہیے۔ تمام فریق دہشت گردی اور تشدد کی ہر شکل کی مذمت کریں گے اور ایسے قوانین وضع کریں گے جس سے بازیابی کے لیے اشتعال انگیزی کی روک تھام ہوسکے۔ وہ بین الاقوامی کمیونٹی کے ساتھ مل کر ایک ایسے محفوظ اور مستحکم مشرق وسطیٰ کی تعمیر کے لیے کام کریں گے جو اجتماعی تباہی کے روایتی و غیر روایتی ہتھیاروں سے پاک ہو۔ یروشلم کی انفرادی حیثیت کوتسلیم کیا گیا اور عملی طور سے قابل قبول انتظامات کے مشورے بھی پیش کیے گئے۔ یہاں تک کہ پناہ گزینوں کا متنازعہ مسئلہ بھی تسلیم کیا گیا اور معاوضہ کے اصول کو بھی۔ ''رہائش کی مستقل جگہ'' کے آپشن کی پیش کش بھی کی گئی بشرطیکہ وہ اسرائیل کے اقتدار پر اثرانداز نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کثیر جہتی انتظام کی مختلف جماعتوں کی مدد سے نافذ ہوگا۔

عراق کی کہانی 16 اکتوبر 2003 کے رمسفیلڈ میمورنڈم میں پہلے ہی سے بیان کردی گئی ہے: ''ہمارے پاس وہ پیمانے نہیں ہیں جن سے ہم جان سکیں کہ ہم دہشت گردی

کے خلاف عالمی جنگ جیت رہے ہیں یا ہار رہے ہیں... قیمت اور نفع کا تناسب ہمارے خلاف ہے۔'' تیس مہینوں بعد صورتحال کی سنجیدگی سے واقف ہیں۔ لیکن شعور اور عام سمجھ بوجھ کے بجائے سیاسی پیچ وخم اب بھی حاوی ہیں۔

ایران کے ساتھ مذاکرات لازمی ہیں لیکن کافی نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ عراق کے دیگر تمام پڑوسی باہمی تعاون کی صورت میں عراق کی زمینی سرحدوں کے تحفظ کی ضمانت دیں۔ بدلے میں وہ عراق کے سیاسی نظام کی ترتیب پر یقین دہانی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک تکثیری سماج میں جمہوری فریم ورک کے اندر مساوات لازی عنصر ہوتا ہے۔ اکثریت کا استبداد استحکام کی راہ سے ہٹا دے گا۔ اگر چہ تاخیر ہو چکی ہے لیکن اتنی تاخیر بھی نہیں ہوئی کہ باہمی تعاون کی مشق کو شروع نہ کیا جا سکے۔

عراق میں دوسرے اصلاحی اقدام بھی لازمی ہیں۔ دستور کی دفعہ 69 میں مذکور دوسرے ایوان کا قیام ابھی باقی ہے۔ دفعہ 108 اور 109 تیل اور گیس کے وسائل کے مسخ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں اور یہ مساوات و استحکام کے لیے نیک شگون نہیں ہے۔ خواہ اس میں کتنی ہی خواری ہو لیکن اتحادی افواج کی واپسی اور یو ایس اڈوں کے بند ہونے کے ایک ٹائم ٹیبل کا اعلان ضروری ہے تا کہ بغاوت کے ایک اہم حصہ کے درجہ حرارت کو ٹھنڈا کیا جا سکے۔

اس زنجیر کی تیسری کڑی ایران ہے جس کو یونائیٹڈ اسٹیٹس کے لیے سب سے مشکل مسئلہ کہا جاتا ہے۔ ایران کی لغزشوں سے قطع نظر یہ مطالبہ کہ ایران کو ثابت کرنا چاہیے کہ اس کے پاس ہتھیاروں کا کوئی پروگرام نہیں ہے احمقانہ ہے کیونکہ آئی اے ای اے کی برسوں کی تفتیش سے یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ ایسا ہے۔ حال ہی میں ایمبسیڈر نیگروپونٹے اس صورتحال کو یوں بیان کیا: ''فی الوقت صورتحال یہ ہے کہ اگر چہ ہمیں یقین ہے کہ ایران کا جوہری ہتھیار حاصل کرنے کا پکا ارادہ ہے، لیکن ہماری یہ جانکاری بھی صحیح ہے کہ انھیں ابھی دھماکہ دار مواد حاصل کرنے اور اس کو جوہری ہتھیار کی شکل دینے میں کئی سال درکار ہوں گے، شاید یہ اگلی دہائی میں ممکن ہو۔''

ان کے بیان کے یہ الفاظ زیادہ فعال تھے: ''ایران میں نئی قیادت سے تشویش
ہے''۔ 21 اپریل کے فنانشیل ٹائمز کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ موجودہ سفارتی داؤ پیچ
ایران کے جوہری پروگرام کو سست رو کرنے کے لیے ہیں جب کہ اس سے بھی زیادہ تیز
کوششیں آخری حل یعنی حکومت میں تبدیلی کے لیے جاری ہیں۔''

ایران کے معاملہ کو سلامتی کونسل میں لے جانا اور جوہری ہتھیاروں کی مہارت کا
استعمال کرتے ہوئے ایرانی سہولتوں پر بمباری کرنے کا مبینہ منصوبہ دراصل نظام کو غیر موثر
. اور غیر مستحکم بنانا ہے۔ ایران کی قوم پرستی کے جذبہ کو دیکھتے ہوئے شاید ایسا ہونا ممکن نہ ہو۔
یہاں تک کہ ملک سے باہر موجود حکومت مخالف عناصر نے بھی ایک اور احمد شلبی کے ظہور
سے محتاط رہنے کے لیے متنبہ کیا ہے!

ایرانی امور کے اکثر ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ایران کا اصل مسئلہ سلامتی
ہے لیکن ضروری نہیں کہ یہ تحفظ جوہری ہتھیاروں کے ذریعہ ہی ہو جو کہ ابھی پہنچ سے دور
ہیں۔ یہ تحفظ چار اہم موضوعات پر سنجیدہ مذاکرات سے حاصل ہوسکتا ہے: عراق، خلیج فارس کی
سلامتی، فلسطینی اسرائیلی مسئلہ کا تصفیہ اور عالمی توانائی مارکیٹ میں ایران کا کردار۔ (اور توانائی
سے متعلق ٹیکنالوجی اور سرمایہ کاری کی ایرانی تلاش)۔ وہ اس نظریہ میں مشترک ہیں کہ ان
دونوں میں سے کسی ایک سے بھی ایران کا اخراج منفی اثرات ڈالے گا۔

ایران کا جوہری مسئلہ ایک وسیع تر فریم ورک میں حل کیا جاسکتا ہے۔ ایران، مصر،
سعودی عرب اور گلف کوآپریشن کونسل کی دیگر ریاستیں مغربی ایشیا میں جوہری اور عالمی تباہی
کے ہتھیاروں سے پاک علاقہ کی حامی ہیں۔ مارچ 2002 کی عرب لیگ قرارداد اور اس
کے بعد اسرائیلی فلسطینی اکارڈ کے مطابق عرب ریاستوں اور اسرائیل کے درمیان ایک سمجھوتہ
یقیناً اس تحریک کو مہمیز دے گا۔

دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے: تینوں تنازعوں کا جاری رہنا یا باہمی
تعاون کا ایک متبادل مثالی نمونہ۔ کیا اس سلسلہ میں مارکیتھو کا کلیہ کوئی راستہ دکھا سکتا ہے؟

(یکم مئی 2006)

یونائیٹڈ اسٹیٹس اور آزادی کی حکمت عملی

جامع پیکیجنگ، جی ایٹ کی حمایت اور اعلیٰ اشتہار بازی کی معیت میں اس کا اعلان بہت دھوم دھام کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے بارے میں عرب حکومتیں اندیشوں، عرب قدامت پرست شکوک اور عرب آزاد خیال امید میں مبتلا تھے۔ ایک پورے خطہ میں بیرونی دباؤ کے تحت اندرونی تبدیلی لانے کے لیے اس ظاہری مشق کو پوری دنیا نے بڑی حیرت سے دیکھا۔

دو سال بعد اس ہفتہ لندن روزنامہ القدس العربی کے محترم مدیر عبدالباری اتوان نے اس کا ایک عرب تجزیہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ لیبیا (سفارتی تعلقات کی بحالی)، مصر (واشنگٹن میں جمال مبارک کا استقبال) اور فلسطین (حماس کو بھوکا مار کر اطاعت گذاری) سے متعلق امریکی حرکات نے اس تحریک کی صداقت کو مکمل طور سے مجروح کیا ہے۔ جناب اتوان کے تبصرہ کے نکات یہ ہیں: ''امریکی انتظامیہ جمہوریت اور جدید عرب آزاد خیالی کو ان عرب آمریتوں کے خلاف ترپ کے پتہ کی طرح استعمال کررہے ہیں جن کی خلاف ورزیوں کو یہ پچھلے پچاس سال سے نظرانداز کرتے رہے اور جن کے جبر و استبداد کی حمایت کرتے رہے۔ ان کا مقصد تین خاص اہداف کا حصول ہے۔ اوّلین مقصد اسرائیل کی سپر پاور کی حیثیت اور تعلقات میں خوش گواری کو برقرار رکھنا ہے، دوسرا تیل کے بہاؤ کو جاری رکھنا اور کسی بھی علاقائی طاقت کو جو اس کے وسائل، ریزروس اور پائپ لائن پر امریکی بالادستی کو ختم کرنے کی دھمکی دے، کو روکنا اور تیسرا دہشت گردی سے لڑنا، اور دہشت گردی سے مراد اسلامی بنیاد پرست دہشت گردی ہے، اور مزید یہ کہ کسی بھی اعتدال پسند یا انتہا پسند اسلامی تحریک جو اس خطہ سے متعلق امریکہ کے منصوبے کو ناپسند کرتا ہو، اقتدار میں آنے سے روکے۔''

جناب اتوان نے کہا کہ ''فاقہ زدگی، آمروں اور حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں کی حمایت کی پالیسی کے نتیجہ میں انتہا پسندی بڑھ رہی ہے، دنیا اب کم محفوظ ہے، القاعدہ

روز بروز طاقتور ہوتی جارہی ہے اور اس کے نظریات پھیل رہے ہیں۔''

انھوں نے اشارہ کیا کہ اگر امریکی میزائلوں کا رُخ ایران کی جانب ہوا تو اور کئی القاعدہ ظہور میں آئیں گے۔

عرب دنیا میں احساس محرومی اور اندیشے واضح طور سے موجود ہیں اور وہ تیل کی بے پناہ دولت کی لہر اور علاقائی اسٹاک مارکیٹ کی پر جوش سرگرمیوں میں غرق نہیں ہوئے ہیں۔

دوسرے تبصرہ نگار قدرے نرم رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ موجودہ صورتحال کو تعطل کا ایسا وقفہ قرار دیتے ہیں جس کے دوران اصلاحی عمل کے پہلے فیز سے حاصل ہوئے سبق کو عوام اور حکومتیں ہضم کررہی ہیں۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس کے متعلق جناب التوان کے اندازے پچھلی تحریروں کی تائید کرتے ہیں۔ اکتوبر 2005 میں یونیورسٹی آف میری لینڈ میں انور سادات چیر کے حامل شبلی تلیمانی اور زوربی انٹرنیشنل نے چھ عرب ملکوں، مصر، اردن، لبنان، مراکش سعودی عرب اور یو اے ای میں ایک رائے شماری کی تھی۔ ساٹھ فیصد افراد کا خیال تھا کہ جمہوریت کا فروغ یونائیٹڈ اسٹیٹس کا حقیقی مقصد نہیں ہے۔

یہ دراصل تیل (76 فیصد)، اسرائیل ترقی (68 فیصد)، بالادستی (63 فیصد) اور مسلم دنیا کو کمزور (59 فیصد) کرنا ہے۔ ستر فیصد افراد اسرائیل کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے ہیں اس کے بعد یونائیٹڈ اسٹیٹس (63 فیصد) اور ایران (6 فیصد)۔ ساٹھ فیصد یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایران پر دباؤ کو ختم ہونا چاہیے حالانکہ 43 فیصد افراد کی رائے ہے کہ ایران جوہری ہتھیار بنانے کی کوشش کررہا ہے۔ ایک تازہ ترین عنصر عرب دنیا میں محمود احمدی نژاد کی بے پناہ مقبولیت ہے۔

امریکی رائے کافی حد تک ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہے۔ دو بنیادی سوالات بار بار دوہرائے جاتے ہیں: کیا جمہوریت کا فروغ یو ایس کے مفادات کے حق میں ہے؟ اگر ایسا ہے تو ایسی پالیسی کا نفاذ کس طرح ہوگا؟ 2006 میں (2003-2004 کے برعکس)

اس کا جواب یہ ہے کہ جمہوریت باہر سے نہیں تھوپی جاسکتی ہے، امریکی مفادات ایک آہستہ رو اور پیمانہ بند تبدیلی جس کی رفتار حکومتیں طے کریں گی، سے بہتر طور پر دیکھے بھالے جاسکتے ہیں۔ اپنے فعال معنوں میں ترقی کو ایک طرف رکھ دیا گیا ہے۔

لہٰذا وہ جن کا یقین اس کے برعکس تھا، محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔

مغربی ایشیا سے متعلق یونائیٹڈ اسٹیٹس کے نظریات میں رابطوں کو تسلیم کرنے کی نااہلی یا غیر رضامندی ہے۔

اس کی ایک بہترین مثال ایک کونسل فار فارن ریلیشنز ٹاسک فورس کا یہ بے کیف اصرار ہے: ''یونائیٹڈ اسٹیٹس کو چاہیے کہ وہ مشرق وسطیٰ میں جمہوری اصلاحات کی حمایت کرے خواہ اس سے امن کی جانب ترقی ہو یا نہ ہو۔'' ریکارڈز کے دقیق تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سے کوئی بھی امریکا کے عظیم تر مقاصد کے لیے موزوں تصور نہیں کیا جاتا۔

عراق کے ناکام تجربہ نے 2003 کے ایجنڈے سے واپسی پر مجبور کیا۔ اگرچہ بے دلی کے ساتھ لیکن آخرکار بش اور بلیئر کی جوڑی نے تسلیم کیا کہ غلطیاں سرزد ہوئیں، ابوغریب کے واقعات رونما ہوئے، میرینز نے بے گناہ شہریوں کا قتل عام کیا، مزاحمت کا وجود ہے اور اس کو کم آنکا گیا۔ اور یہ تسلیم کرنا ابھی باقی ہے کہ اس فساد کی جڑ عراق پر حملہ اور اس کو برباد کرنے کی ایک سازش تھی۔

اب تو دوست بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اینٹی ڈیفیمیشن لیگ کے ابراہم فوکس مین کا یہ تبصرہ قابل غور ہے: ''بنیادی طور سے ہم صدر سے کہہ رہے ہیں کہ ہم (اسرائیل کے دفاع کے لیے آپ کے وعدہ کو) سراہتے ہیں اور اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن کیونکہ یہ مباحثہ عراق سے متعلق ہے جہاں لوگ ہم پر الزام رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، آپ کو یہ بات اتنی کثرت اور بلند آواز سے نہیں کہنا چاہیے۔ یہودی کیونٹی کے اندر آپ کے لیے شکرگزاری کے جذبات ہیں لیکن کوئی شکریہ نہیں۔''

کیا یہ ممکن ہے کہ بدلتی ہوئی صورتحال یو ایس انتظامیہ کو اسرائیل و فلسطین مسئلہ کو

حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے پر مجبور کرے اور وہ اسرائیل سے کہے کہ امن اور مستقل سرحدوں سے متعلق مذاکرات فلسطینیوں کے ساتھ ہوں نہ کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ساتھ۔ یہ ایک عمل جو قبضہ، خوف اور انتشار سے نجات کی طرف لے جاتا ہے آزادی، امن، جمہوریت اور یوایس کے ایک بہتر امیریشن کے لیے تمام ادھ کچی پکی تحریکوں سے زیادہ کام کرے گا۔

اونچی بولیاں مشکل نیلام

حال ہی میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے ایک سابقہ افسر نے انکشاف کیا ہے کہ مئی 2003 میں ایران نے یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ساتھ مصالحت کی تجویز رکھی تھی۔ اس سے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ طرفین کے پچھلے تین سال کے اقدامات اور جوابی اقدامات کا دوبارہ تجزیہ کیا جائے۔

ہنری کیسنجر نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ آخر روزویلٹ سے لے کر کارٹر تک یوں ہر صدر یونائیٹڈ اسٹیٹس اور دوستانہ ایران میں مفادات کے متوازی ہونے کی تائید کرتا ہے، لکھا ہے کہ 'ایران مصر اور چین کے ساتھ خودمختار حکومت کی طویل ترین تاریخ کا حامل ہے، لہٰذا 1979 کا قطع تعلق بہت ہی تکلیف دہ تھا اور اس نے زخم کے نفسیاتی نشان چھوڑ دیے'۔

1985 میں کچھ خوش فعلیوں کے ساتھ تعلقات میں سدھار کی اوّلین کوشش کی گئی تھی لیکن یہ کوشش سخت ناکام ہوئی۔

1990 میں امریکی پالیسی ساز اس فکر میں تھے کہ وہ ایران سے آنے والے خوش نما گیتوں سے مسحور نہ ہوں لہٰذا انھوں نے ایسی پالیسی اختیار کی جو مخالفت کے سدباب اور مقابلہ آرائی کے درمیان لچکتی تھی۔

محمد خاتمی کا 'تہذیبی مذاکرہ' والے رویہ کا واشنگٹن میں استقبال کیا گیا۔ 1997 کے آخر میں سوئس سفارتکار تہران امریکا کا یہ پیغام لے کر پہنچے کہ وہ گفتگو کے لیے راضی ہیں۔ اسی بات کو سعودیوں کے ذریعہ 1998 کی ابتدا میں دوہرایا گیا۔ اپریل میں بل کلنٹن نے ماضی میں ہوئی ناانصافیاں، مذاکرات اور ''آخرکار بنیادی ہم آہنگی'' کے متعلق بات کی۔

مارچ 2000 میں سکریٹری آف اسٹیٹ میڈیلین آل برائٹ نے 1953 میں وقوع پذیر ہوئے مصدق واقعہ پر معذرت کی لیکن ایرانی پالیسیوں پر ''غیر منتخب ہاتھوں'' کے کنٹرول کا تذکرہ کر کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

بش انتظامیہ کا ایران پر پرزور بیان افغانستان کے مسئلہ پر باہمی عملی تعاون میں تبدیل ہوگیا۔ بون میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا اور کانفرنس کو کامیاب بنایا۔ اور عراق پر حملہ کے وقت ''غیر مددگار'' نہیں تھا اور جنگ کے تعمیر نو کے کاموں میں قابل قدر تعاون دیا۔

یہی وہ مرحلہ ہے جہاں صدر جارج ڈبلیو بش کے تحت نیشنل سیکورٹی کونسل کے ایک اہلکار فلنٹ لیوریٹ کا نیا انکشاف تصویر کو مکمل کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے 24 جنوری 2006 کے نیویارک ٹائمز میں اس کا حوالہ دیا۔ اس کاغذ کا متن جو سوئس کے ہاتھوں بھیجا گیا تھا اب جا کر منکشف ہوا ہے۔

اس دستاویز کو بہت احتیاط سے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ تفصیل کے ساتھ ایرانی اور امریکی اہداف کا ذکر کیا گیا اور مذاکرات کے انعقاد کے لیے ایک طریقہ عمل بھی تجویز کیا گیا ہے۔ اہداف کے باب میں اس کا مشورہ ہے کہ طرفین الگ الگ لیکن بیک وقت ایک دوسرے کے احترام میں مذاکرات کو قبول کریں اور ہر فریق ایجنڈے کے لیے بنیادی توجہ کے طالب چھ مسائل کی ایک ایک فہرست تیار کرے۔

سب سے پہلے ایرانی اہداف کا ذکر ہے: ایران کی جانب یو ایس برتاؤ میں تبدیلی، منجمد اثاثہ پر تمام پابندیوں اور بندشوں کا خاتمہ، عراق میں جمہوری اور نمائندہ حکومت کی حمایت، عراق میں ایرانی قومی مفادات کا احترام اور نجف اور کربلا سے دینی رابطے، پرامن جوہری ٹیکنالوجی، بائیوٹیکنالوجی، کیمیکل ٹیکنالوجی تک مکمل رسائی، خطہ میں ایران کی سلامتی کے جائز قانونی مفادات کو تسلیم کرنا جو دفاعی صلاحیت کے ساتھ ساتھ چلے، ایرانی مخالف دہشت گرد گروپس کے خلاف کارروائی۔

یو ایس کی فہرست میں بھی صاف گوئی سے کام لیا گیا ہے: مکمل شفافیت بشمول

حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے پر مجبور کرے اور وہ اسرائیل سے کہے کہ امن اور مستقل سرحدوں سے متعلق مذاکرات فلسطینیوں کے ساتھ ہوں نہ کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ساتھ۔ یہ ایک عمل جو قبضہ، خوف اور انتشار سے نجات کی طرف لے جاتا ہے آزادی، امن، جمہوریت اور یو ایس کے ایک بہتر امیریشن کے لیے تمام ادھ کچی پکی تحریکوں سے زیادہ کام کرے گا۔

اونچی بولیاں مشکل نیلام

حال ہی میں نیشنل سیکورٹی کونسل کے ایک سابقہ افسر نے انکشاف کیا ہے کہ مئی 2003 میں ایران نے یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ساتھ مصالحت کی تجویز رکھی تھی۔ اس سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ طرفین کے پچھلے تین سال کے اقدامات اور جوابی اقدامات کا دوبارہ تجزیہ کیا جائے۔

ہنری کیسنجر نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ آخر روز ویلٹ سے لے کر کارٹر تک یوں ہر صدر یونائیٹڈ اسٹیٹس اور دوستانہ ایران میں مفادات کے متوازی ہونے کی تائید کرتا ہے، لکھا ہے کہ 'ایران مصر اور چین کے ساتھ خودمختار حکومت کی طویل ترین تاریخ کا حامل ہے، لہٰذا 1979 کا قطع تعلق بہت ہی تکلیف دہ تھا اور اس نے زخم کے نفسیاتی نشان چھوڑ دیئے۔

1985 میں کچھ خوش فعلیوں کے ساتھ تعلقات میں سدھار کی اولین کوشش کی گئی تھی لیکن یہ کوشش سخت ناکام ہوئی۔

1990 میں امریکی پالیسی ساز اس فکر میں تھے کہ وہ ایران سے آنے والے خوش نما گیتوں سے مسحور نہ ہوں لہٰذا انھوں نے ایسی پالیسی اختیار کی جو مخالفت کے سد باب اور مقابلہ آرائی کے درمیان لچکتی تھی۔

محمد خاتمی کا 'تہذیبی مذاکرہ' والے رویہ کا واشنگٹن میں استقبال کیا گیا۔ 1997 کے آخر میں سوئس سفارتکار تہران امریکا کا یہ پیغام لے کر پہنچے کہ وہ گفتگو کے لیے راضی ہیں۔ اسی بات کو سعودیوں کے ذریعہ 1998 کی ابتدا میں دوہرایا گیا۔ اپریل میں بل کلنٹن نے ماضی میں ہوئی ناانصافیاں، مذاکرات اور '' آخر کار بنیادی ہم آہنگی'' کے متعلق بات کی۔

مارچ 2000 میں سکریٹری آف اسٹیٹ میڈیلین آل برائٹ نے 1953 میں وقوع پذیر ہوئے مصدق واقعہ پر معذرت کی لیکن ایرانی پالیسیوں پر ''غیر منتخب ہاتھوں'' کے کنٹرول کا تذکرہ کر کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

بش انتظامیہ کا ایران پر پرزور بیان افغانستان کے مسئلہ پر باہمی عملی تعاون میں تبدیل ہوگیا۔ بون میں دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا اور کانفرنس کو کامیاب بنایا۔ اور عراق پر حملہ کے وقت ''غیر مددگار'' نہیں تھا اور جنگ کے تعمیر نو کے کاموں میں قابل قدر تعاون دیا۔

یہی وہ مرحلہ ہے جہاں صدر جارج ڈبلیو بش کے تحت نیشنل سیکورٹی کونسل کے ایک اہلکار فلنٹ لیوریٹ کا نیا انکشاف تصویر کو مکمل کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے 24 جنوری 2006 کے نیویارک ٹائمز میں اس کا حوالہ دیا۔ اس کاغذ کا متن جو سوئس کے ہاتھوں بھیجا گیا تھا اب جا کر منکشف ہوا ہے۔

اس دستاویز کو بہت احتیاط سے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ تفصیل کے ساتھ ایرانی اور امریکی اہداف کا ذکر کیا گیا اور مذاکرات کے انعقاد کے لیے ایک طریقہ عمل بھی تجویز کیا گیا ہے۔ اہداف کے باب میں اس کا مشورہ ہے کہ طرفین الگ الگ لیکن بیک وقت ایک دوسرے کے احترام میں مذاکرات کو قبول کریں اور ہر فریق ایجنڈے کے لیے بنیادی توجہ کے طالب چھ مسائل کی ایک ایک فہرست تیار کرے۔

سب سے پہلے ایرانی اہداف کا ذکر ہے: ایران کی جانب یو ایس برتاؤ میں تبدیلی، منجمد اثاثہ پر تمام پابندیوں اور بندشوں کا خاتمہ، عراق میں جمہوری اور نمائندہ حکومت کی حمایت، عراق میں ایرانی قومی مفادات کا احترام اور نجف اور کربلا سے دینی رابطے، پرامن جوہری ٹیکنالوجی، بائیو ٹیکنالوجی، کیمیکل ٹیکنالوجی تک مکمل رسائی، خطہ میں ایران کی سلامتی کے جائز قانونی مفادات کو تسلیم کرنا جو دفاعی صلاحیت کے ساتھ ساتھ چلے، ایرانی مخالف دہشت گرد گروپس کے خلاف کارروائی۔

یو ایس کی فہرست میں بھی صاف گوئی سے کام لیا گیا ہے: مکمل شفافیت بشمول

تمام متعلقہ آلات کے نفاذ کے لیے انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی سے تعاون تا کہ یقین دہانی ہو سکے کہ ایران جوہری یا دیگر عالمی تباہی کے ہتھیار بنانے کی کوشش نہیں کر رہا ہے؛ ایرانی سرزمین پر سرگرم دہشت گرد گروہوں خصوصاً القاعدہ کے خلاف فیصلہ کن کارروائی؛ عراق سے متعلق موقف پر آپسی تال میل تا کہ جمہوری اداروں اور غیر مذہبی حکومت کا قیام اور استحکام ہو سکے؛ فلسطینی گروہوں کو (حماس، جہاد وغیرہ) کوئی بھی مادی سہولت پہنچانے میں تعطل اور ان پر دباؤ ڈالنا کہ وہ 1967 کی سرحدوں میں رہنے والے شہریوں پر تشدد کی کارروائی نہ کریں؛ حزب اللہ کے خلاف کارروائی تا کہ وہ صرف ایک لسانی، سیاسی جماعت تک محدود رہ جائے؛ فلسطین کے لیے عرب لیگ کے دو ریاست والے حل کو قبول کرنا۔

طریقۂ کار کے سوال پر ایرانی دستاویز میں ایک منظور شدہ متن پر بیک وقت باہمی بیانات کی تجویز ہے: ''ہم ہمیشہ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور ایران کے بالمشافہ اور مستند مذاکرات کے لیے تیار رہے ہیں جو کہ نیک نیتی پر منحصر ہوں اور جن کا مقصد باہمی احترام کے ساتھ اپنے مشترکہ مفادات اور معروضی حقیقتوں اور ترجیحات کی بنیاد پر اپنے باہمی اندیشوں پر بحث کرنا ہو، لیکن ہم نے یہ ہمیشہ واضح کیا ہے کہ ایسے مذاکرات اسی وقت ممکن ہو سکتے ہیں جب ہمارے اندیشوں کے حل کی جانب مثبت پیش قدمی ہو۔''

الفاظ دلچسپ اور کسی بھی سوئے اتفاق کے لیے محفوظ ہیں۔ یہ تجویز رکھی گئی کہ اس کے بعد پہلی بالمشافہ میٹنگ، غالباً پیرس میں، منعقد ہونی چاہیے جہاں عراق، دہشت گردی، مشرق وسطی کا سوال اور دوطرفہ مسائل پر حتمی اور فیصلہ کن گفتگو ہو سکے۔

جہاں تک عراق کا سوال ہے ایران نے ایک جوائنٹ گروپ کی تجویز رکھی اور عراق کی تعمیر نو اور استحکام میں مدد کا وعدہ کیا۔ اس کے بدلے میں ایران امریکہ کا پکا وعدہ چاہتا ہے کہ جب عراق کے بیرونی قرضہ جات پر بحث ہو تو امریکہ ایران کے تاوان کے دعویٰ کی حمایت کرے۔ دہشت گردی پر ایران کا خیال ہے کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس وعدہ کرے کہ وہ سلامتی کونسل کی قرارداد 1373 کے مطابق مجاہدین خلق (ایم کے او) کو غیر مسلح اور ان کو عراق سے باہر نکالے۔ بدلے میں ایران عراق میں القاعدہ کے خلاف اپنی کارروائی کو تیز

کرے گا۔ مشرق وسطیٰ کے سوال پر ایران نے عرب لیگ کے بیروت ڈکلریشن کو قبول کرنے، ایک پرامن حل جس میں ہر فریق شامل ہو اور اس طرح سے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی پیش کش کی ہے۔ بدلے میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کو ایک عام بیان دینا ہوگا کہ ایران کا 'برائی کے محور' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آخری شق کے طور پر ایرانی دستاویز غیر مسلح کرنے، علاقائی سلامتی، معاشی تعاون پر کام کرنے کے تین گروپ کا قیام کیا جائے جن کا مقصد تین روڈ میپس کو فروغ دینا ہو۔ اس نے تجویز کیا کہ ان ورکنگ گروپ میں مباحثہ کے لیے ہر فریق یہ خیال رکھے کہ دوسرے فریق کے اہداف بھی ایجنڈے میں شامل ہیں۔

دستاویز کے تجزیہ سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ (i) فوری مفادات کے نکات کی صحیح طور پر نشاندہی کی گئی؛ (ii) توازن کے لیے وعدہ اور یقین دہانیاں کرائی گئیں؛ (iii) ایران نے عراق، القاعدہ، حماس، حزب اللہ اور فلسطین کے دو ریاستی حل پر تعاون کی پیش کش کی؛ (iv) ایران نے آئی اے ای اے کے پروٹوکول کو مکمل طور سے قبول کرتے ہوئے شفافیت کی پیش کش کی (v) بدلے میں ایران تعلقات کی بحالی، ایم کے او کے خلاف کارروائی، اثاثوں کو غیر منجمد کرنے، ٹیکنالوجی تک رسائی اور علاقائی سلامتی میں ایک رول کا مطالبہ کرے گا۔ ''مشن اکمپلشڈ'' کے بعد نشہ کے ایام میں ایرانی پیشکش پر غور کیا گیا، پھر مسترد کر دیا گیا اور دوبارہ کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

2003-2005 کے زمانہ میں ایران کے ساتھ ای یوتھری کے مذاکرات جو ستمبر 2005 میں ویانا میں ٹوٹ گئے اس کے بعد یونائیٹڈ اسٹیٹس کے اقدامات جو اس امر کو سلامتی کونسل میں مباحثہ کے لیے لے گئے اس پس منظر کے حوالے سے دیکھنا چاہتے ہیں جس میں کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس نے (i) اصولی طور پر ایران کے ساتھ رابطہ سے انکار کیا (ii) ای یوتھری کے ذریعہ شرائط کو تھوپنے کی کوشش کی اور اس عمل میں 'گول پوسٹ' کی جگہ بدل دی (iii) این پی ٹی کو دوبارہ تحریر کرنے کی کوشش کی اور اپنے ہی خطرے کے نشان کو، ایران کو جوہری ہتھیار کا حق دینے سے انکار کی جگہ اوّل تو افزودگی سے انکار اور دوم جوہری تحقیق اور علم کے حق سے بھی انکار۔

اس عمل میں جوہری مسئلہ پر ایران کی واضح اور حتمی پیش کشوں کو دانستہ طور پر نظرانداز کیا گیا۔ ان میں ایمبیسیڈر جاوید ظریف کی نیویارک ٹائمز (6 اپریل) سابق ڈپٹی وزیر خارجہ عباس مالکی کا فنانشل ٹائمز (9 مئی) میں تبصرہ اور ایران کی سپریم نیشنل سیکورٹی کونسل کے سکریٹری حسن روحانی کا ٹائم میگزین (9 مئی) میں مضمون شامل ہیں۔ مجموعی طور سے یہ موقف کو مزید واضح کرتے ہیں اور حتمی اور دوررس ہیں: (i) یہ توثیق سے پہلے اوپشنل پروٹوکول لاگو کرتے ہیں؛ (ii) افزودگی اور انتقال کے وقت سہولتوں کی سائٹس پر آئی اے ای اے انسپکٹرز کی مستقل موجودگی کی اجازت؛ (iii) جوہری ہتھیاروں کی پیداوار کو روکنے کے لیے داخلی قانون کا تعارف (iv) پلاٹینم کی پیداوار یا اس پر دوبارہ عمل سے احتراز (v) افزودگی کا پروگرام پاور ری ایکٹرز کی ایندھن کی ضروریات تک محدود ہو؛ (vi) ان طریقوں کو اپنایا جائے جن سے ایران این پی ٹی کو نہ چھوڑے (vii) یورینیم افزودگی پروگرام میں پبلک اور پرائیویٹ دونوں بیرونی شراکت دار قبول کریں؛ (viii) فیول سائیکل ڈیولپمنٹ میں مشترکہ ملکیت کا علاقائی کنسورشیم قائم کیا جائے اور (ix) آئی اے ای اے کو اختیار دیا جائے کہ وہ ان سب کے نفاذ کے لیے معینہ مدت میں ایک معتبر پروگرام بنانے کا عمل شروع کرے۔

اگرچہ بش انتظامیہ اپنی ضد پر قائم ہے لیکن یو ایس میں بدلتے ہوئے موڈ کا اظہار اسٹیٹ فارن ریلیشنز کمیٹی کی 16 سے 18 مئی تک کی سماعتوں سے ہوتا ہے۔ سینٹر جوزف آر بائڈن انتظامیہ سے خاصا چیں بجبیں تھے کہ اس نے شرکت کے لیے کسی اعلیٰ افسر کو نہیں بھیجا۔ انھوں نے وہی نازک سوال اٹھایا: کیا انتظامیہ حکومت کی تبدیلی کو طے کر چکی ہے؛ کیا انتظامیہ جوہری مسئلہ پر گفت وشنید کے ذریعہ تصفیہ میں سلامتی ضمانتوں کے پیکیج کے ایک حصہ کی خاطر اس کو ترک کردے گی؟

یہ اتفاق ہے کہ امریکہ کے ساتھ مذاکرات کا مسئلہ 18 مئی کو تہران میں ہوئے ایک سیمینار میں موضوع بحث تھا۔ سابقہ وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی، جو امام سید علی خامنہ ای کے امور خارجہ میں مشیر ہیں، اپنے تبصرہ میں بہت واضح تھے: ''اب سے پہلے ایسا کبھی نہیں

ہوا کہ ہمیں عراق اور فلسطین کے مسائل پر مول تول کرنے کے لیے اتنی طاقت حاصل ہو۔ اب جب کہ مول تول کرنے کی طاقت ہمارے پاس ہے تو ہم مول تول کیوں نہ کریں؟''

قالین فروش مول تول کرتے ہیں تو مذاکرات کرنے والے کیوں نہ کریں۔ دونوں ہی معاملہ طے کرتے ہیں؛ دونوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کم سے کم رعایت دے کر زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے، دونوں ہی کو تحمل، اصرار اور سازگار حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخرالذکر میں سے دو میں یونائٹیڈ اسٹیٹس کمزور ہے: عراق کی صورتحال اور ایران کے خلاف فوجی عمل کی بڑھتی ہوئی سیاسی قیمت۔ کیا اسی نے صدر بش کو راغب کیا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کریں؟

سکریٹری آف اسٹیٹ کنڈولیزا رائس کے 31 مئی کے کانٹے کی دوڑ والے بیان کے باوجود ایک نئے راستہ کی تلاش کی خواہش یقینی ہے۔ اس کا علاقہ پر زبردست اثر پڑے گا۔

(5 جون 2006)

ایران کی خارجہ پالیسی میں ناگزیر داخلی عناصر

ایران کی تاریخی یادداشت بیرونی مداخلت سے جاگ اٹھی ہے۔ اس بارے میں اسلامی جمہوریہ کا دستور اور امام خمینی کو مصیبتیں پہلے سے تحریرشدہ حوالے ہیں۔ ساتھ میں امام آیت اللہ علی خامنہ ای، صدر محمود احمدی نژاد اور کم و بیش ہر طبقہ کی گھریلو رائے شامل ہے۔ لہٰذا خارجہ پالیسی کے اقدامات کو بہت باریک بینی سے دیکھا جاتا ہے اور ان کو مداخلت اور انحصار کے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔

اس طرزِ عمل میں دیگر عناصر بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک ایسے فکری عمل کو جس کی توجہ تاریخی اعتبار سے حسن و قبح، ظاہری و باطنی، سرّی و جہری کے دوئی فلسفہ پر مرکوز ہو، کے تجزیہ کے لیے کسی کو کرزن کی جانب منسوب ہوئے 'سائنسی فریب دہی' کو اپنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گزشتہ ہفتوں میں ایران میں عوامی بحث و مباحثہ اور گفتگو میں ان میں سے ہر ایک کی جھلک دیکھی جاچکی ہے۔

اندرونی منظرنامہ بھی اختلافات اور دباؤ سے بری نہیں ہے۔ یہ بات مذہبی حلقوں میں ایک سنجیدہ اور بامقصد رکاوٹ سمجھی جائے گی۔ قم کے ایک تحقیقی ادارہ میں علی اکبر ہاشمی رفسنجانی کی تقریر کے درمیان شور مچایا گیا اور ان کو تقریر ادھوری چھوڑ کر جانا پڑا۔ اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر عوام کے آذیری، عرب اور بلوچ طبقوں سے بھی اضطراب و ہیجان کی خبریں ملی ہیں۔ اس کی اہمیت پر بحث کی جاسکتی ہے۔ خزستان میں کچھ باغیوں کو قتل کردیا گیا۔ سیستان بلوچستان میں جنداللہ کے قائد عبدالملک ریگی کو مئی میں کافی مقبولیت حاصل ہوگئی جب انھوں نے پہلے سے اغواشدہ کچھ سرکاری اہلکاروں کو رہا کردیا۔ ازاریوں نے جن کارٹونوں کو تذلیل کا باعث سمجھا وہ دراصل ایرانی جارحانہ عصبیت کی ایرانی شراب تھی۔ اسلامی جمہوریہ کی قوت کے ڈھانچہ میں ازاریوں کی بہتر نمائندگی برقرار ہے۔ 12 جون کا بہت زیادہ مشتہر کیا جانے والا شادی، طلاق، بچوں کی رکھوالی میں مساوی حقوق کے لیے خواتین کا احتجاج، صنفی بیداری کی جانب اشارہ کرتا ہے لیکن وہ نسبتاً غیر اہم گروپ تک ہی محدود رہا۔

کچھ حلقوں میں یہ امید ظاہر کی جارہی ہے کہ یہ اور حقوق انسانی کے مسئلے جمہوری دباؤ بڑھانے اور حکومت کی تبدیلی میں آلہ کار ہوسکتے ہیں۔ لیکن تہران اس کو دوسری نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ اس کو ثابت شدہ بیرونی دخل اندازی کے مقابلہ میں یکجہتی و یگانگت کو مزید مضبوط بنائے جانے کی ضرورت کی طرف اشارہ سمجھتا ہے۔

سارے ہی اقدامات دفاعی نہیں ہیں۔ اسی ہفتہ اعلیٰ قائد کے نام پر نجی کاری کے لیے ایک نئے اور جری منصوبہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت صنعتی یونٹ، بینکنگ میڈیا، ٹرانسپورٹیشن اور منرل سیکٹرز میں حکومت کے 80 فیصد حصص پرائیویٹ ہاتھوں میں چلے جائیں گے۔ اس میں تیل، دفاعی صنعت اور شہری ہوابازی اور کچھ بینک شامل نہیں ہوں گے۔ اس رجحان کا اصل ٹسٹ، جو یقیناً ڈبلیو ٹی او میں داخلہ سے مربوط ہے، اس کے نفاذ میں ہے۔ اس کی مزاحمت کئی جانب سے ہوگی۔

اگرچہ ٹھوس ردّعمل ابھی آنا باقی ہیں لیکن حرکات و سکنات کی پیچیدگی ایک گیم پلان کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ 6 جون کے 1+5 پیکیج پر ردّعمل میں سوچی سمجھی تاخیر سے

کام لیا جارہا ہے۔ اس درمیان صدر احمدی نژاد نے ایس سی سی چوٹی کانفرنس میں بیجنگ میں شرکت کی اور بنجول کی افریقی چوٹی کانفرنس میں ایران اور سعودی عرب نے مسلم یکجہتی (سابقہ ایرانی وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی نے جس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ دو اہم اور بڑے حصے یعنی سنّی اور شیعہ مسلمانوں کے درمیان تبادلہ خیالات اور آرا تاکہ انتہا پسندوں کے اقدامات کو بے اثر کیا جاسکے) اور سعودیوں نے کھلے طور پر تیل کی قیمت پر ان تباہ کن اثرات سے خبردار کیا ہے جو ایران پر فوجی طاقت کے استعمال سے ظاہر ہوں گے۔

اپنے ایک بیان میں جو کہ بڑے مسئلہ سے الگ نہیں ہے، ڈپٹی آئل منسٹر محمد ہادی نژاد حسینیان نے یکم جولائی کو ایران۔ پاکستان۔ ہندوستان پائپ لائن پر یہ بات زور دے کر کہی کہ گیس کی دستیاب مقدار یا تو ہندوستان اور پاکستان کو فروخت کی جائے گی یا یوروپ کو لیکن دونوں کو نہیں۔ یہ تبصرہ پائپ لائن سے متعلق گفتگو میں تاخیر اور یوکرین کے بعد روسی سپلائی پر انحصار کم کرنے کے لیے متبادل کی تلاش میں یوروپی اقدامات کی وجہ سے برمحل ہے۔

سرکاری قانون کے ذریعہ ایک نئی فارن پالیسی ایڈوائزری کونسل کی تخلیق کی گئی کیونکہ امام کو خارجی تعلقات کی حکمت عملی اور پالیسی کے فیصلوں کے نفاذ میں کوتاہی نظر آئی۔ یہ پانچ اراکین پر مشتمل ایک تنظیم ہے جس کے سربراہ سابقہ وزیر خارجہ کمال خرازی ہیں اور دوسرے اراکین میں ولایتی اور سابقہ وزیر دفاع علی شمخانی شامل ہیں۔ ولایتی آیت اللہ خامنہ ای کے خارجہ پالیسی کے خصوصی مشیر ہیں۔ کونسل کی پانچ سالہ مدت صدر کی مدت سے آگے تک چلے گی۔ اس کی تخلیق میں ٹھوس اور عملی اشارے پوشیدہ ہیں۔

رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے امام کی قیادت میں ایک نئی مشق جاری ہے۔ جدید ایران کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک متحدہ رجحان پیش کیا جائے اور مکالمہ کے شرکا کو اس جگہ کے اندرونی اختلافات کے بے جا استعمال سے روکا جائے۔ ایک اور مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے جو کہ خالص ایرانی مزاج کا ہے کہ فیصلہ ساز کے نکتہ کو پھیلا دیا جائے اور شرکائے گفتگو کو حیرت میں رکھا جائے۔

ابتدائی اعلان کا اونچا سُر قابل غور ہے۔ صدر احمدی نژاد نے جواب کی تاریخ وسط
اگست تک رکھی ہے۔ ایک افسر نے کہا کہ ایرانی ردعمل قطعیت کے بجائے عام ہوگا اور وہ
گفتگو کے لیے راضی ہوں گے مگر بغیر پہلے سے عائد کردہ شرائط کے اور یورینیم کے افزودگی
روکنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تو کیا ایک باوقار حل کے حصول کے لیے ایک ٹیکنیکل
بریک کے ذریعہ مذاکرات کو شروع کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ سعود الفیصل کا تہران
اور چیف نیگوشیئٹر علی لاریجانی کا قاہرہ اور الجزائر کا دورہ بے معنی نہیں ہوسکتا اور نہ ہی عمان کی
بغیر شور شرابہ کی سفارتکاری کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔

جون کے اختتام تک اولین ردعمل ظاہر ہونے لگے۔ آیت اللہ خامنہ ای نے
کہا: ''ہم کسی سے بھی نیوکلیائی ٹیکنالوجی کے حصول اور اس کے استعمال پر مذاکرہ نہیں
کریں گے لیکن اگر وہ ہمارے نیوکلیائی حقوق کو تسلیم کرتے ہیں تو ہم اس کے کنٹرول،
نگرانی اور بین الاقوامی ضمانتوں پر بات کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' ولایتی نے اس کی مزید
وضاحت کی: ''ایران کسی بھی حالت میں یورینیم افزودگی معطل نہیں کرے گا۔ یہ ایک یقینی اور
مستقل پالیسی ہے اور کوئی بھی اس سے عہدہ برآ ہونے کی جرأت نہیں کرے گا۔'' انھوں نے
مغربی ایشیا کے لیے ایران کی اور دنیا کے لیے مغربی ایشیا کی مرکزیت پر زور دیا۔ امام اور ان کے
خارجہ پالیسی کے مشیر دونوں ہی نے امریکیوں کے ساتھ مذاکرات میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

ایرانی اپنے اسکور بڑھانے میں چوکنا تھے۔ لاریجانی نے یوروپین یونین کے
خارجہ اور سلامتی پالیسی کے چیف جیویر سولانا سے برسلز میں اپنی 5 جولائی کی ملاقات کو حفاظتی
انتظامات کے سبب سے منسوخ کردیا۔ اس منسوخی کے پیچھے دراصل کچھ ای یو ممبران پارلیمنٹ
کا ایم کے او لیڈر مریم رجوی کو دعوت دینا تھا۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی انھوں نے مولانا کا
7 جولائی کے لیے عشائیہ کا دعوت نامہ (خیرسگالی دکھانے کے لیے) قبول کرلیا!

عارضی ہی سہی لیکن کچھ خلاصے سامنے ابھر رہے ہیں۔ ان کا تعلق مباحثہ کی
سیاست، مقصد، طریقہ کار اور متن سے ہے۔ طرفین کو مذاکرات کی ضرورت محسوس ہورہی
ہے۔ اس کے بعد نظریات کے راستے الگ الگ ہیں۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس کا (i) سرکاری طور پر اصرار ہے کہ گفتگو سے پہلے افزودگی کو ختم کیا جائے؛ (ii) ہوسکتا ہے کہ وہ حکومت کی تبدیلی کے لیے فی الحال اصرار نہ کرے لیکن بدلے میں حکومت کو اپنے برتاؤ میں تبدیلی لانی ہوگی؛ (iii) مذاکرات کے آثار کو اندرونی خلفشار کا سبب بنانے کے لیے دباؤ میں استعمال کریں؛ (iv) فوجی حل کو یکسر فراموش کردینے کے حق میں نہیں ہے؛ (v) سلامتی ضمانتوں کے متعلق گفتگو کے حق میں نہیں ہے اور (vi) ابتدائی ایرانی ردّعمل کے مقابلہ میں صبر سے کام لیا جائے گا لیکن اس کے آپشنز کی وسعت کو جاننا چاہتا ہے۔

جہاں تک یوروپین یونین کا تعلق ہے وہ افزودگی کے معاملہ میں امریکہ سے متفق ہے، مذاکرات میں ترقی کی خواہاں ہے، ناکامی کے نتائج سے تشویش میں مبتلا ہے، سلامتی سے متعلق ایرانی اندیشوں کے لیے گنجائش نکالنے کو تیار ہے، چاہتی ہے کہ سلامتی کونسل کا دباؤ وقفہ کے ساتھ اور قابل واپسی ہو، چاہتی ہے کہ بین الاقوامی رائے برقرار رہے اور امریکیوں کے فوجی آپشن پر اس کا رویہ دو جذباتی ہے۔ روسی اور چینی ایران میں ٹھوس معاشی داؤ لگائے ہوئے ہیں اور وہ فوجی حل کے مخالف ہیں، معاشی پابندیوں سے ہچکچاتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ایران نیوکلیائی ہتھیاروں کی سطح تک ترقی نہ کرے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایران کو خلیج فارس کا کس۔ وسطی ایشیا کے علاقہ کے عام سلامتی فریم ورک میں شامل کیا جائے اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ ان کے اور یونائیٹڈ اسٹیٹس کے تعلقات پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ چھوڑے۔

متضاد جذبات عرب دنیا کی خصوصیت ہے۔ عراق کے زیرنظر حالات میں عوامی رائے باغیانہ تیوروں اور ٹیکنالوجی کے حصول میں اس کے دعویٰ کی حمایت کرتی ہے۔ جی سی سی ریاستیں ایران کے رقبہ اور صلاحیتوں سے خائف ہیں اور وہ خلیج فارس میں ایک نیوکلیائی پڑوسی کے تصور سے گھبراتی ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ اس علاقہ کو نیوکلیائی ہتھیاروں سے آزاد زون کا درجہ دیا جائے۔ لیکن کچھ دور ہی پر مصر، شام، عرب لیگ کے اراکین جیسے ممالک اس موقعہ کو اسرائیل کے نیوکلیائی ہتھیاروں پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے

استعمال کرنا چاہتے ہیں اور بحث کا رخ مغربی ایشیا کے عالمی تباہی کے ہتھیاروں سے آزاد زون کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔

ایران کے نقطۂ نظر سے صورتحال حکمت عملی تیار کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ قوم پرستی کے جوش سے اپنی حمایت مضبوط کرنے اور نیوکلیائی مسئلہ کو استعمال کرتے ہوئے امریکہ کو مذاکرات کی ٹیبل پر لے آنے کے بعد اس کی کوشش ہوگی کہ وہ لچک اور سختی کے امتزاج سے ایسا رویہ پیدا کرے جو نیوکلیائی مذاکرات میں اہم مقاصد کو سامنے لا سکے؛ (i) ایک وسیع تر گفتگو (ii) خطہ میں اپنے سلامتی مفادات کو تسلیم کروانا اور اس طرح سے قانونی جواز حاصل کرنا؛ (iii) افزودگی کے مسئلہ پر غیر لچکداری کا اشارہ دینا تاکہ اس کا مکمل فائدہ اٹھایا جائے جب تک کہ ایک قابل قبول پیکیج کی پیش کش نہ ہو۔ بٹی ہوئی بین الاقوامی رائے عامہ اس عمل میں مددگار ہوگی اور اسی طرح عراق کی سلجھتی ہوئی صورتحال بھی اور اسی طرح خلیج فارس اور کیسپین بیسن اور اس کے ثابت شدہ تیل اور گیس کے ذخائر بھی۔

ایران پر امریکہ کی مکمل کامیابی سے مغربی اور وسطی ایشیا کی جغرافیائی سیاست اور روس اور چین کے اہم مفادات پر فیصلہ کن اثر پڑے گا اور اسی طرح ایک مکمل ناکامی بھی یہی کام کرے گی۔ لگی ہوئی بازیوں اور غیر یقینیوں کے پیش نظر کیا تو تیں ایک برابری کا گیم کھیلنا پسند کریں گی؟ کیا ایران ایسے نتیجہ کے لیے مدد کرے گا؟

تیسرا حصہ

برمحل افکار

جدیدیت کی ایک مسمار عمارت

(دی ڈریم پیلیس آف دی عربس: اے جنریشنز اوڈیسی، فواد عجمی)

یہ ایک عام چلن ہوگیا ہے کہ جب بھی عربوں کا تذکرہ ہو تو ان کا مضحکہ اڑایا جائے۔ لفظ عرب 'اسلامی' کے مترادف ہوگیا۔ آج کل اس کے مروجہ معنی انتہاپسند اور جدیدیت کے مخالف لیے جاتے ہیں۔ غیر منقسم وسط کی منطقی خام خیالی بلا روک ٹوک دانشورانہ تحقیق کے آلات ایک طرف رکھ دینے میں مصروف ہے اور ایک بڑا برش بلاامتیاز استعمال کیا جارہا ہے۔ عصری تاریخ نظرانداز کردی گئی ہے، ایک پورے خطہ کے عوام کی پریشانیاں اور خوشیاں بھلا دی گئی ہیں اور میڈیا اسٹوریو ٹائپ جو لاشعوری طور سے مختلف قسم کے تعصبات سے آلودہ ہے کو حق وصداقت کی انجیل بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ ان مذکورہ اور دیگر وجوہات کے باعث 'دی ڈریم پیلیس آف عربس' (عربوں کے خوابوں کا محل ایک نسل کا جوکھم بھرا سفر) کی آمد برمحل اور اصلاح کن ہے۔ یہ یاد دلاتی ہے کہ وسیع تر نظریات و تصورات بھی عرب منظرنامہ کا حصہ ہیں۔

یہ کتاب جزوی طور سے ایام گزشتہ کا مرثیہ بھی ہے اور اس کا دوسرا حصہ عصری عرب تاریخ کا تنقیدی مطالعہ بھی، لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ یہ معروف واقعات کی ترجمانی

ماہرعمرانیات، ناول نگار اور شعرا کی جذباتی کیفیت اور بصیرت کے ذریعہ کرتی ہے اور اقلیتوں کی پکاروں کو اکٹھا کیا جاتا ہے اور ان کی شنوائی کرتی ہے۔ ان میں باہر کی دنیا میں نسبتاً غیر معروف عیسائیوں، قبطیوں، کرد، شیعہ، علوی اور سنی اکثریت کے وہ افراد جن میں اختلافی نظریات کو سننے کی جرأت ہے یعنی غیر روایتی نظریات کی ایک پوری دنیا شامل ہے۔ اس کو قدیمی عرب قوم پرستی کا اداس، یاد دلانے والا اور اصرار کرنے والا تعزیت نامہ کہا جاسکتا ہے۔ چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو فواد عجمی سے بہتر یہ کام کر سکتے ہیں۔ فواد عجمی عرب امریکی ہمسر دانشوروں کے سربراہ، جان ہاپکنز میں پال نٹزے اسکول آف ایڈوانسڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز میں ماجد خدوری چیئر آف مڈل ایسٹرن اسٹڈیز کے حامل، تبریزی نسل کے لبنانی (اسی وجہ سے عجمی نسبت ہے)، شیعہ، اور بیروت نام کے اس گہوارۂ علم و دانش جسے لبنانی خانہ جنگی نے مکمل طور سے تباہ و برباد کردیا کی پیداوار ہیں۔

فواد عجمی اس زندہ تاریخ کے بارے میں لکھتے ہیں جس کا مشاہدہ آنکھوں نے کیا اور ذات نے جس کا تجربہ کیا۔ اس کے درمیان میں خالی جگہ مشرقی عرب دنیا میں گزشتہ تین عشروں کے ویلیو ججمنٹ سے پر ہے جس میں جدیدیت اور روشن خیالی سیکولرزم کی نظیروں پر کھڑی ہوئی سیاسی وراثت عرب نسلوں کے ہاتھ سے پھسلتی جارہی ہے۔'' یہ سب کیسے وقوع پذیر ہوا۔ اس کا پتہ لبنانی شاعر خلیل حاوی کے ذاتی المیے، شامی شاعر نذر قبانی (جن کا انتقال اس سال کی ابتدا میں ہوگیا) اور علی احمد سعید ادونی، کی نظموں، نجیب محفوظ، تحسین بشیر، فراج فودہ، نصر ابوزید اور دیگر مصری ادیبوں کی تحریروں، جلاوطن سعودی ناول نگار عبدالرحمٰن منیف اور کویت کی شاعرہ سعاد الصباح کی تحریروں سے لگتا ہے۔ فواد عجمی تفصیل کے ساتھ نقشہ کھینچتے ہیں کہ ایک بدہیئت عرب قوم پرست حساسیت جو آبائی قدغنوں اور اندیشوں کے ساتھ چل رہی تھی، کس طرح ملکی نیشنلزم، نابرداشتگی اور فرقہ وارانہ تنازعات، نئی دولت اور ریپبلک آف لیٹرز، کے درمیان باہمی عدم اعتماد، 1967 کی تباہی، لبنان میں خانہ جنگی اور شیعہ عنصر کا ظہور، کویت اور امریکا کی جبہ سائی اور یقینی طور سے فلسطین کے لازمی امکانات سے ہم آہنگ ہونے میں ناکام ہوگئی۔ عجمی اس ناکامی کو پچھتاوے اور ماضی کی حسرت ناک یادوں

کو دوبارہ دائرہ خیال میں لانے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ عرب نیشنلزم سے متعلق عرب مفروضوں پر بنیادی سوال نہیں اٹھاتے اور نہ ہی وہ ایک قوم کے ہونے اور ایک قوم کے بننے کے نازک فرق کو گرفت میں لیتے ہیں لیکن وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عرب نیشنلزم نے ''ہر اس چیز کو نظر انداز کر دیا جس کو وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔'' (صفحہ: 131)

اس داستان اور اس کی تشریح کی ابتدا پہلے سے ہونی چاہیے۔ یہ 1928 کی بات ہے جب ایک لبنانی خاتون ناظرہ زین الدین نے عرب معاشرہ کے چار حجابوں۔ لباس، جہالت، منافقت اور جمود۔ کے بارے میں لکھا۔ لیکن دانشوروں کے ایک طبقہ کی جانب سے مسئلہ کی یہ توضیح مسئلہ کو سلجھانے میں تمام دانشوروں اور سماجی کوششوں کو یکجا نہ کر سکی۔ لہٰذا جہالت، جمود اور منافقت گردش کی شکل میں ایک دوسرے کو مدد دیتے رہے۔ اور اس کے لیے ان کو روایت کی آرام دہ پوشاک میسر تھی۔ عرب نشاۃ ثانیہ، اصلاح اور بالآخر انقلاب کی تحریکیں عوامی شعور میں وہ مطلوبہ تبدیلیاں لانے میں ناکام ہوگئیں جن کے بغیر روایت کے اس بھاری حجاب کا تار تار کرنا ناممکن تھا۔ عرب دانشوروں کی جدیدیت کے ساتھ گفتگو بہت تھوڑا آگے بڑھ سکی اور ادونی کی یہ بات کہ ''مغرب سے ہماری مخالفت کو ایک عام اور مکمل انکار کی صورت میں نہ دیکھنا چاہیے۔'' بالآخر آہستہ آہستہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''ہماری عصری جدیدیت ایک سراب ہے'' اور یہ کہ ''عرب دنیا میں کوئی چیز مر چکی ہے۔'' انھوں نے 1986 میں خود جلاوطنی اختیار کر لی:

مجھے سمجھ، اے مرے وطن، مجھے سمجھ
میں تیرا دفاع صرف اپنے بال و پر سے کر سکتا ہوں

سیاست نے بلاشبہ کوئی نفع نہیں پہنچایا۔ عالمی اسٹریٹیجک منظرنامہ میں مغربی ایشیا کی عرب ریاستوں کی مرکزیت نے صورتحال کو دوبارہ نافذ کرنے کو لازمی قرار دیا جیسا کہ 1947 کے ٹرومین ڈاکٹرائن میں ''مشرق وسطیٰ میں ترتیب کی حفاظت'' کے نام سے مذکور ہے۔

واقعات کے خرام اور ان پر ایک عرب کی مایوسی کو کویتی دانشور نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''میں 1956 میں خوش ہوا، میں 1967 میں چھ روزہ جنگ کے بعد رویا، میں

1973 میں ایک بار پھر خوش ہوا جب مجھے بتایا گیا کہ ایک نئی دنیا عربوں کے لیے بانہیں کھولے ہوئے ہے۔ اب 1982 کے موسم گرما میں ایک عشرہ جو وعدوں پر شروع ہوا تھا اور تلخ ذائقہ کے ساتھ ختم ہورہا ہے، میں اپنے صدمہ کے لیے الفاظ اور اپنی ناراضگی کے لیے آنسو بھی نہیں پا سکتا۔'' (صفحہ 123)۔ یہی مایوسی، بددلی اور جھنجھلاہٹ تھی جس کی وجہ سے 1987 کے فلسطینی انتفاضہ کو اتنی پرجوش عوامی حمایت حاصل ہوئی۔ اسی جذبہ کو نذر قبانی نے نہایت ہی موثر انداز میں اپنی نظم 'پتھر کے بچے' میں منظوم کیا ہے۔ انتفاضہ دراصل وہ عاملِ غیر مبدّل تھا جس نے ایک پیچیدہ طریقۂ کار کے ذریعہ جس کی حدیں اسرائیل کی اندرونی سیاست تک پہنچتی تھیں' وہ کردکھایا جو سوچا بھی نہ جاسکتا تھا یعنی اسرائیل کے فلسطینی آپشن کو عمل میں لانا۔ اس بارے میں عجمی کا اندازہ قابل غور ہے: ''اسرائیل کی خواہش کہ وہ فلسطین سے فوجی تسلط کو ختم کرے، عرفات کا یہ تسلیم کرنا کہ اس کی ماضی کی غلطیوں نے اس کے قریب ترین حلیف کھوئے؛ اور یہ کہ عربوں کی زندگی میں خلیج کے عظیم بحران کے بعد سیاست ان پر نرم لحوں میں جب عرب سیاست نے پاکیزگیوں کو راہ دی۔''

عرب حاکموں نے اوسلو معاہدہ کی تائید کی لیکن عرب دانشوروں نے اس سے اپنا دامن صاف رکھا۔ نذر قبانی نے اپنی ایک بے حد مقبول نظم جو 1995 میں شائع ہوئی اس کو 'بزدلوں کا امن' سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے عرب ''گوبر کے ڈھیر'' پر آ گرے۔ دانشوروں کے رول پر عجمی کا تبصرہ ہے کہ: ''دانشوروں کا طبقہ صرف خود ہی کو موردِ الزام ٹھہرا سکتا ہے۔ اس نے حقیقت کے چہرہ کو نہیں پہچانا، اور اس نے سیاسی دنیا کو ویسے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی جیسی کہ وہ حقیقت میں تھی۔ اس کے بیانات واعلانات منطق کی سرد طاقت سے عاری تھے۔ اس کی دنیا ایک نرم ریشمی خول کی مانند تھی جس کو ایک تند وسخت عشرہ نے تار تار کردیا۔'' (صفحہ 283)۔ کچھ سالوں بعد جنوری 1997 میں دانشوروں کی صف میں شگاف ظاہر ہونا شروع ہوئے اور ان میں سے کچھ (بشمول مصر کے لطفی الخولی اور لبنان کے حازم الصفیہ کے) نے یہ دلیل دی کہ یہی وقت ہے کہ ماضی کے جامد طریقوں کو

خدا حافظ کہا جائے اور حقیقت پسندوں اور فلسطینی اور اسرائیلی قوم پرستی کے درمیان گنجائش نکالی جائے۔'' عجمی کی تائید کا تعلق ایک وسیع تر مسئلہ عرب جدیدیت سے ہے: ''اگر جدیدیت کو ایک موقعہ دینا ہے تو عرب سیاسی تصور کو پرانی دشمنی سے آگے آنا ہوگا۔'' انھوں نے تسلیم کیا کہ اگر چہ کچھ دانشور متفق ہیں لیکن زیادہ تر نہیں ہیں یا وہ اس کو کچھ عرصہ کے لیے التوا میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ایک طبقہ کا خیال ہے کہ یہ اُن کی اپنی دنیا کی سچائیوں سے ان کی وفاداری کا معاملہ ہے۔

سیاسی عملیت کے تنازعہ کے درمیان 1995 میں نذر قبانی نے کہا کہ وہ ''مصر کے متعلق غیر جانبداری سے نہیں لکھ سکتے اور نہ ہی غیر جانبدار ہوکر اس سے محبت کر سکتے ہیں۔'' یہی بات عجمی کے مصر کے متعلق باب پر بھی صادق آتی ہے: ''ہمیں مڈل کلاس کے بڑھتے ہجوم کے ایک چھوٹے ٹکڑے کے نظریاتی چیلنج کو طاقت کی مبالغہ آمیزی کا رنگ نہ دینا چاہیے۔ لیکن پھر بھی حکومت کی جانب سے سیکولر سیاست اور ثقافت سے وابستگی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔'' مخبری کے ذریعہ سزا کے خوف نے اظہار رائے کی آزادی کو کم کردیا ہے۔ اقلیتیں دفاعی پوزیشن میں آگئی ہیں اور اندرون خانہ ریاست میں خوفزدہ رہی ہیں اور جمہوری گنجائشیں سمٹتی جارہی ہیں۔'' ساٹھ ملین آبادی والا ملک سال میں صرف 375 کتابیں شائع کرتا ہے'' جب کہ اسرائیل میں شائع شدہ کتابوں کی تعداد چار ہزار ہے۔ خارجہ پالیسی میں ''بحر متوسط کے تعلق سے مصر کا یوروپ کا ایک حصہ ہونے کا لالچ اور پان عربزم کا واہمہ زیرزمین جاچکے ہیں۔'' (صفحہ 247)۔ عرب سیاست پر مصر کی بالادستی داستان پارینہ بن چکی ہے کیونکہ دوسرے عربوں نے اپنے لیے الگ راستہ نکال لیا ہے۔ مصر کے ماضی قریب میں اس فریب نظر سے چھٹکارا حاصل کرنے کو اجاگر کرنے کے لیے عجمی، مصنف حسین احمد امین کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

''ہم نے آزادانہ خیالی، فوجی آمریت، کثیر جماعتی نظام، واحد جماعتی نظام، سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم، مشرق کے ساتھ دوستی اور پھر مغرب کے ساتھ، مصری قوم پرستی اور پان عربزم، سب کو آزمالیا۔ ہمارے صحافیوں اور مصنفوں نے کئی بار اپنے راستے بدلے۔

1973 میں ایک بار پھر خوش ہوا جب مجھے بتایا گیا کہ ایک نئی دنیا عربوں کے لیے بانہیں کھولے ہوئے ہے۔ اب 1982 کے موسم گرما میں ایک عشرہ جو وعدوں پر شروع ہوا تھا اور تلخ ذائقہ کے ساتھ ختم ہورہا ہے، میں اپنے صدمہ کے لیے الفاظ اور اپنی ناراضگی کے لیے آنسو بھی نہیں پاسکتا۔'' (صفحہ 123)۔ یہی مایوس، بددلی اور جھنجھلاہٹ تھی جس کی وجہ سے 1987 کے فلسطینی انتفاضہ کو اتنی پرجوش عوامی حمایت حاصل ہوئی۔ اسی جذبہ کو نذر قبانی نے نہایت ہی موثر انداز میں اپنی نظم 'پتھر کے بچے' میں منظوم کیا ہے۔ انتفاضہ دراصل وہ عاملِ غیر مبدّل تھا جس نے ایک پیچیدہ طریقۂ کار کے ذریعہ جس کی حدیں اسرائیل کی اندرونی سیاست تک پہنچتی تھیں' وہ کردکھایا جو سوچا بھی نہ جاسکتا تھا یعنی اسرائیل کے فلسطینی آپشن کو عمل میں لانا۔ اس بارے میں عجمی کا اندازہ قابل غور ہے:
''اسرائیل کی خواہش کہ وہ فلسطین سے فوجی تسلط کو ختم کرے، عرفات کا یہ تسلیم کرنا کہ اس کی ماضی کی غلطیوں نے اس کے قریب ترین حلیف کھوئے؛ اور یہ کہ عربوں کی زندگی میں خلیج کے عظیم بحران کے بعد سیاست ان پر نرم لمحوں میں جب عرب سیاست نے پاکیزگیوں کو راہ دی۔''

عرب حاکموں نے اوسلو معاہدہ کی تائید کی لیکن عرب دانشوروں نے اس سے اپنا دامن صاف رکھا۔ نذر قبانی نے اپنی ایک بے حد مقبول نظم جو 1995 میں شائع ہوئی اس کو 'بزدلوں کا امن' سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے عرب ''گوبر کے ڈھیر'' پر آگرے۔ دانشوروں کے رول پر عجمی کا تبصرہ ہے کہ: ''دانشوروں کا طبقہ صرف خود ہی کو موردِ الزام ٹھہرا سکتا ہے۔ اس نے حقیقت کے چہرہ کو نہیں پہچانا، اور اس نے سیاسی دنیا کو ویسے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی جیسی کہ وہ حقیقت میں تھی۔ اس کے بیانات واعلانات منطق کی سرد طاقت سے عاری تھے۔ اس کی دنیا ایک نرم ریشمی خول کی مانند تھی جس کو ایک تندوتخت عشرہ نے تار تار کردیا۔'' (صفحہ 283)۔ کچھ سالوں بعد جنوری 1997 میں دانشوروں کی صف میں شگاف ظاہر ہونا شروع ہوئے اور ان میں سے کچھ (بشمول مصر کے لطفی الخولی اور لبنان کے حازم الصفیہ کے) نے یہ دلیل دی کہ یہی وقت ہے کہ ماضی کے جامد طریقوں کو

خدا حافظ کہا جائے اور حقیقت پسندوں اور فلسطینی اور اسرائیلی قوم پرستی کے درمیان گنجائش نکالی جائے۔'' عجمی کی تائید کا تعلق ایک وسیع تر مسئلہ عرب جدیدیت سے ہے: ''اگر جدیدیت کو ایک موقعہ دینا ہے تو عرب سیاسی تصور کو پرانی دشمنی سے آگے آنا ہوگا۔'' انھوں نے تسلیم کیا کہ اگر چہ کچھ دانشور متفق ہیں لیکن زیادہ تر نہیں ہیں یا وہ اس کو کچھ عرصہ کے لیے التوا میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ایک طبقہ کا خیال ہے کہ یہ'ان کی اپنی دنیا کی سچائیوں سے ان کی وفاداری کا معاملہ ہے۔'

سیاسی عملیت کے تنازعہ کے درمیان 1995 میں نذر قبانی نے کہا کہ وہ ''مصر کے متعلق غیر جانبداری سے نہیں لکھ سکتے اور نہ ہی غیر جانبدار ہوکر اس سے محبت کر سکتے ہیں۔'' یہی بات عجمی کے مصر کے متعلق باب پر بھی صادق آتی ہے: ''ہمیں مڈل کلاس کے بڑھتے ہجوم کے ایک چھوٹے ٹکڑے کے نظریاتی چیلنج کو طاقت کی مبالغہ آمیزی کا رنگ نہ دینا چاہیے۔ لیکن پھر بھی حکومت کی جانب سے سیکولر سیاست اور ثقافت سے وابستگی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔'' مخبری کے ذریعہ سزا کے خوف نے اظہار رائے کی آزادی کو کم کر دیا ہے۔ اقلیتیں دفاعی پوزیشن میں آگئی ہیں اور اندرون خانہ ریاست میں خوفزدہ رہی ہیں اور جمہوری گنجائشیں سمٹتی جارہی ہیں۔ ''ساٹھ ملین آبادی والا ملک سال میں صرف 375 کتابیں شائع کرتا ہے'' جب کہ اسرائیل میں شائع شدہ کتابوں کی تعداد چار ہزار ہے۔ خارجہ پالیسی میں ''بحر متوسط کے تعلق سے مصر کا یوروپ کا ایک حصہ ہونے کا لالچ اور پان عربزم کا واہمہ زیر زمین جاچکے ہیں۔'' (صفحہ 247)۔ عرب سیاست پر مصر کی بالادستی داستان پارینہ بن چکی ہے کیونکہ دوسرے عربوں نے اپنے لیے الگ راستہ نکال لیا ہے۔ مصر کے ماضی قریب میں اس فریبِ نظر سے چھٹکارا حاصل کرنے کو اجاگر کرنے کے لیے عجمی، مصنف حسین احمد امین کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

''ہم نے آزادانہ خیالی، فوجی آمریت، کثیر جماعتی نظام، واحد جماعتی نظام، سرمایہ دارانہ نظام، سوشلزم، مشرق کے ساتھ دوستی اور پھر مغرب کے ساتھ، مصری قوم پرستی اور پان عربزم، سب کو آزمالیا۔ ہمارے صحافیوں اور مصنفوں نے کئی بار اپنے راستے بدلے۔

ہم نے اپنے حاکموں کی تعریفوں کے گن گائے اور پھر ان کی مذمت کی۔ ہم نے ان کے مجسمے بنائے اور پھر ان کو پاش پاش کر دیا، ہم نے شاہراہوں کو ان کا نام دیا اور پھر بدل دیا، ہم اسرائیل سے لڑے اور پھر اس سے دوستی کر لی، ہم نے امریکی اشیا کی مزاحمت کی اور پھر انہی کی گود میں جا گرے؛ ہم نے روسیوں کے ساتھ معاہدہ کیا پھر اسے چاک کر دیا۔ اب تک ہم نے کس چیز کو نہیں آزمایا؟ اب صرف یہی باقی رہ گیا ہے کہ ہم اس ماضی میں دور تک چلے جائیں جس کو ہم پسند کرتے ہیں۔ جس سے ہم نے ہر تکلیف دہ چیز کو ہٹا دیا ہے اور جس میں ہر مثبت اور قابل قدر چیز کو باقی رکھا ہے؟'' (صفحہ 30-229)

عربوں کی ثقافتی زندگی میں مصر کی مرکزیت کے پیش نظر ان ناکام قومی آپشنز سے پیدا ہوئے دکھ کا دائرہ مصر سے آگے چلا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر بالآخر مصر کے امراض کی نشاندہی کرنے میں عجمی کے یہاں ایک بے چینی پائی جاتی ہے: ''کسی بھی ملک کی انفرادی پراسراریت اس ملک کے مختلف ضرورتوں کے عورتوں مردوں کو تسلی دے سکتی ہے اور ان کو آپس میں باندھ سکتی ہے، مختلف ادوار میں ان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ شکست خوردگی اور غم کا سبب بیان کر سکتی ہے اور دنیا میں ان کے مقام کی توضیح کر سکتی ہے۔ لیکن یہی پراسراریت ملک کو خود سے پوشیدہ بھی رکھ سکتی ہے۔ اور چھان بین سے الگ رکھ سکتی ہے۔ مصر کی بھی ایک پراسراریت ہے۔ نرم زمین، پرسکون دریا، صابر عوام جو اس کے ساتھ امن میں ہیں اور اس کی دنیا کے باہر بھی۔ مصر کی زیادہ تر تاریخ اسی تصور میں گزری کہ وہ مضبوط و مستحکم آبی معاشرہ ہے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے بہت خون بہا ہے اور برداشت انتہا کو پہنچ گئی ہے'' (صفحہ 251) اسی وجہ سے عجمی کا خیال ہے کہ ''دریا کے کنارے پر نصب آبی پیمانوں کو غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔''

فواد عجمی کی کتاب سیکولر روایات میں رخنہ پڑنے کی تاریخ کو دوہراتے ہوئے اپنے خلاصۂ کلام میں عربوں کو حقیقت کا سامنا کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور وہ اپنے لیے کس قسم کی دنیا کا تصور رکھتے ہیں اس پر بھی نظر ڈالیں۔'' خلاصہ کافی محتاط ہے اور اس عزم سے خالی ہے،۔ جس کی عکاسی اس سے قبل کی کتاب ''دی عرب پر ے ڈی کیمنٹ'' (1980)

کرتی ہے جہاں انھوں نے پرزور الفاظ میں کہا ہے کہ "لوگ ایک غیر معینہ مدت تک غیض و غضب میں نہیں رہ سکتے اور نہ ہی نیم بیداری کی حالت میں رکھے جا سکتے ہیں۔"

اس کی شدت میں زبانی اور ادبی تنازعات سے آگے جانے کے رویہ نے اس بحث کو عرب ممالک میں ختم نہیں کیا ہے اور اسلامزم کے اثر پذیر داخلہ نے بحث کا رخ، شاید کبھی نہ لوٹنے کے لیے، ہی موڑ دیا ہے۔ اس نئے غیر معمولی عنصر پر عجمی کا مشاہدہ دور رس ہے: "ہم نے اسلام پر گفتگو کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف کیا اور ان حساسات اور ولولوں کو جنھوں نے سیاسی اسلام کو جدید اعتبار بخشا، زیادہ توجہ نہیں دی۔" اس کا مقابلہ کرنے میں تشدد اور تشدد کے استعمال نے ان مقامات کو اور تنگ کر دیا جہاں سے ایک معقول جواب کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ ایسے ماحول میں، کیا معاشرتی تصورات کو پھر سے آنکنا ممکن ہے؟ یہ یقیناً پسندیدہ عمل ہوگا کہ محمد ارکون کے اس مشورہ پر تحقیق کی جائے کہ ایک نیا باب کھولا جائے جس میں "تنقیدی فکر جو جدیدیت پر مبنی ہو لیکن خود جدیدیت کی ناقد ہو اور اسلامی مثالوں کی پیش کردگی کے ذریعہ جدیدیت کو فروغ دے، سیاسی عمل، معاشی فیصلے اور بڑی معاشرتی تحریکوں کا ساتھ دے یا کم سے کم ایک بار ان سے آگے چلے۔"

زیادہ تر افراد کے لیے عرب سیکولر روایات پر سوالات کا جواب ابھی نہیں ملا ہے۔ یہ صرف دانشور طبقہ ہی تک کیوں محدود رہا؟ کیوں ایک اداراتی خصوصیت کی کوشش نہیں کی گئی اور پروان نہیں چڑھایا گیا؟ شکستہ روایت کی مرمت کیسے ہو سکتی ہے؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ جوابات سول سوسائٹی، اس کی ساخت کی مضبوطی اور سیاست و معاشرہ تعلقات میں غیر توازن کی تصحیح میں پوشیدہ ہیں۔ معروف صحافی جہاد خازن نے 1980 میں کہا تھا کہ "آزادی ایک ایسا پودا ہے جو دنیا کے اس حصہ میں نہیں پایا جاتا۔" یہی تصور دوسرے مغربی ایشیائی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ زیادہ آزادی، تحمل، اختلاف رائے کے خواہاں ہیں یعنی مختصر طور پر ایک سیکولر نظام کے کچھ بنیادی عناصر کی چاہ ہے۔ لہٰذا ایک آخری تجزیہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آزادانہ اقدار کے لیے جدوجہد حقوق کی جدوجہد بھی ہے ایک جامع تعریف اور مطالعہ کیے ہوئے کوشش کے ساتھ۔ انسانی فطرت اس میں 'خوابوں کے محل' کے

ہم نے اپنے حاکموں کی تعریفوں کے گن گائے اور پھر ان کی مذمت کی۔ ہم نے ان کے مجسمے بنائے اور پھر ان کو پاش پاش کر دیا، ہم نے شاہراہوں کو ان کا نام دیا اور پھر بدل دیا، ہم اسرائیل سے لڑے اور پھر اس سے دوستی کر لی، ہم نے امریکی اشیا کی مزاحمت کی اور پھر انہی کی گود میں جاگرے؛ ہم نے روسیوں کے ساتھ معاہدہ کیا پھر اسے چاک کر دیا۔ اب تک ہم نے کس چیز کو نہیں آزمایا؟ اب صرف یہی باقی رہ گیا ہے کہ ہم اس ماضی میں دور تک چلے جائیں جس کو ہم پسند کرتے ہیں۔ جس سے ہم نے ہر تکلیف دہ چیز کو ہٹا دیا ہے اور جس میں ہر مثبت اور قابل قدر چیز کو باقی رکھا ہے؟'' (صفحہ 30-229)

عربوں کی ثقافتی زندگی میں مصر کی مرکزیت کے پیش نظر ان ناکام قومی آپشنز سے پیدا ہوئے دکھ کا دائرہ مصر سے آگے چلا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر بالآخر مصر کے امراض کی نشاندہی کرنے میں عجمی کے یہاں ایک بے چینی پائی جاتی ہے: ''کسی بھی ملک کی انفرادی پراسراریت اس ملک کے مختلف ضرورتوں کے عورتوں مردوں کو تسلی دے سکتی ہے اور ان کو آپس میں باندھ سکتی ہے، مختلف ادوار میں ان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ شکست خوردگی اور غم کا سبب بیان کر سکتی ہے اور دنیا میں ان کے مقام کی توضیح کر سکتی ہے۔ لیکن یہی پراسراریت ملک کو خود سے پوشیدہ بھی رکھ سکتی ہے۔ اور چھان بین سے الگ رکھ سکتی ہے۔ مصر کی بھی ایک پراسراریت ہے۔ نرم زمین، پرسکون دریا، صابر عوام جو اس کے ساتھ امن میں ہیں اور اس کی دنیا کے باہر بھی۔ مصر کی زیادہ تر تاریخ اسی تصور میں گزری کہ وہ مضبوط و مستحکم آبی معاشرہ ہے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے بہت خون بہا ہے اور برداشت انتہا کو پہنچ گئی ہے'' (صفحہ 251) اسی وجہ سے عجمی کا خیال ہے کہ ''دریا کے کنارے پر نصب آبی پیمانوں کو غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔''

فواد عجمی کی کتاب سیکولر روایات میں رخنہ پڑنے کی تاریخ کو دوہراتے ہوئے اپنے خلاصۂ کلام میں عربوں کو حقیقت کا سامنا کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور وہ اپنے لیے کس قسم کی دنیا کا تصور رکھتے ہیں اس پر بھی نظر ڈالیں۔'' خلاصہ کافی محتاط ہے اور اس عزم سے خالی ہے،۔ جس کی عکاسی اس سے قبل کی کتاب ''دی عرب پریے ڈی کیمنٹ'' (1980)

کرتی ہے جہاں انھوں نے پرزور الفاظ میں کہا ہے کہ ''لوگ ایک غیر معینہ مدت تک غیض و غضب میں نہیں رہ سکتے اور نہ ہی نیم بیداری کی حالت میں رکھے جاسکتے ہیں۔''

اس کی شدت میں زبانی اور ادبی تنازعات سے آگے جانے کے رویہ نے اس بحث کو عرب ممالک میں ختم نہیں کیا ہے اور اسلامزم کے اثر پذیر داخلہ نے بحث کا رخ، شاید کبھی نہ لوٹنے کے لیے، ہی موڑ دیا ہے۔ اس نئے غیر معمولی عنصر پر عجمی کا مشاہدہ دور رس ہے: ''ہم نے اسلام پر گفتگو کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف کیا اور ان حساسات اور ولولوں کو جنھوں نے سیاسی اسلام کو جدید اعتبار بخشا، زیادہ توجہ نہیں دی۔'' اس کا مقابلہ کرنے میں تشدد اور تشدد کے استعمال نے ان مقامات کو اور تنگ کردیا جہاں سے ایک معقول جواب کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ ایسے ماحول میں، کیا معاشرتی تصورات کو پھر سے آنکنا ممکن ہے؟ یہ یقیناً پسندیدہ عمل ہوگا کہ محمد ارکون کے اس مشورہ پر تحقیق کی جائے کہ ایک نیا باب کھولا جائے جس میں ''تنقیدی فکر جو جدیدیت پر مبنی ہو لیکن خود جدیدیت کی ناقد ہو اور اسلامی مثالوں کی پیش کردگی کے ذریعہ جدیدیت کو فروغ دے، سیاسی عمل، معاشی فیصلے اور بڑی معاشرتی تحریکوں کا ساتھ دے یا کم سے کم ایک بار ان سے آگے چلے۔''

زیادہ تر افراد کے لیے عرب سیکولر روایات پر سوالات کا جواب ابھی نہیں ملا ہے۔ یہ صرف دانشور طبقہ ہی تک کیوں محدود رہا؟ کیوں ایک ادارتی خصوصیت کی کوشش نہیں کی گئی اور پروان نہیں چڑھایا گیا؟ شکستہ روایت کی مرمت کیسے ہوسکتی ہے؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ جوابات سول سوسائٹی، اس کی ساخت کی مضبوطی اور سیاست و معاشرہ تعلقات میں غیر توازن کی تصحیح میں پوشیدہ ہیں۔ معروف صحافی جہاد خازن نے 1980 میں کہا تھا کہ ''آزادی ایک ایسا پودا ہے جو دنیا کے اس حصہ میں نہیں پایا جاتا۔'' یہی تصور دوسرے مغربی ایشیائی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ زیادہ آزادی، تحمل، اختلاف رائے کے خواہاں ہیں یعنی مختصر طور پر ایک سیکولر نظام کے کچھ بنیادی عناصر کی چاہ ہے۔ لہٰذا ایک آخری تجزیہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آزادانہ اقدار کے لیے جدوجہد حقوق کی جدوجہد بھی ہے ایک جامع تعریف اور مطالعہ کیے ہوئے کوشش کے ساتھ۔ انسانی فطرت اس میں 'خوابوں کے محل' کے

ہم نے اپنے حاکموں کی تعریفوں کے گن گائے اور پھر ان کی مذمت کی۔ ہم نے ان کے مجسمے بنائے اور پھر ان کو پاش پاش کردیا، ہم نے شاہراہوں کو ان کا نام دیا اور پھر بدل دیا، ہم اسرائیل سے لڑے اور پھر اس سے دوستی کرلی، ہم نے امریکی اشیا کی مزاحمت کی اور پھر انہی کی گود میں جا گرے؛ ہم نے روسیوں کے ساتھ معاہدہ کیا پھر اسے چاک کردیا۔ اب تک ہم نے کس چیز کو نہیں آزمایا؟ اب صرف یہی باقی رہ گیا ہے کہ ہم اس ماضی میں دور تک چلے جائیں جس کو ہم پسند کرتے ہیں۔ جس سے ہم نے ہر تکلیف دہ چیز کو ہٹا دیا ہے اور جس میں ہر مثبت اور قابل قدر چیز کو باقی رکھا ہے؟'' (صفحہ 30-229)

عربوں کی ثقافتی زندگی میں مصر کی مرکزیت کے پیش نظر ان ناکام قومی آپشنز سے پیدا ہوئے دکھ کا دائرہ مصر سے آگے چلا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر بالآخر مصر کے امراض کی نشاندہی کرنے میں عجمی کے یہاں ایک بے چینی پائی جاتی ہے: ''کسی بھی ملک کی انفرادی پراسراریت اس ملک کے مختلف ضرورتوں کے عورتوں مردوں کو تسلی دے سکتی ہے اور ان کو آپس میں باندھ سکتی ہے، مختلف ادوار میں ان کی رہنمائی کرسکتی ہے۔ شکست خوردگی اور غم کا سبب بیان کرسکتی ہے اور دنیا میں ان کے مقام کی توضیح کرسکتی ہے۔ لیکن یہی پراسراریت ملک کو خود سے پوشیدہ بھی رکھ سکتی ہے۔ اور چھان بین سے الگ رکھ سکتی ہے۔ مصر کی بھی ایک پراسراریت ہے۔ نرم زمین، پرسکون دریا، صابر عوام جو اس کے ساتھ امن میں ہیں اور اس کی دنیا کے باہر بھی۔ مصر کی زیادہ تر تاریخ اسی تصور میں گزری کہ وہ مضبوط و مستحکم آبی معاشرہ ہے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے بہت خون بہا ہے اور برداشت انتہا کو پہنچ گئی ہے'' (صفحہ 251) اسی وجہ سے عجمی کا خیال ہے کہ ''دریا کے کنارے پر نصب آبی پیمانوں کو غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔''

فواد عجمی کی کتاب سیکولر روایات میں رخنہ پڑنے کی تاریخ کو دوہراتے ہوئے اپنے خلاصۂ کلام میں عربوں کو حقیقت کا سامنا کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور وہ اپنے لیے کس قسم کی دنیا کا تصور رکھتے ہیں اس پر بھی نظر ڈالیں۔'' خلاصہ کافی محتاط ہے اور اس عزم سے خالی ہے۔۔ جس کی عکاسی اس سے قبل کی کتاب ''دی عرب پرے ڈی کیمنٹ'' (1980)

کرتی ہے جہاں انھوں نے پرزور الفاظ میں کہا ہے کہ ''لوگ ایک غیر معینہ مدت تک غیض و غضب میں نہیں رہ سکتے اور نہ ہی نیم بیداری کی حالت میں رکھے جاسکتے ہیں۔''

اس کی شدت میں زبانی اور ادبی تنازعات سے آگے جانے کے رویہ نے اس بحث کو عرب ممالک میں ختم نہیں کیا ہے اور اسلامزم کے اثر پذیر داخلہ نے بحث کا رخ، شاید کبھی نہ لوٹنے کے لیے، ہی موڑ دیا ہے۔ اس نئے غیر معمولی عنصر پر بُجمی کا مشاہدہ دور رس ہے: ''ہم نے اسلام پر گفتگو کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف کیا اور ان حساسات اور ولولوں کو جنھوں نے سیاسی اسلام کو جدید اعتبار بخشا، زیادہ توجہ نہیں دی۔'' اس کا مقابلہ کرنے میں تشدد اور تشدد کے استعمال نے ان مقامات کو اور تنگ کر دیا جہاں سے ایک معقول جواب کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ ایسے ماحول میں، کیا معاشرتی تصورات کو پھر سے آنکنا ممکن ہے؟ یہ یقیناً پسندیدہ عمل ہوگا کہ محمد ارکون کے اس مشورہ پر تحقیق کی جائے کہ ایک نیا باب کھولا جائے جس میں ''تنقیدی فکر جو جدیدیت پر مبنی ہو لیکن خود جدیدیت کی ناقد ہو اور اسلامی مثالوں کی پیش کردگی کے ذریعہ جدیدیت کو فروغ دے، سیاسی عمل، معاشی فیصلے اور بڑی معاشرتی تحریکوں کا ساتھ دے یا کم سے کم ایک بار ان سے آگے چلے۔''

زیادہ تر افراد کے لیے عرب سیکولر روایات پر سوالات کا جواب ابھی نہیں ملا ہے۔ یہ صرف دانشور طبقہ ہی تک کیوں محدود رہا؟ کیوں ایک ادارتی خصوصیت کی کوشش نہیں کی گئی اور پروان نہیں چڑھایا گیا؟ شکستہ روایت کی مرمت کیسے ہوسکتی ہے؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ جوابات سول سوسائٹی، اس کی ساخت کی مضبوطی اور سیاست و معاشرہ تعلقات میں غیر توازن کی تصحیح میں پوشیدہ ہیں۔ معروف صحافی جہاد خازن نے 1980 میں کہا تھا کہ ''آزادی ایک ایسا پودا ہے جو دنیا کے اس حصہ میں نہیں پایا جاتا۔'' یہی تصور دوسرے مغربی ایشیائی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ زیادہ آزادی، تحمل، اختلاف رائے کے خواہاں ہیں یعنی مختصر طور پر ایک سیکولر نظام کے کچھ بنیادی عناصر کی چاہ ہے۔ لہٰذا ایک آخری تجزیہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آزادانہ اقتدار کے لیے جدوجہد حقوق کی جدوجہد بھی ہے ایک جامع تعریف اور مطالعہ کیے ہوئے کوشش کے ساتھ۔ انسانی فطرت اس میں 'خوابوں کے محل' کے

ہم نے اپنے حاکموں کی تعریفوں کے گن گائے اور پھر ان کی مذمت کی۔ ہم نے ان کے مجسمے بنائے اور پھر ان کو پاش پاش کر دیا، ہم نے شاہراہوں کو ان کا نام دیا اور پھر بدل دیا، ہم اسرائیل سے لڑے اور پھر اس سے دوستی کر لی، ہم نے امریکی اشیا کی مزاحمت کی اور پھر انہی کی گود میں جا گرے؛ ہم نے روسیوں کے ساتھ معاہدہ کیا پھر اسے چاک کر دیا۔ اب تک ہم نے کس چیز کو نہیں آزمایا؟ اب صرف یہی باقی رہ گیا ہے کہ ہم اس ماضی میں دور تک چلے جائیں جس کو ہم پسند کرتے ہیں۔ جس سے ہم نے ہر تکلیف دہ چیز کو ہٹا دیا ہے اور جس میں ہر مثبت اور قابل قدر چیز کو باقی رکھا ہے؟'' (صفحہ 30-229)

عربوں کی ثقافتی زندگی میں مصر کی مرکزیت کے پیش نظر ان ناکام قومی آپشنز سے پیدا ہوئے دکھ کا دائرہ مصر سے آگے چلا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر بالآخر مصر کے امراض کی نشاندہی کرنے میں عجمی کے یہاں ایک بے چینی پائی جاتی ہے: ''کسی بھی ملک کی انفرادی پراسراریت اس ملک کے مختلف ضرورتوں کے عورتوں مردوں کو تسلی دے سکتی ہے اور ان کو آپس میں باندھ سکتی ہے، مختلف ادوار میں ان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ شکست خوردگی اور غم کا سبب بیان کر سکتی ہے اور دنیا میں ان کے مقام کی توضیح کر سکتی ہے۔ لیکن یہی پراسراریت ملک کو خود سے پوشیدہ بھی رکھ سکتی ہے۔ اور چھان بین سے الگ رکھ سکتی ہے۔ مصر کی بھی ایک پراسراریت ہے۔ نرم زمین، پرسکون دریا، صابر عوام جو اس کے ساتھ امن میں ہیں اور اس کی دنیا کے باہر بھی۔ مصر کی زیادہ تر تاریخ اسی تصور میں گزری کہ وہ مضبوط و مستحکم آبی معاشرہ ہے۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے بہت خون بہا ہے اور برداشت انتہا کو پہنچ گئی ہے'' (صفحہ 251) اسی وجہ سے عجمی کا خیال ہے کہ ''دریا کے کنارے پر نصب آبی پیمانوں کو غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔''

فواد عجمی کی کتاب سیکولر روایات میں رخنہ پڑنے کی تاریخ کو دوہراتے ہوئے اپنے خلاصۂ کلام میں عربوں کو حقیقت کا سامنا کرنے کا مشورہ دیتی ہے اور وہ اپنے لیے کس قسم کی دنیا کا تصور رکھتے ہیں اس پر بھی نظر ڈالیں۔'' خلاصہ کافی محتاط ہے اور اس عزم سے خالی ہے،۔ جس کی عکاسی اس سے قبل کی کتاب ''دی عرب پرے ڈی کمنٹ'' (1980)

کرتی ہے جہاں انھوں نے پرزور الفاظ میں کہا ہے کہ ''لوگ ایک غیر معینہ مدت تک غیض و غضب میں نہیں رہ سکتے اور نہ ہی نیم بیداری کی حالت میں رکھے جاسکتے ہیں۔''

اس کی شدت میں زبانی اور ادبی تنازعات سے آگے جانے کے رویہ نے اس بحث کو عرب ممالک میں ختم نہیں کیا ہے اور اسلامزم کے اثر پذیر داخلہ نے بحث کا رخ، شاید کبھی نہ لوٹنے کے لیے، ہی موڑ دیا ہے۔ اس نئے غیر معمولی عنصر پر عجمی کا مشاہدہ دور رس ہے: ''ہم نے اسلام پر گفتگو کرنے میں بہت زیادہ وقت صرف کیا اور ان حساسات اور ولولوں کو جنھوں نے سیاسی اسلام کو جدید اعتبار بخشا، زیادہ توجہ نہیں دی۔'' اس کا مقابلہ کرنے میں تشدد اور تشدد کے استعمال نے ان مقامات کو اور تنگ کر دیا جہاں سے ایک معقول جواب کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ ایسے ماحول میں، کیا معاشرتی تصورات کو پھر سے آنکنا ممکن ہے؟ یہ یقیناً پسندیدہ عمل ہوگا کہ محمد ارکون کے اس مشورہ پر تحقیق کی جائے کہ ایک نیا باب کھولا جائے جس میں ''تنقیدی فکر جو جدیدیت پر مبنی ہو لیکن خود جدیدیت کی ناقد ہو اور اسلامی مثالوں کی پیش کردگی کے ذریعہ جدیدیت کو فروغ دے، سیاسی عمل، معاشی فیصلے اور بڑی معاشرتی تحریکوں کا ساتھ دے یا کم سے کم ایک بار ان سے آگے چلے۔''

زیادہ تر افراد کے لیے عرب سیکولر روایات پر سوالات کا جواب ابھی نہیں ملا ہے۔ یہ صرف دانشور طبقہ ہی تک کیوں محدود رہا؟ کیوں ایک ادارتی خصوصیت کی کوشش نہیں کی گئی اور پروان نہیں چڑھایا گیا؟ شکستہ روایت کی مرمت کیسے ہوسکتی ہے؟ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ جوابات سول سوسائٹی، اس کی ساخت کی مضبوطی اور سیاست و معاشرہ تعلقات میں غیر توازن کی تصحیح میں پوشیدہ ہیں۔ معروف صحافی جہاد خازن نے 1980 میں کہا تھا کہ ''آزادی ایک ایسا پودا ہے جو دنیا کے اس حصہ میں نہیں پایا جاتا۔'' یہی تصور دوسرے مغربی ایشیائی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ زیادہ آزادی، تحمل، اختلاف رائے کے خواہاں ہیں یعنی مختصر طور پر ایک سیکولر نظام کے کچھ بنیادی عناصر کی چاہ ہے۔ لہٰذا ایک آخری تجزیہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آزادانہ اقدار کے لیے جدوجہد حقوق کی جدوجہد بھی ہے ایک جامع تعریف اور مطالعہ کیے ہوئے کوشش کے ساتھ۔ انسانی فطرت اس میں 'خوابوں کے محل' کے

تصور کے ساتھ یا اس کے بغیر کود پڑے گی۔ لیکن سیاسی منظرنامہ بہرحال مزید مسالہ اور استقلال کو لازمی بنا دے گا۔

ہشام شربی بکھرے ہوئے عربوں میں ایک اور نمایاں نام ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''نیو پیٹری آرکی: اے تھیوری آف ڈسٹورٹڈ چینج ان عرب سوسائٹی'' (1988) میں اس کی پیش بنی کی تھی: ''عقل و شعور کی مایوسیت کا مقابلہ کرنے کے لیے فرد کو ارادہ کی رجائیت کو مضبوطی سے تھامے رہنا چاہیے۔''

مذاکرات میں لیت ولعل

(دی برنک آف پیس: دی سیرین۔اسرائیلی نگوسیئیشنز، اتامر رانبووچ)

ایسا اکثر نہیں ہوتا ہے کہ مذاکرات میں شامل شرکا اپنے کام کے بارے میں کھلے طور سے لکھنا شروع کردیں جب کہ معاملہ حساس بھی ہو اور کسی نتیجہ تک نہ پہنچا ہو۔اسی اور دیگر وجوہات کے پیش نظر 1992-1996 میں ہوئے شامی اسرائیلی مذاکرات کا یہ ریکارڈ متعامل عرب اسرائیلی تنازعہ کے شامی دائرہ میں قابل قدر اضافہ ہے۔ مقاصد کے سوال کو شاید نظرانداز کہا جاسکتا ہے لیکن یہ کام بلاشبہ ریکارڈ کے لیے کیا گیا ہے، شاید رائے پر اثرانداز ہونے کے لیے یا اس کو منانے کے لیے بھی۔لیکن اس سے کام کی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ان مذاکرات کی سربراہی کے لیے اسرائیلی وزیراعظم آنجہانی یتز ہاک رابن نے جس شخصیت کا انتخاب کیا وہ ان کے مقصد اور رویہ کے بارے میں کافی کچھ کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بلاشبہ رشیلیو کے اس قول سے واقف تھے کہ مذاکرات میں حصہ لینے والے وہ اشخاص ہوں جو کہ الفاظ کے معنی کو صحیح صحیح سمجھ اور تول سکتے ہوں اور جو فطری طور سے مسودہ نویس ہوں۔ان سب سے اوپر ان کو مکمل جانکاری ہونی چاہیے۔ جب رابن نے اس کام کے لیے پروفیسر

اتامر رابنووچ کا انتخاب کیا تو دراصل وہ ایسی شخصیت کا انتخاب تھا جو شامی معاملات پر اسرائیل میں سب سے مستند، اس کی عصری تاریخ سے مکمل طور پر واقف اور رجحان کی نزاکتوں سے باخبر تھا۔ مذاکرات سے قبل حریف کو سمجھنے کی کوشش پوری سنجیدگی سے شروع ہوگئی۔

ایک عام تاثر یہ ہے کہ عرب اسرائیل تنازعہ میں شامی پہلو ہی سب سے زیادہ دشوار ہے۔ سالوں سے شامیوں نے عزم اور استقلال کا مظاہرہ کیا ہے اور اسی نے اس کو اسرائیل کی نظروں میں ایک جن کی شکل دے دی ہے۔ 1967 کی جنگ کے مورخین کا خیال ہے کہ شامیوں کے کچھ اقدامات نے حماقتوں کی ایک قطار لگا دی تھی جس کا نتیجہ جون 1967 کی چھ روزہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا جس کو بعد میں ''نکبت'' کا نام دیا گیا۔ شامی محاذ پر شام نے گولان کی پہاڑیوں کو کھو دیا اور اسرائیلی فوجوں نے دمشق سے صرف 10 کلومیٹر کی دوری پر اپنے خیمے نصب کر دیے۔ اکتوبر 1973 میں یوم کپور کی جنگ میں شام کو مزید زمینی نقصان ہوا۔ یہ بات نوٹ کرنی چاہیے کہ جنگ نے مصری مقصد یعنی مذاکرات کی تجدید کو پورا کر دیا۔ امریکہ کی چلتی پھرتی سفارتکاری کی کوششوں سے مصر اور شام دونوں محاذوں پر صلح کے معاہدے ہوئے اور جس کی مفصل روداد ہنری کیسنجر کی کتاب ''دی ایرس آف اپ ہول'' میں موجود ہے۔

کیونکہ 96-1992 کے مذاکرات خلا میں واقع نہیں ہوئے تھے لہٰذا ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ کے اندر جھانکا جائے۔ اس بارے میں اسرائیلی تحریریں جو سرکاری ریکارڈز یا ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہیں، نے 1967 کی جنگ کے فوراً بعد والے زمانے میں مذاکرات سے متعلق اسرائیلی مقاصد اور ترجیحات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ تل ابیب یونیورسٹی کے ریبودن پیڈزور نے 1995 میں 16 سے 19 جون 1967 تک منعقد ہوئی کابینہ کی ایک میٹنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اسرائیل ''مصر اور شام کے ساتھ بین الاقوامی سرحدوں اور اسرائیل کی سلامتی کی ضرورتوں پر مبنی صلح کے معاہدہ پر دستخط کرے گا۔'' جنگ کے دوران اسرائیل کے وزیر دفاع، موشے دیان نے 1976 میں آئی۔ خودنوشت سوانح حیات میں یہ انکشاف کیا کہ: ''امن معاہدہ کے لیے مطلوب ہوگا کہ

(i) شامی پہاڑیاں جو فی الوقت اسرائیلی فورس کے قبضہ میں ہیں، کو غیر فوجی علاقہ میں تبدیل کیا جائے؛ اور (ii) مطلق و مکمل گارنٹی کہ اردن کے منبع سے اسرائیل کو پانی کی غیر منقطع سپلائی جاری رہے گی۔ جب تک کہ شام کے ساتھ امن معاہدہ پر دستخط نہیں ہوجاتے، اسرائیل ان علاقوں پر قبضہ جاری رکھے گا جس پر اب وہ قابض ہے۔''

لیکن کسی ایسے معاہدہ کے لیے اقدام ممکن نہ ہو سکے کیونکہ 1967 سے 1973 کے عرصہ میں شام (اور مصر نے بھی)، صلح کی کسی بھی گفتگو میں شریک ہونے سے انکار کیا، اس کے لیے کسی بھی راستے کو ہموار کرنے سے باز رہا اور اصرار کیا کہ اسرائیلی فوجیں غیر مشروط طور سے واپس جائیں۔ لیکن 1973 کی جنگ کے بعد ایک سرکاری لیکن غیر متوازن امریکی سوویت شامیانہ کے نیچے قدم بہ قدم روش 1973 کی جینوا کانفرنس کی صورت میں فتح ہوئی۔ کیسنجر کے الفاظ میں صدر حافظ الاسد نے بہت ہچکچاتے ہوئے انخلا کے مذاکرات میں شرکت کی محض اس لیے کہ جنگ سے ملے الجھے ہوئے فوجی رجحان، جس میں اسرائیل کا وزن دمشق کی جانب تھا ''غیر محفوظ، خطرناک اور ناقابل برداشت تھے۔''

یو ایس سکریٹری آف اسٹیٹ کے پہلے سفر میں شامیوں نے امریکی سرپرستی میں انخلا کی شروعات کو قبول کرلیا'' یہاں تک کہ انھوں نے محدود گفتگو کے لیے علاقہ کی تجویز بھی رکھی اس کے بدلے میں انھوں نے اسرائیلی افواج کی واپسی کا مطالبہ پیش کیا جو اگر جون 1967 سے قبل کی سرحدوں پر نہ ہو لیکن کم سے کم 1973 کی جنگ کے بعد والی پوزیشن سے بہتر حالت میں ہو۔ کیسنجر کے ساتھ گفتگو میں اسد نے حقیقت پسندی اور فراخ دلی سے کام لیا اور کہا کہ ''یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنے حقوق آج ہی حاصل کرلیں۔ وہ ہم کل بھی لے سکتے ہیں... لیکن امن اور خودسپردگی میں کافی فرق ہوتا ہے۔'' کیسنجر نے بہت مشاقی کے ساتھ یہ بات گولڈا میئر اور موشے دایان کے سامنے رکھتے ہوئے ایک انقلابی عرب ریاست کے ساتھ اسرائیل کے دستاویز پر دستخط کرنے کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا: ''اس کے بعد شام کے ساتھ کوئی بھی بحث اصول کا مسئلہ نہیں بلکہ تدبیر کا مسئلہ ہوگا۔'' اس دلیل نے اپنا اثر دکھایا۔

اتامر رابنووچ کا انتخاب کیا تو دراصل وہ ایسی شخصیت کا انتخاب تھا جو شامی معاملات پر اسرائیل میں سب سے مستند، اس کی عصری تاریخ سے مکمل طور پر واقف اور رجحان کی نزاکتوں سے باخبر تھا۔ مذاکرات سے قبل حریف کو سمجھنے کی کوشش پوری سنجیدگی سے شروع ہوگئی۔

ایک عام تاثر یہ ہے کہ عرب اسرائیل تنازعہ میں شامی پہلو ہی سب سے زیادہ دشوار ہے۔ سالوں سے شامیوں نے عزم اور استقلال کا مظاہرہ کیا ہے اور اسی نے اس کو اسرائیل کی نظروں میں ایک جن کی شکل دے دی ہے۔ 1967 کی جنگ کے مورخین کا خیال ہے کہ شامیوں کے کچھ اقدامات نے حماقتوں کی ایک قطار لگا دی تھی جس کا نتیجہ جون 1967 کی چھ روزہ جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا جس کو بعد میں ''نکبت'' کا نام دیا گیا۔ شامی محاذ پر شام نے گولان کی پہاڑیوں کو کھو دیا اور اسرائیلی فوجوں نے دمشق سے صرف 10 کلومیٹر کی دوری پر اپنے خیمے نصب کر دیے۔ اکتوبر 1973 میں یوم کپور کی جنگ میں شام کو مزید زمینی نقصان ہوا۔ یہ بات نوٹ کرنی چاہیے کہ جنگ نے مصری مقصد یعنی مذاکرات کی تجدید کو پورا کر دیا۔ امریکہ کی چلتی پھرتی سفارتکاری کی کوششوں سے مصر اور شام دونوں محاذوں پر صلح کے معاہدے ہوئے اور جس کی مفصل روداد ہنری کیسنجر کی کتاب ''دی ایرس آف اپ ہول'' میں موجود ہے۔

کیونکہ 96-1992 کے مذاکرات خلا میں واقع نہیں ہوئے تھے لہٰذا ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ کے اندر جھانکا جائے۔ اس بارے میں اسرائیلی تحریریں جو سرکاری ریکارڈز یا ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہیں، نے 1967 کی جنگ کے فوراً بعد والے زمانے میں مذاکرات سے متعلق اسرائیلی مقاصد اور ترجیحات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ تل ابیب یونیورسٹی کے ریو ون پیڈزور نے 1995 میں 16 سے 19 جون 1967 تک منعقد ہوئی کابینہ کی ایک میٹنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اسرائیل ''مصر اور شام کے ساتھ بین الاقوامی سرحدوں اور اسرائیل کی سلامتی کی ضرورتوں پر مبنی صلح کے معاہدہ پر دستخط کرے گا۔'' جنگ کے دوران اسرائیل کے وزیر دفاع، موشے دیان نے 1976 میں آئی۔ خودنوشت سوانح حیات میں یہ انکشاف کیا کہ: ''امن معاہدہ کے لیے مطلوب ہوگا کہ

(i) شامی پہاڑیاں جو فی الوقت اسرائیلی فورس کے قبضہ میں ہیں، کو غیر فوجی علاقہ میں تبدیل کیا جائے؛ اور (ii) مطلق و مکمل گارنٹی کہ اردن کے منبع سے اسرائیل کو پانی کی غیر منقطع سپلائی جاری رہے گی۔ جب تک کہ شام کے ساتھ امن معاہدہ پر دستخط نہیں ہوجاتے، اسرائیل ان علاقوں پر قبضہ جاری رکھے گا جس پر اب وہ قابض ہے۔"

لیکن کسی ایسے معاہدہ کے لیے اقدام ممکن نہ ہو سکے کیونکہ 1967 سے 1973 کے عرصہ میں شام (اور مصر نے بھی)، صلح کی کسی بھی گفتگو میں شریک ہونے سے انکار کیا، اس کے لیے کسی بھی راستے کو ہموار کرنے سے باز رہا اور اصرار کیا کہ اسرائیلی فوجیں غیر مشروط طور سے واپس جائیں۔ لیکن 1973 کی جنگ کے بعد ایک سرکاری لیکن غیر متوازن امریکی سوویٹ شامیانہ کے نیچے قدم بہ قدم روش 1973 کی جنیوا کانفرنس کی صورت میں منتج ہوئی۔ کیسنجر کے الفاظ میں صدر حافظ الاسد نے بہت ہچکچاتے ہوئے انخلا کے مذاکرات میں شرکت کی محض اس لیے کہ جنگ سے ملے الجھے ہوئے فوجی رجحان، جس میں اسرائیل کا وزن دمشق کی جانب تھا "غیر محفوظ، خطرناک اور ناقابل برداشت تھے۔"

یو ایس سکریٹری آف اسٹیٹ کے پہلے سفر میں شامیوں نے امریکی سرپرستی میں انخلا کی شروعات کو قبول کرلیا "یہاں تک کہ انھوں نے محدود گفتگو کے لیے علاقہ کی تجویز بھی رکھی اس کے بدلے میں انھوں نے اسرائیلی افواج کی واپسی کا مطالبہ پیش کیا جو اگر جون 1967 سے قبل کی سرحدوں پر نہ ہو لیکن کم سے کم 1973 کی جنگ کے بعد والی پوزیشن سے بہتر حالت میں ہو۔ کیسنجر کے ساتھ گفتگو میں اسد نے حقیقت پسندی اور فراخ دلی سے کام لیا اور کہا کہ "یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اپنے حقوق آج ہی حاصل کرلیں۔ وہ ہم کل بھی لے سکتے ہیں... لیکن امن اور خودسپردگی میں کافی فرق ہوتا ہے۔" کیسنجر نے بہت مشاقی کے ساتھ یہ بات گولڈا میئر اور موشے دایان کے سامنے رکھتے ہوئے ایک انقلابی عرب ریاست کے ساتھ اسرائیل کے دستاویز پر دستخط کرنے کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا: "اس کے بعد شام کے ساتھ کوئی بھی بحث اصول کا مسئلہ نہیں بلکہ تدبیر کا مسئلہ ہوگا۔" اس دلیل نے اپنا اثر دکھایا۔

آخرکار ثابت قدمی اور سخت مول تول سے 31 مئی 1974 کو اسرائیلی اور شامی افواج کے درمیان انخلا کا معاہدہ طے پایا جس میں ان کی علاحدگی کا علاقہ (جہاں یو این ڈس انگیجمنٹ آبزرور فورس کو تعینات کیا جائے گا) اور ہتھیاروں اور فوجوں کا علاقہ واضح تھا۔ گولان پہاڑیوں کے رقبہ اور جغرافیائی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے یہ کافی مشکل کام تھا۔ سطح مرتفع کا کل رقبہ 640 کلومیٹر سے کچھ ہی زیادہ اور چوڑائی بارہ سے بیس کلومیٹر کے دائرہ میں ہے۔ اس دستاویز کی آخری شق بالکل واضح تھی۔ ''یہ دستاویز ایک امن معاہدہ نہیں ہے۔ یہ سلامتی کونسل قرارداد 338 مورخہ 22 اکتوبر 1973 کی بنیاد پر ایک پائیدار اور انصاف پسند امن کی طرف ایک قدم ہے۔'' قنیطرہ شہر کی واپسی اور کم و بیش 1967 کی جنگ کے بعد کی لائن تک اسرائیلی فوج کی واپسی نے شامی انا کو باقی رکھا۔

چار سال بعد جون 1977 میں اسرائیل میں ایک نئی حکومت جس کے وزیراعظم مینخم بیجین اور وزیرخارجہ موشے دایان تھے۔ اس کابینہ کی پہلی میٹنگ کے میمورنڈم میں اپنے لیے عربوں کے ساتھ ان مذاکرات میں، اپنے مقام کو مقرر کیا۔ یہ کام وزیرخارجہ کے سپرد کیا گیا۔ بعد میں انھوں نے اپنی 1981 کی کتاب ''بریک تھرو: اے پرسنل اکاؤنٹ آف ایجپٹ۔ اسرائیل پیس نگوسیشنز'' میں اس کی دلچسپ تفصیلات بیان کی ہیں۔ موشے دایان کی توجہ کا مرکز وہ کم سے کم شرطیں تھیں جن کو اسرائیل ایک منصفانہ اور پائیدار امن کے لیے لازمی جانتا ہو اور جو ہر عرب پڑوسی کے ساتھ حقیقت پسندانہ طور پر مذاکرات کی بنیاد بن سکے:

> ''شامی اسرائیلی سرحد کو ایک مختلف رویہ کی ضرورت تھی۔
> وہاں اسرائیل کا مفاد دریائے اردن کے آبی منبع کی حفاظت
> اور شمالی گلیلی کی دیہی بستیوں کے دفاع سے وابستہ تھا۔ اس
> سرحدی تنازعہ میں گولان پہاڑیوں پر 1967 سے بسائی
> ہوئی بستیاں ایک اضافی مسئلہ تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ شام
> کے ساتھ کسی بھی بات چیت میں اسرائیل کو پانی اور دفاع کا

> مسئلہ پیش کرنا چاہیے اور اس کے حل کے لیے تجاویز کو دعوت
> دینا چاہیے۔ جہاں تک بین الاقوامی سرحدوں کا تعلق ہے
> ہمیں گولان اور ہرمون پہاڑیوں پر صرف اسرائیلی فوجی
> چوکیوں کے لیے اصرار کرنا چاہیے اور وہ بھی مستقل امن کے
> فریم ورک میں۔''

ایک مہینے بعد بیجین واشنگٹن گئے اور ان شرائط پر گفتگو کی جن کی بنیاد پر جنیوا میں ایک عرب اسرائیلی امن کانفرنس بلائی جاسکتی ہے۔ ایک پرائیویٹ میٹنگ میں کارٹر کو ایک کیبنٹ پیپر بھی دکھایا گیا۔ اسرائیلی شامی سرحد سے متعلق اس کاغذ نے زور دیا تھا کہ اسرائیل گولان کی پہاڑیوں پر رہے گا ''لیکن ایک امن معاہدہ کے فریم ورک میں ہم اپنی افواج ان کی موجودہ لائن سے پیچھے ہٹانے کے لیے تیار رہیں گے اور ان کو ایسی لائن پر تعینات کریں گے جو مستقل سرحد بنے گی۔'' لیکن اس وقت ان میں سے کسی کو نہیں آزمایا گیا۔ مساوات کی سلسلہ جنبانی اور کیمپ ڈیوڈ معاہدوں نے شام کے اندر انکاری قوتوں اور تقریباً بارہ سال تک سفارتکاری کے جمود کو مزید مضبوط کیا جس کے دوران شامی صدر اپنے لبنانی آپشن کے ذریعہ بڑی کامیابی کے ساتھ اسرائیل پر دباؤ اور صورتحال کو ناخوش گوار بنانے کی کوشش کرتے رہے۔

اس سے پہلے کے مذاکرات جو ایک بچولیہ کی مدد سے ہوئے تھے، کا پس منظر، انتفاضہ کے بعد، کویتی جنگ کے بعد، مختلف اقدار پر مبنی کثیر جہتی اور دوطرفہ عرب اسرائیلی امن گفتگو جو اکتوبر-نومبر 1991 میں میڈرڈ میں شروع کی گئی تھی، کا پس منظر بناتے ہیں۔ اس کے لیے سابق یو ایس صدر جارج بش نے اسٹیج تیار کیا۔ 6 مارچ 1991 کو یو ایس کانگریس کے ایک مشترکہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے زور دے کر کہا کہ ایک ''جامع امن کی بنیاد، قرارداد 242 اور 338 اور زمین برائے امن کے اصول پر ہونی چاہیے۔ اس اصول کو مزید واضح کیا جائے اور اسرائیل کا تحفظ، اس کی شناخت اور ساتھ ہی ساتھ فلسطینیوں کے جائز سیاسی حقوق بھی شامل کیے جائیں۔''

اپریل 1993 میں پیٹرک سیل کو دیے ہوئے ایک نایاب اور طویل انٹرویو میں حافظ الاسد نے یو ایس کے اس اقدام کی اہمیت پر تبصرہ کیا: ''جس چیز نے ہمیں میڈرڈ جانے پر تیار کیا وہ نئی امریکی سنجیدگی کا ثبوت تھا اور خاص طور سے امریکی اقدام کا متن جو ہمیں منصفانہ لگا۔'' تینتالیس سالوں میں پہلی بار ہونے والی میڈرڈ میں اسرائیلی شامی دوطرفہ بات چیت گولان پہاڑیوں سے اسرائیلی افواج کی واپسی اور 1967 سے قبل کی سرحدوں کے نازک مسئلہ پر جلد ہی اٹک گئی۔ اسرائیل نے گولان پہاڑیوں ''پر'' اپنی فوجوں کی واپسی لیکن گولان پہاڑیوں ''سے'' اپنی واپسی پر رضامندی کا اظہار کیا۔ اس نے یہ بتانے سے انکار کردیا کہ اس انخلا کی حد کہاں تک ہوگی جب تک کہ شام حتمی اور جامع طریقہ سے ان ''عام حالات'' کی وضاحت نہ کردے جو امن کے بعد جاری رہیں گے۔

امن عمل کے تیئں شامی حکومت کا رویہ قطعی طور سے مثبت نہیں تھا۔ محمد ہیکل کے الفاظ میں اس حکومت کے خیال میں ''وقت گزاری بجائے خود ایک حل ہے۔'' اس کے علاوہ قرض کی ضمانت کے مسئلہ پر یو ایس سے تناؤ، اور گٹھ جوڑ میں شریک دائیں بازو کی چھوٹی چھوٹی پارٹیوں سے جھگڑوں نے جون 1992 میں جلد انتخابات کرائے اور یتزاک رابن کی قیادت میں لیبر حکومت کا ظہور ہوا۔

راندوچ مذاکرات کی روداد اسی نقطہ سے بیان کرتے ہیں۔ ''جب آنجہانی تیزاک رابن نے مجھے شام کے ساتھ امن مذاکرات کے وفد کا سربراہ مقرر کیا تو ان مذاکرات کے بھاری بھرکم امکان سامنے تھے۔ وزیراعظم نے ہمارے ساتھ پہلی میٹنگ میں اپنے ارادوں کی وضاحت کی کہ شام کے ساتھ امن قائم ہونے کے تمام امکانات کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جائے۔ انھوں نے اپنی اس رضامندی کا اظہار بھی کیا کہ اگر شام کے ساتھ امن کے سنجیدہ آثار نظر آئیں تو اہم مراعات بھی دی جاسکتی ہیں...اسرائیل کے نئے وزیراعظم اب تعطل کو ختم کرنے کی پیش کش کررہے تھے۔'' (صفحہ IX)

لہٰذا یہ کتاب اس روداد کو بیان کرتی ہے جو ہوا اور جو نہیں ہوا۔ اور یہ کہ ''اسرائیل اور شام نے ایک دوسرے سے رابطے کیسے قائم کیے۔ وہ کن باتوں پر ایک دوسرے سے راضی

ہوئے اور نقطہ اختلاف کہاں سے شروع ہوا۔'' بر سبیل تذکرہ وہ تینوں عملی۔ امریکی، اسرائیلی اور شامی۔ نظاموں کی اندرونی حقائق سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ کھوئے ہوئے مواقع کو بھی گرفت میں لیا گیا لیکن ان کو قابل ذکر اہمیت نہیں دی گئی۔ لیکن اس کو ایک مذاکرات کے سربراہ کے نقطۂ نظر سے سمجھا جاسکتا ہے۔

''حریف ریاستوں'' کے درمیان گفتگو میں سہولتیں یونائیٹڈ اسٹیٹس نے فراہم کیں۔ گفتگو واشنگٹن میں منعقد ہوئی اور زیادہ تر اس کا مقام اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ ہی ہوتا تھا جہاں مغربی ایشیا کے امن عمل کے ماہر اور ہر پہلو سے واقف سینئر امریکی سفارتکار موجود رہتے تھے۔ ماحول متناسب تھا لیکن دوستانہ نہیں تھا۔ رابنووچ کی ''جنگل کی سیر'' کی خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ ہر فریق اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور اپنے اپنے نوٹس لکھتا رہا۔ کچھ دن بعد یہ تجویز کہ امریکی گفتگو کا ایک خلاصہ تیار کریں، کو شامیوں نے سختی سے مسترد کر دیا۔

مذاکرات کا پہلا فیز 24 اگست سے 17 دسمبر 1992 تک جاری رہا اور اس میں تین راؤنڈ ہوئے۔ رابنووچ کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ''شامی موقف کو کھنگالیں اور ہمارے اپنے مقصد کی سنجیدگی کی جانب توجہ دلائیں'' یہ اشارہ کرتے ہوئے کہ نئی اسرائیلی حکومت اپنے پیش رو کی 'امن کی قیمت امن' کے فارمولے کو مسترد کرتی ہے اور اقوام متحدہ سلامتی کونسل قرارداد 242 کو مذاکرات کی بنیاد بنانے کے لیے تیار ہے اور ان کی خاطر گولان پہاڑیوں سے واپسی کے عنصر کو بھی شامل کرنے کے لیے غور کیا جاسکتا ہے۔ یہ اہمیت کی بات ہے کہ وزیر خارجہ پیریز کے ایک نزدیکی مشیر کی یہ تجویز کہ 19 جون 1967 کی منعقدہ میٹنگ کے فیصلہ کو اس مرحلہ پر دوہرایا جائے، کو رابنووچ نے مراعات میں حد سے تجاوز کرنے سے تعبیر کیا۔ ان کی دلیل تھی کہ حافظ الاسد کے کردار اور گفت و شنید کے طریقہ کار کو دیکھتے ہوئے اس رعایت کو کمزوری سمجھا جائے گا۔ اس کے لیے ایک اور زیادہ سنجیدہ توجیہہ کا انکشاف بھی کیا گیا۔ ''یہ ایک کھلا ہوا سوال تھا کہ لیبر حکومت مکمل واپسی کے بدلے میں شام سے امن قائم کرنے کے لیے رضامند ہے لیکن یقینی طور سے یہ بعید از قیاس تھا کہ وہ سنجیدہ مذاکرات کی تمہید کے لیے ایسا کوئی وعدہ کرے گی۔'' (صفحہ 56)

پہلے ہفتہ کے آخر میں شامیوں نے مذاکرات کا آغاز اپنی جانب سے اصولوں کی فہرست کو سامنے رکھ کر کیا: (i) مقصد امن ہے جو منصفانہ، جامع اور سلامتی کونسل کی قرارداد 242 اور 338 کی بنیاد پر ہو جس میں تمام مسائل کا تصفیہ ہو، باہمی تحفظ کی یقین دہانی ہو اور مذاکرات کا برقرار رہنا ہو: (ii) اس کے قیام اور نفاذ کے لیے گولان پہاڑیوں سے مکمل واپسی اور ایک منظم ٹائم ٹیبل کے ذریعہ بستیوں کا انہدام: جنگ کے خاتمہ کا اعلان اور ایک دوسرے کی آزادی، اقتدار اعلیٰ اور محفوظ و منظورشدہ سرحدوں میں رہنے کے حقوق کی منظوری، فوجی اور ٹیکنیکل گروپ کی تشکیل؛ غیر فوجی علاقوں کی حد بندی اور چیکنگ پوسٹ میں یو این، روسی یا یو ایس فوجی ہوں گے؛ اور معاون ریاستوں اور سلامتی کونسل سے تحفظ کی ضمانت کا مسئلہ۔ (مغربی ایشین میڈیا اور ایف بی آئی ایس نے شامی دستاویز کے متن کو اکتوبر 1992 میں شائع کیا)۔

شامی موقف کی اس وضاحت کی جانب اسرائیلی وفد کا رویہ بے توجہی کا تھا ''شامی مسودہ کی کوتاہیاں اور کمزوریاں بہت واضح تھیں اور اس کے پیچھے تکنیکی فکر شفاف تھی۔ شامی وفد نے اپنی پہلی چال میں ہم کو مکمل انخلا کے بدلے میں ایک پرشکوہ غیر جارحانہ صورتحال کی پیش کش کی۔ شامی تحفظ کے انتظامات پر مستقبل میں مذاکرات کے لیے بھی مستعد نظر آتے تھے اور ہمارے اور فلسطینیوں کے روابط کے مسئلہ پر دانستہ ابہام کا پردہ ڈال رہے تھے۔'' (صفحہ 62) اس موقعہ پر کوشش کی گئی کہ وفد کے سربراہوں کے درمیان فرد فرد کی بنیاد پر غیر رسمی طور سے کچھ راستے کھولنے کے لیے ملاقات ہو جس کو شام نے قبول نہیں کیا۔ لیکن وہ اس پر راضی ہو گئے کہ چھ افراد کا ایک مختصر گروپ (ہر فریق کے دو نمائندے) جو اسٹیٹ سکریٹری ایڈورڈ جیری جان کے آفس میں مستقل طور پر ملے گا اور مزید کھوج کرنے کا اہل ہوگا اور کوشش کرے گا کہ ماحول اور رفتار کو بغیر بریک تھرو حاصل کیے قائم رکھے۔

اس تعطل کا سبب ظاہر تھا۔ اسرائیل مکمل انخلا اس وقت تک عمل میں نہیں لاسکتا تھا جب تک کہ اسے شام کی جانب سے امن کے تفصیلی وعدے جیسے کہ سفارتی تعلقات کا قیام، لوگوں کی آمدورفت، معاشی تعلقات، حالات کی بحالی وغیرہ وغیرہ جن کا امن عمل کے دیگر

راستوں سے کوئی تعلق نہ ہو، حاصل نہیں ہو جاتے۔ شام چاہتا تھا کہ پہلے مکمل انخلا عمل میں آئے بعد میں وہ اپنی مول تول کی پیش کش کو ظاہر کرے گا۔ رابنووچ نے اسرائیل کے جون 1967 کے مکمل انخلا کے وعدہ سے منہ پھیر لیا۔ جب شامی وفد کے سربراہ سفیر الاف نے یہ سوال کیا کہ کیا اسرائیلی جوابی مسودہ میں انخلا کی اصطلاح سے مراد مکمل انخلا ہے تو وہ ''ہمارے دو جذباتی رجحان'' کا سہارا لیتے ہیں۔ ''میں نے ان سے کہا کہ ان کا مطالبہ نا قابل قبول ہے اور میں بغیر کسی منفی یا مثبت تعصب کے ساتھ اس کو مسترد کرتا ہوں!''

مصنف ایک بڑی اندرونی لاچاری کا بھی اظہار کرتا ہے: ''اور بستیوں اور ان میں رہنے والوں کا کیا ہوگا؟ اس وقت تک گولان پہاڑیوں پر بارہ ہزار سے زیادہ لوگ تھے۔ تقریباً تیس سال تک گولان پہاڑیوں میں رہنے کے بعد، ایک مشن کی صورت میں بستیوں کا انہدام نا قابل برداشت اذیت کا باعث ہوگا۔'' (صفحہ 73)

اس مرحلہ پر شامی اور اسرائیلی سیاسی قیادت نے عوامی سیاست میں ایک مشق کے ذریعہ مدد کا ہاتھ بڑھایا۔ حافظ الاسد نے ''بہادروں کا امن'' کی اصطلاح وضع کی۔ اسرائیل کا خیال تھا کہ یہ اظہار بیان مبہم، حیران کن اور سرد تھا۔ اس کے بعد رابن نے کہا کہ انخلا کی وسعت امن کی پائیداری کی آئینہ دار ہوگی۔ شامی وزیر خارجہ نے جواب میں ''مکمل امن کے لیے مکمل انخلا کی تجویز پیش کی لیکن انھیں پتہ چلا کہ اسرائیلی ''مکمل'' اور ''پورے'' انخلا میں فرق کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد اسد نے اس کو واضح کیا ''پورے امن کے لیے پورا انخلا۔'' اسرائیل نے اپنے جواب میں کہا کہ 'پورے امن' اور 'پورے انخلا' میں کوئی صحیح تناسب نہیں ہے۔''

واشنگٹن میں 1993 کی ابتدا میں ایک نئی انتظامیہ نے اس عمل میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ رابن سے اپنی پہلی ملاقات میں کلنٹن نے ''وزیر اعظم سے کئی بار یہ خبر نکالنے کی کوشش کی کیا وہ شام سے امن کی خاطر پورے انخلا کے لیے رضامند ہوں گے۔ رابن ٹال گئے لیکن انھوں نے صدر سے یہ ضرور کہا کہ اگر معاملات اس نقطہ تک پہنچے تو ایک ریفرنڈم کی ضرورت پڑے گی کیونکہ وہ اس مسئلہ میں خود سے فیصلہ لینے کے مجاز نہیں ہیں۔''

پہلے ہفتہ کے آخر میں شامیوں نے مذاکرات کا آغاز اپنی جانب سے اصولوں کی فہرست کو سامنے رکھ کر کیا: (i) مقصد امن ہے جو منصفانہ، جامع اور سلامتی کونسل کی قرارداد 242 اور 338 کی بنیاد پر ہو جس میں تمام مسائل کا تصفیہ ہو، باہمی تحفظ کی یقین دہانی ہو اور مذاکرات کا برقرار رہنا ہو: (ii) اس کے قیام اور نفاذ کے لیے گولان پہاڑیوں سے مکمل واپسی اور ایک منظم ٹائم ٹیبل کے ذریعہ بستیوں کا انہدام؛ جنگ کے خاتمہ کا اعلان اور ایک دوسرے کی آزادی، اقتداراعلیٰ اور محفوظ و منظورشدہ سرحدوں میں رہنے کے حقوق کی منظوری، فوجی اور ٹیکنیکل گروپ کی تشکیل؛ غیرفوجی علاقوں کی حد بندی اور چیکنگ پوسٹ میں یو این، روسی یا یو ایس فوجی ہوں گے؛ اور معاون ریاستوں اور سلامتی کونسل سے تحفظ کی ضمانت کا مسئلہ۔ (مغربی ایشین میڈیا اور ایف بی آئی ایس نے شامی دستاویز کے متن کو اکتوبر 1992 میں شائع کیا)۔

شامی موقف کی اس وضاحت کی جانب اسرائیلی وفد کا رویہ بے توجہی کا تھا ''شامی مسودہ کی کوتاہیاں اور کمزوریاں بہت واضح تھیں اور اس کے پیچھے تکنیکی فکر شفاف تھی۔ شامی وفد نے اپنی پہلی چال میں ہم کو مکمل انخلا کے بدلے میں ایک پرشکوہ غیر جارحانہ صورتحال کی پیش کش کی۔ شامی تحفظ کے انتظامات پر مستقبل میں مذاکرات کے لیے بھی مستعد نظر آتے تھے اور ہمارے اور فلسطینیوں کے روابط کے مسئلہ پر دانستہ ابہام کا پردہ ڈال رہے تھے۔'' (صفحہ 62) اس موقعہ پر کوشش کی گئی کہ وفد کے سربراہوں کے درمیان فرد فرد کی بنیاد پر غیر رسمی طور سے کچھ راستے کھولنے کے لیے ملاقات ہو جس کو شام نے قبول نہیں کیا۔ لیکن وہ اس پر راضی ہوگئے کہ چھ افراد کا ایک مختصر گروپ (ہر فریق کے دو نمائندے) جو اسٹیٹ سکریٹری ایڈورڈ جیری جان کے آنس میں مستقل طور پر ملے گا اور مزید کھوج کرنے کا اہل ہوگا اور کوشش کرے گا کہ ماحول اور رفتار کو بغیر بریک تھرو حاصل کیے قائم رکھے۔

اس تعطل کا سبب ظاہر تھا۔ اسرائیل مکمل انخلا اس وقت تک عمل میں نہیں لاسکتا تھا جب تک کہ اسے شام کی جانب سے امن کے تفصیلی وعدے جیسے کہ سفارتی تعلقات کا قیام، لوگوں کی آمدورفت، معاشی تعلقات، حالات کی بحالی وغیرہ وغیرہ جن کا امن عمل کے دیگر

راستوں سے کوئی تعلق نہ ہو، حاصل نہیں ہوجاتے۔ شام چاہتا تھا کہ پہلے مکمل انخلا عمل میں آئے بعد میں وہ اپنی مول تول کی پیش کش کو ظاہر کرے گا۔ رابنووچ نے اسرائیل کے جون 1967 کے مکمل انخلا کے وعدہ سے منہ پھیرلیا۔ جب شامی وفد کے سربراہ سفیر الاف نے یہ سوال کیا کہ کیا اسرائیلی جوابی مسودہ میں انخلا کی اصطلاح سے مراد مکمل انخلا ہے تو وہ ''ہمارے دو جذباتی رجحان'' کا سہارا لیتے ہیں۔''میں نے ان سے کہا کہ ان کا مطالبہ ناقابل قبول ہے اور میں بغیر کسی منفی یا مثبت تعصب کے ساتھ اس کو مسترد کرتا ہوں!''

مصنف ایک بڑی اندرونی لاچاری کا بھی اظہار کرتا ہے:''اور بستیوں اور ان میں رہنے والوں کا کیا ہوگا؟ اس وقت تک گولان پہاڑیوں پر بارہ ہزار سے زیادہ لوگ تھے۔ تقریباً تیس سال تک گولان پہاڑیوں میں رہنے کے بعد، ایک مشن کی صورت میں بستیوں کا انہدام ناقابل برداشت اذیت کا باعث ہوگا۔'' (صفحہ 73)

اس مرحلہ پر شامی اور اسرائیلی سیاسی قیادت نے عوامی سیاست میں ایک مشق کے ذریعہ مدد کا ہاتھ بڑھایا۔ حافظ الاسد نے ''بہادروں کا امن'' کی اصطلاح وضع کی۔ اسرائیل کا خیال تھا کہ یہ اظہار بیان مبہم، حیران کن اور سرد تھا۔ اس کے بعد رابن نے کہا کہ انخلا کی وسعت امن کی پائیداری کی آئینہ دار ہوگی۔ شامی وزیر خارجہ نے جواب میں ''مکمل امن کے لیے مکمل انخلا کی تجویز پیش کی لیکن انھیں پتہ چلا کہ اسرائیلی ''مکمل'' اور ''پورے'' انخلا میں فرق کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد اسد نے اس کو واضح کیا ''پورے امن کے لیے پورا انخلا۔'' اسرائیل نے اپنے جواب میں کہا کہ 'پورے امن' اور 'پورے انخلا' میں کوئی صحیح تناسب نہیں ہے۔''

واشنگٹن میں 1993 کی ابتدا میں ایک نئی انتظامیہ نے اس عمل میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ رابن سے اپنی پہلی ملاقات میں کلنٹن نے ''وزیراعظم سے کئی بار یہ خبر نکالنے کی کوشش کی کیا وہ شام سے امن کی خاطر پورے انخلا کے لیے رضامند ہوں گے۔ رابن ٹال گئے لیکن انھوں نے صدر سے یہ ضرور کہا کہ اگر معاملات اس نقطہ تک پہنچے تو ایک ریفرنڈم کی ضرورت پڑے گی کیونکہ وہ اس مسئلہ میں خود سے فیصلہ لینے کے مجاز نہیں ہیں۔''

(صفحہ 92) اس کے بعد مزید گفتگو اور سکریٹری آف اسٹیٹ وارن کرسٹوفر کی سفری سفارتکاری جاری رہی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

اس کے بعد 3 اگست 1993 (تاریخ قابل غور ہے) کی ایک میٹنگ میں رابن نے کلنٹن سے کہا کہ ''اسرائیل بیک وقت دو راستوں پر نہیں چل سکتا۔ تو امن عمل میں ترقی کو حصوں میں بانٹنا ہوگا۔ رابن کی اپنی ترجیح یہ تھی کہ اولاً شام اور لبنان کے ساتھ معاملات طے کریں اور ساتھ ہی ساتھ فلسطینیوں سے بھی محدود ترقی کی کوشش کرتے رہیں۔ (غزہ فرسٹ پلان کے پیمانے پر)'' (صفحہ 104)۔ ایسا کرنے کے لیے ان کو ضرورت تھی کہ وہ حافظ الاسد سے معلوم کریں کہ اس مفروضہ پر کہ ان کے مطالبہ کو منظور کرلیا جائے گا کہ کیا شام امن عمل کے دیگر حصوں سے کوئی رابطہ قائم رکھے بغیر معاہدہ پر دستخط کرے گا اور حقیقی امن اور صورتحال کی مکمل بحالی کے لیے تیار رہے گا اور کیا وہ امن کے کچھ عناصر کی مکمل انخلا سے پہلے پیش کش کرے گا (جو کہ پانچ سال کی مدت میں مکمل ہوگا)۔ وزیراعظم نے یہ اضافہ کیا کہ وہ ایک مفروضہ کی بات کررہے ہیں، انھوں نے مطلق رازداری پر زور دیا، تصفیہ کے بعد حفاظتی انتظامات میں یو ایس کی شرکت کی یقین دہانی، اور شام کے ساتھ کسی بھی معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہلے وہ معاملہ کو ایک ریفرنڈم کے سپرد کریں گے۔

اسد کے ردِعمل کو امریکیوں نے مثبت جانا لیکن رابن کے نزدیک وہ مایوس کن تھا۔ شامیوں نے پہلی اور دوسری تجویز قبول کرلی اور تیسری کے بے جوڑ پن کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا اور رابن کے تجویز کردہ پانچ سال کے بجائے نفاذ کے لیے چھ ماہ کی مدت تجویز کی۔

ان مشوروں اور پیش کش کے حوالہ سے کئی جائز سوال اٹھتے ہیں۔ کیا واقعی اسرائیل شام کے ساتھ نیک نیتی سے تصفیہ چاہتا تھا؟ کیا پیش کی گئی 'اہم رعایت' مذاکرات کا ایک پھندا تھی جس کے لالچ میں شام اسرائیل کی شرائط پر شامل ہوجائے گا؟ ہمیں جین کاربن کی کتاب ''دی ناروے چینل'' (1994) سے اوسلو مذاکرات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ 26 جولائی تک فلسطینی اسرائیلی مذاکرات خاصی حد تک آگے جاچکے تھے اور اس

وقت پی ایل او شدید مالی بحران کا شکار تھی اور اسرائیل سے معاہدہ کی تلاش میں جو رعائتیں
یاسر عرفات دینے کے لیے تیار تھے ان پر بھی اندرون خانہ اختلاف تھا۔ ''اسرائیل میں کچھ
لوگوں کا خیال تھا کہ فلسطینیوں کی اندرونی اکھاڑ پچھاڑ اور مالی بحران اشارہ تھا کہ اس سے
پہلے کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جائے اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔''
اس کے علاوہ فلسطینیوں کو یہ خدشہ بھی تھا کہ وزیراعظم رابن اور صدر اسد آپس
میں گولان پہاڑیاں لوٹانے کا علاحدہ معاہدہ کرلیں گے۔ [illegible] تھے۔ وہ نہیں
چاہتے تھے واشنگٹن مذاکرات جس میں انھیں شامل نہیں کیا گیا سے کوئی نتیجہ برآمد ہو کیونکہ اب
تو پی ایل او کو بالکل ہی درکنار کردینے کا خطرہ تھا۔ کاربن اضافہ کرتے ہیں (اور رابنووچ
آزادانہ طور سے تائید کرتے ہیں) کہ کرسٹوفر کی واشنگٹن واپسی کے کچھ دن بعد رابن نے
اسرائیلی ٹیم کو ناروے واپس جانے کا اختیار دے دیا (13 اگست) تاکہ معاہدہ کو آخری شکل
دی جائے۔ پی ایل او کے مخمصہ کی طرف سے اسرائیل کا اندازہ درست تھا۔ مذاکرات کی
آخری رات کو نارویجن وزیر خارجہ اسرائیلی وزیر خارجہ نے شمعان پیریز کی طرف سے بولتے
ہوئے اسٹاک ہوم سے تیونس کو ایک فیصلہ کن ٹیلیفون کال کی: ''ان سے کہہ دیں کہ ہم شام
کے ساتھ ہیں۔'' عربوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے کی اسرائیلی صلاحیت کا
مظاہرہ ایک بار پھر ہوا۔

اوسلو معاہدہ پر شامی تلخی کا اظہار اکتوبر میں وزیر خارجہ فاروق الشراع کے ذریعہ ہوا: ''ہم نے شام کے اندر اس کی حمایت نہیں کی۔ ہم نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ عرب موقف کو جو نقصان اس نے پہنچایا ہے ہم نے ان اندیشوں کو بھی نہیں چھپایا اور نہ ہی عرب فریقوں کے تعاون کو۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ فلسطینیوں نے اسرائیل کو وہ چیزیں بخش دیں جن کا احسان بھی نہ مانا گیا جیسے کہ سلامتی اور معاشی تعاون۔''

رابنووچ تسلیم کرتے ہیں کہ اوسلو معاہدوں کے بعد کچھ مہینوں تک اسرائیلی شامی امن عمل کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی۔ یہ رابن کی ضرورت کے موافق بھی تھا کیونکہ انھیں عرفات کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کے نفاذ کے لیے وقت چاہیے تھا اور اپنے عوام سے

(صفحہ 92) اس کے بعد مزید گفتگو اور سکریٹری آف اسٹیٹ وارن کرسٹوفر کی سفری سفارتکاری جاری رہی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

اس کے بعد 3 اگست 1993 (تاریخ قابل غور ہے) کی ایک میٹنگ میں رابن نے کلنٹن سے کہا کہ ''اسرائیل بیک وقت دو راستوں پر نہیں چل سکتا۔ تو امن عمل میں ترقی کو حصوں میں بانٹنا ہوگا۔ رابن کی اپنی ترجیح یہ تھی کہ اولاً شام اور لبنان کے ساتھ معاملات طے کریں اور ساتھ ہی ساتھ فلسطینیوں سے بھی محدود ترقی کی کوشش کرتے رہیں۔ (غزہ فرسٹ پلان کے پیمانے پر)'' (صفحہ 104)۔ ایسا کرنے کے لیے ان کو ضرورت تھی کہ وہ حافظ الاسد سے معلوم کریں کہ اس مفروضہ پر کہ ان کے مطالبہ کو منظور کرلیا جائے گا کہ کیا شام امن عمل کے دیگر حصوں سے کوئی رابطہ قائم رکھے بغیر معاہدہ پر دستخط کرے گا اور حقیقی امن اور صورتحال کی مکمل بحالی کے لیے تیار رہے گا اور کیا وہ امن کے کچھ عناصر کی مکمل انخلا سے پہلے پیش کش کرے گا (جو کہ پانچ سال کی مدت میں مکمل ہوگا)۔ وزیراعظم نے یہ اضافہ کیا کہ وہ ایک مفروضہ کی بات کررہے ہیں، انھوں نے مطلق رازداری پر زور دیا، تصفیہ کے بعد حفاظتی انتظامات میں یو ایس کی شرکت کی یقین دہانی، اور شام کے ساتھ کسی بھی معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہلے وہ معاملہ کو ایک ریفرنڈم کے سپرد کریں گے۔

اسد کے ردعمل کو امریکیوں نے مثبت جانا لیکن رابن کے نزدیک وہ مایوس کن تھا۔ شامیوں نے پہلی اور دوسری تجویز قبول کرلی اور تیسری کے بے جوڑپن کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا اور رابن کے تجویز کردہ پانچ سال کے بجائے نفاذ کے لیے چھ ماہ کی مدت تجویز کی۔

ان مشوروں اور پیش کش کے حوالہ سے کئی جائز سوال اٹھتے ہیں۔ کیا واقعی اسرائیل شام کے ساتھ نیک نیتی سے تصفیہ چاہتا تھا؟ کیا پیش کی گئی 'اہم رعایت' مذاکرات کا ایک پھندا تھی جس کے لالچ میں شام اسرائیل کی شرائط پر شامل ہوجائے گا؟ ہمیں جین کاربن کی کتاب ''دی ناروے چینل'' (1994) سے اوسلو مذاکرات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ 26 جولائی تک فلسطینی اسرائیلی مذاکرات خاصی حد تک آگے جاچکے تھے اور اس

وقت پی ایل اوشدید مالی بحران کا شکار تھی اور اسرائیل سے معاہدہ کی تلاش میں جو رعائتیں یاسر عرفات دینے کے لیے تیار تھے ان پر بھی اندرون خانہ اختلاف تھا۔''اسرائیل میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ فلسطینیوں کی اندرونی اکھاڑ پچھاڑ اور مالی بحران اشارہ تھا کہ اس سے پہلے کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جائے اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

اس کے علاوہ فلسطینیوں کو یہ خدشہ بھی تھا کہ وزیراعظم رابن اور صدر اسد آپس میں گولان پہاڑیاں لوٹانے کا علاحدہ معاہدہ کرلیں گے۔عرفات تذبذب میں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے واشنگٹن مذاکرات جس میں انھیں شامل نہیں کیا گیا سے کوئی نتیجہ برآمد ہو لیکن اب تو پی ایل او کو بالکل ہی درکنار کردینے کا خطرہ تھا۔ کاربن اضافہ کرتے ہیں (اور رابنووچ آزادانہ طور سے تائید کرتے ہیں) کہ کرسٹوفر کی واشنگٹن واپسی کے کچھ دن بعد رابن نے اسرائیلی ٹیم کو ناروے واپس جانے کا اختیار دے دیا (13 اگست) تاکہ معاہدہ کو آخری شکل دی جائے۔ پی ایل او کے مخمصہ کی طرف سے اسرائیل کا اندازہ درست تھا۔ مذاکرات کی آخری رات کو ناروین وزیرخارجہ اسرائیلی وزیرخارجہ نے شمان پیرز کی طرف سے بولتے ہوئے اسٹاک ہوم سے تیونس کو ایک فیصلہ کن ٹیلیفون کال کی:''ان سے کہہ دیں کہ ہم شام کے ساتھ ہیں۔'' عربوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے کی اسرائیلی صلاحیت کا مظاہرہ ایک بار پھر ہوا۔

اوسلو معاہدہ پر شامی تلخی کا اظہار اکتوبر میں وزیرخارجہ فاروق الشراع کے ذریعہ ہوا:''ہم نے شام کے اندر اس کی حمایت نہیں کی۔ ہم نے اس کی مخالفت نہیں کی۔عرب موقف کو جونقصان اس نے پہنچایا ہے ہم نے ان اندیشوں کو بھی نہیں چھپایا اور نہ ہی عرب فریقوں کے تعاون کو۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ فلسطینیوں نے اسرائیل کو وہ چیزیں بخش دیں جن کا احسان بھی نہ مانا گیا جیسے کہ سلامتی اور معاشی تعاون۔''

رابنووچ تسلیم کرتے ہیں کہ اوسلو معاہدوں کے بعد کچھ مہینوں تک اسرائیلی شامی امن عمل کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی۔ یہ رابن کی ضرورت کے موافق بھی تھا کیونکہ انھیں عرفات کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کے نفاذ کے لیے وقت چاہیے تھا اور اپنے عوام سے

(صفحہ 92) اس کے بعد مزید گفتگو اور سکریٹری آف اسٹیٹ وارن کرسٹوفر کی سفری سفارتکاری جاری رہی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

اس کے بعد 3 اگست 1993 (تاریخ قابل غور ہے) کی ایک میٹنگ میں رابن نے کلنٹن سے کہا کہ ''اسرائیل بیک وقت دو راستوں پر نہیں چل سکتا۔ تو امن عمل میں ترقی کو حصوں میں بانٹنا ہوگا۔ رابن کی اپنی ترجیح یہ تھی کہ اولاً شام اور لبنان کے ساتھ معاملات طے کریں اور ساتھ ہی ساتھ فلسطینیوں سے بھی محدود ترقی کی کوشش کرتے رہیں۔ (غزہ فرسٹ پلان کے پیمانے پر)'' (صفحہ 104)۔ ایسا کرنے کے لیے ان کو ضرورت تھی کہ وہ حافظ الاسد سے معلوم کریں کہ اس مفروضہ پر کہ ان کے مطالبہ کو منظور کرلیا جائے گا کہ کیا شام امن عمل کے دیگر حصوں سے کوئی رابطہ قائم رکھے بغیر معاہدہ پر دستخط کرے گا اور حقیقی امن اور صورتحال کی مکمل بحالی کے لیے تیار رہے گا اور کیا وہ امن کے کچھ عناصر کی مکمل انخلا سے پہلے پیش کش کرے گا (جو کہ پانچ سال کی مدت میں مکمل ہوگا)۔ وزیراعظم نے یہ اضافہ کیا کہ وہ ایک مفروضہ کی بات کررہے ہیں، انھوں نے مطلق رازداری پر زور دیا، تصفیہ کے بعد حفاظتی انتظامات میں یو ایس کی شرکت کی یقین دہانی، اور شام کے ساتھ کسی بھی معاہدہ پر دستخط کرنے سے پہلے وہ معاملہ کو ایک ریفرنڈم کے سپرد کریں گے۔

اسد کے ردِّعمل کو امریکیوں نے مثبت جانا لیکن رابن کے نزدیک وہ مایوس کن تھا۔ شامیوں نے پہلی اور دوسری تجویز قبول کرلی اور تیسری کے بے جوڑپن کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا اور رابن کے تجویز کردہ پانچ سال کے بجائے نفاذ کے لیے چھ ماہ کی مدت تجویز کی۔

ان مشوروں اور پیش کش کے حوالہ سے کئی جائز سوال اٹھتے ہیں۔ کیا واقعی اسرائیل شام کے ساتھ نیک نیتی سے تصفیہ چاہتا تھا؟ کیا پیش کی گئی 'اہم رعایت' مذاکرات کا ایک پھندا تھی جس کے لالچ میں شام اسرائیل کی شرائط پر شامل ہوجائے گا؟ ہمیں جین کاربن کی کتاب ''دی ناروے چینل'' (1994) سے اوسلو مذاکرات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ 26 جولائی تک فلسطینی اسرائیلی مذاکرات خاصی حد تک آگے جاچکے تھے اور اس

وقت پی ایل او شدید مالی بحران کا شکار تھی اور اسرائیل سے معاہدہ کی تلاش میں جو رعائتیں یاسر عرفات دینے کے لیے تیار تھے ان پر بھی اندرون خانہ اختلاف تھا۔ ''اسرائیل میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ فلسطینیوں کی اندرونی اکھاڑ پچھاڑ اور مالی بحران اشارہ تھا کہ اس سے پہلے کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جائے اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

اس کے علاوہ فلسطینیوں کو یہ خدشہ بھی تھا کہ وزیراعظم رابن اور صدر اسد آپس میں گولان پہاڑیاں لوٹانے کا علاحدہ معاہدہ کرلیں گے۔ عرفات تذبذب میں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے واشنگٹن مذاکرات جس میں انھیں شامل نہیں کیا گیا سے کوئی نتیجہ برآمد ہو لیکن اب تو پی ایل او کو بالکل ہی درکنار کردینے کا خطرہ تھا۔ کاربن اضافہ کرتے ہیں (اور رابنووچ آزادانہ طور سے تائید کرتے ہیں) کہ کرسٹوفر کی واشنگٹن واپسی کے کچھ دن بعد رابن نے اسرائیلی ٹیم کو ناروے واپس جانے کا اختیار دے دیا (13 اگست) تاکہ معاہدہ کو آخری شکل دی جائے۔ پی ایل او کے مخمصہ کی طرف سے اسرائیل کا اندازہ درست تھا۔ مذاکرات کی آخری رات کو ناروین وزیرخارجہ اسرائیلی وزیرخارجہ نے شمان پیرز کی طرف سے بولتے ہوئے اسٹاک ہوم سے تیونس کو ایک فیصلہ کن ٹیلیفون کال کی: ''ان سے کہہ دیں کہ ہم شام کے ساتھ ہیں۔'' عربوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانے کی اسرائیلی صلاحیت کا مظاہرہ ایک بار پھر ہوا۔

اوسلو معاہدہ پر شامی تلخی کا اظہار اکتوبر میں وزیرخارجہ فاروق الشراع کے ذریعہ ہوا: ''ہم نے شام کے اندر اس کی حمایت نہیں کی۔ ہم نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ عرب موقف کو جو نقصان اس نے پہنچایا ہے ہم نے ان اندیشوں کو بھی نہیں چھپایا اور نہ ہی عرب فریقوں کے تعاون کو۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ فلسطینیوں نے اسرائیل کو وہ چیزیں بخش دیں جن کا احسان بھی نہ مانا گیا جیسے کہ سلامتی اور معاشی تعاون۔''

رابنووچ تسلیم کرتے ہیں کہ اوسلو معاہدوں کے بعد کچھ مہینوں تک اسرائیلی شامی امن عمل کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی۔ یہ رابن کی ضرورت کے موافق بھی تھا کیونکہ انھیں عرفات کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کے نفاذ کے لیے وقت چاہیے تھا اور اپنے عوام سے

کارکردگی کو منوانا بھی تھا۔ اس سے شام کو ایک اتفاقیہ فائدہ یہ ہوا کہ سوائے لبنانی پہلو کے رشتوں اور رابطوں کا مسئلہ عملی طور سے سلجھ گیا۔

1993 کے موسم خزاں میں مذاکرات دوبارہ شروع ہوئے لیکن جب تک اسرائیلی نظریہ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ یو ایس کے ایلچی ڈینس روس، اسرائیل گئے اور رابن سے کہا کہ وہ اگست 1993 میں کرسٹوفر کے ذریعہ عرفات کو دیے گئے پیغام کی یقین دہانی کرائیں۔ انھوں نے رابن سے یہ بھی کہا کہ یو ایس کے سمجھنے کے مطابق اسرائیل اور شام میں ایک معاہدہ اس موقعہ پر قرار پا چکا ہے۔ رابن نے دونوں ہی معاملوں پر معذرت کی۔ دو مہینے بعد اپنے ایک ششماہی امریکی دورہ میں وزیراعظم نے اپنے موقف میں لچکداری دکھائی اور اوّلین پیغام پر قائم رہنے کی یقین دہانی کرائی۔ لیکن انھوں نے یہ اضافہ بھی کیا کہ اوسلو معاہدوں کا نفاذ اور اردن کے ساتھ معاملات طے کرنا ان کی اولین ترجیحات ہیں۔ (صفحات 26-125)

دسمبر 1993 میں رابنووچ نے اپنے وزیراعظم کے ساتھ ان قابل عمل عوامی اسرائیلی اقدامات پر کام کیا جو ایک آخری معاہدہ کی جانب لے جا سکتے تھے یعنی حکومت کے 19 جون 1967 کے فیصلہ کی دوبارہ یقین دہانی اور یہ اعلان کہ 1981 کا گولان قانون گولان کو ضم کرنے کا احاطہ نہیں کرتا ہے اور یہ بیان کہ اسرائیل نے کبھی بھی گولان پر اقتدار اعلیٰ کا دعویٰ نہیں کیا، وغیرہ وغیرہ'' (صفحہ 128)۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان اقدامات کو عملی جامہ پہنایا جاتا، 16 جنوری 1994 کو اسد اور کلنٹن کے درمیان ہوئی ایک میٹنگ نے اسرائیل کے اندر شدید وسوسے پیدا کر دیے۔ رابن کو یہ خدشہ پیدا ہوا کہ یونائٹیڈ اسٹیٹس اسرائیل کی جانب سے مذاکرات کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ اور اسی سوچ میں رفتہ رفتہ اپنے اصل پیکیج کو مٹا دیا۔ انھوں نے عوام کے سامنے ریفرنڈم کی ضرورت پر زور دیا اور اپنی مذاکراتی ٹیم کو ہدایت کی کہ امن اور انخلا پر بحث و مباحثہ کو ایک طرف رکھیں اور سلامتی، ٹائم فریم اور ادوار پر بات چیت کریں۔ اس تاخیر نے وارن کرسٹوفر کو ناراض کر دیا۔ مزاحمت اور گنجائش اور اسرائیل کے دوروں کی مانوس فضا جاری ہو گئی۔

مارچ 1994 میں رابن نے کلنٹن کو بتایا کہ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور اسرائیل مل کر دو پیکیج سامنے رکھیں گے۔ پہلا جو ٹائم ٹیبل، ادوار اور سلامتی کے مسائل سے متعلق ہوگا اس کو یونائیٹڈ اسٹیٹس شام کے سامنے رکھے گا تاکہ شام کا ردِّعمل معلوم ہو سکے اور ایک مقابلہ جاتی پیکیج اگلوا سکے۔ دوسرا اگر معاہدہ ہو جاتا ہے تو اسرائیل کی سلامتی سے متعلق یونائیٹڈ اسٹیٹس کی امداد سے تھا۔ شام سے انخلا کے موضوع پر براہ راست گفتگو میں پس و پیش کی وجہ سے، جواب تک ممکن تھا، بہت حد تک ان تجاویز کے باعث مٹتا چلا گیا۔ اس نے پہلی بار یونائیٹڈ اسٹیٹس کو شامی جوابی اقدام کے استقبال کا موقعہ دیا اور اس طرح فاصلے کم ہونے لگے۔ اپریل میں رابن نے پہلی بار عوامی طور سے ''قیام امن کی خاطر گولان بستیوں کے انہدام پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔'' (صفحہ 137)

شامی ردِّعمل دبا دبا بلکہ تقریباً رد کرنے والا تھا۔ پھر ایک اور سفر میں سکریٹری آف اسٹیٹ کو شامی جوابی تجاویز حوالے کردی گئیں۔ ان میں چھ ماہ کا ٹائم فریم تھا آٹھ ہفتوں بعد اس کو بارہ مہینوں تک بڑھا دیا گیا)۔ دونوں فریق کے لیے مساوات کی بنیاد پر سلامتی کے انتظامات، 14 کلومیٹر کا ایک غیر فوجی زون اور اس کے علاوہ محدود فوجی موجودگی کے لیے اضافی زون کی تجاویز شامل تھیں۔ شامیوں نے فوری وارننگ اسٹیشنز کی تنصیب کی مخالفت کی اور مرحلہ در مرحلہ معمول کے مطابق پرامن تعلقات کے نفاذ کی سفارش کی جو معاہدہ کی دستخطی سے شروع ہوکر جامع تصفیہ کی تکمیل پر ختم ہوتا ہو اور جس میں سفارتی تعلقات کا اعلان پہلے سے ہو لیکن ان کا نفاذ آخرالذکر کے بعد میں ہو۔ اس پر رابن کا ردِّعمل جارحانہ تھا اور اس بارے میں امریکیوں سے کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی۔ اسرائیلی ناراضگی کا خاص سبب علاقائی استحکام میں شام کی مرکزیت کا، یو ایس کے تصور کا کھلا ہوا اظہار تھا۔

کیونکہ شدید مول تول اس وقت بلاشبہ جاری تھا، یو ایس کی موجودگی کے ساتھ ایک سفارتی راستہ جولائی میں کھولا گیا تاکہ اس موقف کی تحقیق اور شناخت کی جائے جو یو ایس کو ایک فیصلہ کے بارے میں خاص کرداروں سے مطلوب ہو۔ رابن اور معلم (جو الاف کی جگہ پر آئے تھے) کے درمیان ماحول خوشگوار تھا لیکن بے تکلف نہ تھا۔ ان ٹھوس بحث و

مباحثہ کے طریقہ کار کے بارے میں اسرائیل میں کچھ خدشات پیدا ہوئے۔ وزیر خارجہ پیرس نے ایک کابینی وزیر کے بارے میں اپنی ترجیح کا اظہار کیا: ''کیونکہ وزرا غلطیاں کرسکتے ہیں لیکن سفیر نہیں۔'' لیکن اس کے باوجود حدود کی کھوج کی مشق کچھ کامیابی کے ساتھ کی گئی۔ رابن پانچ سالہ ٹائم فریم پر پھر واپس آگئے اور اکتوبر میں کرسٹوفر کے دورہ کے وقت اسد اور رابن دونوں اس بات پر متفق ہوگئے کہ ان کے فوجی اعلیٰ افسران سلامتی کے مسائل پر گفتگو کے لیے اس مرحلہ پر مذاکرات میں حصہ لیں۔ اسد نے ٹائم فریم کو بارہ سے بڑھاکر سولہ مہینے کرنے کا اشارہ بھی کیا اور اس کی گنجائش بھی رکھی کہ اسرائیلی انخلا کی تکمیل سے تین ماہ قبل ایک قسم کی سفارتی نمائندگی بھی موجود ہوسکتی ہے۔ دونوں ہی حریفوں نے یو ایس کی تیارکردہ کارروائیوں کی تحریری شکل کو مسترد کردیا۔

چیف آف اسٹاف (جنرل ایہود بارق اور حکمت شہابی) کی سطح پر سلامتی کے مسئلہ پر یہ میٹنگ نومبر میں شروع ہوئی۔ اس کی توجہ کا پہلا مرکز برابری کا اصول تھا۔ دوسرے نمبر پر وہ تفصیلی انتظامات جو اسرائیلی انخلا کے بعد عمل میں لائے جائیں گے۔ شہابی کا زور سلامتی انتظامات کے اصول پر تھا جب کہ بارق ان کے مقاصد پر زور دے رہے تھے۔ ڈینس روس نے تجویز کیا کہ مقاصد اور اصولوں پر مباحثہ اکٹھا ہو! رانبووچ تبصرہ کرتے ہیں کہ سلامتی انتظامات سے متعلق اسرائیلی موقف میں وہ ربط اور شفافیت نہیں تھی جو شامی موقف میں موجود تھی۔ اسرائیلی موقف رابن کے اس تکنیکی فیصلہ سے بھی بوجھل تھا کہ ان کے انخلا کی حدود کا اعلان نہ کیا جائے، اور اس معاملہ میں ابہام اور گنجائش کے عنصر کو باقی رکھا جائے۔ (صفحہ 169) جنرل بارق غیر فوجی زون، محدود فوجی علاقے، شامی فوج کی تعداد اور تعیناتی، گولان میں ایک اسرائیلی فوری وارننگ اسٹیشن، یو ایس کی شرکت کے ساتھ ایک غیر یو این بین الاقوامی نگراں فوج اور توثیق و شفافیت کے متعلق فکرمند تھے۔ شہابی نے فوج کی دوبارہ رضاکارانہ تعیناتی اور شفافیت پر لچکداری دکھائی۔ انھوں نے کنایۃً ایک قابل عمل سودے بازی کی طرف اشارہ بھی کیا یعنی شام فوجوں کی واپسی کی ناموزونیت پر رضامند ہوسکتا ہے اگر اسرائیل ایک وارننگ اسٹیشن کی تنصیب پر رضامند ہوجاتا ہے جو یو

ایس افسران کے ذمہ ہو۔'' یونائیٹڈ اسٹیٹس نے مدد کا ہاتھ بڑھایا اور دونوں فریقوں کو ہدایت کی کہ ترجیح کے لحاظ سے اپنے مقاصد کی فہرست بنائیں تاکہ سودے بازیاں اور سمجھوتے ایک معاہدہ کی جانب لے چلیں۔

سلامتی انتظامات سے متعلق ایک نان پیپر جو اس بحث و مباحثہ کا نتیجہ تھا بنجامن نتن یاہو کے ہاتھ لگ گیا جس کو انھوں نے پارلیمنٹ میں گولان لابی کی موجودہ مزاحمت (اور اس کے یو ایس حمایتی سینٹر جیسی ہیلم'' ڈی اماٹو اور مالکم ویلوپ اور ساتھ ہی نیویارک ٹائمز کے ایب روزینتھال) کو ہوا دینے کے لیے استعمال کیا۔ رابن کی اپنی لیبر پارٹی میں گولان باسیوں کی لابی کی موجودگی اور وزیراعظم کا بڑھتا ہوا احساس کہ الجھے ہوئے غیر مقبول فیصلے اکتوبر 1996 میں ہونے والے عام انتخابات میں غیرخوش کن سیاسی نتائج برآمد کریں گے، نے معاملات کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔

نومبر 1995 میں ایک قاتل کی گولی نے معاملات کو خلاف توقع وقت سے پہلے ختم کر دیا۔ رابن کی موت کے بعد پیرز نے حکومت اور پارٹی دونوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ نئے وزیراعظم اوسلو I اور اوسلو II میں اپنی کامیابیوں سے واقف تھے، انھوں نے طریقہ اور اہم نکات میں تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے معاشی تعاون پر زور دیا اور معاملات میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کی زیادہ شرکت کی خواہش کی۔ ان کا خیال تھا کہ اسد کے ساتھ ایک جلد ملاقات معاہدہ میں سرعت کا لازمی جز ہوگی۔ یوری ساویر نے مذاکرات ٹیم کے سربراہ کی حیثیت سے رابنووچ کی جگہ لے لی اگرچہ آخرالذکر واشنگٹن میں اسرائیل کے سفیر کی حیثیت سے اپنے عہدے پر قائم رہے۔ پیرز نے جنوبی لبنان کی سلامتی صورتحال اور اس میں شام کے کردار کو بھی قبول نہیں کیا اور ایک زبردست اسرائیلی ردعمل کی دھمکی دی۔ کئی مباحثوں کے بعد کرسٹوفر نے ایک دس نکاتی منصوبہ تیار کیا۔ اسد کا ردعمل محتاط طور سے مثبت تھا لیکن بہت ہی محفوظ تھا۔ شامی صدر اسرائیل کے نئے اقدام سے واقف تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ پیرز کے ذہن میں کیا چل رہا ہے اور ان کی پیشکش کیا ہے اس سے پہلے کہ وہ خود کوئی وعدہ کریں۔ اس بنیاد پر یونائیٹڈ اسٹیٹس نے زیادہ منظم اور شدید مذاکرات اور جگہ جہاں یہ ممکن

ہو سکے یعنی اسپین انسٹی ٹیوٹ کانفرنس سینٹر، وائی پلانٹیشن کی پیش کش کی۔ یہ دسمبر 1995 کی بات ہے۔ ڈینس روس نے کہا کہ ''مذاکرات کے پچھلے چار سال میں وہ حاصل نہیں ہوسکا جو ان چھ دنوں میں حاصل ہوا'' رابنووچ کے خیال میں یہ مبالغہ آمیزی تھی لیکن انھوں نے تسلیم کیا کہ ''وائی پلانٹیشن میں وارد ہونے والا وفد واضح طور سے 1996 میں ہوجانے والے معاہدہ کی جانب کام کررہا تھا۔ (صفحہ 210)

اسرائیل میں خانگی سیاست کی شورش نے پھر سر اٹھایا۔ پیرز نے محسوس کیا کہ اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے انھیں یا تو ایک فوری معاہدہ یا فوری الیکشن چاہیے۔ انھوں نے شام پر زور ڈالا کہ وہ معاہدہ کے بعد والے زمانے میں اپنی 'معمول کے مطابق حالات' کی پیش کش سے آگے بڑھیں اور واضح اور حتمی طور سے دوطرفہ معاشی تعلقات کا ذکر کریں۔ شام نے معذرت ظاہر کی۔ اسرائیل نے پانی کا مسئلہ اٹھایا تو اس کا جواب ملا کہ ''اگر یونائیٹڈ اسٹیٹس اور اسرائیل ترکی کے ساتھ شام کے پانی کے مسائل کو حل کروادیں تو اسرائیل اور شام کے درمیان پانی کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' سلامتی کے محاذ پر اگرچہ اسرائیلی اصولی طور سے برابری کو مانتے تھے لیکن یکسانیت کے شدید مخالف تھے: ''یہ خیال کہ اسرائیلی فوجیوں کی ایک کثیر تعداد کی واپسی ہو، اس کے بعد غیر فوجی علاقے کو قبول کریں پھر اپنی سرزمین پر بین الاقوامی موجودگی برداشت کریں ہمارے ذہن میں بھی نہیں آیا۔'' (صفحات 21-220)

یونائیٹڈ اسٹیٹس نے اس تعطل کو ختم کرنے کے لیے سکریٹری آف اسٹیٹ کے ایک اور دورہ کا سہارا لیا۔ اس سے پہلے کہ یہ سب عمل میں آتا پیرز نے جنوری 1996 میں یہ فیصلہ کیا کہ الیکشن کی تاریخوں کو اکتوبر کے بجائے مئی میں کردیا۔ مذاکرات پر اس کا سیاسی اثر صاف طور سے ظاہر تھا۔ اس کے باوجود معاہدہ کی جزئیات پر آہستہ آہستہ کام ہوتا رہا اور جیسا کہ بعد میں 'جرنل آف پیلسٹائن اسٹڈیز' کی لنڈا بٹلر کو دیے ہوئے ایک طویل انٹرویو میں ایمبیسڈر الاف نے دعویٰ کیا کہ ''توقع یہ تھی کہ ستمبر 1996 تک فائنل دستاویز تیار ہوجائے گی۔''

کتاب کا آخری باب گزشتہ دنوں کے کارناموں کا بیان ہے۔ کیا فریق واقعی معاہدۂ امن کے لیے کوشش کر رہے تھے یا اس کے پیچھے ان کے ذہن میں کوئی اور مقصد تھا؟ کیا پیرز، اسد یا دونوں نے کوئی موقعہ گنوا دیا؟ ''اسد اور پیرز کے درمیان مقابلہ تلخ مایوسیوں کی کہانی بن گیا۔'' شام کی حمایت میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اسرائیل کے مطالبات بہت زیادہ تھے اور چالاکی میں وہ اپنا ہی نقصان کر بیٹھے: ''وہ امن حاصل کر سکتے تھے لیکن وہ امن اور بالادستی دونوں چاہتے تھے۔''

وارن کرسٹوفر نے اس ناکامی کے لیے اسرائیل کی پیش کش کے تئیں اسد کے شبہ اور غیر اعتمادی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے: ''انھوں نے اس کو اتنی دقت نظری اور تفصیل کے ساتھ کھنگالا کہ وہ موقعہ گنوا بیٹھے۔'' رابنوچ کا خیال ہے کہ اپنے اسرائیل ہم منصب کی خانگی مشکلات اور دشواریوں سے ہم آہنگی اور ذہنی موافقت پیدا کرنے میں اسد کی ناکامی اس نتیجہ کی ذمہ دار ہے۔ دسمبر 1997 میں اسرائیلی میڈیا کی ایک روداد جس کو مذاکرات کے اسرائیلی سربراہ وری ساویر کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، میں اس رائے کا اظہار کیا گیا ہے کہ مذاکرات کو ایک معاہدہ کی شکل ملنے ہی والی تھی: ''اب جو باقی رہ گیا تھا وہ صرف فیصلہ لینا تھا، لیکن پیرز یہ مشکل فیصلہ نہیں لے سکے اور جس پوزیشن میں وہ تھے وہ کبھی نہیں لے سکتے تھے۔'' جو پیرز نہیں کر سکے وہ ان کے جانشین نتن یاہو نہیں کریں گے۔ نتیجہ کے طور پر اسرائیل اور شام کے درمیان امن اگرچہ قابل حصول ہے لیکن اس کی حصولیابی باقی ہے۔

فروری 1995 میں یو ایس آرمی کی اسٹریٹیجک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ شائع ہوئے ایک مطالعہ میں اسٹیفن پیلیے ٹیر نے یہ تجزیہ کیا ہے کہ ''اس سلسلہ میں شامی صدر حافظ الاسد کی کارکردگی یقیناً نمایاں تھی۔ انھوں نے عرب اسرائیلی امن عمل میں وہاں سے آغاز کیا جہاں ان کے لیے کچھ نہیں تھا اور اس کو طاقتور پوزیشن میں بدل دیا۔'' اس تجزیہ کو درست ثابت کرنے کے لیے محرم راز درون خانہ رابنوچ کے بیانات کافی ہیں۔ مصنف ایک یہ قابل غور رائے بھی پیش کرتا ہے کہ اگر تصفیہ کی جانب قدم بڑھانا ہے تو شام کو چاہیے کہ وہ اس کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ اسرائیلی سیاسی نظام کو سمجھے۔

اسرائیلی سفارتکاروں کے گرد، ابا سولومن ایبان نے حال ہی میں اپنے شائع شدہ لیکچرز میں اپنے ملک کے اندر بدلے ہوئے اور بدلتے ہوئے موڈ کو مختصر مگر جامع الفاظ میں یوں بیان کیا ہے: ''امن عمل کی جس چیز نے حوصلہ افزائی کی ہے وہ اسرائیل کا توسیع پسندی اور بالادستی کے فریب نظر تجربہ سے باہر نکلنا ہے۔ امید ہے کہ فکر کا یہ ارتقا، اس مفروضہ کو الٹ دے گا کہ صرف تحفظ ہی امن کا ضامن ہوسکتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے ایک شاعر آئزک واٹسن نے کنگار پر کھڑے رہنے والے کے تذبذب کی بڑی مناسب تصویر کشی کی ہے:

سہا ہوا اجل گرفتہ ابتدا کرتا ہے اور پھر رک جاتا ہے
تنگ سمندر کو پار کرنے سے
اور چھلانگ لگانے سے خوف زدہ
ساحل پر کھڑا لرزتا رہتا ہے

اسرائیل اور عرب ریاستی نظام

(دی ڈیکلائن آف عرب اسرائیلی کانفلکٹ: مڈل ایسٹ
پالیٹکس اینڈ دی کوئیسٹ فار ریجنل آرڈر: آوراہم سیلا)

یہ کتاب خاصی مہنگی ہے اور ایسے موضوع پر لکھی گئی جس سے دلچسپی مقابلتاً گھٹ رہی ہے تو ممکن ہے کہ اس کے قارئین کا دائرہ زیادہ وسیع نہ ہو۔ لیکن پھر بھی کتاب کے عنوان میں لفظ 'زوال' (ڈیکلائن) یقیناً تجسس ابھارے گا اور مغربی ایشیا کی سیاست کے طالب علموں کی توجہ اپنی طرف کھینچے گا۔

اور اہم سیلا اسرائیل کی ہیبرو یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات پڑھاتے ہیں۔ وہ عربوں کی آپسی سیاست اور عرب اسرائیلی تنازعہ کے درمیان باہمی جوابی عمل کی تحقیق کرتے ہیں اور دونوں کی اندرونی توانائیاں، اور عالمی، علاقائی اور مقامی سطح کی سیاست پر ان کے باہمی عمل کے منطقی مناظرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ کسی بھی قیاس سے عرب سائڈ میں ان طاقتوں کے باہمی جوابی عمل کو پرکھنے (البتہ پہاڑی کے دوسری جانب سے) پر یہ ایک سنجیدہ کام ہے۔ سیلا یہ دلچسپ تحقیق سامنے لاتے ہیں کہ عرب چوٹی کانفرنس (1964 میں شروع ہوئی) جو فلسطین کے مسئلہ پر عرب اتحاد و یگانگت کو ابھارنے کے لیے بلائی گئی تھی،

نے ''دراصل روایتی پالیسیوں سے انحراف کو قانونی جواز عطا کر دیا۔''

تو آخر یہ پالیسیاں کیا تھیں؟ ان کا ارتقا کیسے ہوا؟ اس انحراف کے پیچھے کیا عناصر تھے؟ اور آخر میں ان کا نتیجہ کیا نکلا؟ مئی 1999 میں اسرائیل میں جنرل الیکشن کے پیش نظر مسئلہ نے نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایہود بارک کا ایک رہنما کی صورت میں ظہور، اس کے علاوہ سفارتی ہلچل یہ اشارہ دیتی ہے کہ امن عمل کے ہر محاذ پر نئی روح پھونکی جا رہی ہے۔

عرب ریاستی نظام یا علاقائی ذیلی نظام کے ارتقا کو مصنف نے پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ، سلطنت عثمانیہ کے زوال، اور بالفور ڈیکلریشن اور سائیکس۔ پی کوٹ پیکٹ جو بعد میں آئے، سے شروع کیا ہے۔ ایک چوتھائی صدی بعد دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر عرب لیگ (1945) وجود میں آئی جو تقدیر اور مقاصد کی قدر مشترک کے عرب جذبات کا ذریعۂ اظہار سمجھی جائے گی۔ لیگ کی ابتدا کچھ عرب قائدین کی آنکھوں میں کھٹکی۔ عبدالرحمٰن عزام پاشا جو بعد میں عرب لیگ کے سکریٹری جنرل کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے (اور پھر اس کے بعد بدنام زمانہ بریمی نخلستان کے فیصلہ میں سعودی عرب کے ایجنٹ جنرل مقرر ہوئے) نے اس وقت محسوس کیا تھا کہ لیگ برطانیہ کا 'نومولود ولد الحرام' ہے۔

برسوں گزرنے پر ایک جانب وسیع تر عرب قوم پرستی کے امکانات اور دوسری جانب عرب ریاست سے استثنائی لگاؤ نے مقاصد اور طریقۂ کار کے ارتقا میں متوازن سے کچھ کم کی یقین دہانی کرائی اور پروفیسر وائی کیوٹس کے اس قول کو تقویت بخشی: ''بین العرب تعلقات ہموار ترقی کی رنگین پٹی پر نہیں رکھے جاسکتے جو جنت سے جہنم اور اس کے برعکس حرکت کریں بلکہ ان کا راستہ جزئی طور سے گردشی اور جزئی طور سے جھٹکے اور چکردار ہے اور درمیانی مقامات پر آرام کرتا ہے۔'' لیکن نظریہ کی بنیاد نسلی تقابل پر مبنی عرب عوام کی فاخرانہ شناخت اور ایک مشترک ثقافت سے چپٹے رہنے پر منحصر تھی۔ اس عمل میں اکثر قوم اور ریاست کے درمیان فرق دھندلا جاتا ہے جیسا کہ ایک قوم ہونے اور قوم بننے کے امتیاز کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

1964 میں پہلی عرب چوٹی کانفرنس اور اگلی دو کانفرنسوں کا مقصد بالادستی کے لیے بین الریاستی جدوجہد کو بالائے طاق رکھنا اور اس کی بجائے ایک مجموعی عرب کارروائی پر منحصر ہونا تھا جو دریائی پانی کے مسئلہ سے نمٹنے (اور اسرائیل کے لیے کچھ پانی پر روک)، ایک مشترکہ عرب کمانڈ کا قیام اور فلسطینیوں کو سیاسی طور سے منظم کرنے کی ابتدا تھی۔ ان حالات کا پس منظر عرب دنیا کے سیاسی افق پر انقلابیت کا نمودار ہونا تھا جو 1958 کے عراق انقلاب، پان عربزم احساسات کا ابھار اور نتیجہ کے طور پر عرب اتحاد کے لیے دباؤ جس کی وجہ سے شام اور مصر (یو اے آر) اور یو اے آر اور عراق کے مختصر مدتی انضمام وجود میں آئے۔

ان دو معاملوں میں ناکامی کے باعث تلخ نظریاتی اور ذاتی جھگڑے سامنے آئے:

''لفاظی کی جنگ نے ایک نظریاتی کردار اپنا لیا اور ایک دوسرے کو غیر قانونی ٹھہرایا جانے لگا اور فلسطینی کاز کو قومی آزادی اور مغربی غلبہ کی لفاظی میں استعمال کیا جانے لگا۔'' (صفحہ 46)

اس کشمکش میں داخلی اور خارجی پالیسی میں انقلابیت کا قانونی جواز ترقی پسند موقف میں تھا۔ اسی نے جمال عبدالناصر، جو عرب طاقت کی قیادت کرنے والی طاقت، مصر کے قائد تھے، کو اکسایا کہ وہ باہمی عرب وجود جو ان کی پالیسی، صفوں میں اتحاد، کا نعرہ تھا سے آگے بڑھ کر ایک مداخلتی 'مقصد کے اتحاد' کی وکالت کریں۔ لیکن اس قدم نے ان کو جلد ہی انقلابیوں اور قدامت پرستوں دونوں ہی کے ساتھ الجھا دیا۔

اس کا ایک مظہر یمن میں مصری مداخلت تھی۔ اس الجھاؤ کے تضادات، اور اسرائیل کے ساتھ تنازعہ میں شامی عسکریت کے امکانات نے ناصر کے نہ چاہنے کے باوجود ان کو جون 1967 کی چھ روزہ جنگ میں دھکیل دیا۔ سیلا کا مشاہدہ ہے کہ ''ناصر کے اقدامات ان تمام موقفوں کے متضاد تھے جو وہ ہر چوٹی کانفرنس میں دوہراتے تھے کہ اسرائیل کے ساتھ جنگ اس وقت تک موخر کی جائے جب تک عربوں کو اسٹریٹجک برتری حاصل نہ ہو جائے۔'' (صفحہ 90)

صادق العزم اور عبداللہ لاروئی جیسے عرب مصنفین نے تفصیل کے ساتھ 1967 کی عرب شکست کی نفسیاتی جہتوں، اور عرب معاشروں کی کم ترقی یافتگی کے گہرے اسباب کا

تجزیہ کیا ہے۔ سیاسی میدان اور سیاستدانوں پر حقیقت بڑے سنگین طریقہ سے آشکار ہوئی۔
اگست کے مہینہ میں خرطوم میں بلائی گئی چوٹی کانفرنس میں ''اسرائیل کے ساتھ تنازعہ میں
نظریہ کی تبدیلی کی شروعات ہونے لگی۔ اب اسرائیل کے قانونی جواز سے توجہ سرحدوں اور
زمینوں کی طرف مبذول ہوئی'' اگرچہ کہ اس مرحلہ میں اسرائیل کے ساتھ تصفیہ زمینوں کی
واپسی کے بدلے میں شامل نہیں تھا۔'' (صفحہ 108)

نومبر میں مصر اور اردن کی جانب سے سلامتی کونسل کی قرارداد 242 کا تسلیم کیا
جانا تبدیلی کی جانب اشارہ تھا۔ اس تبدیلی کو تمام عربوں نے نہیں مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرطوم
میں جو نازک اتفاق رائے عمل میں آئی تھی بکھر گئی۔

ایک اور چوٹی کانفرنس جس کی مصر اور اردن کو تیل کے پیسے کی تلاش میں سخت
ضرورت تھی، مشکل الحصول ثابت ہوئی۔ اگست 1969 کا مسجد اقصیٰ کا حادثہ ایک سمجھوتہ
سامنے لایا۔ سعودی ایک عرب چوٹی کانفرنس کے لیے راضی ہوئے اس کے بدلے میں مصر کو
اسلامی چوٹی کانفرنس کے لیے رضامند ہونا پڑا۔ موخر الذکر (ستمبر 1969) کا عراق اور شام
نے نظریاتی بنیاد پر بائیکاٹ کیا۔ اور اول الذکر جو رباط ہی میں کچھ مہینوں بعد دسمبر میں منعقد
ہوئی، میں، مصر کے تمام مطالبے رد کر دیے گئے۔

خاص عرب شرکا کے مبینہ مقاصد سے متعلق سیلا کا اندازہ کچھ سنسنی خیز محسوس ہوتا
ہے لیکن یہ عربوں کے باہمی اختلاف پر مالکم کیر کے مستند اور کلاسیکی بیان پر مبنی ہے: ''عراق
کی پشت پناہی کے ساتھ (الجزائری صدر حوری) بومدین اور (سعودی شاہ) فیصل کے درمیان
ناصر کے خلاف ایک واہیات گٹھ جوڑ قائم ہوا جس کا مطالبہ تھا کہ یا تو ناصر جنگ کریں یا پھر
سعودی امداد سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ بومدین کی یہ اچانک نفرت بظاہر مصر کے لیبیا اور سوڈان
سے اس دوستی کی وجہ سے تھی جس میں الجزائر کو شمالی افریقہ میں طاقت کے توازن کو بگاڑنے
والا سمجھا گیا تھا۔ درحقیقت فیصل ''میکاولی کے معیار کی' چال چل رہے تھے۔ وہ ناصر کو جنگ
کے لیے ہٹکانا چاہتے تھے اور اس طرح ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس میں
ناکامی کے بعد وہ یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ناصر جنگ کے آپشن کے بارے میں غیر مخلص

تھے لہٰذا مدد میں بڑھوتری کا کوئی منصفانہ جواز نہیں تھا۔ ناصر نے سعودی داؤ کا جواب یہ اعلان کر کے دیا کہ وہ جنگ پر جانے کے لیے تیار ہیں اگر عرب ریاستیں یہ وعدہ کریں کہ وہ صراحت کردہ معاشی اور فوجی امداد مہیا کریں گی۔ ناصر کو بخوبی علم تھا کہ دولت مند عرب حکمران کبھی راضی نہ ہوں گے کہ اتنی زیادہ دولت، جس کی ناصر کو ضرورت بھی تھی، ٹرانسفر کردیں اور خود اپنی میکاولی والی چال میں شاید ان کی تمنا رہی ہو کہ وہ اس یقینی انکار کی بنا پر سیاسی حل کے آپشن سے اپنی وابستگی جس کی وہ چھ روزہ جنگ سے وکالت کررہے تھے، صحیح ثابت کریں۔'' (صفحات 22-121)

عربوں کے آپسی تعلقات کے اتار چڑھاؤ کے تعطل سے قطع نظر، رباط کی عرب چوٹی کانفرنس نے فلسطینی قوم پرستی جس میں 1967 کے بعد والے زمانے میں ابال آیا، کی جانب توجہ کی۔ اس کا ابتدائی المناک انجام جلد ہی ظاہر ہوگیا۔ 1970 کے موسم گرما میں اردنی فوج نے (جس کو ایک پاکستانی فوجی مشن، میجر جنرل ضیاء الحق کی قیادت میں ماہرانہ تربیت دے رہا تھا) عمان کے پناہ گزین کیمپوں میں فلسطینی ریاست درون ریاست کو منہدم کردیا۔ عربوں کی صفوں میں ہلچل مچ گئی۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور اسرائیل ہاشمی سلطنت کو بچانے کی فکر میں لگ گئے۔ سمجھوتے کے دباؤ میں سفارتی تعلقات منقطع کردیے گئے۔ کویت اور لیبیا نے اردن کی مالی امداد روک دی۔ شاہ حسین کے مقرر کردہ فلسطینی وزیراعظم نے علاحدگی اختیار کرلی۔ آخرکار چھوٹے چھوٹے تنازعات کے فیصلے کے لیے حسین اور یاسر عرفات کے درمیان 24 ستمبر 1970 کو قاہرہ میں چوٹی کانفرنس ہوئی۔ ایک عرب قائد کی حیثیت سے یہ ناصر کی آخری کارگزاری تھی۔ اگلے دن وہ چل بسے۔ ان کی موت پان عرب دور اور اجتماعی عرب پالیسی سازی کا خاتمہ تھی۔

مصر (انور سادات) اور شام (حافظ الاسد) کے نئے قائدین اس تبدیلی کے نمائندہ تھے۔ عربوں کی اندرونی باہمی سیاست پر دونوں کا رجحان مشترک تھا یعنی ''ایک تھوپے ہوئے پان عربزم سے خروج اور عملی تعاون کا اختیار۔'' (صفحہ 140)۔ جنوری 1971 میں یو این سینئر گنار جارنگ کی قرارداد 242 کے تعاقب میں سفری سفارتکاری، اور

اسی سال کے آخر میں سکریٹری آف اسٹیٹ ولیم ووجر کی عبوری تصفیہ کی تلاش میں سفری سفارتکاری کوئی بھی نتیجہ برآمد کرنے میں ناکام رہی اور حقیقت میں اس نے سادات کے لیے ایک پیچیدہ اور بظاہر ناقابل توجیہہ چال کے لیے راہ ہموار کی۔ مئی 1971 میں مصر اور سوویت معاہدہ برائے دوستی و تعاون پر دستخط ہوئے، جولائی 1972 میں سوویت لڑاکا فوج اور فوجی مشیر مصر سے نکال دیے گئے۔ سیلا کا خیال ہے کہ آخرالذکر کارروائی کی اہمیت ''جنگ پر جانے کے لیے ایک آزادانہ مصری فیصلے کے راستے سے رُکاوٹ ہٹانا تھا۔'' (صفحہ 137) جنگ پر جانے کے فیصلہ کا نفاذ 6 اکتوبر کو ہوا جو ''اسرائیل کے لیے ایک اسٹریٹجک تعجب تھا۔ جنگ سے پہلے شام کے ساتھ کچھ فوجی تعاون ہوا تھا اور سعودی عرب کے ساتھ زیادہ ٹھوس سیاسی مفاہمت ہوئی جس کے بعد ''اگست 1993 میں فیصل نے سادات کو خبردار کیا کہ وہ اسرائیل کے خلاف مہم میں تیل کو ایک ہتھیار کی صورت میں استعمال کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ جنگ اتنی طویل ہو کہ مغرب کو تیل کی کمی کا مکمل تجربہ ہو جائے۔'' (صفحہ 143)

یوایس انتظامیہ بھی یکساں طور سے تعجب میں تھی۔ بعد میں ہنری کیسنجر اپنی کتاب ''ایرز آئی اپ ہیول'' میں سادات کی اسٹریٹجی کی اس خیال میں نہ آنے والی جرأت اور عرب اسرائیلی مذاکرات میں نفسیاتی بنیادوں کی نوعیت بدلتے ہیں، اس کی کامیابی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے: ''ہماری عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ محض عزت نفس کی خاطر کوئی ایک نہ جیتنے والی جنگ کیسے شروع کرسکتا ہے؟'' کئی سال بعد محمد ہیکل نے عرب نقطۂ نظر کی تصویرکشی یوں کی ہے: ''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یوم کپور کی جنگ ایسا واقعہ تھی جس میں صیہونیوں کی خوداعتمادی ختم ہوگئی اور عربوں کو احساسِ ذلت سے نجات ملی۔'' اس طرح سے اوسط درجہ کے ایک عرب لیڈر (فواد عجمی نے جس کو مناسب طریقہ سے ''ان زنجیروں سے آزاد جو ہیروز کو اپنے کارناموں سے باندھے رکھتے ہیں'' کہا ہے) نے عربوں کو دوبارہ کھیل کے میدان میں کھڑا کردیا۔ اس کے بعد جو ہوا اس کو سیلا نے سادات کی سانپ کی صفت والی سیاست سے تعبیر کیا ہے۔ جس میں وہ مصری قومی مفادات سے متعلق اپنی جستجو کو عرب رائے عامہ کے متوازن رکھنا چاہتے تھے۔

اکتوبر 1974 میں رباط میں ہونے والی عرب چوٹی کانفرنس (اور اس سے قبل نومبر 1973 میں الجزائر کی کانفرنس) میں کچھ مسائل جیسے کہ عرب اسرائیل تنازعہ، وسیع تر عرب سیاسی کارگزاریاں اور پیلسٹائن لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کو فلسطینی عوام کے واحد ترجمان ہونے پر اتفاق رائے ہوا۔ لیبیا اور عراق کی غیر حاضری کے باوجود نظریاتی اختلافات تھے اور ضبط تحریر میں بھی آئے۔ نتیجہ ناگزیر تھا: ''لیکن تقریباً فوراً ہی صلح جویانہ ماحول عربوں کے آپسی معمولی جھگڑوں کے میدان میں تبدیل ہوگیا جس نے عربوں کو حاشیہ پر ڈال دیا اور مقبوضہ علاقہ میں سے مزید اراضی کی حوالگی سے متعلق اسرائیل پر سے دباؤ ہٹا لیا۔ رباط میں ہوئے معاہدہ کی بنیادوں کو خطرہ لاحق ہوگیا کیونکہ امریکہ کی حوصلہ افزائی کے ساتھ سادات مصری مفادات کو مقدم رکھنے اور دوسرے عرب شرکا کی ضروریات اور تشویشوں کو بعد میں دیکھنے پر تلے تھے اور یوں تعمیر امن کے مسئلہ پر شام سے اپنے اختلافات بڑھا رہے تھے۔'' (صفحہ 163)

مصری رویہ کا نتیجہ 1974 کی جنیوا کانفرنس (عرب اسرائیلی تنازعہ میں تاریخی اہم موڑ جو مصری صدر اور اردن کی رضامندی کہ اسرائیل سے ایک ہی کمرہ میں رسمی طور سے گفتگو کی جائے) اور افواج کی علاحدگی کے معاہدہ کی شکل میں ظاہر ہوا جس پر 18 جنوری 1974 میں دستخط کیے گئے۔ یونائٹیڈ اسٹیٹس کی یہ توقع کہ اس کے فوراً بعد تیل پر سے پابندی اٹھا لی جائے گی کو اس وقت دھکا پہنچا جب سعودی عرب نے کہا کہ تیل پر پابندی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک شام کے ساتھ مذاکرات آگے نہیں بڑھتے۔ جیسا کہ کیسنجر نے ریکارڈ کیا ہے کہ ''ایک چھوٹی عرب چوٹی کانفرنس (فروری 1974) میں ایک بھرم رکھنے والا فارمولا اپنایا گیا کہ میں فروری میں علاقے کا ایک تفتیشی دورہ کروں تاکہ شامی ڈس انگیجمنٹ کے لیے راستہ کھلے۔ اس پر رضامندی آسان تھی۔ ایک ماہ بعد تیل پر سے پابندی ہٹا لی گئی'' سیلا کی دلیل ہے کہ سینائی معاہدہ 11 کے بعد شام اور مصر کے درمیان پیدا ہونے والی دراڑ (جس کو کہیں پر جارج ڈبلیو بال نے ایک بہت بڑی پراپرٹی ڈیل سے تعبیر کیا ہے جس میں یونائٹیڈ اسٹیٹس نے اسرائیل سے صحرائے سینا کا ایک حصہ کثیر

مالی اور سیاسی منفعت کے عوض میں لیا اور پھر اسے قبول کرنے کے لیے مصر کو ادائیگی کی) نے بین العرب سیاست کو مرتکز کردیا اور لبنانی خانہ جنگی کو پروان چڑھایا کیونکہ شام کے صدر کو ایک نئی علاقائی حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ اور انھوں نے اردن، لبنان اور فلسطینیوں سے تعلقات کو مضبوط کر کے اس ضرورت کو پورا کیا یہاں تک کہ بات ''عظیم تر شام'' کے تصور تک آگئی۔ (صفحہ 76-175)

لبنان کے واقعات کے حوالہ سے عرب ذرائع کا خیال تھا 13 اپریل 1975 کا حادثہ جو لبنانی خانہ جنگی کی ابتدا کا سبب بنا دراصل ایک اسرائیلی سازش تھی۔ اگر ایسا ہے بھی تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ستر کے عشرہ کے وسط میں لبنان سماجی اور سیاسی اعتبار سے دھماکہ دار مادہ سے پُر تھا جو ایک معمولی اشارہ پر پھٹ سکتا تھا۔ آنے والے دنوں کے فسادات میں تقریباً پچاس ہزار جانیں ضائع ہوئیں۔ کچھ خارجی اداکاروں نے بھی کردار نبھایا۔ شام کی دلیل تھی کہ اس کو اپنی قومی سلامتی کے تحفظ کی خاطر مداخلت کا حق ہے اور اکثر ریاستیں شام کے حق میں تھیں: ''لبنان پر شامی حملے سے قبل یونائیٹڈ اسٹیٹس کے ذریعہ اسرائیل سے سرخ لائن پر ایک خاموش سمجھوتہ ہوا تھا جس میں لبنان کے اندر دونوں کی فوجوں کی موجودگی کی حدود کی خاکہ کشی کی گئی تھی۔ سرخ لائن سمجھوتہ کا مقصد اسد کی علاقائی اہمیت کو مزید مستحکم کرنا تھا اور پھر امن عمل کی جانب واپسی کے لیے راستہ بنایا جائے۔'' (صفحات 81-80)

لبنان میں پی ایل او سے شامی مقابلہ آرائی نے عرب سیاست کے اندر نیا رخ اور نئے جھگڑے فساد پیدا کردیے۔ بالآخر ایک سعودی مصری مصالحانہ کارروائی نے مداخلت کو عرب ڈیٹرنس فورس (اے ڈی ایف) کی تخلیق کر کے قانونی جواز بخشا اور اس کے بعد اکتوبر 1996 میں قاہرہ کی عرب چوٹی کانفرنس (اور مصری، سعودی، شامی اتحاد کی تجدید) نے تنازعہ میں ملوث تمام ریاستوں کو نئے مالی اور سیاسی ذمہ داریوں کی نئی صورتحال کی برقراری قائم رکھنے نے تقویت دی''۔ اس طرح پی ایل او کو ایک ٹھوس قدم اٹھانے کے لیے زمین ہموار تھی اور یہ مارچ 1977 میں فلسطینی قومی کونسل کے تیرھویں اجلاس میں آگیا۔

عربوں کی متفقہ رائے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ اسرائیل کو عربوں کے مجوزہ جنیوا کانفرنس کے فریم ورک میں پیش کیے گئے جامع تصفیہ جس میں پی ایل او بھی شامل ہو، کی تجویز سے خطرہ تھا۔ یہ نظریہ یکم اکتوبر 1977 کے ایک سوویت۔ یو ایس اعلانیہ میں پیش کیا گیا تھا۔ اس سے مقابلہ کرنے کے لیے اسرائیل نے مصر سے بلاواسطہ رابطہ کی راہ اختیار کی۔ اس کے لیے مراکش میں وزیر خارجہ موشے دایان اور انور سادات کے ایک نمائندہ میں خفیہ ملاقات ہوئی۔

اگرچہ اس موقعہ کے متن کے بارے میں فریقین میں اختلاف ہے لیکن اس کا بدیہی انجام مصری قائد کا بیجین سے براہ راست گفتگو کے لیے یروشلم جانے کا جرأت مندانہ اقدام تھا۔ 20 نومبر 1977 کو ہونے والے اس واقعہ نے عرب اور اس کے باہر کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

اصل اہم چیز یہ ہے کہ اس اقدام نے اسرائیل کو مجبور کردیا کہ وہ امن کے بارے میں اپنے خیالات واضح طور سے پیش کرے: اسرائیل چاہتا ہے کہ مصر کے ساتھ اپنے معاملات علاحدہ طے کرے تاکہ اس کے سامنے سے ایک متحدہ عرب محاذ کا خطرہ ٹل جائے اور بقیہ عرب زمینوں بالخصوص مغربی کنارے اور غزہ پٹی پر اس کی گرفت قائم رہے۔ سینا اور گولان پہاڑیوں کے اکثر علاقوں سے دستبرداری کی خواہش کے ساتھ اسرائیل نے مغربی کنارے اور غزہ پٹی پر فلسطینی اتھارٹی کا منصوبہ پیش کیا۔ اقتدار کے مسئلہ کو بغیر فیصلہ کے چھوڑ دیا۔ خودمختاری کا نظریہ مستقبل میں مقبوضہ فلسطینی سرزمین کے حوالے سے اسرائیل کی پالیسی میں ایک بنیادی تبدیلی تھی۔'' (صفحہ 198) اسرائیلی شرائط پر اس دوطرفہ رویّہ نے یو ایس صدر کے پاس بھی سوائے اس کی تائید کرنے کے کوئی اور راستہ نہ چھوڑا۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ ایک منطقی نتیجہ تھا۔

۔یلا کا مشاہدہ ہے کہ ابتدائی غم وغصہ کے بعد عرب ردّعمل کی غیر یکسانیت بہت روشن تھی۔ مراکش، سوڈان، صومالیہ، عمان اور تیونس انور سادات کے حق میں تھے جب کہ شام، عراق، لیبیا، الجزائر، عوامی جمہوریہ یمن (پی ڈی آر وائی) اور پی ایل او نے مذمت کی۔

ایک تیسرے گروپ سعودی عرب، اردن اور خلیجی امارات نے محتاط رویہ اختیار کیا۔ اس تین طرفہ تقسیم نے بالائی سطح پر کام کو مشکل بنا دیا۔ آخر بہت کوششوں اور عراق کے اقدام کے نتیجے میں نومبر 1978 میں بغداد میں ایک چھوٹی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے تنازعہ میں ملوث تمام ریاستوں، پی ایل او اور مقبوضہ علاقوں میں مقیم فلسطینیوں کے لیے دس سال تک ساڑھے تین لاکھ بلین ڈالر کا سالانہ فنڈ جاری کیا اور مصر کو متنبہ کیا کہ اگر اس نے اسرائیل کے ساتھ علاحدہ سے کوئی رسمی معاہدہ کیا تو اس پر بندشیں عائد ہوسکتی ہیں۔ اسی درمیان ایک اہم پیش رفت میں کانفرنس نے اسرائیل کے حوالہ سے امن کو ایک 'منصفانہ امن' کا نام دیا۔

لیکن عرب اتفاق رائے قائم نہ رہ سکا ''بغداد چوٹی کانفرنس کے محض دو سال بعد عراق ایران کے ساتھ جنگ میں ملوث ہوگیا اور عرب مفاد کے نام پر عرب دنیا کو تقسیم کردیا اور اسرائیلی محاذ پر شام کو تنہا کردیا۔'' (صفحہ 217)۔ علاقہ میں اس سے پہلے بھی تک رسائی (جولائی 1979)، عراقی شامی دراڑ اور مکہ میں کعبۃ اللہ کا محاصرہ (نومبر 1979)۔ لہٰذا تیونس کی عرب چوٹی کانفرنس جو 20 نومبر 1979 کو شروع ہوئی، کے لیے ماحول بہت غیر دوستانہ تھا۔ اس کی مرکزی توجہ اختلافات کو کم سے کم کرنے پر تھی۔ مصر کا بائیکاٹ جاری رہا لیکن بندشوں کو موخر کردیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ یوایس کے خلاف بندشیں عائد کرنے کی ایک تجویز کو بھی موخر کردیا گیا۔ لبنان اور دیگر متاثرہ ریاستوں کو مالی امداد جاری رہے گی۔

نومبر 1980 میں عمان میں ہونے والی ایک اور چوٹی کانفرنس کا شام، لبنان، الجزائر، اور پی ایل او نے بائیکاٹ کیا۔ اس بائیکاٹ سے عرب ریاستوں کے باہمی تعلقات و سیاست پر ایران وعراق کی جنگ کے اثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (حافظ الاسد نے اس جنگ کو موزوں طریقہ پر 'ایک غلط جنگ ایک غلط دشمن کے ساتھ، سے تعبیر کیا)۔ عربوں کی مجموعی کاوشوں کی یہ داخلی محصوری آنے والی لبنانی خانہ جنگی کے درمیان بھی جاری رہی جس میں کہ اسرائیلی فوجی اور سیاسی حمایت لبنانی عیسائیوں کے حق میں کافی بڑھ گئی۔

شامی مورخ قسطنطنین زوریک نے کہا ہے کہ ''تباہیوں کو سمجھنے میں ناکامی، لوگوں کے لیے خود تباہیوں سے زیادہ مہلک ہے۔'' اس بیان کی صداقت کا شاہد ہر وہ فرد ہوگا جس

نے 80 کے عشرہ کے ابتدائی سالوں میں عرب صورتحال کا جائزہ لیا ہوگا۔ مشرقی محاذ پر ایران سے جنگ، برادری سے مصر کا اخراج، جون 1982 کے لبنان پر اسرائیلی حملہ کے تناظر میں لبنان کی لاچاری اور فلسطینی مزاحمت کو حاشیہ پر رکھ دینا، اس کی گواہی دیں گے۔

1980 کی بارھویں، تیرھویں اور چودھویں عرب چوٹی کانفرنس (عمان) اور 1981 اور 1982 (دونوں ہی ''فیز'' میں) میں ہوئیں اور ان میں اسرائیل کے ساتھ تنازعہ کے بنیادی مسئلہ کے بجائے توجہ عربوں کے باہمی مسائل پر رہی۔ اس میں استثنا سعودی عرب کے ولی عہد فہد کا اگست 1981 میں وہ جرأت مندانہ اقدام تھا جس میں انھوں نے ایک جامع عرب اسرائیلی تصفیہ کے لیے 'رہنما اصول' کا ایک مجموعہ پیش کیا۔ ''سعودی منصوبہ دراصل کیمپ ڈیوڈ معاہدوں کے متبادل فریم ورک کے طور پر پیش کیا گیا تھا جو کہ بالترتیب عرب چوٹی کانفرنس اور اقوام متحدہ کی قبولیت کے بعد عرب اور بین الاقوامی قانونی سند حاصل کرلے گا... یہ قدم قومی سلامتی کے سعودی نظریہ کے خطوط پر تھا جو کہ خود علاقائی استحکام، یو ایس کے ساتھ بے زبان اتحاد، اور سعودیوں کی عربوں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی ساتھ واشنگٹن سے اپنے روابط کے ظاہری تضادات کو کم دکھانے کی کوششوں پر مبنی تھا۔'' (صفحہ 274) ابتدائی ہچکچاہٹ کے بعد صدر ریگن نے بذات خود اس کی اسرائیل کے حق بقا کی جانب ایک پیش کش کی حیثیت سے تعریف کی۔ فہد کے منصوبہ کو ای ای سی (یوروپین اکنامک کمیونٹی) کونسل آف منسٹرز کی غیر مشروط تائید بھی حاصل ہوگئی کیونکہ اس منصوبہ اور جون 1981 کے وینس ڈیکلریشن میں اکثر باتیں مشترک تھیں اور اس کے صدر، برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کیرنگٹن نے سعودی حکمرانوں سے معاملات پر مذاکرات کے لیے ریاض کا دورہ کیا۔'' (صفحہ 275)

دوسری جانب اسی منصوبہ پر عرب ردعمل کی شدت کو اس حقیقت سے ناپا جاسکتا ہے کہ 1981 کے فیز میں منعقد عرب چوٹی کانفرنس بغیر اس پر بحث کیے ہی اٹھ گئی اور دس مہینے بعد ستمبر 1982 میں منعقد ایک اور عرب چوٹی کانفرنس میں ایک ترمیم شدہ متن کی منظوری دی لیکن اس سے پہلے مسترد کیے ہوئے سابقہ متن کے مشوروں پر عمیق بحث ہوئی

جیسے کہ 1965 کی بورقیبہ کی تجاویز (تقسیم پر اقوام متحدہ کی 1947 کی قرارداد کو قبول کرنے کے لیے) اور لبنان پر اسرائیلی حملہ کے تناظر میں ریگن کا امن کی جانب اقدام:

> اب بھی، اسرائیل کے ساتھ تنازعہ میں عربوں کے اجتماعی رویہ میں فیز پلان ایک تاریخی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ عرب اسرائیلی تنازعہ کے حوالے سے کسی عرب چوٹی کانفرنس کی قرارداد میں نہ صرف جنگی اصطلاحوں سے گریز کیا گیا تھا بلکہ غیر مصالحانہ طرز بیان سے بھی احتراز کیا گیا۔ یہ غیر عبوری بھی تھا۔ مرحلوں کی سیاست سے رخصت لیتے ہوئے۔ درحقیقت عرب امن منصوبہ کا نشانہ یو ایس انتظامیہ تھی جو عربوں کے ساتھ تنازعہ میں اسرائیل کی بھاری بھرکم حکمت عملی کی بڑھتی ہوئی جانکاری کی آئینہ دار ہے۔ لیکن ان سب سے الگ اور اہم عنصر تیل کی قیمت میں گراوٹ تھی جس میں خلیجی جنگ کا بھاری معاشی بوجھ بھی شامل تھا۔ یہی عناصر تھے جنھوں نے بین الاقوامی میدان میں عربوں کی مول تول کی طاقت کو کم کردیا اور تیل والی مطلق العنان سلطنتوں کو اپنے قومی وسائل تنازعہ کے خاص کرداروں کی خدمت میں استعمال کرنے کی رضامندی کو مشکوک کردیا۔'' (صفحہ 284)

اس کے علاوہ بالکل ساتھ ساتھ دیگر عناصر بھی تھے جو سر اٹھانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اردن کے شاہ حسین اور عرفات کے درمیان ایک مذاکرہ شروع ہوا۔ لبنان کی جنگ اگرچہ اپنی توجہ فلسطینی مسئلہ پر رکھے ہوئے تھی لیکن اس نے آخرالذکر کو اس کے لبنانی اڈوں سے پرے کردیا۔ فروری 1985 میں عرفات اور شاہ حسین نے عمان معاہدہ پر دستخط کیے جس کی رو سے ایک بین الاقوامی کانفرنس کی سرپرستی میں امن مذاکرات ہوں گے جس میں فلسطینی،

اردنی۔ فلسطینی مشترکہ وفد کا ایک حصہ ہوں گے۔ اس مرحلہ پر مراکشیوں نے مربعہ کو مکمل کرنے کے لیے کاسا بلانکا (اگست 1985) میں ایک اور چوٹی کانفرنس کی دعوت دے ڈالی تاکہ عمان معاہدہ اور فیز منصوبہ میں تطبیق پیدا کی جائے۔ آخر میں دونوں ہی کی تائید کر دی گئی۔

لیکن ترقی کی راہ میں دوسری رکاوٹیں باقی رہیں خاص طور سے یو ایس کی پی ایل او سے گفتگو کے لیے لازمی شرائط، مجوزہ بین الاقوامی کانفرنس کی نوعیت کے بارے میں اسرائیل کے تحفظات اور کسی امن عمل میں بامعنی حیثیت سے سوویت یونین کی شرکت سے یو ایس کا تامل۔ نومبر 1987 میں عمان میں منعقدہ ایک ہنگامی عرب چوٹی کانفرنس میں مصر کی سفارتی تنہائی کو ختم کر دیا گیا۔ ایک سال بعد اسرائیل کے ساتھ مذاکرات کے موضوع پر عرفات نے کچھ اور ڈھیل دی۔ اس سے زیادہ یہ کہ انتفاضہ (دسمبر 1987) کی شروعات زمینی صورتحال میں خوش گوار تبدیلی لائی: ''بغاوت کا سب سے اہم پیغام جس کو اسرائیلی سماج اور امریکی فیصلہ گروں نے ایک دوسرے کے ساتھ کافی حد تک تسلیم کیا ہے کہ مغربی کنارے اور غزہ پٹی پر اسرائیلی قبضہ کی طویل صورتحال اور فلسطینیوں کے قومی حقوق سے انکار، پائیدار نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی ایک جاری رہنے والی بغاوت کے باوجود فریقوں کی قوت مدرکہ حقیقت کے پیچھے رہی جو ان کے طویل مدتی نظریات کی اسیر تھی۔'' (صفحہ 307)

سیلا کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انتفاضہ کی جانب عرب حکومتوں کا سرکاری ردعمل سست رو اور غیر فیصلہ کن تھا لیکن عوامی ہمدردی بلاشبہ کافی تھی جس کا ثبوت سعودی عرب اور خلیجی امارات سے آنے والی مالی امداد میں مضمر ہے۔ جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ انتفاضہ ایک باضابطہ اور منظم بغاوت ہے تو یو ایس انتظامیہ حرکت میں آئی اور ایک منصوبہ پیش کیا جس میں اصل زور سیلف ڈٹرمنیشن کے بجائے فلسطینی خودمختاری پر تھا (صفحہ 306) ساتھ ہی اردنی آپشن کو پار لگانا بھی مدنظر تھا۔ لیکن یہ منصوبہ بال و پر کی حد سے آگے نہ بڑھا۔ جون 1988 کی الجزائر چوٹی کانفرنس (انتفاضہ چوٹی کانفرنس) نے پی ایل او کی قیادت میں ایک فلسطینی ریاست کے قیام کی حمایت پر مہر لگا دی۔ سات ہفتوں بعد اردن نے مغربی کنارے سے اپنے تمام انتظامی اور قانونی روابط قطع کر دیے اور یوں ایک نئی ریاست کی تشکیل کے عمل کو فزوں تر کر دیا۔

اگلے دو سالوں میں دو چوٹی کانفرنسوں (کاسابلانکا اور بغداد) نے مصر کی عرب لیگ میں واپسی، اور عرب صفوں میں نئے انتشار کی نمو جو کہ ایک نئے عرب جھکاؤ اور علاقائی ٹکڑوں میں تقسیم کی طرف لے جاتا ہے، کا مشاہدہ کیا (دی عرب مغرب یونین اور عرب کوآپریشن کونسل): ''وہ پان عربزم کے مٹتے ہوئے تصور کا آئینہ دار تھے۔'' (صفحہ 317)

اس راستہ کی طرف لے جانے میں آخری مہمیز یکم اگست 1990 میں کویت پر عراق کے حملہ نے لگائی۔ حملہ کے دس دن بعد بلائی گئی ہنگامی چوٹی کانفرنس کویتی بحران کا کوئی عرب حل ڈھونڈنے میں ناکام رہی اور عراق کی مذمت پر مجبور ہوئی۔ بین الاقوامی معمولات کا دینے اور ان پر سرگرم رہنے میں عرب حل کا نظریہ مسترد کرتے ہوئے درحقیقت کانفرنس نے ان معمولات کو مزید داخلی بنانے میں پیش رفت کی اور عرب ریاستوں کو عالمی نظام میں ضم کرنے کی طرف قدم بڑھایا۔'' (صفحہ 328)۔ گلف کوآپریشن کونسل کے سکریٹری جنرل عبداللہ بشارا کے فروری 1991 کے ایک تبصرہ سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے ''ایک نیا عرب نظام جو قانونیت، باہمی احترام، اندرونی معاملات میں غیر مداخلت کاری پر مبنی ہو اور باہمی مفادات کی تخلیق میں معیشت کے کردار کی ضرورت، پر بولتے ہوئے دیا تھا۔ کویتی بحران نے 26 سالہ عرب چوٹی کانفرنسوں کو بھی ختم کر دیا۔

اسرائیل کے ساتھ تنازعہ میں تصفیہ کے لیے عرب کھوج نئے امکانات۔ میڈرڈ، اوسلو اور دیگر۔ کو تلاش کرتی رہی۔ سیلا نے یہ خلاصہ کیا ہے کہ ایک نیا علاقائی نظام ابھر رہا ہے جو بجائے نسلی و قومی شناخت کے اسٹریٹجک اور معاشی اصولوں پر مبنی ہے اور یہ پان عرب علاقائی نظام سے علاحدگی کی واضح طور سے نمائندگی کرتا ہے اور علاقائی اور باہمی علاقائی سیاست میں ریاست کو آزادانہ کردار عطا کرتا ہے۔ سیلا کہتے ہیں کہ یہ اسرائیل کے اس کے عرب پڑوسیوں سے تعلقات کو معمول پر لانے پر منتج ہوگا (صفحہ 350)۔ عرب ذہنوں میں بالادستی کا خوف چھوٹ جائے گا اور قرابت داریوں اور نسلی یکجہتی کے آثار ثقافتی رشتوں میں مضبوطی سے بندھ جائیں گے۔

یہ کتاب گہری تحقیق اور مستند دستاویزات کا نمونہ ہے۔ 1964 سے 1990 تک

بیس چوٹی کانفرنسوں میں لیے ہوئے فیصلے اور بحث میں آئے ہوئے مسائل کا خلاصہ ایک مفید ضمیمہ میں کر دیا ہے۔ ایک اور تتمہ ہر چوٹی کانفرنس میں شریک ریاستوں کی سطح کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنف کی کوشش ہے کہ وہ علاقائی عرب سیاست کی تاریخ پر موجودہ ادب کے خلا کو پُر کرے اور کتاب نے یہ مقصد خاصی حد تک پورا کیا ہے۔ اس کتاب کی جامعیت میں یقیناً مزید اضافہ ہو جاتا اگر مصنف عربوں کے ساتھ مذاکرات کے حوالہ سے اسرائیل کے اندر ہوئے داخلی بحث و مباحثہ اور ان کے امکانات کو بھی شامل کر لیتا۔ ممکن ہے کہ عرب دنیا سے کوئی ''آشنائے راز'' اٹھے اور موجودہ تاریخ سے متعلق دبے ہوئے جذبوں کو قابو میں کرے، ''سیکرٹ چینلز'' میں محمد ہیکل کی کاوشوں کو تقویت دے، ایک قابل موازنہ عرب جائزہ پیش کرے اور جیسا کہ شاید ابن خلدون نے کہا کہ ''نقاب کشائی'' کرے۔

انسانی حقوق کی جدید گردان

(ہیومن رائٹس ہورائزنز: دی پرسوٹ آف جسٹس
ان اے گلوبلائزنگ ورلڈ: مصنف رچرڈ فاک)

بین الاقوامی قانون کے طلبا کے لیے پروفیسر رچرڈ فاک کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ گزشتہ چار عشروں سے ان کی تصانیف بنیادی مطالعہ میں شمار ہوتی ہیں۔ اتنی ہی معروف ان کی وہ کاوشیں ہیں جو انھوں نے انسانی حقوق جس کا منبع خود اقوام متحدہ کا منشور ہے، کو مضبوط کرانے میں کی ہیں۔ 1980 میں شائع ہوئے مضامین کے ایک مجموعہ میں انھوں نے یہ جاننے کی جستجو کی تھی کہ ''حقوق انسانی کے کاموں کو ایک ایسے عالمی نظام میں کیسے فروغ دیا جائے جس پر اگرچہ ریاستی اقتدار کے حقائق کی اجارہ داری نہیں ہے لیکن اس کی بالادستی قائم ہے۔'' انھوں نے کارٹر انتظامیہ کی جانب سے محتاط طریقہ سے وضع کی گئی حقوق انسانی کی حیثیت پر غور کیا اور زور دیا کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ حقوق انسانی کے ایجنڈے کو مختلف اقسام کے مفادات کے حامل عناصر کے آپسی سودے بازی سے الگ رکھا جائے، انھوں نے ایک سریع کامیابی بلکہ سست رو ترقی کو بھی خارج از امکان قرار دیا لیکن ایک ترقی پذیر عالمی بیداری کے زمانے میں تحفظ کی ضرورت پر زور دیا۔ موجودہ

کتاب اس تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے نوٹ کرتی ہے کہ ''ایک بدلے ہوئے عالمی منظرنامہ کے جواب میں متعدد ریاستیں راستہ بدل رہی ہیں لیکن یکسانیت کے ساتھ نہیں کیونکہ ریاستوں کے اپنے اپنے حالات ہوتے ہیں اور ان کے اختیار میں صلاحیتوں اور اسٹر ریٹیجیز کی گنجائشوں کا وسیع تر میدان ہوتا ہے۔'' لہٰذا اب جو چیلنج سامنے ہے وہ یہ ہے کہ (i) ''شناخت اور سیاسی اقتدار کے رقبہ میں کمی کے رجحان کے تئیں حقوق انسانی کے موقف کو کیسے فروغ دیا جاسکتا ہے اور (ii) عالمی معیشت میں پالیسی سازی کا معیشاتی مزاج کس طریقہ سے ان فیصلوں کو انسانی چہرہ عطا کرسکتا ہے، اور اس طرح حقوق انسانی کی رسائی گروہوں کے حقوق تک کرسکتا ہے، ثقافتی تکثیریت کو مدنظر رکھ سکتا ہے اور یوں ایک انسانیت سے معمور طرز حکومت کو فروغ دے سکتا ہے۔

فاک کا خیال ہے کہ سرد جنگ کے بعد والے زمانے میں حقوق انسانی سے متعلق مخاصمت کے اسباب نظریہ سے الگ ہوکر ثقافت کی جانب آگئے ہیں اور تلخ بحث کا موضوع بن گئے ہیں۔ لہٰذا حقوق انسانی کی سیاست کو ایک موثر نفاذ کی حکومت سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ مستقبل میں اصل چیلنج موخرالذکر کی طرف سے آئے گا۔

اس مقصد کی خاطر یہ کتاب جو تین حصوں میں منقسم ہے موجودہ ابھرتے ہوئے نظریاتی فریم ورک کا جائزہ لیتی ہے اور اس کو پرکھتی ہے، کچھ ٹھوس چیلنجوں اور کشمکشوں کو اجاگر کرتی ہے اور ان امکانات کا اندازہ لگاتی ہے جو عالمی تحفظ کی خصوصیت کے ساتھ اکیسویں صدی میں انسانی اخلاقیات کو جگہ دے سکیں۔ واضح طور سے یہ کوشش ''تعریف'' پر بنیادی نظرثانی کی جانب پیش رفت ہے۔

لہٰذا کتاب کے پہلے حصہ میں نظریاتی فریم آف ریفرنس کو ابھارا ہے تاکہ یہ دکھایا جاسکے کہ 'حقوق انسانی کی ثقافت کی حصولی اور عالمی امن کا قیام لازم وملزوم ہیں اور بیک وقت قابل نفاذ مقاصد ہیں اور یوں انسانیت سے معمور طرز حکومت کا فریم ورک بنتے ہیں۔'' (صفحہ 10) انصاف کی یہ تلاش جو افلاطون سے رال تک مغربی سیاسی فلسفہ کا لازمی جز رہی ہے، کو جدید ریاست کی جامد منطق اور مارکیٹ کی طاقتوں کے تئیں اس کی

ذمہ داریوں کی صورت میں رُکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس کے نتیجہ میں ریاست کے عمل میں انسانی حق تلفی سرزد ہوتی ہے۔اس کے باوجود بھی عالمی سطح پر سرگرم عمل محرکات سے نئے نمایاں سیاسی اداکاروں کے عالمی ایجنڈے پر حقوق انسانی کا ظہور حیرت انگیز طور پر ایک اہم مسئلہ کی طرح ہوا ہے۔'' (صفحہ 35) انجام کار پچھلی روایت یعنی طرز حکومت پر اخلاقیات سازی کو حقوق انسانی کے معیار کو اونچا کرنے والے عمل سے بدل دیا اور یوں بین الاقوامی تعلقات میں انداز گفتگو دیا ہے۔ یہ بڑے آرام سے ایک معیاری اصول بندی کی کوشش اور اقوام متحدہ نظام کے اندر انسانیت کے خلاف جنگی جرائم اور قوانین کو مضبوط کرنے کی مرکزی توجہ کے ساتھ اور حقوق انسانی کے کردار کو فروغ دینے کے لیے ساتھ ساتھ چلا۔ عالمی سول سوسائٹی میں حقوق انسانی سرگرمیوں کے فروغ نے ان رجحانات کو مزید تقویت دی ہے۔

ستم ظریفی بہرحال یہ ہے کہ نفاذ کے عمل کو داخلی بنا لینا بڑی حد تک نابرابر ہے اور اکثر ممالک۔خصوصاً آزادانہ خیالات کی جمہوریتیں۔حقوق انسانی کو خارجہ پالیسی کے ایک آلہ کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں اور یہ اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے چننے کی وجہ سے اس مشاہدہ کا جواز کہ 'حقوق انسانی کی وجہ سے مداخلت کاری مسی سی پی دریا کی طرح ہے جو صرف شمال سے جنوب کی جانب بہتا ہے' ثابت ہوتا ہے۔ (صفحہ 60) لہٰذا فاک جمہوری احتساب کے برطانوی اقدام کو سراہتے ہیں جس میں کارروائیوں، داخلی قوانین، انتظامی امور اور عدلتی فیصلوں کی بین الاقوامی حقوق انسانی کے معیار کی روشنی میں نگرانی کی جائے گی اور پرکھا جائے گا اور ایک ایسے عمل کے ذریعہ بھی جس میں ہر سوسائٹی اس معیار کو عوامی شرکت میں اندرونی بنا لے: ''ضرورت یہ ہے کہ نفاذ کے چیلنج کو داخلی پالیسی کی ایک نئی ترجیح کی طرح سمجھنا چاہیے نہ کہ، جیسا کہ اکثر ہوتا آیا ہے، خارجہ پالیسی سجاوٹ کے طور پر استعمال ہو۔'' (صفحہ 66)

ریاستوں کے سلوک اور کردار کے بین الاقوامی معیار پر کوئی بھی مباحثہ بہرطور اقتدار کے سوال سے شروع ہوتا ہے۔موجودہ دور میں وسیع طور سے رسمی جہتوں اور مشاہداتی

حقائق کے درمیان تسلیم شدہ فاصلہ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے فاک اس موضوع پر دقیق نظری کے ساتھ ایک مکمل باب صرف کرتے ہیں۔ پچھلے عشروں میں یہ فاصلہ، بین الاقوامی قانون میں حقوق انسانی کے ایک متوازی حیثیت میں فروغ کی وجہ سے، بڑھتا گیا ہے۔ لہٰذا اقتدار کو ایک نیا تصور دینا اور یہ دیکھنا کہ یہ ایک دوطرفہ شاہراہ ہے جس میں سے ایک حقوق کا راستہ ہے لیکن اس میں ذمہ داریاں بھی ہیں۔'' اس بنیاد پر فاک ''روایتی زمینی اقتدار اعلیٰ کے مقابلہ میں اصول بند اقتدار اعلیٰ کا تصور پیش کرتے ہیں (صفحات 75-74) ایک ایسے تصور میں عالمی طور سے تسلیم شدہ حقوق انسانی کا فریم ورک اور اس کے نفاذ کے لیے یوروپین کمیونٹی کا طریقہ کار (پرکھنے کے ایک خارجی طریقہ کار کی مدد سے) آپس میں ضم ہو جائیں گے۔ افراد کی مجرمانہ ذمہ داری کے معیار اور ایک بین الاقوامی عدالت کے ذریعہ ان پر مقدمہ داری نظام کو اور زیادہ مضبوط بنائے گی۔ مصنف حقوق انسانی کے نفاذ کی خاطر فوجی مداخلت کاری کے حق میں نہیں ہے۔ ایک بہتر راستہ یہ ہوگا کہ حقوق انسانی کے عالمی ڈیکلریشن کے ساتھ ساتھ ایک انسانی ذمہ داریوں پر عالمی ڈیکلریشن بھی لازمی قرار دیا جائے۔

تعریف و ترتیب میں اتنی بھاری تبدیلی اپنے ساتھ ٹھوس کشمکش لائے گی۔ اس کتاب کے خاصے بڑے حصے کو فاک اسی بحث کے لیے مختص کرتے ہیں: خوداختیاری، انسانیت پر مبنی دخل اندازی، گروپ رائٹس، اسلام کے حوالے سے اخراج کی جغرافیائی سیاست اور گلوبلائزیشن کے زمانے میں نسل کشی کی سیاست۔ ان میں سے خوداختیاری کی تاریخ سب سے طویل ہے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ظہور میں آئی۔ ایک جانب اس کی حمایت ووڈرو ولسن نے کی اور دوسری جانب سے لینن نے۔ اس موضوع پر الفریڈ کوبان 1945 میں اپنی مستند کتاب میں رقم طراز ہیں: ''خودمختاری کی تاریخ قوموں کو بنانے اور ریاستوں کو توڑنے کی تاریخ ہے۔'' لیکن وارسیلز تصفیہ میں اس تصور کو جداگانہ طرز میں استعمال کیا گیا ہے۔ ''وہ سیاستداں جو پیرس میں اکٹھا ہوئے غلط فہمیوں کا شکار نہیں تھے۔ انھوں نے خودمختاری کے مطالبہ کو جنگ کے حیلہ کے طور پر لیا تھا اور اگرچہ لازمی طور پر یہ

منافقانہ رویہ نہیں تھا لیکن ان میں سے اکثر اس کو اپنانے کو تیار نہیں تھے جب امن کی شرائط میں یہ اصول ان کی اپنی ریاستوں کے مفادات سے ٹکرایا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کے منشور میں اس کا حوالہ ایک ''اصول'' کی حیثیت سے ہے نہ کہ ''ایک حق'' کی طرح اور یہ تذکرہ بھی سرسری طور پر کیا گیا ہے۔

اس نظریہ کو اصل تحریک اور قوت، عدم نوآبادیاتی عمل اور 16 دسمبر 1960 کے یواین جنرل اسمبلی کی قرارداد 1514 سے ملی جو کہ خود 1966 میں بین الاقوامی معاہدوں اور 1970 کے ڈیکلریشن آن فرینڈلی ریلیشنز سے مضبوط ہوا تھا۔ بات کی تہہ جس کو فاک قبولیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے جج ہارڈی ڈلارڈ نے 1975 میں علاحدہ رائے میں مغربی صحارا کے معاملہ میں کہی: ''یہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ سرزمین کی قسمت کا فیصلہ کریں نہ کہ سرزمین افراد کی قسمت کا فیصلہ کرے۔''

اس سے قطع نظر جلد ہی ایک نظریہ ابھرا کہ خوداختیاری کا عمل ریاست کی موجودہ سرحدوں کو نہ چھیڑے۔ نتیجہ میں پیدا ہونے والے تذبذب کو فاک تسلیم کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ مسئلہ پر ایک خالصتاً منطقی نظر ڈالنے سے کتراتے ہیں اور خوداختیاری کے جن کو دوبارہ گرفت میں لینے کے جدید قانونی ہدایات جو بین الاقوامی رائے اور عمل کی نمائندہ ہیں، کے قیام کے ذریعہ ایک موثر سیاسی حل کی تجویز کرتے ہیں۔'' وہ اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ 1989 کے بعد والی مدت میں حالیہ عمل کی دو نمایاں خصوصیات، حق خوداختیاری کی گزشتہ تمام تصورات سے آگے کا پھیلاؤ اور خوداختیاری کے خصوصی وعدوں میں اطمینان بخش انتظامات میں تغیر پذیری ہے۔ (صفحات 13-112)

پھر آخر اس کا حل کیا ہے؟ سابقہ سوویت یونین اور یوگوسلاویہ کا نوے کی دہائی کا تجربہ ایک معروضی معیار، سیاسی غلبہ اور اسٹریٹجک متعلقات کی عدم موجودگی کو واضح کرتا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ انتشار اور ناانصافی کے درمیان انتخاب کی کشمکش شاید بہت حقیقی ہے۔ اس وجہ سے فاک، 1994 کے لیچ ٹینس ٹین پروپوزل (جو 1995 میں پرنسٹن یونیورسٹی میں خوداختیاری پر ایک تحقیق

حقائق کے درمیان تسلیم شدہ فاصلہ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے فاک اس موضوع پر دقیق نظری کے ساتھ ایک مکمل باب صرف کرتے ہیں۔ پچھلے عشروں میں یہ فاصلہ، بین الاقوامی قانون میں حقوق انسانی کے ایک متوازی حیثیت میں فروغ کی وجہ سے، بڑھتا گیا ہے۔ لہٰذا اقتدار کو ایک نیا تصور دینا اور یہ دیکھنا کہ یہ ایک دوطرفہ شاہراہ ہے جس میں سے ایک حقوق کا راستہ ہے لیکن اس میں ذمہ داریاں بھی ہیں۔'' اس بنیاد پر فاک ''روایتی زمینی اقتدار اعلیٰ کے مقابلہ میں اصول بند اقتدار اعلیٰ کا تصور پیش کرتے ہیں (صفحات 75-74) ایک ایسے تصور میں عالمی طور سے تسلیم شدہ حقوق انسانی کا فریم ورک اور اس کے نفاذ کے لیے یوروپین کمیونٹی کا طریقہ کار (پرکھنے کے ایک خارجی طریقہ کار کی مدد سے) آپس میں ضم ہوجائیں گے۔ افراد کی مجرمانہ ذمہ داری کے معیار اور ایک بین الاقوامی عدالت کے ذریعہ ان پر مقدمہ داری نظام کو اور زیادہ مضبوط بنائے گی۔ مصنف حقوق انسانی کے نفاذ کی خاطر فوجی مداخلت کاری کے حق میں نہیں ہے۔ ایک بہتر راستہ یہ ہوگا کہ حقوق انسانی کے عالمی ڈیکلریشن کے ساتھ ساتھ ایک انسانی ذمہ داریوں پر عالمی ڈیکلریشن بھی لازمی قرار دیا جائے۔

تعریف وترتیب میں اتنی بھاری تبدیلی اپنے ساتھ ٹھوس کشمکش لائے گی۔ اس کتاب کے خاصے بڑے حصے کو فاک اسی بحث کے لیے مختص کرتے ہیں: خوداختیاری، انسانیت پر مبنی دخل اندازی، گروپ رائٹس، اسلام کے حوالے سے اخراج کی جغرافیائی سیاست اور گلوبلائزیشن کے زمانے میں نسل کشی کی سیاست۔ ان میں سے خوداختیاری کی تاریخ سب سے طویل ہے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ظہور میں آئی۔ ایک جانب اس کی حمایت ووڈرو ولسن نے کی اور دوسری جانب سے لینن نے۔ اس موضوع پر الفریڈ کوبان 1945 میں اپنی مستند کتاب میں رقم طراز ہیں: ''خودمختاری کی تاریخ قوموں کو بنانے اور ریاستوں کو توڑنے کی تاریخ ہے۔'' لیکن وارسیلز تصفیہ میں اس تصور کو جداگانہ طرز میں استعمال کیا گیا ہے۔ ''وہ سیاستداں جو پیرس میں اکٹھا ہوئے غلط فہمیوں کا شکار نہیں تھے۔ انھوں نے خودمختاری کے مطالبہ کو جنگ کے حیلہ کے طور پر لیا تھا اور اگرچہ لازمی طور پر یہ

منافقانہ رویہ نہیں تھا لیکن ان میں سے اکثر اس کو اپنانے کو تیار نہیں تھے جب امن کی شرائط میں یہ اصول ان کی اپنی ریاستوں کے مفادات سے ٹکرایا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کے منشور میں اس کا حوالہ ایک ''اصول'' کی حیثیت سے ہے نہ کہ ''ایک حق'' کی طرح اور یہ تذکرہ بھی سرسری طور پر کیا گیا ہے۔

اس نظریہ کو اصل تحریک اور قوت، عدم نوآبادیاتی عمل اور 16 دسمبر 1960 کے یو این جنرل اسمبلی کی قرارداد 1514 سے ملی جو کہ خود 1966 میں بین الاقوامی معاہدوں اور 1970 کے ڈیکلریشن آن فرینڈلی ریلیشنز سے مضبوط ہوا تھا۔ بات کی تہہ جس کو فاک قبولیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے جج ہارڈی ڈلارڈ نے 1975 میں علاحدہ رائے میں مغربی صحارا کے معاملہ میں کہی: ''یہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ سرزمین کی قسمت کا فیصلہ کریں نہ کہ سرزمین افراد کی قسمت کا فیصلہ کرے۔''

اس سے قطع نظر جلد ہی ایک نظریہ ابھرا کہ خوداختیاری کا عمل ریاست کی موجودہ سرحدوں کو نہ چھیڑے۔ نتیجہ میں پیدا ہونے والے تذبذب کو فاک تسلیم کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہ مسئلہ پر ایک خالصتاً منطقی نظر ڈالنے سے کتراتے ہیں اور خوداختیاری کے جن کو دوبارہ گرفت میں لینے کے جدید قانونی ہدایات جو بین الاقوامی رائے اور عمل کی نمائندہ ہیں، کے قیام کے ذریعہ ایک موثر سیاسی حل کی تجویز کرتے ہیں۔'' وہ اس بات پر نظر رکھتے ہیں کہ 1989 کے بعد والی مدت میں حالیہ عمل کی دو نمایاں خصوصیات، حق خوداختیاری کی گزشتہ تمام تصورات سے آگے کا پھیلاؤ اور خوداختیاری کے خصوصی وعدوں میں اطمینان بخش انتظامات میں تغیر پذیری ہے۔ (صفحات 13-112)

پھر آخر اس کا حل کیا ہے؟ سابقہ سوویت یونین اور یوگوسلاویہ کا نوے کی دہائی کا تجربہ ایک معروضی معیار، سیاسی غلبہ اور اسٹریٹجک متعلقات کی عدم موجودگی کو واضح کرتا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔ انتشار اور ناانصافی کے درمیان انتخاب کی کشمکش شاید بہت حقیقی ہے۔ اس وجہ سے فاک، 1994 کے لیچ ٹینس ٹین پروپوزل (جو 1995 میں پرنسٹن یونیورسٹی میں خوداختیاری پر ایک تحقیقی

پروگرام کا سبب بنا) کو سراہتے ہیں اور یوں یہ ایک علامتی لچک کے لیے راستہ دیتی ہے جب کہ ریاست کے بکھرنے کے ٹھوس استعمال کو ترک کرے گی (صفحہ 104)۔ لیکن اس کی بھی اپنی کمزوریاں ہیں۔ پروفیسر قبول کرتے ہیں کہ ''مکمل طور سے اطمینان بخش حل ممکن نہیں ہیں۔''

قدامت پرستی کے ایک اور چیلنج کا تعلق گروپ کے وعدوں سے ہے۔ روایتی طور سے ایک قومی ریاستی فریم ورک کے اندر انفرادی حقوق توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی اکثر ریاستوں میں تکثیری قومیت ایک موجودہ حقیقت ہے اگرچہ قانون ایک متحدہ قومیت کی جانب اشارہ کرتا ہے جو ریاست کے اختیارات کے مقتدراعلیٰ مرکز کی جانب سے عطا کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ میں انضمام شدہ گروپ بہت زیادہ امتیاز اور ظلم و زیادتی کے شکار ہیں۔ لہٰذا نظریاتی سوال یہ ہے کہ گروپ دعووں کے مختلف سیاق و سباق میں قومی ریاست کو کیسے جوڑا جائے۔ لیگ آف نیشنز نے اقلیتوں کے مسئلہ کو موثر طریقے سے گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام ہوئی۔ اقوام متحدہ کے سیاسی ماحول نے، خصوصاً سرد جنگ کے دوران، مسئلہ کو لاتعلقی کی آخری حدوں تک پہنچا دیا۔ ''نتیجہ کے طور پر اقلیتوں کی شکایتوں کی حقیقت مضبوط اور متحدہ ریاستوں کے سراب میں چھپ گئی یا کم سے کم دبا دی گئی۔'' یہاں پر ایک بار پھر سرد جنگ کا خاتمہ ایک کیفیتی تغیر کا باعث ہوا۔

لہٰذا نظریاتی سوال یہ ہے کہ گروپ دعووں کے مختلف سیاق میں قومی ریاست سے کیا تعلق رکھا جائے۔ لیگ آف نیشنز نے کوشش کی کہ اقلیتوں کے مسئلہ کو موثر طریقہ سے گرفت میں لے لیکن ناکام ہوگئی۔ اقوام متحدہ کے سیاسی ماحول، خصوصاً سرد جنگ کے دوران، نے اس مسئلہ کو غوروفکر کے باہری حاشیہ پر منتقل کردیا۔ نتیجہ کے طور پر اقلیتوں کی شکایتوں کو مضبوط، متحد ریاستوں کے سراب میں چھپا دیا گیا یا کم سے کم دبا دیا گیا۔ سرد جنگ کا خاتمہ ایک بار پھر یہاں پر ماہیتی تبدیلی کا سبب بنا۔

دسمبر 1992 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد ''قومی یا نسلی، مذہبی یا لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے حقوق'' پر منظور کی اور اس پر زور دیا کہ

''اقوام متحدہ کو اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔'' اسی بات کو لسانی حقوق پر منعقد ہونے والی 25 جون 1993 کی ویانا عالمی کانفرنس میں دوہرایا گیا۔ فاک کا خیال ہے کہ گروپ رائٹس کے حوالے سے اقوام متحدہ کا کردار مددگار رہا ہے اگرچہ کہ وہ بالواسطہ اور ماحول کے لحاظ سے تھا اور جس سے وہ فضا ہی تبدیل ہوگئی جس میں یہ مسائل ابھرے اور حل کیے گئے۔ اس طرح سے گروپ کے دعووں کے بارے میں جو عالمی بیداری ابھری وہ ریاستوں کو اقلیتی گروہوں کے خلاف زیادتی کرنے سے باز رکھتی ہے اور دوسروں کو مسئلہ کے حل میں محتاط رہنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ وہ مواقع بھی فراہم کرتی ہے جو مثبت گروپ رائٹس کے حصول اور انتقال اختیارات، خودمختاری، سوراج، وفاقیت اور خود انتظامی کے لیے آلات کو فروغ دیتے ہیں''۔ (صفحہ 142)۔ کیا اقوام متحدہ اسی راستہ پر گامزن رہے گی؟ اور کیا یہ گروپ دعووں کے حوالے سے سفر کو منفی سے مثبت طریقۂ عمل کی جانب لے جائیں گی؟

نوع انسانی کے تحفظ میں حکومتوں کی ناکامی پر انسانیت کی بنیاد پر دخل اندازی کا مسئلہ، خصوصاً نسل کشی کے معاملات میں بوسنیا اور روانڈا کے حوالے سے، حقیقت پسندانہ طریقہ سے زیر بحث لایا جاتا ہے۔ جہاں تک بوسنیا کا تعلق ہے اس معاملہ کی تعیین کرنے والے محرک کا ایک حاشیہ میں خلاصہ کیا گیا ہے: ''یوروپی وفاداریاں نسلی، مذہبی اور تاریخی بنیاد پر پارٹیوں میں تقسیم ہوگئی تھیں۔ اسلام اور مغرب کے درمیان تناؤ جو کہ ہمیشہ سے ایک اہم عنصر رہا ہے کے پیش نظر بوسینائی قیادت کی حمایت یوروپ کو ہضم نہیں ہورہی تھی۔'' (صفحہ 259)

جہاں تک روانڈا اور برونڈی کا سوال ہے تو عالمی سطح پر بڑے اداکاروں نے بے توجہی کا رویہ اپنایا کیونکہ یہاں کوئی اہم مفاد بازی پر نہیں لگا تھا۔ بہرحال گوشواروں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ''موثر مداخلت کاری، صرف مفاد سے وابستہ ہوتی ہے اقدار سے نہیں''۔ لہٰذا بہتر نتیجے اسی صورت میں حاصل کیے جاسکتے ہیں جب عالمی نظام کی اقدار سے جڑی ہوئی ماورائی قومی و سماجی طاقتیں، حکومتوں پر عمل کے لیے زور ڈالیں: ''ایک

نسل کشی مخالف مہم چلانے کے لیے خواہ وہ بوسنیا میں ہو یا دنیا میں کہیں بھی، صرف سرکاری وسائل پر بھروسہ کرنا، پچھلے دو سو سال کے بین الاقوامی تعلقات کے طرز کو غلط سمجھنے کی نشانی ہے۔'' فاک یہ مضمون گجرات کے حالیہ منظم قتل عام جو نسل کشی کی حد کو چھو رہا تھا، کے بعد بھی لکھ سکتے تھے جہاں نہ تو حقائق اور نہ ہی تعریفی وضاحت سوال کے دائرہ میں آئے۔ بااقتدار ریاستوں کے اس دھندلے ریکارڈ کے باوجود فاک کا خیال ہے کہ جدید ریاست نے معیار ساز صلاحیتوں کی کھوج نہیں کی جس کو اخلاقی طور سے حساس اور ترقی پسند سیاسی قوتوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی اس بحث کی بنیاد 1994 میں منعقدہ کیل یونیورسٹی میں کین بوتھ کے کلیدی لکچر (انٹرنیشنل افیرز، جلد 71، شمارہ 1، (1995) صفحات 26-103) پر رکھی ہے جس کے مطابق انسانی لغزش کے تصور کے ذریعہ اخلاقی طاقت کو استعمال کیا جاسکتا ہے اور یوں ایک نئی سیاسی بحث جو اکیسویں صدی کی کثیر ثقافتی اور آفاقی دنیا کے لیے موزوں ہو، کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ ایسے عالمی معاشرہ کو تہذیبی شناختوں کو اپنانا ہوگا، ان کی جائز شکایات پر غور کرنا ہوگا اور معیار ساز گنجائشیں اختیار کرنا ہوں گی تاکہ عالمی کمیونٹی کے تمام طبقے پوری طرح سے اپنا اپنا کردار نبھائیں۔ اور یوں مغربی بالادستی کے ذریعہ ظہور میں آئی جھوٹی آفاقیت کے تصور پر قابو پائیں۔

فاک کی کتاب فکر کو دعوت دیتی ہے۔ وہ اگرچہ روایت پرستی پر سوال اٹھاتے ہیں لیکن وہ ایسا موجودہ دنیا کی پیچیدگیاں اور تضادات کو گرفت میں لیتے ہوئے عملی طور سے کرتے ہیں۔ وہ عالمی انصاف کا مطالعہ متقابل دعووں میں توازن سے کرتے ہیں یعنی امن بمقابلہ انصاف، معاشی فروغ بمقابلہ سماجی مساوات، موجودہ نسل کے دعوے بمقابلہ مستقبل کی نسل کے دعووں، روایتی اتفاق رائے بمقابلہ حاشیہ پر رہنے والوں کے حقوق، اور روایتی جغرافیائی سیاست بمقابلہ عالمی نظام کی معیار ساز اقدار۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ انسانی اخلاقیات عالمی تحفظ پر خاص نظر رکھیں اور اس جدید اخلاقیات کے محرکات غیر ریاستی عناصر سے ظہور میں آئیں۔

حقیقت پسند اس دلیل کو غیر دانشمندانہ قرار دیں گے اور کہیں گے کہ تبدیل ہونے

کی صلاحیت اور نیچے سے تبدیلی کی صلاحیت مبالغہ آمیز ہیں۔ فاک، غالباً اس کا جواب کین بوتھ کے الفاظ میں دینا پسند کریں گے: ''لیکن کون جانتا ہے کہ گلوبلائزیشن کے ضابطوں کے تحت ساڑھے تین سو سال کی ماہرانہ آفاقیت کے کیا اثرات ہوں گے؟ میرے خیال کے مطابق ''بیسویں صدی کے آخر میں یہ یقین رکھنا کہ انسانی معاشرہ موجودہ طرز پر ہمیشہ جاری رہے گا، اصل حماقت ہے۔''

چوتھا حصہ

ضمیمے

ضمیمے

فلسطین پر دستاویزات

I- اقوام متحدہ سلامتی کونسل قرارداد 242 (1967)

II- اقوام متحدہ سلامتی کونسل قرارداد 338 (1973)

III- طابہ مذاکرات۔ اسرائیلی فلسطینی مشترکہ اعلانیہ (طابہ، 27 جنوری 2001)
یوروپین یونین نان پیپر (طابہ، جنوری 2001)

IV- اقوام متحدہ سلامتی کونسل قرارداد 1397 (2002)

V- عرب لیگ اعلان (بیروت، 28 مارچ 2002)

VI- فلسطینی نان پیپر (22 جون 2002)

VII- صدر بش کا مشرق وسطی کا خطاب (24 جون 2002)

VIII- اسرائیلی فلسطینی تنازعہ کو ایک مستقل دو ریاستی حل کا ایک کارگزاری پر مبنی روڈ میپ (30 اپریل 2003)
فیز I - دہشت اور تشدد کا اختتام، فلسطینی زندگی کو معمول پر لانا اور فلسطینی اداروں کی تعمیر

فیز II-عبوری دور (جون 2003 - دسمبر 2003)

فیز III- دائمی حیثیت پر معاہدہ اور اسرائیلی۔ فلسطینی تنازعہ کا خاتمہ (2004-2005)

IX- روڈ میپ پر حکومت اسرائیل کے تحفظات (25 مئی 2003)

سعودی اصلاحات پر دستاویزات

I- تبدیلی کے لیے عرضداشت (دسمبر 1990)

II- ''نصیحت'' کا میمورنڈم (فروری 1991)

III- اسلامک موومنٹ فار چینج۔عرب جزیرہ نما میں جہاد ونگ کا پہلا بیان (1995)

IV- قومی اصلاح کی دستاویز (جنوری 2003)

V- شیعہ عرضداشت (اپریل 2003)

VI- ''قوم کے دفاع میں'' عرضداشت (ستمبر 2003)

VII- دوسرے قومی مذاکرہ اعلامیہ (4 جنوری 2004)

فلسطین

ا- اقوام متحدہ سلامتی کونسل قرارداد 242 (22 نومبر 1967)

سلامتی کونسل مشرق وسطیٰ کی سنگین صورتحال پر اپنی مستقل تشویش کا اظہار کرتی ہے اور پرزور طریقہ سے جنگ کے ذریعہ حاصل کی ہوئی زمین کو ناقابل قبول مانتی ہے اور ایسے کام کی ضرورت پر جس سے ایک منصفانہ اور پائیدار امن حاصل ہو، جہاں علاقہ کا ہر ملک سلامتی کے ساتھ رہ سکے؛

اور مزید زور دیتی ہے کہ تمام ممبر ریاستوں نے اقوام متحدہ کے منشور کو قبول کر کے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے کہ وہ منشور کی دفعہ 2 کے مطابق کام کریں گی؛

ا- تائید کرتی ہے کہ منشور کے اصولوں کی تکمیل کے لیے مشرق وسطیٰ میں منصفانہ اور پائیدار امن کا قیام مطلوب ہے جو مندرجہ ذیل دونوں اصولوں پر مشتمل ہے:

(i) حالیہ تنازعہ میں اسرائیلی مسلح افواج کی مقبوضہ علاقہ سے واپسی؛

(ii) تمام دعووں اور جنگی ماحول کا خاتمہ، علاقہ کی ہر ریاست کے اقتدار اعلیٰ، زمینی سالمیت اور سیاسی آزادی کا قبول کرنا اور اس کا احترام اور ان کا محفوظ اور تسلیم شدہ سرحدوں میں امن کے ساتھ رہنے کا حق جو خطروں اور خارجی قوتوں کے

خوف سے آزاد ہوں:

2- مزید اس ضرورت کی تائید کرتی ہے کہ

(i) علاقہ میں بین الاقوامی پانیوں میں جہاز رانی کی آزادی کی ضمانت ہو؛

(ii) پناہ گزینوں کے مسئلہ کے منصفانہ حل کی ضمانت ہو؛

(iii) علاقہ کے ہر ملک کی زمینی سالمیت اور سیاسی آزادی کی ضمانت ان وسائل کے ذریعہ ہو جس میں غیر فوجی زون بھی شامل ہوں؛

3- سکریٹری جنرل سے درخواست کرتی ہے کہ وہ مشرق وسطی میں بھیجنے کے لیے اپنا خصوصی نمائندہ نامزد کریں جو متاثرہ ریاستوں سے تعلقات قائم کرے اور برقرار رکھے تاکہ رضامندی کو فروغ ہو اور وہ ان کاموں میں مدد کرے جو اس قرارداد کے اصولوں اور ضابطوں کے مطابق پر امن اور منظور شدہ تصفیہ حاصل کر سکیں؛

4- سکریٹری جنرل سے درخواست کرتی ہے کہ وہ خصوصی نمائندہ کی ان کوششوں کی رپورٹ سلامتی کونسل کو جتنی جلد ممکن ہو سکے، پیش کرے۔

1382 ویں میٹنگ میں باتفاق رائے منظور شدہ

II- اقوام متحدہ سلامتی کونسل قرارداد 338 (22 اکتوبر 1973)

سلامتی کونسل

1- موجودہ جنگ کے تمام فریقوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ جنگ بندی کریں اور وہ جس مقام پر بھی ہوں اس فیصلہ کی منظوری کے وقت سے بارہ گھنٹے سے پہلے پہلے تمام فوجی سرگرمیوں کو فوراً روک دیں؛

2- تمام متعلقہ فریقوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ جنگ بندی کے فوراً بعد تمام علاقوں میں سلامتی کونسل قرارداد 242 (1967) کا نفاذ کریں؛

3- یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جنگ بندی کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد متعلق فریقوں کے درمیان مناسب سرپرستی میں مذاکرات شروع ہوں گے جن کا مقصد مشرق وسطی میں منصفانہ اور پائیدار امن کا قیام ہوگا۔

1747 ویں میٹنگ میں 14 کے مقابلہ میں صفر ووٹ سے منظور شدہ
(چین نے ووٹنگ میں حصہ نہیں لیا)

III- طابہ مذاکرات

27 جنوری 2001 میں طابہ میں مشترک اسرائیلی۔ فلسطینی اعلانیہ

گزشتہ چھ دنوں میں اسرائیلی اور فلسطینی وفود نے دونوں فریقوں کے درمیان ایک مستقل اور مستحکم معاہدہ پر پہنچنے کے لیے سنجیدہ، گہری اور عملی گفتگو کی۔

اپنے مثبت ماحول اور ایک دوسرے کی قومی، سلامتی اور موجودہ ضرورتوں کو سمجھنے میں باہمی دلچسپی اور خواہش کے لحاظ سے طابہ مذاکرات سے پہلے یہ مثال نہیں ملتی۔

وقت کی تنگی اور صورتحال کے پیش نظر اگرچہ یہ ناممکن تھا کہ تمام مسائل پر سمجھوتہ ہوسکے تاہم ہر وہ مسئلہ جو زیر بحث آیا اس میں معقول پیش رفت ہوئی۔

فریقین تسلیم کرتے ہیں کہ اس سے پہلے وہ کسی معاہدہ کے اتنے نزدیک نہیں پہنچے تھے، اس لیے ہمیں یقین ہے کہ بقیہ فاصلوں کو اسرائیل میں الیکشن ہونے کے بعد مذاکرات کی بازیافت میں طے کیا جا سکتا ہے۔

دونوں فریق حالات کو معمول پر لانے اور شرم الشیخ میمورنڈم کی روح کے مطابق اپنی باہمی وعدوں کی ادائیگی کے ذریعہ خطہ میں ایک محفوظ صورتحال کے قیام کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

مذاکراتی وفود نے چار خاص موضوعات پر گفتگو کی: پناہ گزین، سلامتی، سرحدیں اور یروشلم۔ پیش نظر یہ مقصد تھا کہ ایک پائیدار اور مستقل معاہدہ تک رسائی ہوجائے جو فریقین کے درمیان تنازعہ کو ختم کرے اور دونوں طرف کے عوام کو امن مہیا کرسکے۔

فریقین نے صدر کلنٹن کی پیش کردہ تجاویز پر ان کی تمام تر خوبیوں اور تحفظات کے ساتھ غور کیا۔

ان تمام مسائل پر دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں معقول پیش رفت ہوئی اور ان میں سے کچھ پر دونوں فریق زیادہ قریب ہوگئے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا، سیاسی نظام الاوقات نے تمام مسائل کو معاہدہ تک پہنچنے کا موقعہ نہ دیا۔

لیکن پھر بھی فریقین کے اختلافات کو کم کرنے میں جو قابل قدر پیش رفت ہوئی اس کی روشنی میں دونوں فریقوں کو یقین ہے کہ ایک معاہدہ پر پہنچنے کی فوری اور لازمی نوعیت کو تسلیم کرنے اور کاوشوں کو تیز تر کرنے سے ایک مختصر وقف میں بقیہ اختلافات کو ختم کرنے اور ان کے درمیان امن کے ایک مستقل تصفیہ تک رسائی ممکن ہو سکے گی۔

اس معاملہ میں فریقین کو یقین ہے کہ وہ جلد سے جلد ملنے والے عملی موقعہ پر اس راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

اس احساس کے ساتھ کہ فریقین میں اعتمادسازی کی فضا کو فروغ ہوا اور یہ کہ دونوں فریق معاہدہ کے اتنے نزدیک آج سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے، اسرائیلی فلسطینی مستقل حیثیت پر مذاکرات نے طابہ گفتگو کے طویل سفر کا قابل ذکر حصہ طے کیا۔

ہم طابہ کو امید اور باہمی حصولیابی کے جذبہ کے ساتھ الوداع کہتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ باہمی اعتماد و یقین کو پھر سے قائم کرنے اور اہم مسائل پر قابل قدر پیش رفت کی بنیاد پڑ چکی ہے۔

فریقین ان مذاکرات کی میزبانی اور سہولتیں فراہم کرنے کے لیے صدر حسنی مبارک کے شکرگزار ہیں اور ساتھ ہی ان مذاکرات کی حوصلہ افزائی کے لیے یوروپین یونین کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

یوروپین یونین نان پیپر (موریٹینوز دستاویز)، طابہ، جنوری 2001

تعارف

یہ یوروپین نان پیپر جنوری 2001 میں طابہ میں موجود اسرائیلی اور فلسطینی وفود سے مشوروں کے بعد، مشرق وسطیٰ امن عمل کے یوروپین یونین کے خصوصی نمائندے ایمبیسڈر مورے ٹینوز اور ان کی ٹیم نے تیار کیا۔ اگرچہ اس دستاویز کی کوئی رسمی حیثیت نہیں ہے تاہم اس کو طابہ میں مستقل حیثیت کے اوپر ہونے والے مذاکرات اور ان کے نتیجے پر

ایک بہتر بیانیہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ اس وسیع کام کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے جو دائمی حیثیت کے مسائل جیسے اراضی، یروشلم، پناہ گزیں اور تحفظ پر کیا گیا ہے تاکہ ایک مشترکہ موقف تک پہنچا جاسکے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان ابھی تک اہم اختلافات باقی ہیں جن کو مستقبل کے مذاکرات میں حل کرنا ہوگا۔ اس نقطہ نظر سے پیپر یہ ظاہر کرتا ہے کہ پالیسی کے اختیار اور قانونی کارروائی کے حوالہ سے مشکل کام ابھی باقی ہے لیکن پیپر یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ دونوں فریق نے ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے میں خاصا طویل سفر طے کیا ہے اور مسائل کا حل ممکن ہے۔

1 - اراضی

دونوں فریق متفق تھے کہ سلامتی کونسل قرارداد 242 کے مطابق 4 جون 1967 کی حدیں اسرائیل اور فلسطین کی سرحدوں کی بنیاد ہوں گی۔

1.1 مغربی کنارہ

پہلی بار دونوں فریقوں نے مغربی کنارہ کے اپنے اپنے نقشے پیش کیے۔ یہ نقشے اراضی اور بستیوں پر مباحثہ کی بنیاد بنے۔ اسرائیلیوں نے دو نقشے پیش کیے اور فلسطینیوں نے اس بنیاد پر کام کیا۔ فلسطینیوں نے کچھ توضیحی مصور نقشے پیش کیے جس سے مغربی کنارہ میں اسرائیلی مفادات سے متعلق ان کی سمجھ کا پتہ چلتا ہے۔ مذاکرات میں اراضی کے کئی پہلو زیر بحث آئے۔ اس میں بستیوں کا مسئلہ بھی تھا اور یہ کہ ہر فریق کی ضرورتوں کے لیے کیسے گنجائش نکالی جائے۔ کلنٹن کے بتائے ہوئے حدود اور دائروں نے مباحثہ کے لیے ایک ڈھیلی ڈھالی بنیاد تو ضرور فراہم کی لیکن پھر ان کے معنی اور وسعت کے سلسلہ میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ فلسطینیوں نے کہا کہ وہ کلنٹن تجاویز کو کچھ تحفظات کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

اسرائیلیوں کا کہنا تھا کہ کلنٹن تجاویز بستیوں کی شمولیت کی تائید کرتی ہے جب کہ فلسطینی اس سے متفق نہ تھے کہ تجاویز میں بستیوں کا الحاق شامل ہے۔ فلسطینیوں کا خیال تھا کہ بستیاں فلسطینی مفادات اور حقوق کے لیے ضرر کا اسباب ہوں گی خصوصاً ان فلسطینیوں کے لیے جو ان علاقوں میں مقیم ہیں جن کا الحاق اسرائیل چاہتا ہے۔

اسرائیلی فریق کا اصرار تھا کہ اسے بستیوں کو ایک دوسرے سے متصل کرنے کا اختیار حاصل ہے جب کہ فلسطینیوں کا جواب تھا کہ فلسطینی ضرورتوں کو بستیوں پر ترجیح ہونی چاہیے۔ اسرائیلی نقشوں میں مغربی کنارہ پر اسرائیلی بستیوں کے مستقبل کی ترقی کے منصوبے شامل تھے۔ فلسطینی مغربی کنارہ کی بستیوں میں کسی مزید ترقی کے حق میں نہیں تھے۔ جو بھی ترقی ہو وہ اسرائیل کے اندر ہی ہو۔

فلسطینی فریق کا اصرار تھا کہ کیونکہ اسرائیل کی فلسطینی سرزمین پر ضرورتیں ہیں لہٰذا سرحدوں پر واجب ترمیمات کی تجویز کے لیے وہی ذمہ دار ہے۔ فلسطینی فریق نے دہرایا کہ یہ تجاویز کسی بھی صورت میں فلسطینی مفادات سے نہ ٹکرائیں۔

اسرائیلی فریق کا کہنا تھا کہ حفاظتی وجوہات کے تحت وہ وادی اردن میں بستیوں کو قائم نہیں رکھنا چاہتے اور ان کے مجوزہ نقشوں میں یہ موقف ظاہر ہے۔

اسرائیلی نقشے خاص طور سے بستیوں کی آبادی کے نظریہ پر مبنی تھے جو تقریباً 80 فیصد رہنے والوں کو ضم کرلیں گے۔ اسرائیلیوں نے ایک اور نقشہ کھینچا جس میں چھ فیصد الحاق کو پیش کیا گیا جو کلنٹن کے سمجھاؤ میں آخری حد تھی فلسطینیوں کے توضیحی نقشہ میں زمین کی ادلا بدلی کی مقدار 3.1 فیصد تھی۔

دونوں فریق نے زمین کی ادلا بدلی کے اصول کو تسلیم کیا لیکن اس کا تناسب زیر بحث رہا۔ دونوں ہی فریق اس بات پر راضی ہوئے کہ اسرائیلی اور فلسطینی خودمختار علاقے اپنے اقتدار میں اتصال رکھیں گے۔ اسرائیلی فریق کی خواہش تھی کہ وہ ''محفوظ راستہ / کاریڈور، جیسی تجویز جو زمین کی ادلا بدلی کا حصہ ہے، کو ''اثاثہ'' قرار دیں حالانکہ یہ تجویز فلسطینیوں کو ان ''اثاثوں'' پر کوئی اختیار نہیں دے گی۔ اسرائیلی فریق، کلنٹن تجاویز کے مطابق زیادہ سے زیادہ تین فیصد زمین کی ادلا بدلی کے لیے تیار ہوا۔

فلسطینی نقشوں میں بھی ایسا ہی ایک نظریاتی نکتہ موجود تھا جو کسی بھی فلسطینی گاؤں کی غیر الحاق کی اہمیت پر زور دیتا تھا اور مغربی کنارہ اور یروشلم کے اتصال پر اصرار کرتا تھا۔ ان نکات کا قیاس اس اصول پر لگایا گیا تھا کہ ادلا بدلی میں زمین کا رقبہ اور قدر و قیمت

مساوی ہوں گے اور وہ علاقہ فلسطینی سرحد سے ملا ہوا ہوگا اور اسرائیل سے الحاق کیے ہوئے علاقہ کے آس پاس ہوگا۔ فلسطینی فریق کا مزید اصرار تھا کہ فلسطینی اقتدار کے تحت وہ زمین جیسے کہ اسرائیلی مجوزہ ''محفوظ راستہ/ کاریڈور'' اور اقتصادی مفادات ادلا بدلی کے حساب کتاب میں شامل نہیں ہیں۔

فلسطینیوں کا اصرار تھا کہ ''بے نامی اراضی'' (لاترن علاقہ) مغربی کنارہ کا حصہ ہے۔ اسرائیلیوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

اسرائیلی فریق نے لیز بندوبست کے تحت دو فیصد اضافی زمین کی درخواست کی۔ فلسطینیوں کا جواب تھا کہ لیز کا موضوع اسی وقت زیربحث لایا جاسکتا ہے جب فلسطینی ریاست قائم ہوجائے اور زمین فلسطینی اقتدار کو منتقل ہوجائے۔

1.2 غزہ پٹی

غزہ پٹی پر کسی فریق نے کوئی نقشہ نہیں پیش کیا۔ یہ مان لیا گیا کہ غزہ پٹی مکمل طور سے فلسطینی اقتدار کے تحت رہے گی لیکن پھر بھی کچھ جزئیات پر کام ہوگا۔ تمام بستیوں کو خالی کرایا جائے گا۔ فلسطینیوں کا دعویٰ تھا کہ یہ کام چھ مہینوں کے اندر ہوسکتا ہے لیکن اسرائیلیوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔

1.3 غزہ سے مغربی کنارہ تک محفوظ راستہ/ کاریڈور

دونوں فریق کا اس امر پر اتفاق تھا کہ شمالی غزہ (بیت حنون) سے ہیبر دن ضلع تک ایک محفوظ راستہ ہوگا اور یہ کہ مغربی کنارہ اور غزہ پٹی کو ایک دوسرے سے زمین کے ذریعہ جڑنا چاہیے۔ زمینی جوڑ پر حکمرانی اور اقتدار کی نوعیت پر رضامندی نہ ہوسکی۔

2- یروشلم

2.1 اقتدار

دونوں فریق نے اصولی طور پر کلنٹن کی یہ رائے قبول کی کہ عرب قرب و جوار پر فلسطینی اور یہودی قرب و جوار پر اسرائیلی اقتدار ہو۔ فلسطینی فریق نے اقرار کیا کہ وہ

اسرائیل کی اس درخواست پر غور کرنے کے لیے راضی ہیں کہ 1967 کے بعد مشرقی یروشلم میں تعمیر کی گئی یہودی بستیوں پر اسرائیلی اقتدار ہوگا۔ لیکن جبل ابوغنیم اور رأس العمود کی بستیاں اس سے خارج ہوں گی۔ فلسطینیوں نے یروشلم میٹرو پولیٹن ایریا کی بستیوں جیسے معالی ادومیم اور گیوت زیف پر اسرائیلی اقتدار کو مسترد کر دیا۔ فلسطینی فریق سمجھتا تھا کہ اسرائیل مشرقی یروشلم کے عرب قرب و جوار بشمول یروشلم کے پرانے شہر کے کچھ حصہ پر فلسطینی اقتدار تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔ اسرائیلی فریق سمجھتا ہے کہ فلسطینی پرانے شہر کے یہودی کوارٹر بشمول امریکی کوارٹر کے کچھ حصہ پر اسرائیلی اقتدار تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے۔

فلسطینیوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اسرائیلی مغربی یروشلم میں فلسطینیوں کی جائداد کے زر تلافی کے دعووں پر بحث کے لیے تیار ہیں۔

2.2 آزاد شہر

دونوں فریق ایک آزاد شہر کے تصور کو پسند کرتے تھے۔ اسرائیلیوں کی رائے ایک ایسے آزاد شہر کے قیام کے حق میں تھی جس کی جغرافیائی حدود یروشلم کے پرانے شہر اور مقدس وادی یا تاریخی وادی پر مشتمل ہوں۔

فلسطینی فریق بھی آزاد شہر کے حق میں تھا بشرطیکہ اتصال اور الحاق قائم رہے۔ فلسطینیوں نے آزاد شہر سے متعلق جغرافیائی حدود والی تجویز مسترد کر دی اور زور دیا کہ آزاد شہر صرف اسی صورت میں قابل قبول ہے جب وہ مغربی و مشرقی یروشلم کی مکمل بلدیاتی حدود پر مشتمل ہو۔

اسرائیلیوں نے روزانہ کے باہمی رابطہ کا تصور پیش کیا اور بلدیاتی ربط و تعاون کے لیے کئی صورتیں تجویز کی گئیں (جن کا تعلق انفرا اسٹرکچر، سڑکوں، بجلی، نکاس اور گندگی کی صفائی سے تھا)۔ ان انتظامات کو کسی اگلے مفصل معاہدہ میں تشکیل دیا جا سکتا تھا۔ اس نے ایک ڈھیلے ڈھالے سرحد کی رعایتوں کی تجویز بھی دی۔ اس کے علاوہ اسرائیلی فریق نے آزاد شہر میں مقیم اسرائیلی اور فلسطینی باشندوں کے لیے کئی خصوصی مراعات کی تجویز پیش کی تا کہ اس بات کی ضمانت ہو سکے کہ آزاد شہر کے انتظامات نہ تو ان کی زندگیوں کو منفی طور سے متاثر

کرے اور نہ ہی ہر فریق آزاد شہر کے اپنے سیکشن کے اقتدار پر سمجھوتہ کرے۔

2.3 دو ریاستوں کی راجدھانی

اسرائیلی فریق نے تسلیم کیا کہ یروشلم کا شہر دو ریاستوں کی راجدھانی ہوگا: اسرائیلی ریاست کی راجدھانی یروشلم اور فلسطینی ریاست کی راجدھانی 'القدس' کہلائے گا۔ فلسطینی فریق نے اس بارے میں صرف یہی کہا کہ مشرقی یروشلم فلسطینی ریاست کی راجدھانی ہے۔

2.4 پرانا شہر اور مقدس/ تاریخی وادی

پرانے شہر اور اس کے مضافات سے متعلق ایک متبادل تصور بنانے کی کوشش کی گئی اور اس سلسلہ میں اسرائیلی فریق نے کئی متبادل نمونے بحث کے لیے پیش کیے مثال کے طور پر پرانے شہر میں ربط و تعاون کے میکینزم کا قیام۔ ایک مخصوص پولیس فورس کا قیام بھی زیر بحث آیا لیکن اس پر اتفاق نہ ہو سکا۔

اسرائیلی فریق نے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اس علاقہ کی جانب اندیشہ ظاہر کیا جس کو مقدس وادی تصور کیا گیا ہے (اور جس میں زیتون پہاڑ پر یہودیوں کا قبرستان، داؤد کا شہر اور کیورون وادی شامل ہے)۔ فلسطینی فریق نے یقین دلایا کہ وہ اسرائیلی اندیشوں اور تعلق پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ یہ علاقہ فلسطینی اقتدار کے تحت رہے۔ مقدس وادی کے لیے اسرائیلیوں نے غیر رسمی طور سے اور متبادل پیش کیے جیسے کہ مخصوص حکومت کی تخلیق یا تمام علاقہ کے لیے بین الاقوامیت کی کوئی شکل یا مخصوص ربط و تعاون کے ساتھ مشترکہ حکومت۔ فلسطینی ان میں سے کسی پر بھی راضی نہ ہوئے حالانکہ اس پر بحث جاری رہے گی۔

2.5 مقدس مقامات: مغربی دیوار اور دیوار گریہ

دونوں فریق نے ایک دوسرے کے مقدس مقامات پر ایک دوسرے کے اقتدار کے اصول کو تسلیم کیا (مذہبی اور انتظامی)۔ اس اصول کے مطابق مغربی دیوار پر اسرائیل کے اقتدار کو تسلیم کیا جائے گا اگرچہ مغربی دیوار کے احاطہ میں آئے ہوئے علاقہ پر تنازعہ برقرار

رہے گا خصوصاً اس کڑی پر جس کے لیے کلنٹن کا خیال ہے کہ 'یہودیت کے لیے مقدس اور اس کا حصہ ہے۔'

فلسطینیوں نے مانا کہ اسرائیل نے مغربی دیوار کے مقدس حصوں سے الحاق کے لیے درخواست کی ہے لیکن انھوں نے یہ بھی کہا کہ مغربی دیوار اور/ یا دیوار گریہ کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے مغربی دیوار اور دیوار گریہ کے درمیان امتیاز کی اہمیت پر اصرار کیا جو کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق دیوار براق تسلیم کی جاتی ہے۔

2.6 حرم الشریف/ کوہ ہیکل

دونوں فریق اس بات پر متفق تھے کہ حرم الشریف/ ہیکل کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی دونوں فریق 'اسرائیلی و فلسطینی تحفظات سے قطع نظر' حرم الشریف پر فلسطینی اقتدار کے حوالہ سے کلنٹن کے مشورہ کو قبول کرنے کے بہت نزدیک آ گئے۔ طرفین نے کمپاؤنڈ کے اندر انخلا، تعمیر، عوامی ڈسپلن کے عملی اقدامات کو سراہا۔ ایک غیر رسمی رائے یہ بھی ظاہر کی گئی تھی کہ ایک مخصوص و متعینہ مدت جیسے کہ تین سال حرم الشریف/ ہیکل، پی 5 اور مراکش (یا کوئی اور اسلامی ملک) کے اقتدار کے تحت رہے گا اور اس دوران فلسطینی اس کے کسٹوڈین/ گارجین رہیں گے۔ اس مدت کے اختتام پر یا تو طرفین نیا حل ڈھونڈیں گے یا موجودہ بندوبست کی توسیع کریں گے۔ عدم معاہدہ کی صورت میں طرفین کو کلنٹن فارمولا کو اپنانا ہوگا۔ اس کو کسی بھی فریق نے نہ قبول کیا اور نہ ہی مسترد کیا۔

3- پناہ گزین

نان پیپرز کا باہمی تبادلہ ہوا اور ان کو مذاکرات کے لیے مفید بنیاد سمجھا گیا۔ طرفین متفق تھے کہ فلسطینی پناہ گزینوں کا مسئلہ اسرائیلی فلسطینی تعلقات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ ایک پائیدار اور اخلاقیات کے پابند امن کی تخلیق کے لیے جامع اور منصفانہ حل لازمی ہے۔ دونوں فریق نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ ان اصولوں اور حوالوں کو جو معاہدہ کے حصول میں آسانی پیدا کریں گے، کا استعمال کریں گے۔

طرفین نے یہ رائے بھی ظاہر کی کہ ابتدا کی خاطر فریقین اس پر راضی ہوں کہ

سلامتی کونسل قرارداد 242 کے مطابق پناہ گزینوں کے مسئلہ کا منصفانہ حل جنرل اسمبلی قرارداد 194 کے نفاذ کے لیے راستہ ہموار کرے گا۔

3.1 توضیحی بیان

فلسطینی پناہ گزینوں کے المیہ کے حوالے سے اسرائیلی فریق نے مشترک روداد کی رائے دی فلسطینیوں نے مجوزہ توضیحی بیان پر بحث کی اور بات کافی آگے بڑھی حالانکہ عام متن میں تاریخی توضیح کو فروغ دینے کی کوشش میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا۔

3.2 واپسی، وطن واپسی اور نئے مقامات میں واپسی اور بحالی

دونوں فریقوں نے پناہ گزینوں کے مسئلہ کے لیے عملی اقدامات میں بحث پر حصہ لیا۔ جنرل اسمبلی قرارداد 194 کے مطابق فلسطینی پناہ گزینوں کو اپنے گھروں کو واپسی کا حق ہونا چاہیے۔ اسرائیلی فریق نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ جنرل اسمبلی قرارداد 194 کے متن کے مطابق گھر واپس لوٹنے کی خواہش کا نفاذ مندرجہ ذیل پروگراموں میں سے کسی ایک کے فریم ورک میں ہوگا:

(الف) واپسی، وطن واپسی

i اسرائیل میں

ii اسرائیل کی ادلا بدلی والی اراضی میں

iii فلسطینی ریاست میں

(ب) بحالی اور نئے مقامات پر رہائش پذیری

i میزبان ملک میں بحالی

ii کسی تیسرے ملک میں رہائش پذیری

ان تمام معاملات میں لبنان میں رہنے والی فلسطینی آبادی کو ترجیح دی جائے گی فلسطینی فریق نے اصرار کیا کہ مندرجہ بالا ہر پناہ گزیں کے انفرادی اور ذاتی انتخاب پر منحصر ہوگا اور جنرل اسمبلی قرارداد 194 کی ترجمانی کے مطابق یہ انتخاب ان کے گھر لوٹنے کے حق پر اثرانداز نہیں ہوگا۔

اسرائیلیوں نے غیر رسمی طور سے انضمام کی ایک پندرہ سالہ سہ رخی تجویز پیش کی اس پر بحث ہوئی لیکن کوئی اتفاق نہ ہوسکا۔ پہلا رخ اسرائیل میں انضمام سے متعلق تھا۔ کسی تعداد پر اتفاق رائے نہ ہوسکا۔ لیکن ایک نان پیپر میں پہلے تین سالوں میں 25,000 افراد کا ذکر ہے (اس پروگرام کے پہلے پانچ سالوں میں 40,000 کا ذکر نان پیپر میں نہیں ہے بلکہ زبانی طور سے اٹھایا گیا تھا) دوسرا رخ ان فلسطینی پناہ گزینوں کے انضمام سے متعلق تھا جو ان اسرائیلی زمینوں پر واپس آئیں گے جو بعد میں فلسطینی اقتدار کو منتقل کردیے جائیں گے۔ اور تیسرا رخ ان پناہ گزینوں کے انضمام سے متعلق تھا جو خاندانوں کو ایک کرنے اور جوڑنے کی اسکیم میں آتے ہیں۔

فلسطینیوں نے کوئی تعداد تو نہیں پیش کی لیکن یہ کہا کہ بغیر کسی ابتدائی اسرائیلی موقف کے مذاکرات شروع نہیں ہوسکتے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ پناہ گزینوں کی واپسی کی اسرائیلی منظوری ان موجودہ پروگراموں کی نفی نہیں کرے گی جو اسرائیل میں جاری ہیں جیسے کہ خاندانوں کی یکجائی۔

3.3 معاوضہ

دونوں فریق اس بات پر رضامند ہوئے کہ معاوضہ کے ہر پہلو کے لیے ایک انٹرنیشنل کمیشن اور ایک انٹرنیشنل فنڈ کے میکینزم کو قائم کرنا چاہیے۔ طرفین اس بات پر بھی متفق ہوئے کہ پناہ گزینوں کو چھوٹی رقم کے معاوضے 'فاسٹ ٹریک' طریقۂ کار کے ذریعہ ادا کیے جائیں گے۔ جائداد کے نقصان کے معاوضہ کے دعوے جو ایک مخصوص سطح سے کم ہوں، بھی 'فاسٹ ٹریک' طریقہ کار کے تحت آئیں گے۔

مالی نقصانات، زمین اور اثاثوں سے بے دخلی سے متعلق اسرائیلی معاوضوں پر بھی گفتگو میں پیش رفت ہوئی۔ ساتھ ہی اس معاہدہ کے لیے بھی بات آگے بڑھی کہ اسرائیل ایک خاص رقم فوری ادائیگی کی صورت میں دے یا آپس کی رضامندی سے صحیح قیمت کی رقم ادا کرے جو انٹرنیشنل فنڈ میں داخل کردی جائے گی۔ اسرائیل فریق کے مطابق ان رقومات کے حساب کتاب کی بنیاد ایک میکرو اکنامک سروے ہوگا جو اثاثوں کی اصل قیمت کا اندازہ

لگائے گا۔ فلسطینی فریق کی رائے تھی کہ اس رقم کا حساب یواین سی سی پی، کسٹوڈین فار ایبسنٹی پراپرٹی، اور دیگر متعلقہ گوشواروں کے ریکارڈز اور سرمایہ کاری کے منافع کے فرق کو سامنے رکھ کر اثاثوں کی مناسب قیمت کا اندازہ لگایا جائے۔

3.4 یواین آر ڈبلیو اے

دونوں فریق اس بات پر بھی متفق تھے کہ ایک راضی شدہ پانچ سالہ نظام الاوقات کے درمیان یو این آر ڈبلیو اے کو ختم کر دینا چاہیے۔ فلسطینی فریق نے اس مدت میں ایک امکانی گنجائش کا اضافہ کیا کہ اس کا یقین ہونا چاہیے کہ یہ معاہدہ کے دوسرے پہلوؤں کے نفاذ کے تحت ہوگا یعنی پناہ گزینوں کا معاملہ اور مختلف مقامات میں فلسطینیوں کے پناہ گزینی حیثیت کا معاملہ۔

3.5 سابقہ یہودی پناہ گزین

اسرائیلی فریق نے درخواست کی کہ عرب ممالک سے سابقہ یہودی پناہ گزینوں کے معاوضہ کے مسئلہ کو بھی تسلیم کیا جائے لیکن انھوں نے ساتھ میں یہ بھی مانا کہ یہ فلسطینیوں کی ذمہ داری نہیں ہے اور نہ ہی یہ طرفین کا مسئلہ ہے۔ فلسطینی بھی متفق تھے کہ یہ فلسطینی اسرائیلی باہمی معاہدہ کا مسئلہ نہیں ہے۔

3.6 تلافی

فلسطینی فریق نے پناہ گزینوں کی جائداد کی تلافی کا مسئلہ اٹھایا لیکن اسرائیلیوں نے اس کو مسترد کر دیا۔

3.7 دعووں کا اختتام

دعووں کے خاتمہ کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا اور یہ رائے ظاہر کی گئی کہ معاہدہ کے نفاذ کا مطلب ہے جنرل اسمبلی قرارداد 194 کا مکمل نفاذ۔ لہٰذا تمام دعوے کالعدم قرار دیے جائیں گے۔

4- سلامتی۔تحفظ

4.1 ابتدائی وارننگ اسٹیشنز

اسرائیلی فریق نے فلسطینی سرزمین پر تین ابتدائی وارننگ اسٹیشنز کی درخواست کی۔ فلسطینی ابتدائی وارننگ اسٹیشنز کے استعمال کی اجازت کچھ شرائط کے ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔ لہٰذا حتمی میکنزم کی تفصیل مستقبل کے مذاکرات کے لیے چھوڑ دی گئی۔

4.2 فلسطینی ریاست کی فوجی اہلیت

اسرائیلی فریق کا اصرار تھا کہ کلنٹن تجاویز کی رو سے فلسطینی ریاست ایک غیر فوجی ریاست ہوگی۔ فلسطینی فریق اس بات کے لیے راضی تھی کہ ان کے لیے اسلحہ کے حصول کو محدود کر دیا جائے اور ان کی تعریف محدود اسلحہ والی ریاست کی حیثیت سے کی جائے۔ ابھی تک دونوں فریق اسلحہ کی حدود کے دائروں پر متفق نہیں ہوئے ہیں لیکن مختلف آپشنز کی کھوج شروع کر دی ہے۔ دونوں فریق متفق تھے کہ یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا ہے۔

4.3 ایراسپیس کنٹرول

دونوں فریقوں نے منظور کیا کہ فلسطینی ریاست کو اپنی فضائی حدود پر مکمل اقتدار حاصل ہوگا۔ اسرائیلی فریق نے بین الاقوامی ضابطوں کے مطابق فلسطینی شہری ہوابازی کے کل حقوق کی قبولیت اور احترام کو منظور کیا لیکن ساتھ ہی ایک مشترکہ ایرکنٹرول سسٹم کی تجویز بھی پیش کی جس میں اسرائیل کی بالادستی ہو۔ اس کے علاوہ اسرائیلی فریق نے فوجی آپریشن اور ٹریننگ کی غرض سے فلسطینی فضائی حدود میں داخلہ کی درخواست کی۔

فلسطینیوں کو شہری ہوابازی میں وسیع تعاون اور ربط کے میدان میں نمونوں کی کھوج سے دلچسپی تھی لیکن وہ ایرکنٹرول کی بالادستی سے اسرائیل کے حق میں دستبردار نہیں ہونا چاہتے تھے۔ جہاں تک فلسطینی فضائی حدود میں اسرائیلی فوجی آپریشن اور ٹریننگ کا سوال ہے فلسطینی فریق نے اس کو فلسطینی ریاست کے غیر جانبدارانہ اصول کے مخالف بتا کر مسترد کر دیا اور کہا کہ وہ اسرائیل کو یہ مراعات نہیں دے سکتے جب کہ عرب پڑوسیوں کو اس سے انکار کریں گے۔

4.4 مغربی کنارہ اور وادی اردن سے انخلا کا ٹائم ٹیبل

کلنٹن تجاویز پر مبنی اسرائیل فریق اس بات پر رضامند ہوا کہ 36 مہینوں کے اندر مغربی کنارہ سے اسرائیلی فوجیں واپس بلا لی جائیں گی۔ اسرائیل نے اس خدشہ کا بھی اظہار کیا کہ ایک طویل طریقہ کار اسرائیل فلسطین تناؤ میں مزید شدت پیدا کرے گا۔ فلسطینی فریق نے فوجوں کی واپسی کی مدت اٹھارہ مہینے رکھی جو بین الاقوامی افواج کی زیر نگرانی ہوگی۔ جہاں تک وادی اردن سے اسرائیلی فوجوں کی واپسی کا تعلق ہے فلسطینی اس میں مزید دس مہینوں کی مہلت دینے کے لیے تیار تھے۔ حالانکہ فلسطینی مغربی کنارہ پر بین الاقوامی فوجوں کی موجودگی کو طویل عرصہ کے لیے برداشت کرنے کو تیار تھے لیکن اسرائیلی افواج کی حالیہ موجودگی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔

4.5 ہنگامی صف بندی (یا ہنگامی مقامات)

اسرائیلی فریق نے فلسطینی سرزمین پر پانچ ہنگامی لوکیشنز کے استعمال اور دیکھ بھال کی درخواست (وادی اردن میں) کی۔ جواب میں فلسطینیوں نے زیادہ سے زیادہ دو ہنگامی لوکیشنز کی اجازت دی اور وقت معینہ پر ان کے انہدام کی شرط رکھی۔ مزید یہ کہ فلسطینیوں کی رائے تھی کہ یہ دو ہنگامی لوکیشنز بجائے اسرائیلیوں کے بین الاقوامی نگرانی میں رہیں۔ غیر رسمی طور سے اسرائیلی فریق نے رضامندی ظاہر کی کہ ان طریقوں کی تلاش کی جائے جو دونوں فریقوں کے اندیشوں کو گرفت میں لینے کے لیے بین الاقوامی موجودگی کے لیے ذریعہ بن سکتے ہیں۔

فلسطینی فریق ہنگامی حالات میں فلسطینی سرزمین پر اسرائیلی مسلح افواج کی صف بندی پر رضامند نہیں ہوا لیکن ان طریقوں پر غور کرنے کے لیے تیار تھا جن میں بین الاقوامی افواج کو اس کردار میں استعمال کیا جاسکتا تھا۔ خصوصاً علاقائی سلامتی میں تعاون کی کوششوں میں۔

4.6 سلامتی میں تعاون اور دہشت سے جنگ

دونوں ہی فریق سلامتی میں تعاون اور دہشت گردی سے جنگ کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار تھے۔

4.7 سرحدیں اور بین الاقوامی کراسنگس

فلسطینی فریق کو اعتماد تھا کہ بین الاقوامی کراسنگ پوائنٹس اور سرحدوں پر فلسطینی اقتدار اعلیٰ کو معاہدہ میں تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن دونوں فریق اس مسئلہ بشمول فلسطین کے بین الاقوامی سرحدوں پر توثیق و تصدیق کے سوال پر کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے (اسرائیلی یا بین الاقوامی موجودگی)۔

4.8 الیکٹرومیگنیٹک حدود

اسرائیلی فریق نے تسلیم کیا کہ فلسطینی ریاست کو اپنی الیکٹرومیگنیٹک حدود میں اقتدار حاصل ہوگا اور یہ مانا کہ اسرائیل اس کے فلسطینی تجارتی استعمال سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا لیکن سلامتی وتحفظ کی خاطر اس کا کنٹرول اسرائیل کے ہاتھ میں رہے گا۔

فلسطینی فریق نے الیکٹرومیگنیٹک حدود میں اقتدار کے مکمل حقوق کا مطالبہ کیا تاہم اسرائیل کی معقول ضرورتوں کے لیے بین الاقوامی ضابطوں اور قواعد کے تحت ایک تعاون کے فریم ورک میں گنجائش نکالنے کے لیے تیار ہے۔

(دونوں دستاویز کے متن 'جرنل آف پیلسٹائن اسٹڈیز' XXX، no.3 اسپرنگ 2002، صفحات 89-79 سے لیے گئے ہیں)

IV- یواین سلامتی کونسل قرارداد 1397 (2002)

(12 مارچ 2002)

سیکورٹی کونسل اپنے تمام سابقہ متعلقہ قراردادوں خصوصاً 242 (1967) اور 338 (1973) کی جانب توجہ دلاتے ہوئے ایک ایسے خطہ کے تصور کی تائید کرتی ہے جہاں اسرائیل اور فلسطین کی دو ریاستیں تسلیم شدہ اور محفوظ سرحدوں میں ایک دوسرے کے

ساتھ ساتھ رہیں؛

اور ستمبر 2000 سے اب تک ہونے والے المناک اور پرتشدد واقعات اور ان کے جاری رہنے پر گہری تشویش کا اظہار کرتی ہے خصوصاً حالیہ حملوں اور ان میں واقع ہونے والی اموات کی بڑھتی ہوئی تعداد پر؛

تمام متعلقین پر شہریوں کی حفاظت کے لیے زور دیتی ہے؛

بین الاقوامی قانون برائے انسانیت کے عالمی سطح پر منظورشدہ معمولات کے احترام کی ضرورت پر زور دیتی ہے؛

مشرق وسطی میں منصفانہ، پائیدار اور جامع امن کی خاطر یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا، رشین فیڈریشن، یوروپین یونین، اقوام متحدہ کے خصوصی رابطہ کار کی کوششوں کو خوش آمدید کہتی ہے اور حوصلہ افزائی کرتی ہے؛

سعودی ولی عہد عبداللہ کے تعاون کو خوش آمدید کہتی ہے:

1- مطالبہ کرتی ہے کہ تشدد کی کل کارروائیاں بشمول دہشت گردی، تباہی، اشتعال انگیزی اور چھیڑخانی کو فوراً روک دیا جائے؛

2- اسرائیلی اور فلسطینی فریق اور ان کے قائدین سے مطالبہ کرتی ہے کہ ٹینٹ ورک پلان اور مشل رپورٹ کے نفاذ میں، ایک سیاسی حل کے مذاکرات کی تجدید کے لیے، تعاون کریں؛

3- تشدد کے روکنے اور امن عمل کی تجدید میں فریقین کی مدد کرنے میں سکریٹری جنرل اور دیگر کی کاوشوں کو سراہتی ہے؛

4- معاملہ کو گرفت میں رکھنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

V- عرب لیگ اعلان (بیروت، 28 مارچ 2002)

امن کی عرب کاوش

عرب ریاستوں کی کانفرنس چوٹی کی سطح کے چودھویں معمولات کے سیشن میں:

جون 1996 میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی عرب چوٹی کانفرنس میں پاس

ہوئی قرارداد کہ مشرق وسطی میں ایک منصفانہ اور جامع امن عرب ممالک کا اہم آپشن ہے جو بین الاقوامی قانونیت کے مطابق حاصل کیا جائے اور اسرائیلی حکومت سے بھی ایسا ہی یکساں عہد مطلوب ہے، کو دہراتے ہوئے؛

رائل ہائی نس پرنس عبداللہ بن عبدالعزیز ولی عہد مملکت سعودی عرب کے بیان کو سننے کے بعد جس میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ سلامتی کونسل قرارداد 242 اور 338 کے نفاذ میں اور جس کی تائید 1991 کی میڈرڈ کانفرنس نے کی اور زمین کے بدلے امن کے اصول اور مشرقی یروشلم کی راجدھانی کے ساتھ آزاد فلسطینی ریاست کی اسرائیلی منظوری، اسرائیل کے ساتھ جامع امن اور عام معیار کے مطابق تعلقات کے قیام کے بدلے میں:

عرب ممالک کا یہ یقین کہ تنازعہ کے فوجی حل سے امن اور سلامتی حاصل نہیں ہوں گے، کی روشنی میں کونسل:

1- اسرائیل سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں پر نظرثانی کرے اور یہ اعلان کرے کہ منصفانہ امن اس کا بھی اہم آپشن ہے؛

2- اسرائیل سے مزید مطالبہ کرتی ہے کہ وہ توثیق کرے:

(i) 1967 سے مقبوضہ علاقوں بشمول گولان پہاڑیوں سے مکمل اسرائیلی انخلا 4 جون 1967 کی حدود پر، ساتھ ہی مغربی لبنان میں مقبوضہ لبنانی علاقہ سے واپسی

(ii) فلسطینی پناہ گزینوں کے مسئلہ کا منصفانہ حل جو جنرل اسمبلی قرارداد 194 کے مطابق ہو

(iii) غزہ پٹی اور مغربی کنارہ پر 4 جون 1967 سے مقبوضہ فلسطینی سرزمین پر ایک خودمختار اور آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی منظوری، جس کی راجدھانی مشرقی یروشلم ہوگا۔

3- نتیجہ کے طور پر، عرب ممالک مندرجہ ذیل کی توثیق کرتے ہیں:

(i) عرب اسرائیلی تنازعہ کو ختم سمجھیں گے، اسرائیل کے ساتھ ایک امن معاہدہ

میں بندھیں گے اور علاقہ کی تمام ریاستوں کو تحفظ فراہم کریں گے۔

(ii) اس جامع امن کے حوالے سے اسرائیل کے ساتھ معمول کے مطابق تعلقات قائم رکھیں گے۔

4- فلسطینیوں کی شہریت کے مطالبہ کی تمام صورتوں کو رد کرنے کا یقین دلاتی ہے جو میزبان عرب ممالک کے خصوصی حالات کے خلاف ہوں۔

5- امن کی توقعات کے تحفظ، مزید خون ریزی کو روکنے، اسرائیل اور عرب ممالک کو اچھے پڑوسیوں کی طرح ساتھ ساتھ رہنے اور آئندہ نسلوں کو تحفظ، استحکام اور خوشحالی دینے کی خاطر اسرائیلی حکومت اور اسرائیلی عوام سے ان اقدامات کو تسلیم کرنے کی درخواست کرتی ہے۔

6- بین الاقوامی کمیونٹی، تمام ممالک اور تنظیموں کو ان اقدامات کے لیے تعاون کی دعوت دیتی ہے۔

7- چوٹی کانفرنس کے صدر سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کمیٹی تشکیل دیں جو کچھ متعلقہ ممبر ریاستوں اور لیگ آف عرب اسٹیٹس کے سکریٹری جنرل پر مشتمل ہو تاکہ وہ ہر سطح پر اس اقدام کی حمایت کے لیے رابطہ قائم کریں خصوصاً اقوام متحدہ، سلامتی کونسل، یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا، رشین فیڈریشن، یوروپین یونین اور مسلم ریاستوں سے۔

VI- فلسطینی نان پیپر (12 جون 2002)

عرب امن منصوبہ پر مبنی دائمی حیثیت پر مذاکرات کے نتیجہ کا فلسطینی تصور:

اس نازک وقت میں جب بین الاقوامی کمیونٹی مشرق وسطی کے تعلق سے ایک جامع پالیسی کی تشکیل کی فکر میں ہے، فلسطینی اتھارٹی (پی اے) کا خیال ہے کہ فلسطینی اسرائیلی تنازعہ کو ختم کرنے کے لیے یہ اہم ہے کہ فلسطینی تصور کو پیش کیا جائے۔ یہ تصور اس عرب اقدام پر مبنی ہے جو سعودی عرب کے ولی عہد نے بیروت کی عرب چوٹی کانفرنس میں پیش کیا اور جس کو بہ اتفاق رائے منظور کیا گیا۔ اگرچہ موجودہ بحران کے خاتمہ کے لیے کئی

تخلیقی و تعمیری منصوبے پیش کیے جا رہے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ یہ منصوبے اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک ایک واضح سیاسی افق ان کے ساتھ نہ ہو جو کہ مذاکراتی حل پر مبنی دائمی امن کی امید کو پھر سے نہ جگائے۔

حسب ذیل بیان کی ہوئی فلسطینی توضیحات ہمارے عرب دوستوں خصوصاً سعودی عرب، مصر اور اردن کے ساتھ زیر بحث آچکے ہیں اور وہ سب امن کے تصور کی مرکزیت سے لے کر کسی بھی کوشش کی کامیابی تک ہماری رائے میں شریک ہیں۔

مارچ 2002 کا 'عرب امن اقدام' ہماری شرائط و ضوابط کی بنیاد ہے۔ یہ اقدام اور اس کے ساتھ صدر بش کا نظریہ، سکریٹری آف اسٹیٹ کولن پاول کی نومبر 2001 کی تقریر اور اقوام متحدہ کی قراراداد 242، 338 اور 1397، اسرائیل اور فلسطین کے درمیان دائمی حیثیت کے معاہدہ پر فلسطینی تصور کی بنیادیں ہیں۔ ان پر مبنی ہمارے تصور کے خاص عناصر حسب ذیل ہیں:

☆ فلسطینی ریاست اور اسرائیلی ریاست کے درمیان 4 جون 1967 کی جنگ بندی لائن سرحد ہوگی اگرچہ فریقین چھوٹے، باہمی اور مساوی سرحدی رد و بدل پر راضی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ زمینی اتصال کو متاثر نہ کرے۔ فلسطینی اور اسرائیلی فریق 4 جون 1967 کی سرحدوں سے آگے کوئی زمینی دعویٰ نہیں کریں گے۔ یہ سرحدیں دونوں ریاستوں کے درمیان دائمی اور مستقل ہوں گی۔

☆ فلسطینی ریاست کے غزہ پٹی اور مغربی کنارے کے درمیان ایک دائمی زمینی کاریڈور ہوگا۔

☆ مشرقی یروشلم فلسطینی ریاست اور مغربی یروشلم اسرائیلی ریاست کی راجدھانی ہوگا۔

☆ یروشلم جو تین وجدانی مذاہب کا محترم ہے، تمام لوگوں کے لیے کھلا ہوگا۔

☆ فلسطینی فریق یروشلم میں یہودی کوارٹر اور مغربی دیوار کا دیوار گریہ والے حصے کا اقتدار اسرائیل کو منتقل کر دے گا جب کہ بقیہ پرانے شہر پر اپنی اتھارٹی برقرار رکھے گا۔

☆ فلسطین اور اسرائیل دونوں حفاظتی تعاون کے انتظامات قائم کریں گے جو دونوں ریاستوں کے اقتدار اور سالمیت کو محفوظ رکھیں گے۔ ان انتظامات میں بین الاقوامی افواج مرکزی کردار ادا کریں گی۔ مزید یہ کہ دونوں فریق ایک علاقائی سلامتی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔

☆ فلسطین اور اسرائیل دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے خلاف کسی فوجی اتحاد میں شریک نہیں ہوگا اور نہ ہی اپنی سرزمین کو ایک دوسرے یا اپنے پڑوسیوں کے خلاف فوجی اڈہ بننے کی اجازت دے گا۔ دونوں میں سے کسی ریاست میں باہری فوجیں تعینات نہیں ہوں گی جب تک کہ دائمی حیثیت کے معاہدہ میں حتمی طور پر واضح نہ ہو یا پھر طرفین اس پر متفق ہوں۔ فلسطین اور اسرائیل کی خودمختاری اور اقتدار اعلیٰ کی ضمانت بین الاقوامی کمیونٹی کے اراکین کے رسمی معاہدوں میں دی جائے گی۔

☆ مارچ 2002 کے عرب امن منصوبے کے مطابق، فلسطینی پناہ گزینوں کے مسئلہ کا منصفانہ حل ہونا چاہیے جو جنرل اسمبلی قرارداد 194 پر مبنی ہو۔

☆ پانی کا مسئلہ بین الاقوامی سمجھوتوں اور معمولات کی روشنی میں منصفانہ اور مساویانہ طریقہ پر حل کیا جائے گا۔

☆ فلسطین اور اسرائیل آزاد مارکیٹ معیشت کے ساتھ جمہوری ریاستیں ہوں گی۔

☆ جامع دائمی حیثیت کا معاہدہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان ہر تنازعہ کا خاتمہ سمجھا جائے گا اور اس کے مکمل نفاذ کے ساتھ ان کے درمیان سارے دعوے بھی کالعدم قرار دیے جائیں گے۔

قدرتی طور سے اس تصور کی کامیابی کے لیے ایک متوازی عمل کی ضرورت ہے جو زمین پر ایک ٹھوس اور مثبت فروغ کو جنم دے۔ اس کے لیے تخفیف، انخلا، قانون کی حکمرانی کے مطابق اسرائیلی اور فلسطینی عوام کی حفاظت کی یقین دہانی اور اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات کے آہستہ د تعارف کی ضرورت ہے تا کہ ایک دائمی حیثیت پر معاہدہ کے لیے زمین ہموار کی جائے۔

اس کی تکمیل کے لیے سفارتی وابستگیوں کو ضامن ہونا چاہیے تاکہ یہ عمل رک نہ جائے۔ آنے والی فلسطینی ریاست کی تیاری کے لیے کچھ اندرونی انفرا اسٹرکچر کی ضرورت ہے جس کو ہم سیاسی، مالی اور حفاظتی میدانوں میں پہلے ہی شروع کر چکے ہیں۔ تحفظ و سلامتی کے میدان میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج ٹینٹ کے بچاؤ ہماری کوششوں کی بنیاد ہوں گے۔

VII- صدر بش کی مشرق وسطیٰ پر تقریر (24 جون 2002)

ایک طویل عرصے مشرق وسطیٰ کے باشندوں نے موت اور خوف کے سائے میں زندگی گزاری۔ کچھ افراد کی نفرت نے اکثر کی امیدوں کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ انتہا پسندی اور دہشت گردی کی قوتیں امن اور ترقی کو کچلنے کے لیے منصوبوں کا قتل کر رہی ہیں۔ اور یہ پورے خطہ کے لیے ایک سیاہ دھبہ ہے۔ عالم انسانیت کی بقا کے لیے مشرق وسطیٰ میں حالات کو بدلنا چاہیے۔ اسرائیلی شہریوں کے لیے دہشت میں رہنا ناقابل برداشت ہے۔ فلسطینیوں کے لیے گندگی اور قبضہ میں رہنا ناقابل برداشت ہے اور موجودہ صورتحال زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کوئی پیش کش نہیں کرتی۔ اسرائیلی شہری دہشت گردوں کے شکار ہوتے رہیں گے اور اسرائیل اسی طرح دفاعی کارروائیاں کرتا رہے گا۔

اس صورت میں فلسطینی عوام کی کسمپرسی اور بڑھتی جائے گی۔ میرا تصور یہ ہے کہ دو ریاستیں کاندھے سے کاندھا ملا کر امن اور سلامتی کے ساتھ رہیں۔ اور یہ امن اس وقت تک حاصل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ تمام فریق دہشت گردی سے جنگ نہ کریں۔ لیکن پھر بھی اگر اس نازک لمحے میں تمام فریق ماضی کو بھلا دیں اور ایک نئے راستہ پر گامزن ہوں تو ہم امید کی کرن سے تاریکی پر فتح پاسکتے ہیں۔ امن کے لیے ایک نئی اور مختلف فلسطینی قیادت کی ضرورت ہے تاکہ ایک فلسطینی ریاست وجود میں آسکے۔

میں فلسطینی عوام سے چاہتا ہوں کہ وہ نئے قائد منتخب کریں۔ ایسے قائد جن کا دہشت گردی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک عملی جمہوریت کی تعمیر کریں جو آزادی اور تحمل پر مبنی ہو۔ اگر فلسطینی عوام تمامتر قوت کے ساتھ ان اہداف کے لیے کوشش

کرتے ہیں تو امریکہ اور پوری دنیا مستعدی سے ان کی کوششوں کو تعاون دے گی۔ اگر فلسطینی عوام یہ اہداف حاصل کر لیتے ہیں تو وہ اسرائیل، مصر، اردن کے ساتھ سلامتی اور آزادی کے دوسرے انتظامات پر معاہدہ کر سکتے ہیں۔

اور جب فلسطینی عوام نئے قائد، نئے ادارے اور پڑوسیوں کے ساتھ تحفظ کے نئے انتظامات حاصل کر لیں گے تو یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا ایک فلسطینی ریاست کی تخلیق کی حمایت کرے گا جس کی سرحدیں اور اقتدار کے کچھ پہلو عارضی ہوں گے تا آنکہ ان کو مشرق وسطی میں آخری تصفیہ کے حصہ کے طور پر حل نہیں کر لیا جاتا۔

آگے کے کام میں ہم سب کی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ فلسطینی باصلاحیت اور باہنر لوگ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی قوم کو حیات تو بخش سکتے ہیں۔ فلسطینی ریاست کبھی بھی دہشت گردی سے وجود میں نہیں آ سکتی۔ یہ اصلاح کے ذریعہ تعمیر ہوگی اور اصلاح ایک نمائشی تبدیلی یا صورتحال برقرار رکھنے کی پردہ پوشی نہ ہو۔ اصلاح کو نئے سیاسی اور اقتصادی ادارے مطلوب ہوں گے جو جمہوریت، مارکیٹ اکنامی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ پر مبنی ہوں گے۔

آج منتخب فلسطینی مقننہ کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے اور طاقت چند غیر ذمہ دار افراد کے ہاتھ میں ہے۔ ایک فلسطینی ریاست اپنے شہریوں کی خدمت صرف ایک نئے دستور کے ذریعہ کر سکتی ہے جو حکومت کی طاقت کو علاحدہ علاحدہ کرے۔ فلسطینی پارلیمنٹ کو ایک مجلس قانون ساز کے کل اختیارات حاصل ہونا چاہئیں۔ مقامی افسران اور سرکاری وزرا کو اپنی اتھارٹی اور آزادی حاصل ہونی چاہیے تاکہ وہ موثر طریقہ سے حکومت کر سکیں۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس، یوروپین یونین اور عرب ریاستوں سے مل کر فلسطینی قائدین کے ساتھ ایک نئے دستور فریم ورک اور فلسطینی عوام کے لیے ایک عملی جمہوریت پر کام کرے گی اور یونائیٹڈ اسٹیٹس بین الاقوامی کمیونٹی کے دیگر اراکین کے ساتھ سال کے آخر میں ہونے والے کثیر پارٹی مقامی انتخابات کو منصفانہ طریقہ سے نگرانی اور منظم کرنے میں فلسطینیوں کی مدد کرے گی۔ قومی انتخابات بعد میں ہوں گے۔

آج فلسطینی عوام معاشی جمود میں سانس لے رہے ہیں جس کو سرکار کے کرپشن نے مزید برا بنا دیا ہے۔ ایک فلسطینی ریاست کو ایک متحرک معیشت مطلوب ہوگی جہاں ایماندار حکومت ایماندارانہ تجارت کی حوصلہ افزائی کرے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس، بین الاقوامی مخیر کمیونٹی اور عالمی بینک فلسطینیوں کے ساتھ اقتصادی اصلاحات اور فروغ میں ایک عظیم پروجیکٹ پر کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس، یوروپین یونین، عالمی بینک بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی خواہش ہے کہ وہ فلسطینی مالیات کی نگرانی کریں اور آزادانہ احتساب اور شفافیت کی حوصلہ افزائی کریں۔

فلسطینیوں کو تکلیف سے راحت دینے کے لیے یونائیٹڈ اسٹیٹس، ترقی یافتہ دنیا میں اپنے حلیفوں کے ساتھ، اپنی امداد میں اضافہ کردے گی۔ آج فلسطینی عوام کے پاس موثر عدالتیں نہیں ہیں اور اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ فلسطینی ریاست کو قابل اعتماد انصاف کا ایسا نظام مطلوب ہوگا جہاں معصوموں کے شکاریوں کو سزا مل سکے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس اور بین الاقوامی کمیونٹی کے دوسرے اراکین فلسطینی قائدین کے ساتھ مالیات کے قیام اور ایک حقیقی آزاد عدلیہ کی نگرانی کے لیے تیار ہیں۔

آج فلسطینی حکام بجائے مخالفت کے دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کررہے ہیں۔ یہ قابل قبول نہیں ہے۔ اور یونائیٹڈ اسٹیٹس اس وقت تک فلسطینی ریاست کے قیام کی حمایت نہ کرے گا جب تک اس کے قائدین دہشت گردی کے خلاف ایک پائیدار جنگ نہ لڑیں اور ان کے ٹھکانوں اور اڈوں کو منہدم نہ کردیں۔ اس کے لیے بیرونی نگرانی کی ضرورت ہوگی تاکہ فلسطینی حفاظتی سروسز کو از سرنو تعمیر کیا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔ حفاظتی نظام میں حاکمیت اور جواب دہی کی ذمہ داری بالکل واضح ہوں اور صاحبان اختیار کی ایک سالم کڑی بھی ہو۔

امریکہ ان اصلاحات کے لیے اہم علاقائی ریاستوں کے ساتھ کوشش کررہا ہے۔ اگرچہ دنیا مدد کے لیے تیار ہے لیکن آخرکار ریاست کا منصب دلانے کے یہ سارے اقدامات فلسطینی عوام اور ان کے قائدین پر منحصر ہیں۔ اگر وہ پوری قوت کے ساتھ اصلاحات کا راستہ

اختیار کرتے ہیں تو اس کے اچھے نتیجے جلد مل سکتے ہیں۔ اگر فلسطینی جمہوریت کو اپنا لیں، کرپشن سے مقابلہ کریں اور مضبوطی سے دہشت گردی کو مسترد کردیں تو ایک عارضی فلسطینی ریاست کے قیام میں وہ امریکہ کی مدد پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔

اگر یکسوئی اور انہماک سے کام کیا جائے تو یہ ریاست تیزی سے ترقی کرسکتی ہے اور اسرائیل مصر، اردن سے عملی مسائل جیسے کہ تحفظ پر سمجھوتہ کرسکتی ہے۔ حتمی سرحدیں، راجدھانی اور اس ریاست کے اقتدار اعلیٰ کے دوسرے پہلوؤں پر فریقین میں آخری تصفیہ کے حصے کی صورت میں، گفتگو ہوسکتی ہے۔ اس عمل میں عرب ریاستوں نے اپنی مدد کی پیش کش کی ہے اور ان کی مدد کی ضرورت ہے۔

میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں یا تو اقوام ہمارے ساتھ ہیں ورنہ ہمارے مخالف ہیں۔ امن کے طرفداروں میں اپنی گنتی کرانے کے لیے قوموں کو کام کرنا ہوگا۔ ہر لیڈر جو حقیقتاً امن چاہتا ہے سرکاری میڈیا میں تشدد پر اکسانا بند کردے اور عوام کے سامنے قتل و غارت گری کے لیے بامبنگ کی مذمت کرے۔ ہر وہ ملک جو حقیقتاً امن چاہتا ہے دہشت گرد گروپ بشمول حماس، اسلامی جہاد اور حزب اللہ جو اسرائیل کی بربادی کے درپے ہیں کو پیسہ، ساز و سامان اور افرادی قوت کی ترسیل کو بند کردے گا۔ ہر وہ ملک جو حقیقتاً امن چاہتا ہے ان گروپس کو ایرانی آلات حرب کے جہاز بھیجنے سے روکے اور عراق جیسی حکومتیں جو دہشت گردی کو شہ دیتی ہیں کی مخالفت کرے گا اور شام کو بھی اپنی سرزمین میں دہشت گردوں کے کیمپ بند اور ان کی تنظیموں کو، ان کے خلاف جنگ میں صحیح راستہ اختیار کرنے کے لیے، ملک سے باہر نکالنا ہوگا۔

وہ قائدین جو امن عمل میں شریک ہونا چاہتے ہیں ان کو اپنے کاموں سے امن کے لیے غیر منقسم تعاون دکھانا ہوگا۔ اور جیسے جیسے ہم ایک پُرامن حل کی جانب بڑھ رہے ہیں عرب ریاستوں سے امید ہے کہ وہ اسرائیل کے ساتھ واضح سفارتی اور معاشی بندھنوں کی ابتدا کریں جو بالآخر اسرائیلی اور عرب دنیا کے درمیان معمولات کے مطابق تعلقات کی جانب لے جائیں گے۔

ایک جمہوری فلسطین کی کامیابی میں اسرائیل کے لیے بھی بہت فائدہ ہے۔ مستقل قبضہ اسرائیل کی شناخت اور جمہوریت دونوں کے لیے خطرہ ہے۔ جس تحفظ کے لیے اسرائیل تڑپ رہا ہے اس کے حصول کے لیے ایک مستحکم، پرامن فلسطینی ریاست لازمی ہے۔ لہذا میں اسرائیل کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ایک قابل اعتماد اور بھروسہ مند فلسطینی ریاست کے ظہور میں ٹھوس اقدام لے۔ جوں جوں ہم سلامتی کی طرف آگے قدم بڑھا رہے ہیں اسرائیلی افواج کو 28 ستمبر 2000 کی پوزیشن پر واپس چلا جانا چاہیے اور مشل کمیٹی کی سفارشات کے پیش نظر مقبوضہ علاقہ میں اسرائیلی بستیوں کی کارروائی کو روک دینا چاہیے۔

فلسطینی معیشت کو ابھرنے کا موقعہ ملنا چاہیے۔ اگر تشدد میں کمی ہوگی تو نقل وحرکت جاری ہوگی جس سے بے گناہ فلسطینیوں کو کام پر جانے اور معمول کے مطابق زندگی گزارنے کا موقعہ ملے گا۔ فلسطینی قانون ساز اور افسران، رضاکار اور بین الاقوامی کام گاروں کو ایک بہتر مستقبل کی تیاری میں آنے جانے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اسرائیل کو چاہیے کہ وہ فلسطین کے منجمد کھاتے ایماندار اور ذمہ دار ہاتھوں میں منتقل کردے۔

میں نے سکریٹری پاول کو ہدایت دی ہے کہ وہ مشرق وسطی اور بین الاقوامی لیڈروں کے ساتھ مل کر تندہی کے ساتھ فلسطینی ریاست کے تصور کو حقیقت میں تبدیل کریں۔ اور وہ اپنی توجہ فلسطینی اصلاحات اور اداروں کی تعمیر پر مرکوز کریں۔

اگر حقیقی امن چاہیے تو بالآخر اسرائیل اور فلسطین کو ان تمام اہم مسائل کو حل کرنا ہوگا جو انھیں الگ کرتے ہیں اور اپنے درمیان تمام دعووں اور تنازعوں کو ختم کرنا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اسرائیلی قبضہ جو 1967 سے شروع ہوا فریقین کے درمیان گفت وشنید کے ذریعہ ہوئے تصفیہ سے ختم ہوجائے جو اقوام متحدہ کی قرارداد 242 اور 338 پر مبنی ہو تاکہ اسرائیل محفوظ اور ازسرنو منظم سرحدوں پر واپس چلا جائے۔

ہم کو یروشلم، فلسطینی پناہ گزینوں کی درگت اور مستقبل اور اسرائیل اور لبنان کے درمیان امن کے مسئلہ کو حل کرنا ہے۔ اسرائیل اور ایسے شام، جو امن چاہتا اور دہشت گردی سے جنگ کرتا ہو، کے درمیان امن قائم کرنا ہے۔

وہ تمام افراد جو مشرق وسطیٰ کی تاریخ سے واقف ہیں بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس عمل میں ناکامیاں بھی سامنے آئیں گی اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ تربیت یافتہ اور ارادہ کے پکے قاتل اس کو روکنا چاہتے ہیں۔ اس کے باوجود اسرائیل کے ساتھ مصری اور اردنی سمجھوتے ہمیں باور کراتے ہیں کہ قوت ارادی کی حامل اور ذمہ دار قیادت کے تحت تیزی سے ترقی ہوسکتی ہے۔

جوں جوں نئے فلسطینی ادارے قیادت، سلامتی اور اصلاحات پر کارکردگی دکھاتے ہوئے ابھر رہے ہیں مجھے اسرائیل سے امید ہے کہ وہ دائمی حیثیت پر معاہدہ کی جانب پیش قدمی کرے گا۔ اگر سب لوگ لگن سے کام کریں تو یہ معاہدہ اب سے تین سال کے عرصہ ہوسکتا ہے۔ میں اور میرا ملک اس ہدف کی جانب مستعدی سے رہنمائی کریں گے۔

میں اسرائیلی عوام کے گہرے غم وغصہ کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ ایک طویل عرصہ سے خوف اور جنازوں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ آپ نے بازار جانا اور پبلک ٹرانسپورٹ ترک کردیا ہے۔ آپ کو مجبور کیا گیا ہے کہ کنڈرگارڈن کی کلاسوں میں مسلح محافظ رکھیں۔ فلسطینی اتھارٹی نے آپ کی پیش کش کو مسترد کردیا اور دہشت گردوں کا ساتھ دیا۔ آپ کو معمول کے مطابق، سلامتی اور تحفظ کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق ہے۔ اور میرا پکا یقین ہے کہ تحفظ وسلامتی حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایک اصلاح شدہ اور ذمہ دار فلسطینی شریک کار کی ضرورت ہے۔

میں فلسطینی عوام کے گہرے غصہ اور مایوسی کو بھی سمجھ سکتا ہوں۔ سالوں سے آپ لوگ مشرق وسطیٰ کے تنازعہ میں پیادوں کی طرح استعمال ہورہے ہیں۔ آپ کے مفادات کو ایک جامع امن معاہدہ نے یرغمال بنا رکھا ہے جو کہیں آتے ہوئے نہیں دکھ رہا ہے اور آپ کی زندگیاں سال بہ سال بد سے بدتر ہوتی جارہی ہیں۔ آپ ایک آزاد معاشرہ اور بڑھتی ہوئی معیشت کے مستحق ہیں۔ آپ اپنے بچوں کے لیے امیدوں اور آرزوؤں والی زندگی کے مستحق ہیں۔ قبضہ کا خاتمہ اور ایک پرامن جمہوری فلسطین ریاست دور دکھائی دے سکتے ہیں لیکن امریکہ اور دنیا بھر میں اس کے حلیف مدد کے لیے تیار ہیں، آپ کی مدد تاکہ ممکن کو جلد سے جلد ممکن بنایا جاسکے۔

اگر آزادی کے شگوفے مغربی کنارہ اور غزہ پٹی کی سنگلاخ زمینوں پر کھل سکتے ہیں تو یہ دنیا کے لاکھوں مرد اور عورتوں کے لیے ولولہ اور جوش کا باعث ہوسکتا ہے جو اسی طرح سے غربت اور جبر وستم کے مارے ہوئے ہیں اور جو اسی طرح سے جمہوری حکومت کے منافع کے حقدار ہیں۔

مجھے مسلم ممالک کے عوام سے امید ہے۔ اخلاقیات، تعلیم اور تحمل کے میدان میں آپ کی ذمہ داریوں نے تاریخی کارنامے انجام دیے اور اسلامی دنیا میں وہ اقدار آج بھی زندہ ہیں۔ آپ ایک قیمتی ثقافت کے پاسدار ہیں اور ہر ثقافت کے افراد کی امنگوں میں شریک ہیں۔ آزادی، وقار اور خوشحالی صرف امریکی یا مغربی امیدیں نہیں ہیں۔ یہ کائناتی انسانی آرزوئیں ہیں اور مشرق وسطی کے تشدد اور افراتفری کے باوجود امریکہ کو یقین ہے کہ ان آرزوؤں اور امنگوں میں یہ طاقت ہے کہ وہ قوموں اور زندگیوں کو بدل دیں۔

یہ لمحہ مشرق وسطی کے تمام فریقوں کے لیے ایک موقعہ بھی ہے اور امتحان بھی۔ مستقبل کے امن کی بنیاد رکھنے کا موقعہ اور یہ امتحان کو پتہ چلے کہ امن کے بارے میں کون سنجیدہ ہے اور کون نہیں۔ یہاں انتخاب سیدھا اور روشن ہے۔ انجیل مقدس کہتی ہے: ''میں نے تمھارے سامنے زندگی اور موت رکھی ہیں، لہٰذا زندگی کو اختیار کرو۔'' وقت آگیا ہے اس تنازعہ میں ملوث ہر ایک امن، امید اور زندگی کو منتخب کرے۔

بہت بہت شکریہ

VIII- اسرائیلی فلسطینی تنازعہ میں ایک دائمی دو ریاستی حل کے لیے کارکردگی پر مبنی روڈ میپ (30 اپریل 2003)

کارکردگی اور مقصد کی حصولیابی پر مبنی روڈ میپ حسب ذیل ہے۔ اس روڈ میپ میں کوائریٹ کے زیر سرپرستی دونوں فریقوں کے ذریعہ سیاسی، حفاظتی، اقتصادی، انسانی اور اداروں کی تعمیر کے میدان میں ترقی کی طرف باہمی اقدامات کے لیے واضح ادوار، نظام الاوقات، حتمی تاریخوں اور معیار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسرائیلی فلسطینی تنازعہ کا ایک جامع اور آخری تصفیہ، اس کی منزل ہے۔ جیسا کہ صدر بش نے اپنی 24 جون کی تقریر میں

کہا ہے اور جس کو یوروپین یونین، روس اور اقوام متحدہ نے 16 جولائی اور 17 ستمبر کے کوارٹیٹ وزرا کے بیانوں میں خوش آمدید کہا گیا ہے یہ تصفیہ 2005 تک طے ہوجانا چاہیے۔

اسرائیلی فلسطینی تنازعہ کا دو ریاستی حل اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب تشدد اور دہشت گردی ختم ہو جائے اور فلسطینی عوام کو ایسی قیادت حاصل ہو جو دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن اقدامات لے اور آزادی وتحمل پر مبنی ایک عملی جمہوریت کی تعمیر پر رضامند ہو اور اس کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔ اور ایک جمہوری فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے ضروری اقدامات لینے کے لیے اسرائیل کی بلا تامل کارگزاری، اور دونوں فریق کے ذریعہ مذاکرات سے تراشے ہوئے ایک بیان کا واضح اور غیر مبہم اعلان چاہیے۔ دور ا سے شروعات کرتے ہوئے اور اگر ضرورت پڑے تو دونوں فریقوں کے درمیان براہِ راست گفتگو بھی، کوارٹیٹ منصوبہ کے نفاذ میں مدد اور سہولتیں فراہم کرے گا۔ منصوبہ میں نفاذ کے لیے ایک حقیقت پسندانہ نظام الاوقات ہے۔ بہرحال کیونکہ یہ کارکردگی پر مبنی منصوبہ ہے لہٰذا ترقی مطلوب ہے اور اس کا انحصار دونوں فریقوں کی نیک نیتی سے کی گئی کوششوں اور درج ذیل ذمہ داریوں کی بجاآوری پر ہے۔ اگر فریقین اپنی اپنی ذمہ داریاں تیز رفتاری سے نبھاتے ہیں تو جیسا کہ منصوبہ میں اندازہ لگایا گیا تو ترقی ہر دور میں تیزی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ ذمہ داریوں سے لاپرواہی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے گی۔

فریقین کے درمیان مذاکرات کے ذریعے کیے ہوئے تصفیہ کا نتیجہ ایک آزاد، جمہوری اور پائیدار فلسطینی ریاست کا ظہور ہوگا جو امن وسلامتی کے ساتھ اسرائیل اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہے گی۔ یہ تصفیہ اسرائیلی فلسطینی تنازعہ اور 1967 سے شروع ہوئے قبضہ کا خاتمہ ہوگا۔ اس تصفیہ کی بنیادیں میڈرڈ کانفرنس، امن کے بدلے زمین کے اصول، سلامتی کونسل کی قراداد 242، 338 اور 1397، فریقین کے درمیان سابقہ معاہدے اور سعودی ولی عہد عبداللہ کے پیش کیے ہوئے اقدام میں ہیں۔ ولی عہد عبداللہ کی پیش کش کی بیروت عرب لیگ کی چوٹی کانفرنس نے تائید کی ہے۔ اس میں اسرائیل کو جامع تصفیہ کے حوالے سے امن وسلامتی کے ساتھ رہنے والے ایک پڑوسی کی حیثیت سے قبول کیا گیا ہے۔

یہ اقدام ان بین الاقوامی کوششوں کا اہم جز ہے جو تمام راستوں پر جامع امن کے خواہاں ہیں بشمول اسرائیلی شامی اور اسرائیلی لبنانی محاذ کے۔

منصوبہ کے نفاذ پر دونوں فریق کی کارکردگی کو پرکھنے کے لیے کوارٹیٹ کی اعلیٰ سطح کی میٹنگ پابندی سے ہوگی۔

فریقین سے امید کی جاتی ہے کہ وہ ہر دور میں اپنے اپنے فرائض متوازی طور سے انجام دیں گے سوائے اس جگہ کے جہاں کوئی اور ہدایت موجود ہو۔

پہلا دور:

دہشت گردی اور تشدد کا خاتمہ کرنا، فلسطینی زندگی کو معمول کے مطابق لانا اور فلسطینی اداروں کی تعمیر کرنا (موجودہ وقت سے مئی 2003 تک)

پہلے دور میں مندرجہ ذیل خاکہ کشی کرتے ہوئے اقدامات کے مطابق فلسطینی غیر مشروط طور پر فوراً تشدد بند کردیں گے: اس عمل میں اسرائیل کی مدد بھی شامل ہوگی۔ نو ساختہ اور متاثر کن فلسطینی حفاظتی سروسز کے ذریعہ تشدد، دہشت گردی اور اشتعال انگیزی کو ختم کرنے کے لیے ٹینٹ ورک پلان کے مطابق اسرائیل اور فلسطین حفاظتی تعاون کو دوبارہ شروع کریں گے۔ ریاست کا درجہ پانے کے لیے فلسطینیوں کو جامع سیاسی اصلاحات کرنا ہوں گی اور اس میں فلسطینی دستور کی مسودہ سازی اور آزاد اور منصفانہ الیکشن کی تیاری شامل ہیں۔ اسرائیل کو وہ تمام اقدامات لینے ہوں گے جو معمول کے مطابق والی ایک فلسطینی زندگی کے لیے لازمی ہیں۔ اسرائیل اپنی فوجوں کو 28 ستمبر 2000 میں قابض ہوئے فلسطینی علاقہ سے واپس بلائے اور دونوں فریق اُس وقت کی پوزیشنوں کو حفاظتی کارکردگی اور تعاون میں ترقی کے لیے برقرار رکھیں۔ مشل رپورٹ کے مطابق اسرائیل بھی بستیوں کو آگے بڑھانے کی ہر کارروائی کو منجمد کردے۔

پہلے دور کے شروع ہی میں:

☆ فلسطینی قیادت غیر مبہم بیان میں امن اور سلامتی کے ساتھ اسرائیل کے وجود کے

حق کو تسلیم کرے اور تمام مسلح کارروائیوں کو روکنے اور اسرائیل کے خلاف کہیں بھی تشدد کے واقعات پر پابندی لگانے کے لیے فوری طور پر غیر مشروط جنگ بندی کا اعلان کرے۔ فلسطینیوں کے تمام سرکاری ادارے اسرائیل کے خلاف اشتعال انگیزی بند کردیں۔

☆ اسرائیلی قیادت غیر مبہم بیان میں اقرار کرے کہ وہ ''ریاستی تصور میں ایک آزاد، قابل نمو اور خودمختار فلسطینی ریاست جو اسرائیل کے ساتھ، صدر بش کے الفاظ میں، امن و سلامتی کے ساتھ رہتی ہے، کو تسلیم کرتی ہے اور فلسطینیوں کے خلاف اشتعال انگیزی کو فوراً بند کردے۔

تحفظ

☆ فلسطینی غیر مبہم الفاظ میں تشدد اور دہشت گردی کے خاتمہ کا اعلان کریں اور ہر اس فرد یا گروپ کو روکیں، گرفتار کریں، اور دباؤ ڈالیں جو کہیں بھی اسرائیلیوں پر پرتشدد حملے کی منصوبہ بندی کررہا ہو۔

☆ دوبارہ تشکیل کیا ہوا اور تربیت یافتہ فلسطینی حفاظتی دستہ دہشت گردی میں ملوث ہر کسی کے خلاف پائیدار، نشان زدہ اور موثر آپریشن انجام دے اور دہشت گردی کی سہولتوں اور انفرااسٹرکچر کو منہدم کرے اس میں غیر قانونی ہتھیاروں کی ضبطی اور ایک ایسی سیکورٹی اتھارٹی کو مضبوط کرنا ہے جو دہشت گردی اور بدعنوانی کے عناصر سے بالکل لاتعلق ہو، بھی شامل ہے۔

☆ اسرائیلی حکومت ایسا کوئی کام نہیں کرے گی جس سے اعتماد مجروح ہو جیسے کہ جلاوطنی، شہریوں پر حملے تقریری کارروائی میں یا اسرائیلی تعمیرات میں آسانی کے لیے فلسطینی گھروں اور املاک کی ضبطی اور انہدام، فلسطینی اداروں کے انفرااسٹرکچر کی تباہی، اور دیگر اقدامات جوٹینٹ ورک پلان میں مذکور ہیں۔

☆ زمینی وسائل اور موجودہ میکنزم کو عمل میں لاتے ہوئے کوارٹیٹ نمائندے غیر رسمی نگرانی شروع کرسکتے ہیں اور نگرانی کے رسمی میکنزم اور نفاذ کے لیے فریقوں سے

مشورہ کرسکتے ہیں۔

☆ جیسا کہ پہلے طے ہو چکا ہے باہر کے نگرانی بورڈ (یو ایس۔ مصر۔ اردن) کے ساتھ مل کر یو ایس تعمیر نو، ٹریننگ اور حفاظتی تعاون کے منصوبہ کا نفاذ۔ پائیدار اور جامع جنگ بندی کی حصول یابی کے لیے کوارٹیٹ کی حمایت۔

- تمام فلسطینی حفاظتی تنظیموں کا تین سروسز میں انضمام کر دیا جائے گا جو ایک بااختیار وزیر داخلہ کو جوابدہ ہوں گی۔

- ٹینٹ ورک پلان بشمول یو ایس افسران کی شرکت کے ساتھ اعلیٰ سطح کی باضابطہ میٹنگوں کے، نفاذ کے لیے نوساختہ اور نو تربیت یافتہ فلسطینی حفاظتی دستے اپنے آئی ڈی ایف ہم منصبوں کے ساتھ تیزی سے کام شروع کریں۔

☆ عرب ریاستیں ایسے تمام گروپس کی ظاہری اور پوشیدہ امداد بند کر دیں گی جو تشدد اور دہشت گردی کے عمل میں مصروف ہیں۔

☆ فلسطینیوں کو بجٹ کے مطابق ملنے والی تمام رقوم فلسطینی وزارت خزانہ کے ''سنگل ٹریژری اکاؤنٹ'' کے ذریعہ آئیں گی۔

☆ جوں جوں جامع حفاظتی کارکردگی کی پیش رفت ہوتی ہے اسرائیلی دفاعی افواج بھی 28 ستمبر 2000 کے قبضہ میں آئے ہوئے علاقوں سے واپس ہوتی چلی جائیں گی اور وہی صورتحال برقرار رکھیں گی جو 28 ستمبر 2000 سے قبل تھیں۔ اسرائیلی افواج سے خالی ہوئی زمین پر فلسطینی حفاظتی دستوں کو تعینات کر دیا جائے گا۔

فلسطینی اداروں کی تعمیر

☆ فلسطینی ریاست کے درجہ کے لیے دستور کی مسودہ سازی کے قابل یقین عمل کی فوری شروعات۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے دستوری کمیٹی مستحکم پارلیمنٹری جمہوریت اور بااختیار وزیراعظم کی کیفیت پر مبنی دستور کا مسودہ بحث و مباحثہ اور تبصرہ کے لیے عوام کے سامنے لائے۔ دستور ساز کمیٹی اس دستاویز کا مسودہ مجاز فلسطینی اداروں کی موزوں منظوری کے لیے الیکشن کے بعد پیش کرے گی۔

☆ فیصلہ کرنے اور فیصلہ کن انتظامی اختیارات کے ساتھ عارضی وزیراعظم یا کیبنٹ کا تقرر۔

☆ پی ایل سی اور کیبنٹ سیشن، بین الاقوامی نگرانی میں سیکورٹی کی دوبارہ تربیت، انتخابی اور دیگر اصلاحی کارروائیوں اور اصلاحی کاموں سے متعلق امدادی اقدامات کے لیے فلسطینی افسران کے سفر اور نقل وحمل کو اسرائیلی دفاعی افواج مکمل سہولتیں فراہم کرے گی۔

☆ فلسطینی وزرا کا مسلسل تقرر جن کے پاس بنیادی اصلاحات کے نفاذ کے اختیارات ہوں۔ اصل تقسیم اختیارات کے حصول کے لیے مزید اقدامات کی تکمیل بشمول اس مقصد کے لیے کوئی اور لازمی فلسطینی قانونی اصلاح۔

☆ آزاد فلسطینی الیکشن کمیشن کا قیام۔ پی ایل سی الیکشن کے قوانین کا جائزہ لے اور ان میں ترمیم کرے۔

☆ فلسطینی اصلاحات پر بین الاقوامی ٹاسک فورس کے قائم کردہ عدالتی، انتظامی اور اقتصادی معیار پر فلسطینی کارکردگی۔

☆ مندرجہ بالا پیمانوں اور ایک کھلی ہوئی بحث کے حوالے اور ایک شفاف امیدوار کے انتخاب / انتخابی مہم پر مبنی جتنی جلد ممکن ہو سکے فلسطینی ایک آزاد، کھلا ہوا اور منصفانہ الیکشن کا انعقاد کریں۔

☆ حکومت اسرائیل ٹاسک فورس کو الیکشن میں مدد، ووٹر رجسٹریشن، امیدواروں اور ووٹنگ افسران کی نقل وحرکت میں تعاون کرے۔ جو این جی اور الیکشن کے عمل میں شامل ہوں ان کی مدد کرے۔

☆ اسرائیلی حکومت فلسطینی چیمبر آف کامرس اور مشرقی یروشلم میں دوسرے کالعدم فلسطینی اداروں کو اس وعدہ کے ساتھ دوبارہ کھولے کہ یہ ادارے قطعیت کے ساتھ فریقین کے درمیان ہوئے گزشتہ معاہدوں کے تحت کام کریں گے۔

انسان دوست ردعمل

☆ انسانیت کی صورتحال میں فروغ کے لیے اسرائیل اقدامات کرے۔ پرسینی رپورٹ میں مذکور تمام سفارشات کے مکمل نفاذ کے لیے اسرائیل اور فلسطین کی حکومتیں انسانی حالات میں بہتری، کرفیو کا خاتمہ اور ساز و سامان اور انسانی نقل و حمل میں پابندیوں پر ڈھیل اور بین الاقوامی اور انسانی کاموں کے کارکنوں کو مکمل، محفوظ اور بغیر مداخلت کی آزادی۔

☆ اے ایچ ایل سی انسانیت کی صورتحال اور مغربی کنارہ اور غزہ پٹی میں اقتصادی ترقی کے امکانات کا جائزہ لے اور ایک بڑی مخیر مد دبشمول اصلاحی کوشش کی ابتدا کرے۔

☆ اسرائیلی حکومت اور فلسطینی اتھارٹی آمدنی کے حساب کتاب کے عمل اور پیسوں کی آمدورفت کو علاقوں میں منظورشدہ نگرانی کے شفاف میکنزم کے مطابق جاری رکھے۔

سول سوسائٹی

☆ مسلسل مخیرانہ امداد بشمول پی وی اوز/ این جی اوز کے ذریعہ بڑھی ہوئی مالی امداد جو عوام سے عوام کو پروگرام، پرائیویٹ سیکٹر کی ترقی اور سول سوسائٹی کے اقدامات کے لیے ہے۔

بستیاں

☆ مارچ 2001 سے تعمیر کی گئی باہری بستیوں کو اسرائیلی حکومت فوری طور پر منہدم کرے۔

☆ مشل رپورٹ سے موافقت رکھتے ہوئے حکومت اسرائیل بستیوں کی تمام کارروائیوں کو منجمد کردے (بشمول بستیوں کی معمول کے مطابق ترقی کے)

دوسرا دور:

عبوری دور (جون 2003 - دسمبر 2003)

دوسرے دور میں توجہ اس پر مرکوز رکھی جائے گی کہ فلسطین کو عارضی سرحدوں اور اقتدار اعلیٰ کی عارضی خصوصیتوں کے ساتھ ایک آزاد مملکت بنانا ہے جو کہ نئے دستور پر مبنی ہو۔ یہ دائمی حیثیت کے تصفیہ میں درمیان کی ایک منزل ہوگی۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب فلسطینی عوام ایسی قیادت رکھتے ہوں جو دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کر سکے اور آزادی اور تحمل پر مبنی ایک عملی جمہوریت کی آرزو اور صلاحیت رکھتی ہو۔ اصلاح شدہ سول ادارے اور حفاظتی ڈھانچہ اور ایسی قیادت کے ساتھ فلسطینیوں کو ایک آزاد اور پائیدار ریاست کے قیام میں کوارٹیٹ اور وسیع تر بین الاقوامی کمیونٹی کا فعال تعاون حاصل ہوگا۔

دوسرے دور کی ترقی کوارٹیٹ کے متفقہ فیصلہ پر منحصر ہوگی کہ دونوں فریق کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے کیا حالات آگے بڑھنے کے لیے مناسب ہیں۔ فلسطینیوں کی زندگی کو معمول کے مطابق لانے اور فلسطینی اداروں کی تعمیر کے لیے مزید اور پائیدار کوششوں کے ساتھ، دوسرا دور فلسطینی الیکشن سے شروع ہوتا ہے اور 2003 میں عارضی سرحدوں کے ساتھ ایک آزاد فلسطینی ریاست کی ممکنہ تخلیق پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے اولین مقاصد میں مسلسل جامع حفاظتی کارکردگی اور موثر حفاظتی تعاون، فلسطینیوں کی زندگیوں کو معمول کے مطابق لانا اور اداروں کی تعمیر، پہلے دور میں مذکور مقاصد کو برقرار رکھنا اور اس کو بنیاد بنا کر آگے بڑھنا، ایک جمہوری فلسطینی دستور کی توثیق، وزیراعظم کے دفتر کا قیام، سیاسی اصلاحات کو استوار کرنا اور عارضی سرحدوں کے ساتھ فلسطینی ریاست کی تخلیق شامل ہے۔

- ☆ بین الاقوامی کانفرنس: کامیاب فلسطینی الیکشن کے فوراً بعد دونوں فریقوں کی رضامندی سے کوارٹیٹ بین الاقوامی کانفرنس کی دعوت دے گا تا کہ فلسطین کی اقتصادی حالت کی بحالی سے تعاون کیا جائے اور ایسا عمل شروع کیا جائے جو

عارضی سرحدوں کے ساتھ ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کے لیے راہ ہموار کرتا ہو۔

- مشرق وسطیٰ کے ایک جامع امن (بشمول اسرائیل اور شام کے درمیان امن، اور اسرائیل اور لبنان کے درمیان امن) اور اس دستاویز کی تمہید میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں، پر مبنی ہوگا اور اس میں سب شامل ہوں گے۔

- عرب ریاستیں اسرائیل کے ساتھ انتفاضہ کے قبل کے رشتوں (تجارت، دفاتر وغیرہ) کی تجدید کرسکتی ہیں۔

- علاقائی آبی وسائل، ماحولیات، اقتصادی ترقی، پناہ گزین اور تخفیف اسلحہ جیسے مسائل پر کثیر جہتی مصروفیت کی تجدید۔

☆ جمہوری، آزاد فلسطینی ریاست کا نیا دستور مکمل ہوتا ہے اور مجاز فلسطینی ادارے اس کو منظور کرتے ہیں۔ اگر مزید الیکشن مطلوب ہیں تو نئے دستور کی منظوری ہونی چاہیے۔

☆ دستور کے مسودہ کے مطابق اصلاح شدہ بااختیار کابینہ اور وزیراعظم کے دفتر کا رسمی طور سے قیام۔

☆ پہلے دور میں مذکور بنیادوں پر موثر حفاظتی تعاون کے ساتھ مسلسل جامع حفاظتی کارروائی۔

☆ اسرائیلی فلسطینی باہمی عمل کے ذریعہ عارضی سرحدوں کے ساتھ آزاد فلسطینی ریاست کی تخلیق۔ بین الاقوامی کانفرنس کے ذریعہ لانچ کی گئی۔ اس عمل کے ایک جز کی حیثیت سے، زیادہ سے زیادہ زمینی اتصال کو آگے بڑھانے بشمول بستیوں پر مزید کارروائی بمعہ عارضی سرحدوں کے آزاد فلسطینی ریاست کے قیام پر ہر سابقہ معاہدہ کا نفاذ۔

☆ کوارٹیٹ کی متحرک، پائیدار اور عملی تعاون کے ساتھ، عبوری دور کی بین الاقوامی نگرانی میں کردار میں اضافہ۔

☆ کوارٹیٹ کے اراکین فلسطینی ریاست کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کرانے کی بشمول اقوام متحدہ کی ممکنہ رکنیت کے ساتھ، کوشش کریں۔

تیسرا دور:

دائمی حیثیت کے لیے معاہدہ اور اسرائیلی فلسطینی تنازعہ کا خاتمہ (2004-2005)

تیسرے دور میں پیش رفت کوارٹیٹ کے متفقہ فیصلے اور دونوں فریق کی کارروائیوں اور ان پر کوارٹیٹ کی نگرانی پر منحصر ہے۔ تیسرے دور کے مقاصد میں اصلاحات کا استحکام اور فلسطینی اداروں کی مضبوطی، پائیدار اور موثر فلسطینی حفاظتی کارکردگی اور 2005 میں دائمی حیثیت پر معاہدہ کے لیے اسرائیلی و فلسطینی مذاکرات شامل ہیں:

☆ دوسری بین الاقوامی کانفرنس: فریقین کے مشورہ سے 2004 کی ابتدا میں کوارٹیٹ اس کانفرنس کی دعوت دے گی تاکہ عارضی سرحدوں کے ساتھ آزاد فلسطینی ریاست پر جو معاہدہ ہوا ہے اس کی تائید کی جائے اور آخر میں کوارٹیٹ کے پائیدار، فعّال اور عملی تعاون کے ساتھ رسمی طور سے ایک طریقۂ عمل کا اجرا کیا جائے جو کہ 2005 میں دائمی حیثیت پر قرارداد کے لیے راہ ہموار کرے جس میں سرحدوں، یروشلم، پناہ گزینوں، بستیوں کے مسائل بھی شامل ہوں اور مشرق وسطیٰ میں اسرائیل شام، اسرائیل لبنان کے درمیان تصفیوں کی ترقی میں تعاون دے اور جتنی جلد ممکن ہو سکے یہ حاصل کیا جائے۔

☆ دائمی حیثیت پر معاہدہ کے لیے ٹاسک فورس کا تیار شدہ اصلاحات کے ایجنڈے پر جامع، موثر اور مسلسل فروغ

☆ پہلے دور میں مذکور بنیادوں پر موثر حفاظتی تعاون کے ساتھ مسلسل جامع حفاظتی کارروائی۔

☆ حتمی حیثیت کے معاہدہ پر تیاری کے سلسلہ میں اصلاحات میں سہولتوں، فلسطینی

اداروں اور اقتصادیات کے استحکام کے لیے بین الاقوامی کوششیں۔

☆ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل قرارداد 242، 338 اور 1397 پر مبنی تصفیہ جو فریقین کے درمیان مذاکرات میں طے پایا گیا اور جس کے ذریعہ فریقین دائمی حیثیت پر ایک معاہدہ پر پہنچتے ہیں اور یوں 2005 میں اسرائیلی فلسطینی تنازعہ اور 1967 سے ہوئے قبضہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ معاہدہ میں دنیا کے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی احساسات کو مدنظر رکھتے ہوئے یروشلم کی حیثیت پر قرارداد، اور دو ریاستی نظریے کی تکمیل کرتا ہو یعنی ایک اسرائیل اور دوسری خودمختار، آزاد، جمہوری اور پائیدار فلسطینی ریاست، امن و سلامتی کے ساتھ ایک دوسرے کے برابر رہیں گی۔

☆ عرب ریاستیں اسرائیل کے ساتھ معمول کے مطابق مکمل تعلقات قائم کریں گی اور ایک دباؤ ڈالنے والے عرب، اسرائیلی امن کے حوالے سے علاقہ کی ہر ریاست کے لیے تحفظ ہوگا۔

IX- روڈ میپ کی بابت اسرائیلی تحفظات

اسرائیلی تبصرہ کے اوّلین موضوعات

1- اس کی ابتدا میں، اس کے عمل کے دوران، اور اس کے جاری رہنے کی شرط کے طور پر سکون برقرار رکھا جائے گا۔ فلسطینی موجودہ حفاظتی تنظیموں کو ختم کردیں گے اور حفاظتی اصلاحات نافذ کریں گے جس کے دوران نئی تنظیمیں بنائی جائیں گی جو دہشت گردی، تشدد اور اشتعال انگیزی سے مقابلہ کا کام کریں گی۔ (اشتعال انگیزی فوراً ختم ہونی چاہیے اور فلسطینی اتھارٹی کو امن کی تعلیم دینی چاہیے) یہ تنظیمیں تشدد اور دہشت گردی سے صحیح معنوں میں بچاؤ کے لیے گرفتاریوں، تفتیش، احتیاط، تفتیش کے لیے قانونی جواز کا نفاذ، عدالتی کارروائی اور سزا کی مدد لے سکتی ہیں۔ منصوبے کے پہلے دور میں اور دوسرے دور میں داخلہ کی شرط کے طور پر فلسطینی، دہشت گرد تنظیموں (حماس، اسلامی جہاد، پاپولر فرنٹ، ڈیموکریٹک

فرنٹ، الاقصیٰ بریگیڈ اور دیگر) کے انفرا اسٹرکچر کے انہدام کی تکمیل کریں گے اور ساتھ ہی تمام غیر قانونی ہتھیاروں کو جمع کر کے انھیں ایک تیسرے فریق کے حوالے کریں گے جو انھیں علاقے سے باہر لے جائے اور تباہ کردے؛ ساتھ میں فلسطینی اتھارٹی کے اندر ہتھیاروں کی اسمگلنگ اور ہتھیار سازی کے عمل کا خاتمہ؛ احتیاطی عمل کی مکمل فعالی اور اشتعال انگیزی کا خاتمہ۔

دوسرے دور میں بغیر مذکورہ بالا شرائط کی تکمیل کے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کوئی پیش رفت نہیں ہوسکتی۔ نافذ ہوئے حفاظتی منصوبے ٹینٹ اور زنی منصوبے ہیں۔ (جیسا کہ دیگر باہمی فریم ورکس میں ہے، روڈ میپ یہ کبھی نہیں کہے گا کہ اسرائیلیوں کو بھی فلسطینیوں کے خلاف تشدد اور اشتعال انگیزی بند کردینا چاہیے)۔

2- مکمل کارکردگی ادوار کے اندر اور ادوار کے درمیان میں ترقی کے لیے ایک شرط ہوگی۔ ترقی کے لیے اولین شرط دہشت گردی، تشدد اور اشتعال انگیزی کا یکسر خاتمہ ہوگا۔ ادوار کے درمیان اسی وقت ترقی ممکن ہے جب اس سے قبل والے دور میں مکمل کام ہو چکا ہو۔ توجہ وقت پر نہیں بلکہ کارکردگی کے معیار پر رکھی جائے گی (وقت کا نظام صرف حوصلہ کے طور پر استعمال ہوگا)۔

3- حکومتی اصلاحات کے فریم ورک میں فلسطینی اتھارٹی میں ایک نئی اور مختلف قیادت کا ظہور۔ منصوبے کے دوسرے دور میں داخلے کے لیے نئی قیادت کا ظہور ایک شرط ہے۔ اس فریم ورک میں فلسطینی مجلس قانون ساز کے الیکشن اسرائیلی تعاون اور رابطہ کے ساتھ منعقد ہوں گے۔

4- نگرانی کا میکینزم امریکی انتظامیہ کے تحت ہوگا۔ خاص تصدیقی کارروائی اپنی توجہ ایک اور فلسطینی وجود کی تخلیق اور فلسطینی اتھارٹی کے دائرہ میں شہری اصلاحات پر مرکوز رکھے گی۔ تصدیق ہر مسئلہ پر الگ الگ (اقتصادی، قانونی، مالیاتی) خالصتاً پیشہ ورانہ بنیاد پر بغیر کسی متحد یا مرکب میکینزم کے ہوگی۔ اہم فیصلے دونوں فریقوں کے ہاتھ میں رہیں گے۔

5- عارضی فلسطینی حکومت کا کردار اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی کے درمیان مذاکرات میں طے ہوگا۔ عارضی ریاست کی سرحدیں اور اقتدار کے کچھ پہلو عارضی ہوں گے اور وہ مکمل طور سے غیر فوجی ہوگی۔ اس کے پاس کوئی فوج نہ ہوگی سوائے پولیس اور اندرونی سلامتی کے لیے فورس ہوگی جن کے پاس محدود اسلحہ ہوگا۔ اس ریاست کو دفاعی معاہدہ یا فوجی کارروائی کا اختیار نہیں ہوگا۔ تمام آنے جانے والے افراد اور ساز وسامان پر اسرائیل کا کنٹرول ہوگا۔ اسرائیل کا کنٹرول اس کی فضائی حدود اور الیکٹرومیگنیٹک وسعت پر بھی ہوگا۔

6- تعارفی بیانات اور حتمی تصفیہ کے تعلق سے ظاہری حوالے دیے جائیں کہ اسرائیل کو ایک یہودی ریاست کی حیثیت سے وجود اور فلسطینی پناہ گزینوں کو اسرائیل کی ریاست میں لوٹنے کے دعوے کو رد کرنے کا حق ہے۔

7- اس عمل کے خاتمہ پر نہ صرف تنازعہ ختم ہوگا بلکہ تمام دعوے بھی ختم ہو جائیں گے۔

8- مستقبل میں فیصلے دونوں فریق کے درمیان براہ راست مذاکرات اور معاہدوں کے ذریعہ طے ہوں گے جو صدر کی 24 جون کی تقریر میں دیے گئے تصور کے موافق ہوں گے۔

9- حتمی تصفیہ کے تعلق سے جو مسائل ہیں ان میں سے کوئی شریک نہ ہوگا۔ جو مسائل زیر بحث نہ لائے جائیں گے وہ ہیں: جودا، سمریہ اور غزہ کی بستیاں (بستی کے انجماد اور غیر قانونی آؤٹ پوسٹ کے علاوہ)؛ فلسطینی اتھارٹی کی حیثیت اور یروشلم میں اس کے ادارے؛ اور وہ تمام امور جن کا متن حتمی تصفیہ سے متعلق ہے۔

10- قرارداد 242 اور 338 (1397، سعودی اقدام اور بیروت میں منظور شدہ عرب اقدام کے علاوہ تمام حوالے ہٹا دیے جائیں۔ روڈ میپ پر مبنی کوئی بستی ایک خودمختار بستی ہوگی جو اپنا جواز اُسی سے حاصل کرتی ہے۔ کوئی بھی ممکنہ حوالہ صرف قرارداد 242 اور 338 کا ہونا چاہیے اور پھر اس کے بعد دائمی حیثیت پر مستقبل کے مذاکرات میں صرف تجویز کے ابتدائی خاکہ کی طرح استعمال ہوں گے۔

11- [illegible]

[illegible]

اسرائیل کے ساتھ تعاون کی تجدید کی جائے گی۔ معاشی میدان میں: معیشت کی بحالی کے لیے بین الاقوامی کوششیں جاری رہیں گی۔ مالیاتی میدان میں: امریکی اسرائیلی فلسطینی معاہدہ ٹیکس کی آمدنی کی مستقبل میں منتقلی پر مکمل طور سے نافذ ہوگا۔

12- ستمبر 2000 کے خطوط پر اسرائیلی دفاعی افواج کی تعیناتی دفعہ 4 (بالکل خاموش) کی قرارداد کا حصہ بن جانے پر منحصر ہوگا اور نئے حالات اور ضروریات کی نوعیت کے مطابق ان کو لاگو کیا جائے گا۔ زیادہ زور ذمہ داریوں کی تقسیم اور شہری اتھارٹی پر دیا جائے گا جیسے کہ وہ ستمبر 2000 میں تھیں نہ کہ اس وقت افواج کی زمینی پوزیشنوں پر۔

13- حفاظتی حالات پر انحصار کرتے ہوئے اسرائیل فلسطینیوں کی زندگی معمول کے مطابق بحال کرنے کے لیے کام کرے گا؛ اقتصادی حالت کو سدھارنے، تجارتی رابطوں کو بڑھانے، تسلیم شدہ انسانی تنظیموں کی سرگرمیوں میں مدد اور حوصلہ افزائی کے لیے کام کرے گا۔ انسانیت کے مسائل کے فریم ورک کے اندر برٹینی رپورٹ کو ماخذ دستاویز کی طرح استعمال نہیں کیا جائے گا۔

14- عرب ریاستیں دہشت گردانہ کارروائیوں کی مذمت کر کے اس عمل میں تعاون کر سکتی ہیں۔ فلسطین کے مسئلہ کا کسی اور مسئلہ سے کوئی رابطہ نہ جوڑا جائے گا (شامی۔ لبنانی)۔

سعودی اصلاحات

1-تبدیلی کے لیے عرضداشت (دسمبر 1990)

اس دستاویز کا مسودہ 1990 کے موسم خزاں میں تیار کیا گیا تھا اور اس پر 43 عوامی نمائندوں نے دستخط کیے تھے۔ ایک طویل تمہید میں انھوں نے بادشاہ کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور 'موجودہ طرز حکومت' اور عزیز شاہی خاندان کی سلامتی، کے تئیں اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ انھوں نے کہا کہ یہ شہریوں کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ وہ حاکموں کو صحیح بات بتلائیں کیونکہ خود پیغمبر نے کہا ہے کہ 'الدین نصیحہ'۔ انھوں نے مندرجہ ذیل دس اصلاحات کی تجویز رکھی تا کہ بجائے ان پر ردّعمل کے واقعات کے لیے پہلے سے تیار رہنا چاہیے:

1- فتویٰ کے لیے ایک منظم فریم ورک ہو۔ اس میں شریعت کو شامل ہونا چاہیے جو غلطیوں سے پاک ہے اور جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی جیسا کہ قرآن وحدیث کے غیر مبہم متن سے ظاہر ہے۔ لیکن فقہی تبصرے، مفسرین قرآن کی رائے اور شریعت کے ماہرین کی رائے جو مختلف علمی نظریوں سے اخذ کی گئی ہے، تمام کی تمام شریعت کے متن کو سمجھنے کے لیے انسانی کوششیں ہیں۔ ان رایوں پر ان کے مخترع

کی فہم کی صلاحیت، ان کی علمی سطح اور مہارت کا اثر پڑا۔ مقام اور وقت کے حالات کے لحاظ سے بنی ہوئی یہ رائیں صحیح اور غلط ہوسکتی ہیں اور ان کو زیر بحث آنا چاہیے۔ بلاشبہ اس بات پر علما کا اجماع ہے کہ کوئی بھی فرد واحد قرآن یا حدیث کے معنی متعین کرنے کا تنہا دعویٰ نہیں کرسکتا یا شریعت کے قوانین کو بنانے کے حق کی اجارہ داری نہیں لے سکتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم واضح طور پر اور زور کے ساتھ الوہی اور انسانی متن میں امتیاز کرسکیں۔ الہامی اور غیر مبہم متن کو قبول کریں اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ لیکن عالمانہ رایوں پر آزادانہ طور سے تحقیق اور غیر محدود طریقہ سے ان پر سوال اٹھائے جاسکتے ہیں۔

-2 مختلف اوقات میں ملک کے حکمرانوں کے اعلانات اور بیانات کی روشنی میں حکومت کے ایک بنیادی قانون کے اجرا پر غور کیجیے۔

-3 مملکت کے تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے اہل، عالم اور رائے بنانے والے افراد جو اپنی ایمانداری، فراست، غیر جانبداری، اخلاقی معیار اور عوامی خدمت کے لیے معروف ہوں، پر مشتمل ایک مشاورتی مجلس کی تشکیل ہو۔ دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ مجلس کو اقتصادی، سیاسی، تعلیمی اور دوسرے مسائل سے متعلق قوانین اور ضابطوں کے مطالعہ، فروغ اور توثیق کا فرض بھی ادا کرنا ہوگا اور وہ تمام انتظامی محکموں کی موثر تفتیش کرے۔

-4 میونسپل کونسلوں کی تجدید: صوبوں کے قانون کا نفاذ، دوسری تجارتوں کے لیے نمونے کے طور چیمبر آف کامرس کے تجربہ کی عمومیت۔

-5 ججوں اور ان کے نائبین کی تیاری کے عمل کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے اور اس کے قوانین میں جدیدیت لانے کے مقصد سے، عدالتی نظام کے ہر پہلو، درجہ، اقسام اور مہارت کے میدان کی تحقیق۔ عدلیہ کی آزادی کی ضمانت، اس کے اثر اور انصاف کے لیے ہر ضروری قدم اٹھانا چاہیے تا کہ اس کی اتھارٹی اور قوت بنیادوں تک پھیلے۔ اس اہم میدان میں تربیت دینے والے اسکول سارے

شہریوں کے لیے کھلے ہوں اور کسی ایک گروپ کے مقابلہ میں دوسرے کے لیے مخصوص نہ ہوں جو کہ مساوی مواقع کے شرعی اصول کے منافی ہے۔

6- زندگی کے ہر شعبہ میں شہریوں کے درمیان نسلی، قبائلی، طبقاتی یا سماجی اصلیت کے امتیاز کے بغیر مکمل مساوات ہو۔ سوائے عدلیہ کے حکم کے، شہریوں کی زندگی میں دخل اندازی نہ کرنے کے اصول کو سختی سے نافذ کیا جائے۔

7- میڈیا پالیسی پر نظرثانی کی جائے اور اس کو ایک جامع اور حتمی قانون کے تابع کیا جائے جو دوسرے ممالک کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوانین کا آئینہ دار ہو۔ یہ قانون کل سعودی میڈیا کو اس لائق بنائے کہ وہ اپنی آزادی کو بجائے برائی کے اچھائی پھیلانے، خوبیوں کی طرف بلانے اور خرابیوں کو مٹانے اور ایک آزاد مسلم سوسائٹی میں گفت وشنید کے لیے استعمال کرے۔

8- ''اسوسیشن فار دی پروپیگیشن آف ورچو اینڈ دی پری ونشن آف وائس'' کی جامع اصلاح۔ ان کے کاموں اور طریقۂ کار کے بارے میں ایک حتمی قانون ہونا چاہیے جس کو وہ اختیار کریں۔ مخصوص احاطہ اور اس کے ممبران اور سردار کو کرایہ پر رکھنے کے لیے سخت قوانین بنائے جائیں تاکہ منصفانہ اور مدبرانہ تبلیغ عمل میں آئے۔

9- حالانکہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ نسل نو کی پرورش و پرداخت ایک مسلمان عورت کا اوّلین فرض ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ عوامی زندگی کے کئی ایسے میدان ہیں جہاں شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے عورتوں کو شرکت کی اجازت ہونی چاہیے تاکہ معاشرہ کی تعمیر میں وہ اپنا حصہ ادا کرسکیں اور ان کی عزت افزائی بھی ہو۔

10- اللہ تعالیٰ نے مقدس کتابیں اتاریں اور اپنے رسول بھیجے تاکہ وہ تعلیم دیں اور انسانیت کو پروان چڑھائیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوموں کی ترقی اور نشاۃ ثانیہ کے لیے علم سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک کے

نظامِ تعلیم کو جامع اور بنیادی اصلاح کی ضرورت ہے تا کہ وہ اس قابل ہو سکے کہ ایسی تعلیم یافتہ نسل پیدا کر سکے جو ملک کے حال اور مستقبل میں موثر اور مثبت طریقہ سے شریک ہو سکے، اور اس دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے اور ہمیں قوموں کے اس کاروان کے برابر لے آئے جو ہمیں ہر میدان میں بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

II- نصیحت کا میمورنڈم (فروری 1991)

سینتالیس صفحات کی یہ دستاویز جس کو اخبار البحر منظرعام پر لایا، خادم الحرمین الشریفین کو پیش کیا گیا تھا اور اس پر شیخ عبدالعزیز بن باز، کونسل آف سینئر علما اور دارالافتا کے سربراہ اور دوسرے جید علما جیسے شیخ عبداللہ بن جبرین، شیخ صفر الحوالی، شیخ سلمان العودہ اور سو سے زیادہ جج، یونیورسٹی پروفیسرز اور مبلغین کے دستخط تھے۔ اپنے تعارفی نوٹ میں اخبار نے لکھا: ''یہ میمورنڈم اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں پہلی بار یہ انکشاف ہوا ہے کہ سعودی عرب میں مختلف جگہوں پر اسلامی شریعت کے خلاف کیا ہو رہا ہے خصوصاً: (i) علما اور مبلغین کا رول (ii) انتظامیہ (iii) عوامی میڈیا (iv) نظام اور ذیلی قوانین (v) معیشت اور پیسہ (vi) خارجی تعلقات (vii) عدلیہ اور عدالتیں (viii) سماجی سہولتیں (ix) انسانی حقوق (x) فوج (ہر ایک سے متعلق اس کے تبصروں اور سفارشات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے)۔

پرہیزگاری اور نیکی میں ایک دوسرے سے تعاون کے الوہی حکم کے مطابق اور حکام کو نصیحت کرنے کے فرض کے مطابق، آپ کے نظام اور احکامات کے جواب میں ہم یہ میمورنڈم پیش کر رہے ہیں جس میں اس مرحلہ پر ہمارے ملک کے کچھ فوری مسائل پر نظرثانی کی گئی ہے۔ اس میں کچھ مشورے بھی دیے گئے ہیں جن کا مقصد ایسے مسائل کا حل اور اصلاحات کی سلسلہ جنبانی ہے جو ہر فرد کی آرزوؤں کی تعبیر بن سکے:

۱- شریعت کے مطابق داخلی و خارجی مسائل طے کرنے کے لیے ایک مشاورتی کونسل کا قیام۔ اس کے اراکین ایماندار، صاف گو اور ہر میدان میں مہارت کی نمائندگی

کرتے ہوں۔ وہ کلی طور پر خودمختار ہوں اور ان پر کوئی ایسا دباؤ نہ ہو جو کونسل کے اختیارات کو متاثر کرے۔

-2 تمام سیاسی، اقتصادی، انتظامی اور دیگر نوعیت کے قوانین اور ضابطے شریعت کے اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔ شریعت کی ماہر قابل اعتماد کمیٹیوں کو یہ اختیار ہو کہ وہ شریعت کے اصولوں کے خلاف قوانین کو کالعدم قرار دیں۔

-3 خصوصی مہارت، دیانت داری اور یکسوئی کے علاوہ سرکاری افسروں اور بیرون ممالک میں ان کے نمائندے مضبوط اخلاق کے مالک ہوں۔ کسی بھی سبب سے کسی بھی مطلوبہ چیز میں ناکامی عوامی اعتماد کا غلط استعمال ہے اور قومی مفاد اور ساکھ کو مجروح کرنے کا بنیادی سبب ہے۔

-4 تمام شہریوں کے لیے مساوی طریقہ سے انصاف کا نفاذ، حقوق کی ادائیگی اور فرائض کی تقسیم بغیر اشراف کی طرف داری اور کمزوروں سے ناراضگی کے، ہونا چاہیے۔ اختیارات کا غلط استعمال خواہ وہ فرض سے منہ موڑنے یا لوگوں کے حقوق کی ادائیگی سے انکار کی صورت میں ہو، معاشرہ کی تحلیل اور ٹوٹنے کا سبب ہوتا ہے۔

-5 تمام سرکاری افسران خصوصاً وہ جو اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہیں، کی اچھی طرح سے چھان بین کرنی چاہیے اور بغیر کسی استثنا کے ان کو جوابدہ بنانا چاہیے۔ سرکاری محکموں کو ایسے افراد سے پاک کر دینا چاہیے جن کی بدعنوانی اور فرائض سے غفلت ثابت ہو چکی ہو۔ اس سلسلہ میں کسی دوسری خوبی کو خاطر میں نہ لایا جائے۔

-6 عوامی سرمایہ کو تمام طبقات میں منصفانہ طریقہ سے تقسیم کیا جائے۔ ٹیکسوں کو ختم کر دیا جائے اور شہریوں پر بوجھ بننے والی فیس کو کم کیا جائے۔ حکومت کی آمدنی کی بے جا استعمال اور استحصال سے حفاظت کی جائے۔ اخراجات میں سب سے زیادہ فوری ضرورت کو ترجیح دی جائے۔ اجارہ داری کی ہر قسم اور غیر قانونی ملکیت کو مٹا دیا جائے۔ اسلامی بینکوں پر عائد کی گئی پابندیاں ہٹائی جائیں۔ پرائیویٹ

اور پبلک بینکوں کو سود سے پاک کیا جائے جو کہ اللہ اور اس کے رسول سے سینہ زوری ہے اور دولت کی نشوونما میں ایک رُکاوٹ ہے۔

7- ایک مضبوط اور مکمل طور سے متحد فوج تشکیل دی جائے جو ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہو خواہ وہ کہیں سے آئیں۔ اسلحہ سازی اور ان کے فروغ پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ فوج کا مقصد ملک اور مقدس مقامات کی حفاظت ہوگا۔

8- سلطنت کی اپنائی ہوئی میڈیا پالیسی کے مطابق ذرائع ابلاغ کی دوبارہ ساخت ہو۔ اس کے مقاصد میں تعلیم، اسلام کی خدمت اور معاشرتی اخلاق کی تبلیغ ہو۔ میڈیا کو ان مقاصد کی متضاد ہر چیز سے صاف کر دینا چاہیے۔ سچی رپورٹنگ اور تعمیری تنقید کے ذریعہ بیداری عام کرنے میں اس کی آزادی کی، اسلام کے حدود میں حفاظت کی جائے۔

9- خارجہ پالیسی کی بنیاد بغیر غیر شرعی گٹھ جوڑوں پر اعتماد کے، قومی مفاد پر ہوگی۔ یہ مسلم مقاصد کا بھی احاطہ کرے گی۔ سلطنت کے سفارتخانوں کی اصلاح ہوگی تاکہ وہ ملک کی اسلامی نوعیت کی صحیح تصویر پیش کر سکیں۔

10- مذہبی اور تبلیغی اداروں کی ترقی ہو اور ان کو مالیاتی اور افرادی قوت سے مضبوط کیا جائے۔ ان کے مقاصد کے حصول میں جو رُکاوٹیں ہوں انھیں دور کیا جائے۔

11- عدالتی اداروں کو ایک چھت کے نیچے لایا جائے اور ان کو مکمل اور موثر آزادی دی جائے۔ عدالتی اختیار ہر ایک پر نافذ ہوگا۔ یہ لازمی ہے کہ ایسی خودمختار تنظیم قائم کی جائے جس کا کام عدالتی احکام کو عملی طور سے پورا کروانا ہو۔

12- معاشرہ اور فرد کے حقوق کی ضمانت دی جائے۔ عوام کے حقوق اور ادارہ سے ہر پابندی ہٹائی جائے تاکہ قابل قبول مذہبی حصار میں انسان انسانی وقار سے لطف اندوز ہو سکے۔

III- "اسلامک مومنٹ فار چینج" عرب جزیرہ نما میں جہاد ونگ کا پہلا بیان (1995)

اسلام ہماری شان، وقار اور عظمت ہے اور ہماری جدوجہد اللہ تعالیٰ کی راہ میں

ہے مقدس قرآن کہتا ہے: ''ان سے جنگ کرو جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے: وہ لوگ جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے، اس سے انکار کرتے ہیں۔''

اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نام نہاد سلطنت سعودی عرب میں حکمراں طبقہ کافر ہے اور اس کے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ حکومت اسلام، مسلمانوں، مبلغین اور مصلحین کے خلاف ہے۔ یہ کافروں اور صلیبیوں کے ایجنٹ ہیں اور ان کی مدد کر رہے ہیں۔ انھوں نے حرمین الشریفین کی سرزمین کے دروازے بلکہ پورے جزیرہ نمائے عرب کو، حملہ آور غاصب صلیبیوں کے لیے کھول دیے ہیں۔ اسلام کے دشمنوں سے تعاون کے نتیجہ میں پوری قوم ذلت اور بے عزتی کا سامنا کر رہی ہے۔ اس حکومت کو گرانے، حملہ آوروں کو جزیرہ نما سے باہر نکالنے، اور (عرب) قوم کی عزت و وقار کو واپس لانے کے لیے 'اسلامک موومنٹ فار چینج' (جزیرہ نمائے عرب میں جہاد ونگ) اللہ کی راہ میں جہاد کا علم اٹھاتا ہے۔

ہم اس مقصد کے لیے اپنی تمام کوششیں اور دستیاب وسائل بروئے کار لائیں گے یا تو ہم فتح سے ہم کنار ہوں گے اور اللہ کے دین کا علم لہرائیں گے یا اس کی راہ میں شہادت ہوگی۔ موومنٹ کے جہاد آپریشن میں مندرجہ ذیل اس کے اہداف ہوں گے:

سب سے پہلے جزیرہ نمائے عرب میں صلیبی (عیسائی) افواج خواہ امریکی ہوں یا انگریز۔ شہری ہوں یا فوجی، کوئی بھی نہیں بخشا جائے گا۔ اسی طرح سے آلات حرب اور اڈے نشانے پر ہوں گے۔ انھیں یہ سرزمین چھوڑنی ہوگی۔ ہم ان کو محرم 1416ھ مطابق 28 جون 1995 تک کی مہلت، ملک چھوڑنے کے لیے دے رہے ہیں۔ اس مدت کے گزرنے کے بعد یہ افواج قانونی طور سے نشانہ ہوں گی۔

دوسرے، سعودی خاندانوں کے طاقتور اور بارسوخ افراد کیونکہ وہی اس کافر حکومت کے قائد ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو کچھ بھی ہوا ہے اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے پیچھے یہی کارفرما ہیں۔

تیسرے، حکومت کی فوج جو ان کی حفاظت کر رہی ہے جیسے رائل گارڈز، ملٹری پولیس۔ صرف یہی ہیں جو جرائم کے ارتکاب میں ان کی مدد کر رہے ہیں۔

اسلامک موومنٹ فار چینج

IV- قومی اصلاح کی دستاویز (جنوری 2003)

اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت رحم والا ہے

ہزرائل ہائی نس پرنس عبداللہ بن عبدالعزیز، ولی عہد، ڈپٹی وزیراعظم اور نیشنل گارڈز کے سربراہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کی عوامی شرکت کی پیش کش پر ہم اس مہربان ملک کے دانشوروں اور مختلف نظریات و علاقے سے آپ کے بھائیوں اور بیٹوں کی تعریف، توصیف اور ستائش آپ کو پیش کرتے ہیں۔

اس اقدام کے لیے وہ آپ کو اپنا انتہائی احترام اور عزت بھیجتے ہیں اور وہ اس کو صحیح سمت کی جانب ایک قدم تصور کرتے ہیں جس کا اس ملک کو انتظار تھا۔ ان کا خیال ہے کہ معاشرہ اور اس کی قیادت کے درمیان گہرے تعلق کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ملک کے خلاف سازشوں اور خطرات کے مقابلہ میں وہ قیادت کے ساتھ ہیں۔

ستمبر 2002 سے آپ کے بھائیوں اور بیٹوں نے ملک کے حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ اہم رائے قائم کرنا شروع کیا ہے۔ ان کی امید ہے کہ مطلوبہ مقاصد کے حصول، استحکام اور اس ملک کی قوت کے لیے دیگر کاوشوں کے ساتھ یہ بھی آپ کی مدد کریں گے۔

اپنی سرزمین وطن کے حال اور مستقبل کے لیے رائے:

سوسائٹی اور دانشوروں کے مختلف طبقوں کے ساتھ بے تکلف میٹنگ اور آپ کے اس اعلان کہ آپ عوام کی آواز سننا چاہتے ہیں کے ذریعہ جس شفافیت سے آپ نے ملک کے مسائل کی گرفت اور ان کے حل کی کوشش کی ہے عوام اس سے بہت خوش ہیں۔ یہ ایک قابل تعریف اقدام ہے جس نے شہریوں میں سے آپ کے اکثر بھائیوں اور بیٹوں میں جو 11 ستمبر 2001 کے بعد ملک کو درپیش خطرات سے متفکر تھے، حمایت پیدا کی ہے۔ مثال کے طور پر بین الاقوامی اور علاقائی حالات، جن میں ہمارے ملک کی مرکزی حیثیت

ہے، میں فوجی حملہ کی دھمکی، داخلی معاملات میں مداخلت اور پورے علاقے کی دوبارہ نقشہ کشی کا خطرہ ہے۔

اس دستاویز کے دستخطی اگرچہ مختلف مکتب فکر اور گوشوں کے حامل ہیں لیکن وہ اپنے ملک 'مملکت سعودی عرب' کے اتحاد اور اس کی قیادت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ان تمام خطرات کی صورت میں جو ہمارے ملک کے حال اور مستقبل کو درپیش ہیں وہ قیادت کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان خطرات کے پیش نظر قائدین اور کمیونٹی کے درمیان رشتہ کو مضبوط کرنے کے لیے سنجیدہ اصلاحات کی ضرورت ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ''دین نصیحت ہے... مسلم قائدین اور عوام کے لیے'' سے ابتدا کرتے ہوئے اس دستاویز کے دستخطی ایک جامع قومی مذاکرہ میں شرکت کے لیے بیتاب ہیں۔ انھیں امید ہے کہ ان کی یہ دستاویز مسائل اور ان کے حل کی تلاش میں سرکاری اور عوامی کوششوں میں اپنے پہلے خصوصی محور اور دوسرے چار محوروں کے ذریعہ مدد کرے گی۔

پہلا خاص محور: دستوری اداروں کا ایک ملک بنانے کے لیے مزید اقدام

قرآن و سنت، جو قوم کے دستور کی بنیاد ہیں، میں حکومت کا قانونی جواز دو امور سے نکلتا ہے۔ اوّل تو عبادات اور حقوق العباد کے معاملہ میں جو اسلام نے حکم دیا ہے ان پر عمل۔ دوسرے یہ کہ شہری اپنے قائدین کی طرز حکمرانی سے مطمئن ہیں۔ کیونکہ قائدین کمیونٹی کے حقوق و فرائض کی بجا آوری میں اس کے نمائندے ہیں۔ کیونکہ انصاف حکومت کی بنیاد ہے۔ خدا نے بھی معاشرتی انصاف کا حکم دیا ہے اور اس کو ایمان کا ایک بنیادی جز تصور کیا ہے۔ اور کیونکہ انصاف کا حصول بغیر لازمی شوریٰ کے ممکن نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے سیاسی امور میں اپنے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شوریٰ اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اس نے اپنی مقدس کتاب میں کہا ہے: ''اور امور میں ان سے مشورہ کرو۔''

ساتھ ہی ساتھ شوریٰ اس وقت تک موثر نہیں ہوسکتی جب تک کہ دستوری اور اداراتی نظام کی جانب سنجیدہ قدم نہیں اٹھائے جائیں گے۔ اور اس سے بنیادی قانونی نظام

کے فروغ کا جواز نکلتا ہے تاکہ قرآن وسنت سے اخذ کیا ہوا دستوری تصور مضبوط ہو جو منتظمہ، عدلیہ اور مقننہ کے الگ الگ ہونے پر قائم ہو اور انصاف، مساوات اور مساوی مواقع میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی یقین دہانی کرائے۔

ساتھ ہی پارلیمنٹری شوریٰ جو عوامی شرکت کی آئینہ دار ہے، کا نفاذ اور حکمراں اور عوام کے درمیان معاہدہ عمرانی کی ابتدا اور قبولیت و تعاون کے رشتہ میں بندھا ہوا قومی اتحاد جو استحکام اور ترقی کی ضمانت ہو۔

منتخب پارلیمنٹ (منتخب شوریٰ کونسل)

اس اوّلین محور پر دستخطیوں کی رائے حسب ذیل ہے:

1- تمام شہریوں کے لیے شوریٰ کونسل کا براہِ راست انتخاب کے ذریعہ تشکیل جو قانون سازی کے اراکین کے اختیارات، اور معاملات کے ذمہ دار ہیں، کا آئینہ دار ہو۔ یہ سب اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ہو کیونکہ قوم کے فیصلوں میں یہی اعتماد و رضا کی نمائندہ ہیں۔ کونسل کو موقعہ دیا جائے کہ وہ حکومت کی دوسری شاخوں کی جانب قانون سازی اور نگرانی سے متعلق اپنی ذمہ داریاں مکمل کرے۔

2- براہِ راست الیکشن کے ذریعہ علاقائی قانون سازی کی تشکیل تاکہ علاقائی امور کا انتظام ہوسکے اور انتظامیہ پر عوام کی نگرانی کی یقین دہانی کرائی جائے۔

3- عدلیہ کے اختیارات کی آزادی پر اصرار جو کہ نظریاتی طور سے موجود ہوتا ہے لیکن اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتا جب تک کہ اس نظریہ کے نفاذ کے لیے تمام وسائل بروئے کار نہ لائے جائیں (اس دستاویز کے حصہ میں قطعی حفاظتی اقدام مذکور ہیں)۔

4- شہریوں کے حقوق کی ضمانت خصوصاً آزادیٔ رائے، اجتماع، الیکشن اور وہ تمام حقوق انسانی جن کو بین الاقوامی قرارداد بننے سے پہلے اسلام تسلیم کر چکا ہے اور جن کی توثیق ہمارا ملک کرتا ہے، کے لیے ایک شاہی اعلان۔

5- فیصلہ سازی میں عوامی شرکت کی مدد کے لیے کلب، کمیٹیاں، تعلیمی، کاروباری، سماجی اور مزدور یونین جیسے شہری اداروں کے قیام کا حق۔ ساتھ ہی سول سوسائٹی اور حقوق انسانی کے کارکنوں کو کام جاری رکھنے کی اجازت دی جائے کیونکہ ان کی سرگرمیاں مذاکرے اور پُرامن مباحثہ کا ماحول پیدا کریں گی۔ اور ان کی کارروائیوں کے سبب سے حاشیہ پر ڈالنے اور نظرانداز کرنے کا ماحول ختم ہوگا اور اس پر تشدد جدوجہد سے بھی نجات ملے گی جس کا خطرہ ہمارے مستقبل کو لاحق ہے۔

اقتصادی فائل:

دوسرا محور، معاشی مسائل کے حل کا ایک راستہ

1- معاشی منصوبہ بندی اور علاقوں میں دولت کی تقسیم میں انصاف پسندی کے اصول کی پابندی۔

2- عوامی اخراجات پر قابو پانے کے لیے پیشگی پابندیوں کا نفاذ اور اخراجات کی ترجیح پر فیصلہ۔ ساتھ ہی بدعنوانی کے خلاف جنگ، رشوت کے پھیلاؤ اور عوامی اراضی پر غاصبانہ قبضہ کا خاتمہ۔

3- جوابدہی اور نگرانی کے اداروں کو بااختیار اور مضبوط بنانا جیسے کہ پبلک سپرویژن ڈائریکٹوریٹ اور اس کو شوریٰ کے سامنے جوابدہ بنانا۔

4- ملکی قرضہ کو ایک قومی اہمیت کا معاملہ اور بڑی ذمہ داری سمجھا جائے جس کو ایک متعینہ مدت میں موثر طریقہ سے حل کیا جائے۔ ملک کی آمدنی کا ایک حصہ آنے والی نسلوں کے لیے وقف کیا جائے جو تیل کے علاوہ توانائی کے متبادل ذرائع کے فروغ سے خطرہ میں ہیں۔

5- آمدنی کے دیگر وسائل میں ترقی سے معیشت میں تنوع پیدا کیا جائے۔ قومی اور بین الاقوامی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی سرگرمیوں کے لیے

ایک قانونی فریم ورک تیار کیا جائے اور ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔

قومی اتحاد اور خطرات

تیسرا محور: قیادت اور سماج کے درمیان باہمی تعامل کی حوصلہ افزائی۔ ہمارے داخلی محاذ اور اس کی اندرونی یکجہتی کی مضبوطی کے لیے مندرجہ ذیل کی ضرورت ہے:

1- انسانی حقوق کے کلچر، جس کا ہمارے مذہب نے بھی حکم دیا ہے جیسے کہ تحمل، مساوات، انصاف، رواداری وغیرہ کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت اور سماج کے کرداروں کی اہمیت۔ قومی اتحاد کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے اور اختلافات کے سارے عناصر خواہ وہ مسلکی، نسلی، علاقائی یا سماجی ہوں کو ختم کرنا چاہیے۔

2- ملک کی صورتحال سے متفکر مصلحین جیسے کہ یونیورسٹی پروفیسرز اور جج وغیرہ کے حقوق بحال کیے جائیں اور ان کو ان عہدوں پر واپس لایا جائے جن سے وہ نکالے گئے تھے۔

3- مختلف درجوں میں عوامی امور پر بحث و مباحثہ کے لیے تمام سماجی عناصر خصوصاً علما اور دانشوروں کو قانونی آزادی دی جائے اور عوامی امور کے تمام معاملات پر اظہارِ رائے کی آزادی سے پابندیاں ہٹائی جائیں جیسے کہ سفر، جیل میں ڈال دینا، روزگار سے ہٹا دینا، تحریر و اظہار رائے سے روکنے کے لیے جبریہ اقبالی بیان کو ختم کیا جائے۔

پانچواں محور: قومی مذاکراتی کنونشن کا دعوت نامہ

دستخطیوں کا یہ خیال ہے کہ ان اقدامات کے بہترین نتائج کے لیے حکومت ایک قومی مذاکراتی کنونشن بلائے تاکہ خاص خاص مسائل پر بحث ہو سکے۔ اس کنونشن میں عوامی امور سے دلچسپی رکھنے والے دانشوروں کے ایک گروپ کے ساتھ ساتھ ہر مزاج اور نظریہ کے علاقائی، ثقافتی اور سماجی نمائندے شریک ہوں اور ایک اداراتی قوم کی دستوری بنیاد ڈالنے کے لیے جو مسائل اور چیلنجز سامنے ہیں ان پر مذاکرہ کریں۔

آخر میں، ہمارے ملک کو جو خطرات اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں ان کے

مقابلہ میں ہم قیادت سے تعاون میں اپنے عہد کو دوہراتے ہیں۔ہمیں یقین ہے کہ قیادت اس بات کو سمجھتی ہے کہ ہمارے سامنے کے چیلنج کا بغیر سنجیدہ اصلاحات کے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ایسی اصلاحات جن میں عوم کی شرکت ظاہر ہو۔

خدا ہماری سعی وکاوش کے ساتھ ہے اور وہی صراط مستقیم کے لیے ہدایت دیتا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

103 دستخطی

V- شیعہ عرضداشت (اپریل 2003)

(بشمول 24 خواتین کے 450 سعودی شیعہ شخصیات نے اس پر دستخط کیے اور ولی عہد کو پیش کیا۔ اس عرضداشت کا متن لبنانی روزنامہ السفیر میں 22 مئی 2004 کو شائع ہوا)

عزت مآب! مذہبی وقومی ذمہ داری اور مشورہ وتعاون کے فرض سے۔خصوصاً ان اہم اور نازک حالات میں نمو پاتے ہوئے ہم یہ عرضداشت آپ کو پیش کرتے ہیں کیونکہ قوم کے وقار اور سلامتی کا تحفظ عوام اور قائدین کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔اس عرضداشت میں قوم کے اندیشے اور اس کے شہریوں کی امنگیں شامل ہیں۔

قوم سے مطلق اور گہرے تعلق کی بنیاد پر کیا ہوا یہ جائزہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اس حوالے سے مسلکی صورتحال سے نمٹنے کے لائحہ عمل کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں جو اصلاح اور فروغ کی اہم نشانی ہے۔ہم اس کو ایک قومی ذمہ داری سمجھتے ہیں جس میں ہر شہری کو شریک ہونا چاہیے۔

1- قوم (عرب اور اسلامی) کے اتحاد کو مضبوط کرنا

فی الوقت عرب اور اسلامی قوم مہلک ترین خطروں اور آزاروں سے دو چار ہے۔ ان عناصر کے سبب سے یہ لازم ہے کہ ہم اس طوفان کے سامنے متحد ہوکر کھڑے ہوں۔لیکن مسلک کے نظریاتی اختلافات اور کشمکش اب بھی قوم کے اتحاد کو نقصان پہنچا رہے

ہیں اور یکجہتی کے قیام میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اس طرح اکثر مومنین کو اصل مسائل سے دور کرر ہے ہیں۔

مملکت سعودی عرب کو قیادت کے لحاظ سے عرب اور اسلامی دنیا میں جو اوّلین مقام حاصل ہے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نظریاتی اختلافات اور مسلکی بے آہنگی پر قابو پانے کے لیے فعال کردار ادا کرے گی۔ اس کردار کی ادائیگی سے کنارہ کشی کا مطلب انتہا پسند نظریات کی تحریکوں کے لیے راہ ہموار کرنا، ہماری قوم کی نیک نامی پر سیاہی پھیرنا ہے اور اس طرح قوم، اس کشمکش میں ایک فریق بن جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں ان مقاصد کے حصول میں مندرجہ ذیل طریقوں میں سے کچھ کارآمد ہو سکتے ہیں:

مملکت کی جانب سے غیر مبہم الفاظ میں تمام مذہبی فرقوں بشمول شیعہ فرقہ کے احترام کے بارے میں بیان۔

سلطنت کے اسلامی اداروں میں مختلف اسلامی فرقوں کے لیے دروازہ کھلا ہونا (اور ان کو نمائندگی کا بھی حق ہو)۔

سلطنت میں اسلامی علما اور دوسرے فرقوں کے مسلمان علما کے درمیان روابط کو مضبوط کرنا اور ان کے درمیان سمجھوتہ و مصالحت کے لیے کام کرنا۔ اسلامی اتحاد کے سلسلہ میں اسمبلی آف اسلامک جیور سپروڈنس قرارداد نمبر (1/11) 98 مورخہ 25 رجب 1419 سے رہنما ہدایات اخذ کی جا سکتی ہیں۔ اسلامی فرقوں کے درمیان تعلقات کی بحالی اور مصالحت کے لیے انٹرنیشنل آرگنائزیشن فار ایجوکیشن، سوسائٹیز اینڈ کلچر (آئی ایس ای ایس سی او) کے ماہرین کی تجویز کردہ اسٹریٹجی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

2- قومی اتحاد

اس وقت علاقہ اور دنیا میں متغیر ہوتے ہوئے حالات دراصل اس دباؤ کا انکشاف کرتے ہیں جو بین الاقوامی طاقتوں نے صاف صاف الفاظ میں علاقہ کی دوبارہ سیاسی نقشہ کشی اور ممالک اور علاقوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بات کے ذریعہ ڈالا ہے۔ ہمیں قومی اتحاد پر زور دیتے ہوئے اور اس کو عملی طور پر زیادہ موثر بناتے ہوئے اس دباؤ کا سامنا

کرتا ہے۔ اس میں داخلی محاذ کی حفاظت اور استحکام، دشمن کی اندرونی مداخلت کاری پر روک، اور تفریق پیدا کرنے اور گمراہ کرنے والی تحریکوں کی ہر کوشش کو شکست دینا شامل ہے۔

عزت مآب! سلطنت کے شیعہ عوام اس دولت مند قوم کا ایک بنیادی اور غیر منقسم حصہ ہیں۔ نہ ہی وہ کسی اور ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور نہ ہی کسی اور کے لیے وفاداری محسوس کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس نازک وقت میں وہ یقین رکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا امور جو بار بار عزت مآب اور دیگر اعلیٰ افسران کے سامنے رکھے گئے ہیں پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

1- مختلف میدانوں اور پیشوں میں بقیہ لوگوں کے ساتھ قوم کی خدمت کے لیے مساوی مواقع کی تلاش میں شیعہ شہری کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ریاستی نظام میں اب بھی کئی مقامات پر شیعوں کو روزگار سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے جیسے کہ فوج، سلامتی اور سفارتکاری جب کہ ان کی خواتین کو محکمہ تعلیم خواتین میں انتظامی عہدوں پر فائز نہیں کیا جاتا۔ شیعاؤں کو ان کے فرقہ کی وجہ سے حاشیہ پر رکھا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے ہم مندرجہ ذیل تجویز پیش کرتے ہیں:

شہریوں کے تمام فرقوں کے درمیان افسران کو مساوات برتنی چاہیے۔

فرقوں میں امتیاز برتنے کے مسئلہ پر فوری طور سے ایک قومی کمیٹی قائم کی جائے۔ جس میں شیعہ نمائندگی بھی ہو۔

مسلکی امتیاز کو ایک جرم قرار دیا جائے۔

تمام غیر قانونی حفاظتی اقدام جیسے کہ گرفتاری، جاسوسی، تفتیش، سفر سے ممانعت، سرحدوں پر لوگوں کو پکڑنا اور جسم کی تلاشی لینا اور ان سے متعلق دوسرے حقارت آمیز سلوک کو بند کرنا۔

2- ہمارا ملک ایسے انتہا پسند مسلکی گروپوں کی زد میں ہے جو دوسرے اسلامی فرقوں خصوصاً شیعاؤں کے خلاف نفرت پر اکساتے ہیں۔ یہ انتہا پسند گروپ اپنے سرکاری رابطوں اور عہدوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں (اور نصاب، میڈیا، عدالت

اور مذہبی پولیس کو متاثر کرتے ہیں)۔ اس ہمیشہ موجود رہنے والے مسلکی عنصر نے انتہاپسندی اور نفرت کے جراثیم سے نسلوں کو آلودہ کر دیا ہے اور قومی اتحاد کے مستقبل، معاشرتی امن اور سلامتی کے لیے لمحہ فکریہ مہیا کیا ہے۔ اس خطرناک صورتحال سے نبردآزما ہونے کے لیے ریاست کو مندرجہ ذیل اقدام کرنے ہوں گے:

ان رجحانات کا خاتمہ کرنا ہوگا اور اس سلسلہ میں نصاب، میڈیا اور سرکاری مذہبی اداروں سے اجرا کیے ہوئے مواد سے شروعات کرنی ہوگی؛

مسلکوں کی تکثیر کو تسلیم کریں اور حقوق انسانی کا احترام کریں؛

ایک غیر مبہم اور واضح بیان جاری کیا جائے جس میں شیعوں کے حقوق اور دوسرے شہریوں کے ساتھ ان کی مساوات کا اعلان کیا جائے۔

3- سلطنت میں شیعہ شہریوں کو اب بھی اپنی مذہبی تقریبات اور رسومات کی بجا آوری میں پابندیوں اور مختلف قسم کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ثقافتی سطح پر ان کو کوئی آزادی میسر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان کو اپنی کتابوں کی اشاعت اور ان کی درآمد کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی وہ ذہنی مرکز اور ثقافتی ادارے قائم کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ القطیف اور الاحصا میں اوقاف و میراث کی عدالتوں میں ججوں کے زیادہ تر اختیار مرکزی قانونی اتھارٹی کی دخل اندازی کا شکار ہیں۔ کچھ علاقوں جیسے کہ مدینہ میں شیعہ شہریوں پر سخت ترین دباؤ اور پابندیاں ہیں جو ناقابل قبول اور ناقابل معافی ہیں۔ ان مسائل کا سامنا کرنے کے لیے ہمارے پاس مندرجہ ذیل تجاویز ہیں:

شیعوں کے ثقافتی اور دینی امور کے انتظام کے لیے ریاست کی زیر ہدایت اور وزارتِ اوقاف و اسلامی امور کے زیر اہتمام شیعہ اسلامی علما کی ایک سرکاری تنظیم کی تشکیل کی جائے؛

شیعہ دینی تقریبات کے منانے پر سے پابندیاں اور رکاوٹیں ہٹائی جائیں اور شیعی کتب کی درآمد اور اشاعت کے لیے راہ ہموار کی جائے اور اظہار رائے کی ضمانت دی جائے؛

شیعہ شہریوں کو دینی تعلیم کا حق ادا کیا جائے اور ان کے عقائد کے لحاظ سے تعلیم دینے کے لیے کالج قائم کریں؛

شیعہ شہریوں کے اوپر شاہی فرامین کے ذریعہ جو قانون نافذ ہیں ان کو شرعی عدالتوں میں منتقل کیا جائے اور ان عدالتوں کو مناسب قانونی اور انتظامی اختیارات تفویض کیے جائیں۔

28 صفر 1424ھ مطابق 30 اپریل 2003

VI- ''قوم کے دفاع میں'' عرضداشت (ستمبر 2003)

اعلیٰ مرتبت، حضور والا ولی عہد سلطنت عبداللہ بن عبدالعزیز، کمانڈر نیشنل گارڈ حفظہ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

قومی دن کے اس عزیز موقعہ پر ہم حضور والا کو اپنی بہترین مبارک باد اور تہنیت جو محبت اور وفاداری کے جذبہ سے مربوط ہے، پیش کررہے ہیں اور بارگاہ خداوندی میں دعا گو ہیں کہ اس قوم کی فلاح و بہبود اور ترقی کی کاوشوں میں وہ آپ کی مدد فرمائے۔

ہمیں مسرت ہے کہ ہم اس منسلکہ عرضداشت بعنوان ''قومی دفاع میں'' کے ذریعہ آپ کی توجہ اپنے موقف کی طرف مبذول کرا رہے ہیں جس کے تمام دستخطی ہر قسم کے تشدد اور دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں جس کا ہمارا ملک شکار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تمام، دستخطی اصرار کرتے ہیں کہ ہمارے دستوری، سیاسی، معاشی اور سماجی اداروں میں اساسی اور جامع اصلاحات کے نفاذ کی اشد ضرورت ہے۔ یہ اصلاحات آج کے اور مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کا موزوں اور عملی جواب ہیں۔

ریاض، 27 رجب 1424ھ مطابق 24 ستمبر 2003

"قومی دفاع میں"

وہ لوگ جو اسلحہ اور خون ریزی کو اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے منتخب کرتے ہیں اور بجائے مذاکرات و گفتگو کے اپنا نقطہ نظر زبردستی تھوپنا چاہتے ہیں، ہمارے ملک میں تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کے ذمہ دار ہیں۔ اس سے قومی سلامتی، معاشرتی استحکام اور شہری امن کو زبردست نقصان پہنچے گا۔

ان مشکل حالات میں جب کہ ہمارا ملک سخت ترین داخلی اور خارجی چیلنجز کا سامنا کر رہا ہے۔ انتہا پسندی اور تشدد کی تمام علامتوں کی مذمت ایک قومی، سیاسی، اخلاقی اور ثقافتی ذمہ داری ہے۔

اس یقین پر مبنی کہ ہم یعنی حکومت اور عوام۔ قوم کے اتحاد، سلامتی اور استحکام کی حفاظت میں برابر کے شریک ہیں ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں اور ان اقدامات کی تجدید کریں جو ہم کرتے رہے ہیں اور اس بات کو تسلیم کریں کہ اصلاحات کو طویل مدت تک التوا میں رکھنا اور فیصلہ سازی میں شرکت سے عوام کو باز رکھنا وہ عوامل ہیں جو ہمارے ملک کو ان خطرناک موڑ تک لے آئے ہیں جہاں ہمارا ملک آج کھڑا ہے۔ اسی سبب سے، ہمیں یقین ہے کہ ہمارے معاشرہ میں تمام سیاسی، عقلی اور ثقافتی رجحانات کو ان کے فطری حق یعنی اظہار رائے کے انکار نے ایک ایسے مذہبی رجحان جو اسلامی تحمل اور تنوع کی نمائندگی نہیں کرتا ہے اور ایسے مکتب فکر کو جنم دیا ہے جس کا مقصد دہشت گردی اور دوسروں کی تکفیر ہے۔ ہمارا ملک اب بھی اس کو جھیل رہا ہے۔

دہشت گردی کا مقابلہ محض حفاظتی وسائل اور حل سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے ان سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی عوامل کو جاننا بھی ضروری ہے جو اس کے پیچھے کارفرما ہیں اور ان سیاسی اور اقتصادی اصلاحات کو فوراً نافذ کیا جائے جن کا خاکہ ہمارے ملک کے عوامی امور سے وابستہ اکثر افراد نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پیش کیا ہے۔ ان میں سے ایک عرضداشت بعنوان "قوم کے حال اور مستقبل کا تصور" ولی عہد سلطنت حفظہ اللہ کو جنوری 2003 میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں مطالبات کی ایک فہرست تھی جس میں مندرجہ

ذیل مطالبات شامل تھے: ریاست کے دستوری ادارے قائم کیے جائیں؛ فیصلہ سازی میں عوامی شرکت کی اجازت؛ مجلس شوریٰ کو ایک منتخب تنظیم بنانا اور اس کو قانون سازی اور نگرانی کے وہ تمام اختیارات سونپنا جو اس سے متعلق ہیں؛ طاقت کے الگ الگ ہونے کے اصول کا نفاذ؛ عدلیہ کی آزادی میں اضافہ؛ حقوق انسانی کا احترام؛ سول سوسائٹی کے کاموں کی قانونی اجازت؛ اور مذہبی، تعلیمی اور ثقافتی تنوع کو پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا جائے جو یکطرفیت، تکفیر اور سچائی کی اجارہ داری کے ہر دعویٰ کو جھٹلاتا ہے۔ ایسی گفتگو ایک علمی تکثیری ماحول کے فروغ میں معاون ہوگی جو دوسروں کو اپنانے اور برداشت کرنے کے کلچر کی اقدار کو آگے بڑھانے میں مدد کرے گی خواہ وہ کوئی بھی ہو اور کسی بھی قوم کا فرد ہو۔

یہ مطالبات اور مشورے سعودی عوام کے مختلف طبقات کی امنگوں کا مظہر ہیں اور سیاسی قیادت اور مختلف قومی انتخابی حلقوں دونوں کے لیے ایک مشترک تصور بناتے ہیں۔

ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ انتظامی بدعنوانیوں اور عوامی دولت کی لوٹ مار کے جراثیم کو جڑ سے مٹانا، پیداوار کی بنیاد میں تنوع پیدا کرنا، تمام سماجی طبقات اور علاقوں کے درمیان وسائل کی مساوی اور منصفانہ تقسیم کے اصول کا نفاذ، مسائل کے عملی حل کے مشورے جیسے کہ غربت، بے روزگاری، تعلیم، صحت، رہائش، خواتین کو ان کے سماجی اور معاشی کردار نبھانے کے لائق بنانا اور دیگر فوری مسائل مذکورہ بالا اصلاحات کے نفاذ کے بغیر حل نہیں ہوں گے۔

اب جب کہ ہم بانگ دہل دہل انتہا پسندانہ تشدد خواہ وہ علامتی ہو یا حقیقی اور جو ہمارے معاشرہ کو یرغمال بناتا ہے اور ریاست کی بنیادوں کو ہلاتا ہے، کی مذمت کرتے ہوئے اسے مسترد کرتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ ہم ان لوگوں سے جو ان کارروائیوں میں حصہ لیتے ہیں یا ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے تشدد، انتہاپسندی اور دہشت گردی سے زبانی اور عملی طور سے باز آئیں اس امید کے ساتھ کہ ایسے اقدامات کو حکام مثبت نظریہ سے دیکھیں گے اور انتہا پسندوں کے ساتھ منصفانہ قانون اور ضابطوں کے تحت کارروائی ہوگی۔ دوسری جانب ہمارے ملک کے علاقائی، طبقاتی، ثقافتی تنوع کی نمائندہ قومی انتخابی

حلقوں کے نمائندوں سے بنی ہوئی خودمختار قومی انجمن کے سیاسی قیادت کے ذریعہ، طویل مدت سے منتظر جامع قومی اقدام کے اعلان کی اپنی مسلسل درخواست کی توثیق کرتے ہیں۔ اس کا مقصد دستوری، سیاسی، معاشی اور سماجی اصلاحات کے مطالبات کو عملی جامہ پہنانے اور اس کے ایجنڈے کو تسلیم کرنے کے مرحلہ سے ایک غیر لچکدار ٹائم ٹیبل کے مطابق عمل اور نفاذ کے مرحلہ تک لے جانا ہوگا۔

خدا ہمارے ملک کو سلامت رکھے اور اس کو ہدایت کی راہ پر گامزن کرے۔

VII- دوسرے قومی مذاکرہ کا اعلامیہ (4 جنوری 2004)

عوام کے مفادات کی حفاظت اور عوامی فلاح سے متعلق، ملک کے دانشوروں اور دینی بزرگوں کی سنبھالی ہوئی ذمہ داری کی شرعی اصولوں سے موافقت کی بنیاد پر شاہ عبدالعزیز سینٹر فار نیشنل ڈائیلاگ کا قیام عمل میں آیا اور اس کا دوسرا مذاکرہ 8-4 ذوالحجہ 1424ھ/ 31-27 دسمبر 2003 میں منعقد ہوا۔ اس کا مقصد تھا کہ گفت وشنید کے عمل کو زندگی کے طریقہ کا ایک حصہ اور عوامی رائے رجحانات اور حقائق کو جاننے کا ایک خاص ذریعہ بنایا جائے تاکہ ان کو اصلاحات کے ذمہ دار حکام کے سامنے پیش کیا جائے۔

دینی رہنماؤں، علما اور اساتذہ، مرد اور عورتوں نے، جو ایک وسیع دانشورانہ طرز خیال کے دائرہ کے نمائندے تھے، میٹنگ میں حصہ لیا۔ مذاکرہ کا عنوان ''زیادتیاں اور اعتدال پسندی: ایک جامع نظرثانی۔'' یہ موضوع خاصی چھان بین کرنے کے بعد بہت احتیاط سے منتخب کیا گیا تھا اور ذہن میں یہ رکھا گیا تھا کہ ''زیادتیاں اور ان کے خطرات ملک، عوام اور دنیا کو خاصا نقصان پہنچا رہے ہیں اور جس عہد میں ہم جی رہے ہیں اس میں ہر قسم کی زیادتیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

مجلس کے عنوان پر لکھے ہوئے مضامین نے ثانوی، سماجی، نفسیاتی، تعلیمی، سیاسی، معاشی اور میڈیا امور کے ہر پہلو کا احاطہ کیا۔ مجلس کا مقصد تھا، مسئلہ کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ زیادتیوں کی علامتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے رائیں تیار کی جائیں (میٹنگ میں اس موضوع پر چودہ سیشن ہوئے اور مندرجہ ذیل پہلوؤں پر غوروفکر ہوا)

قانونی پہلو: اس زمرہ میں دوسروں کی تکفیر اور دینی اعمال پر ان کی معاشرتی ذمہ داری کی سطح پر تنقید کا موجودہ رویہ شامل ہیں اور ساتھ ہی غیر مسلموں سے تعلقات کا مسئلہ اور یہ کہ کون کتنا سادگی وطہارت پسند ہے اور دوسرے کو کتنا ہونا چاہیے، حاکم و رعایا کے درمیان تعلقات اور شہریوں کے حقوق و فرائض بھی اس زمرہ میں آتے ہیں۔

نفسیاتی سماجی پہلو: ایک انتہا پسند شخصیت کی خصوصیات، مقامی ماحول پر سماجی تربیت اور تعلیم کے اثرات اور سعودی معاشرہ میں دینی تعلیم کی معاشرتی نقطہ نظر سے تنقیح و تفتیش، اس زمرہ میں شامل ہیں۔

تعلیمی پہلو: یہ پہلو اعتدال کے حصول میں سماجی فضا، استاد کے رول اور دینی نصابوں کے اثر کا احاطہ کرتا ہے۔ ایک متوازن شخصیت کی تخلیق اور مثبت طرز فکر کی نشوونما میں تعلیم کا کردار، ساتھ ہی تجاوز اور اعتدال کے حصول میں مشکوک تعلیمی سرگرمیوں کے اثر پر مباحثہ بھی اس میں شامل ہے۔

سیاسی اور معاشی پہلو: سماج میں بے اعتدالیوں سے مقابلہ کرنے میں علمی اور عملی طور پر عوام کی شراکت داری کی اہمیت اور اس کا آزادی اور حقوق انسانی سے رشتہ اور دنیا کے مسلمانوں کے معاملات میں دخل اندازی کی حد، اور معاشی عنصر کا مطالعہ اور بے اعتدالی پر اس کا اثر اور ساتھ ہی دوسرے عناصر جیسے غریبی، بے روزگاری، عام مالیاتی انتظام، اقتصادی فروغ اور متوازن ترقی کے ساتھ اس کا تعلق۔

میڈیا پہلو: تجاوز و بے اعتدالی کی نشری حدود، میڈیا کی مختلف اقسام میں اظہار رائے کی آزادی پر زور اور بے اعتدالی سے مقابلہ کرنے میں اس کا اثر، اس کے علاوہ دینی مواعظ کی نشری حدود اور اعتدال کے حصول اور بے اعتدالی سے مقابلہ کرنے میں اس کا کردار۔

شرکا نے اپنی بحث سعودی قومی اتحاد کے لیے اپنی ذمہ داری پر ختم کی جو اپنے قانون اور دینیات کے لیے اسلام پر مبنی ہو۔

شرکا نے دہشت گردی کو مسترد کرنے کے اپنے اصول کو دوہرایا اور اس کے مقابلے کے لیے مزید اتحاد کا مطالبہ کیا۔

شرکا نے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں:

1- مذہبی علمی اداروں کو دعوت دی جائے کہ وہ بے اعتدالیوں اور تجاوز سے متعلق اصطلاحات جیسے کہ دہشت گردی، جماعت المسلمین، دارالحرب، دارالکفر، دارالاسلام اور طائفہ المنصورہ کے مفہوم پر متفق ہو جائیں۔

2- سعودی معاشرہ میں بے اعتدالی کے عنصر پر اس کے اسباب، اقسام اور اثر پر نظر رکھتے ہوئے ایک جامع سائنسی مطالعہ کی دعوت تاکہ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک جامع حکمت عملی تیار کی جائے۔

3- سیاسی اصلاحات کے عمل میں تیز رفتاری، شوریٰ کونسل اور علاقائی کونسل کے اراکین کے انتخاب کے ذریعہ عوام کی شراکت داری میں توسیع، ٹریڈ یونین، رضاکارانہ اور سول سوسائٹی جیسے اداروں کی تشکیل کی حوصلہ افزائی۔

4- رعایا اور حاکم کے درمیان رابطے کی سہولتوں میں مزید فروغ اور حکومت کے تینوں بازوؤں منتظمہ، عدلیہ اور مقننہ میں واضح فرق اور امتیاز۔

5- عوامی فنڈ کے حوالہ سے اقتصادی امور کے کنٹرول پر زور دینا۔ ترقی کے جامع اور متوازن پروگرام کے مطابق عوام کے بنیادی وسائل کے لیے خرچ کو ترجیح، سخت گیر اقدامات کے ذریعہ عوامی قرض کو کم کرنا اور اس عمل میں جوابدہی اور شفافیت کے اصول کو حاصل کرنا۔

6- دنیا کے عمومی حالات کو محتاط طریقہ سے سمجھتے ہوئے اور ان سے آزادانہ باہمی ربط رکھتے ہوئے دینی پیغام میں جدت لانے کی دعوت۔

7- عوامی مسائل پر وہ انفرادی فتوے جو ریاست کے مفاد اور مستقبل پر اثر انداز ہوں جیسے کہ امن اور جنگ، کو یکسر مسترد کرنا اور یہ ذمہ داری با اہلیت افراد کے سپرد کرنا، ساتھ ہی فتویٰ کے اجرا سے متعلق وسائل اور کارکردگی کو بہتر بنانا۔

8- سعودی سماج میں مذاکرہ اور مکالمہ کے تصور کا تعارف اور اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں ذمہ دارانہ آزاد گفتگو جو عوام کے مفاد میں ہو کے دروازے

کھولتے ہوئے نئی نسل میں اس کی تدریس و تعلیم۔

9- مختلف خصوصی میدان میں تعلیمی پروگرام کو فروغ بشمول تحمل و اعتدال کی روح کو وسعت اور ادراک کی ہنرمندیوں کی ترقی۔

10- نوجوانوں کے صحت مند پروگراموں کو تعاون دینا اور رہائشی قرب و جوار میں لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے لیے یوتھ سینٹرز قائم کرنا۔

11- معاشرہ میں منفی عناصر کی نگرانی اور مستقبل میں ان سے مقابلہ کے لیے منصوبہ بندی۔

12- زندگی کے ہر شعبہ میں عورتوں کے کردار کو اہم بنایا جائے اور ایسے خصوصی قومی سینٹرز قائم کیے جائیں جن کا کام خاندان، خواتین اور اطفال کی بہبود ہو۔

13- کوئی بھی شخص جو تشدد اور برائی کو چھوڑنا چاہتا ہو اور اپنے کیے پر نادم ہو تو اس سے سختی سے برتاؤ کرنے یا حقہ پانی بند کرنے کے بجائے اس کو معاشرہ میں ضم کرنے کے لیے دروازے کھولنے چاہئیں۔

14- ان تمام افراد کو جو تشدد اور دہشت گردی کے ملزم ہیں ایک منصفانہ مقدمہ کی ضمانت ملنی چاہیے، ان کو وکیل کے انتخاب کا حق ہونا چاہیے اور ان سے ہر وقت ملنے کی آزادی۔

15- ایک جامع حکمت عملی کا قیام تاکہ نوجوانوں کو انتہا پسندی اور بے اعتدالی کی راہ سے ہٹا کر صحیح سمت میں لے جایا جائے، ان کے لیے روزگار، ٹریننگ اور اہلیت کے مواقع فراہم کیے جائیں اور مختلف تعلیمی اداروں میں ان کے داخلہ کے لیے میدان کشادہ ہو۔

16- ریاست اور مذہب سے متعلقہ امور میں میڈیا کی رپورٹنگ میں توازن کی ضرورت پر زور اور ایک ایسے نظام کا قیام جو تفریق پیدا کرنے والے ہر سبب کو نظر انداز کرے اور مسلکی تنوع کے دینی اور عملی پہلو پر نظر رکھے۔

17- بیرون سلطنت میڈیا میسیج پر توجہ اور عصری چیلنجز سے مقابلہ کرنے کے لیے اس کے فروغ کی ضرورت اور شاہ عبدالعزیز سینٹر فار نیشنل ڈائیلاگ میں تہذیب و ثقافت

اور ان سے منسلک مطالعوں کے لیے ایک خصوصی یونٹ کا قیام۔

شرکا نے تجویز کیا کہ تیسری میٹنگ کا موضوع بحث مندرجہ ذیل میں سے کوئی ایک ہو:

حاکم ومحکوم کے درمیان تعلق

خواتین کے حقوق وفرائض

عوامی سیاسی شراکت داری

تعلیم

آخر میں شرکا نے میٹنگ کے انعقاد کے لیے سہولتوں کی فراہمی پر خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز، ان کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز اور نائب دوم شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز کا شکریہ ادا کیا اور ستائش کی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تاریخ فلسفۂ اسلام

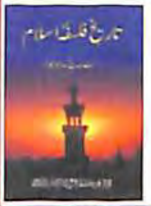

مصنف: ٹ۔ج۔دوبوئر
مترجم : ڈاکٹر سید عابد حسین
صفحات: 171
قیمت : -/70 روپے

سماجی فلسفہ کا خاکہ

مصنف : جے۔ایس۔میکینزی
صفحات: 344
قیمت : -/22 روپے

جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار

مصنف : ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
صفحات: 494
قیمت : -/178 روپے

ہمارا قدیم سماج

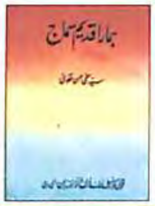

مصنف : سید سخی حسن نقوی
صفحات: 212
قیمت : -/54 روپے

جدید سیاسی فکر

مصنفین : ڈاکٹر سید انوار الحق حقی
ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
صفحات: 305
قیمت : -/120 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات

مصنف : ایم۔این سری نواس
صفحات: 305
قیمت : -/120 روپے

₹ 235/-

ISBN: 978-93-5160-059-6

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025